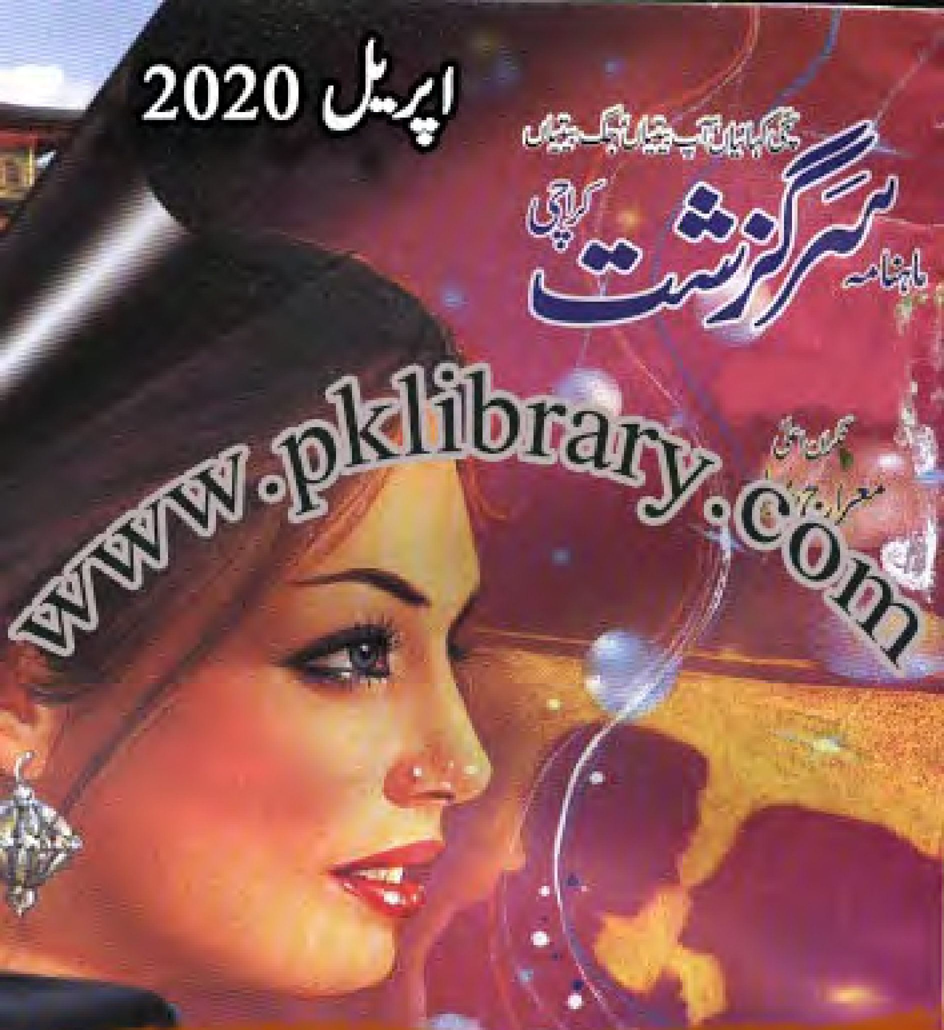

اپریل 2020
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
www.pklibrary.com

UUN

قارئین کرام!

السلام علیکم!

پوری دنیا پر کرونا وائرس کی شکل میں ایک عذاب اترا ہوا ہے جس کی ابتداء چین سے ہوئی تھی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ایک سو پندرہ ممالک اس عذاب کا شکار ہیں۔ چین کے بعد اٹلی، ایران، جنوبی کوریا، اسپین میں بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ جرمنی کی چانسلر انجیلا مرکل نے خبردار کیا ہے کہ جرمنی کی 70 فیصد آبادی متاثر ہوسکتی ہے۔ بھارت نے سیاحوں کے ویزے معطل کر دیے ہیں۔ یورپ بھر کے تعلیمی ادارے بند کر دیے گئے ہیں۔ امریکا میں ایک ہزار سے زائد کیسز دریافت ہو چکے ہیں۔ ناروے نے فوجی مشقیں منسوخ کر دی ہیں۔ انڈونیشیا، البانیا، بلجیم، پناما اور بلغاریہ میں بھی ہلاکتوں کی تصدیق ہوئی ہے۔ الجزائر نے ہر قسم کے اجتماعات کو معطل کر دیا ہے۔ وطن عزیز میں بھی خطرہ بڑھ رہا ہے۔ اس خطرے سے نمٹنے کے لیے میڈیکل ایمرجنسی نافذ کر دی گئی ہے لیکن حکومتی سطح پر اس خطرے کا مقابلہ کیسے کیا جا رہا ہے اس کی تشہیر نہیں ہو رہی ہے۔ بازار میں ماسک اور گلوز بہت زیادہ مہنگے کر دیے گئے ہیں۔ ٹیسٹ کرانا نہیں آتی تو دوسرے لوگ ٹیسٹ کرانے سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وبا روکنے کے لیے احتیاطی تدابیر ضروری ہے۔ اس لیے حکومت کی جانب سے مفت ٹیسٹ کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے مختلف رفاہی تنظیموں کو بھی آگے آنا ہوگا۔ وہ گلوز اور ماسک مفت تقسیم کر سکتی ہیں۔ آگہی مہم بھی بڑے پیمانے پر چلانا چاہیے۔

UUNOVELS.COM

جہاں گرد

زویا اعجاز

بزرگ کہتے ہیں کہ وہی پھول سر چڑھتا ہے جو چمن سے نکل جاتا ہے اور ایسے ہی عزت ملتی ہے جو وطن کی سرحدیں عبور کرلیتا ہے، دیار غیر پہنچ جاتا ہے اور یہی شخص عزت و شہرت کا حقدار ٹھہرا! جب دوسرے ملک پہنچا اسے پذیرائی ملی تو مزید آگے بڑھا پھر تو ایسا لگا کہ پاؤں میں چکر بندھ گئے ہوں وہ ملکوں ملکوں پھرنے لگا، جہاں بھی گیا عزت کا دستار سر پر بندھا، کہیں بادشاہ کا مقرب بنا تو کہیں شہر قاضی مقرر ہوا مگر اسے چین نہ آیا، وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھتا ہی نہیں تھا، ایک کے بعد ایک بلاد العرب کے ممالک کو دیکھ لینے کے بعد فارس چلا گیا پھر وہاں سے برصغیر ہند آکر اس نے یہاں کے رسوم و معاشرت کو دیکھا، سمجھا۔

اسے مسلم دنیا کا نامور سیاح کہا جاتا ہے

وہ شادی کی ایک پُروقار تقریب تھی۔

شہر کے معزز متمول اور بارسوخ تاجر کا پوتا اپنے ہم پلہ خاندان کی نورِ چشم سے عقدِ نکاح میں بندھنے والا تھا۔ ہر سو خوشی، شادمانی اور رنگ و بو کا سیلاب تھا۔ مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔ ان مہمانوں میں شہر کی کئی معروف اور بلند مرتبہ ہستیاں بھی شامل تھیں۔ ہر ہستی کی آمد پر پہلے سے موجود دیگر مہمان خوشدلی سے استقبال کرتے۔ اسی دوران ایک شخص کی آمد نے وہاں موجود چند افراد کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کردیا۔ وہ طویل قامت اور مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ رنگت موسموں کی سختی نے قدرے جھلسا رکھی تھی۔ عمر کی سات دہائیوں کا سفر طے کرلینے کے باوجود اس کے جسم میں کہیں کوئی خم دکھائی نہ دیتا تھا۔ پتلی قدرے لمبی ناک، باریک بھنویں، کشادہ پیشانی اور استخوانی چہرہ مقابل کے دل میں احترام کی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ اس کا بالائی لب خمدار اور زیریں لب ابھرا ابھرا سا تھا۔

اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں اور منفرد شے آنکھیں تھیں۔ سیاہ، اولوالعزم، گہری، زیرک اور کسی کی بھی روح میں جھانک لینے والی کشش کی مالک۔

"اگر میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہیں تو یہ قاضی صاحب ہیں ناں؟" ایک نوجوان نے اشتیاق سے اپنے ساتھی کو کہا۔

"دھوکا کیسا؟ بالکل وہی ہیں۔" اس کے ساتھ بیٹھے دوسرے شخص نے جواب دیا۔

"مجھے ان سے ذاتی طور پر تفصیلی ملاقات کی بڑی تمنا تھی۔ میں نے ان کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے۔ قدرت نے آج کیسے میری یہ خواہش پوری کرنے کا سامان کردیا۔" نوجوان پُرجوش تھا۔

"ہاں! میں نے بھی ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔" دوسرے شخص کی نگاہیں بھی اسی نووارد کے تعاقب میں تھیں۔ شومئی قسمت وہ اپنے لیے نشست تلاش

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

گرتا ہوا انہی کی طرف چلا آیا۔ دونوں افراد نے بڑی محبت سے ملیک سلیک اور معانقہ کیا۔

"آج اپنی خوش بختی پر رشک آرہا ہے کہ آپ جیسی عالی مرتبت ہستی سے ملاقات ہوگئی۔" پہلے شخص نے کہا۔

"مجھ خاکسار کی کیا بساط ہے عزیزم؟ یہ تو بس آپ کی محبت ہے جس نے آپ کو ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔" اس کا ہر ایک انداز منکسر اور لہجہ دھیما تھا۔

"یہی تو آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے محترم! ورنہ آپ کا مقام تو تاروں کو بھی مات دے سکتا ہے۔" دوسرے شخص نے عقیدت کا اظہار کیا۔

"اب مجھے شرمندہ تو مت کیجیے ناں۔" وہ اسی انکساری سے مسکرایا۔

"جناب! میری بڑی آرزو رہی ہے کہ میں آپ کے متعلق زیادہ سے زیادہ جان سکوں۔ آپ کی شخصیت اور سیاحت کا اسرار بہت پرفسوں ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ آپ کی طرح دنیا کا کونا کونا گھوم کر قدرت کی صناعی دیکھوں۔"

"ضرور دیکھنا میرے عزیز! سفر تو وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔" نو وارد نے تحریک دی۔

"میرا نام عبداللہ ہے اور یہ میرا ساتھی ابراہیم ہے۔ آپ اپنے متعلق بھی تو کچھ بتایئے۔ آپ کی شخصیت کا اسرار کھوجنے کی بہت چاہ ہے۔" پہلے شخص نے اپنا تعارف کروایا۔

"آپ سے مل کر اور آپ کا طبعی رجحان جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی عبداللہ! ویسے کیا خوب اتفاق ہے کہ میرا نام بھی شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ محمد بن ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن یوسف اللواتی المعروف بہ ابن بطوطہ ہے۔" معمر شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تعارف کا یہ سلسلہ بہت تشنہ ہے محترم! کچھ تفصیل بھی تو بتایئے۔" اس نے بڑے ادب سے کہا۔

"میرے خاندان کا تعلق بربری قبیلے 'لواتہ' سے ہے۔ یہ قبیلہ ہمیشہ سے ہی معتبر سمجھا جاتا رہا ہے۔ ہم پشت ہا پشت سے عالم تھے۔ میری پیدائش 'المرینیون سلطنت' کے عہد میں سترہ رجب المرجب 703ھ دوشنبہ (بمطابق پچیس فروری 1304ء) کو ہوئی۔ میری ولادت پر والدین کی وہی خوشی اور جذبات تھے جو ازل سے کائنات میں ہر ماں باپ محسوس کیا کرتے ہیں۔ سنتے ہیں اپنے وجود کے ایک حصہ کو مجسم شکل میں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو بھر آئے تھے۔ مجھے گود میں لیے انہوں نے خاندانی روایات کے مطابق عالم بنانے کے ڈھیروں خواب دیکھے تھے۔ میری پیشانی چوم کر اپنی محبت کی حدت میرے وجود میں منتقل کرتے ہوئے انہوں نے وہ بھی کیفیات محسوس کی ہوں گی جو ہر ماں اور باپ کی جبلت ہوتی ہے۔"

"آپ یقیناً بچپن سے ہی بہت غیر معمولی بچہ ہوں گے۔ آپ کے معمولات اور سرگرمیاں بے حد منفرد رہی ہوں گی۔" ابراہیم کی اس بات پر وہ متانت سے ہنس دیا۔

"نہیں میرے عزیز! بچے تو ہر دور میں ایک جیسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ میں بھی ایک معمولی سا بچہ تھا۔ اپنے والدین کی محبتوں کے سائے میں زندگی کی تلخیوں سے کوسوں دور۔ مدرسے سے گھر اور گھر سے ہم جولیوں کے ساتھ کھیل کر خوشی محسوس کرنے والا ایک عام سا لڑکا۔ کھیل کود کر تھک ہار جاتا تو والدہ کے ہاتھوں سے بنے لذیذ پکوان کھا کر ان کی آغوش میں پناہ لے لیتا۔ تھوڑا اور بڑا ہوا تو شمالی مراکش کے مالکی مدرسے سے قرآن و حدیث، ادب، تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔"

"یہ بات کچھ ماننے میں نہیں آتی حضرت!" عبداللہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "کچھ نہ کچھ تو آپ میں غیر معمولی رہا ہی ہوگا۔" اس کی بات پر ابن بطوطہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا وہ کسی دھندلکے کی اوٹ میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"ہاں! کسی حد تک تمہاری بات ٹھیک ہی ہے۔ ایک دو باتیں ایسی ضرور تھیں جو اس وقت میرے کسی بھی ہم جولی میں نہ تھیں۔ جغرافیہ پڑھ کر قدرت کی تخلیق کردہ اس زمین کو مختلف زاویوں سے جانچنے کا دل کرتا تھا۔ نئی زبانیں سیکھنے کے لیے دل مچلنے لگتا اور دوسری بات تو بالکل ہی منفرد تھی۔ ان کے خواب اور سوچ مجھ سے بہت مختلف تھے۔ میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ مجھے بھی ان کی طرح لذیذ پکوانوں، کھیل کود میں دوسروں کو شکست دینے یا نت نئی شرارتوں کے خواب کیوں نہیں آتے؟"

"تو آپ کے خواب کس نوعیت کے ہوا کرتے تھے محترم؟ کچھ تو یاد ہوگا ہی آپ کو؟" ابراہیم متجسس تھا۔

"ہاں! بالکل یاد ہے۔ والدین کی محبت اور ان کی خوشبو کے بعد ایک یہی تو شے ہے جو عمر کی سات دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی مجھے آج تک نہیں بھولی۔ میں اکثر ایک

ہی نوعیت کے خواب دیکھتا تھا کہ میں ایک بہت بڑے پرندے کی پشت پر سوار ہوں۔ وہ مجھے لیے بلندی کی جانب محو پرواز ہے۔ بلند.... بلند تر.... مزید بلند تر.... پہلے پہل نیچے جھانکنے سے مجھے خوف محسوس ہوتا تھا پھر مناظر کی تبدیلی دلکش لگنے لگی۔

میں نے سمندر دریا پہاڑ ٹیلے صحرا وادیاں ویرانے بازار کھنڈرات ایسے ایسے نظارے دیکھے جن کے بارے میں بیدار ہو کر سوچتا تو حیران رہ جاتا۔ ان سب مظاہر فطرت کے بارے میں آج تک صرف کتابوں میں پڑھا تھا یا بزرگوں کا مشاہدہ سن رکھا تھا۔ یہ خواب دیکھتے ایک سرشاری محسوس کرتے میں نے بچپن کا پڑاؤ طے کرلیا۔ تعلیم و تربیت کا سلسلہ بڑے ہموار طریقے سے جاری تھا۔ طنجہ کے علماء و مشائخ سے اسلامی علوم و فنون سیکھتے میں نے عمر کی دو دہائیاں عبور کرلی تھیں۔ خوابوں کا وہ سلسلہ بھی طویل ہوتے اب تک میرا ساتھی تھا۔ مجھے اپنے سامنے ایک دھند دکھائی دیتی تھی۔ کبھی ایسا بھی لگتا تھا کہ اس دھند کے پار سے کچھ آوازیں مجھے پکارتی ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو اپنی باہیں واکیے مجھے بغلگیر ہونے کے لیے بلاتے ہیں۔ یہ کون لوگ تھے؟ کیوں مجھے بلاتے تھے؟ کیا رشتہ تھا ان سے میرا؟ یہ کیسی آوازیں تھیں؟ میرا ان سے کیا تعلق تھا بھلا؟ کیوں اپنی جانب کھینچتی تھیں؟ بیداری کے بعد میں انہی سوالات میں الجھا رہتا لیکن کوئی سرا سلجھ کے ہی نہ دیتا۔

''اس ذہنی کشمکش کا انجام کب اور کیسے ہوا تھا حضرت؟'' عبداللہ مزید متجسس ہوا۔

''انجام.....'' اس نے بے خیالی میں لفظ کو طویل کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! آگیا یاد، اس وقت میری عمر لگ بھگ اکیس برس تو ہو ہی چکی تھی۔ جوانی کا جوش زندگی کو بہت خوبصورت بنائے ہوئے تھا۔ میرا ولولہ ہر وقت آسمان سے باتیں کیا کرتا۔ کوئی بھی مشکل یا رکاوٹ راہ کا معمولی سا پتھر محسوس ہوا کرتی تھی۔ سینہ تان کر چلنا بڑا پسندیدہ تھا۔ دنیا کی ہر مشکل قدموں کی دھول ہی تو معلوم ہوتی تھی۔ انہی دنوں والدین نے حجاز مقدس کی زیارت اور حج کا فیصلہ کر لیا۔ وہ وقت بڑا ہی سہانا تھا۔ خانہ خدا اور روضۂ رسول کی دید کا تصور ہی دل گداز کر کے آنکھوں میں نمی پیدا کرنے لگتا۔ کبھی دل چاہتا کہ ہمیں پنکھ لگ جائیں اور پلک جھپکنے میں ہی وہاں پہنچ جائیں۔ روایات کے مطابق استخارہ کروایا گیا۔ نتیجہ بے حد مثبت اور حوصلہ افزا تھا۔ ہمارے جذبے مزید

سوانحی خاکہ

نام.... ابن بطوطہ.... اصل نام۔ محمد شرف الدین یا شمس الدین
تاریخ ولادت.... سترہ رجب المرجب 703ھ (دوشنبہ) بمطابق پچیس فروری 1304
جائے ولادت.... طنجہ
آغاز سفر.... رجب 725ھ (چودہ جون 1325 عیسوی) عمر بائیس سال
سفرنامہ کا اختتام (تحریری).... تین ذی الحجہ 756ھ
والد کا نام.... عبداللہ بن محمد بن ابراہیم
والدہ کا نام.... فاطمہ
کنیت.... ابوعبداللہ.... ابن بطوطہ
مقام آغاز اسفار.... طنجہ سے تلمسان
مقام اختتام اسفار.... دارالخلافہ فاس سے طنجہ
نسلی و لسانی نسبت.... اللواتی.... الطنجی
قوم / ذات.... بربری الواتہ
اسفار.... 44 عدد ممالک کا سفر کیا

☆☆☆

ابن بطوطہ کے سفرنامہ نے.... عالمگیر شہرت اختیار کی تھی۔ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ اس نے اپنے تاثرات و مشاہدات سفر پوری سچائی، بے باکی اور جرأت کے ساتھ قلمبند کیے ہیں۔

مہمیز ہو گئے۔ اس دور میں ہمارے امیرالمومنین ناصرالدین مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ ان کا اصل نام امام ابو یوسف بن عبدالحق تھا۔ وہ فیاضی و سخاوت اور جود و کرم میں اپنی مثال آپ تھے۔ عوام امن و عافیت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا عدل و انصاف لاثانی تھا۔ عزائم ایسے بلند اور صادق کہ ملک سے شرک کو ملیامیٹ کر کے کفر کی آگ کو سرد کر رکھا تھا۔ اب تم لوگ یقیناً یہ سوچ رہے ہو گے کہ میں ان فروعی باتوں میں کیوں الجھ گیا ہوں۔ دراصل امیرالمومنین ناصرالدین کے عہد کی یادیں میرے ذہن میں آج بھی نقش ہیں۔''

''بچپن اور جوانی بھولتی ہی کہاں ہے محترم! اور ایسا سنہرا دور تو یوں بھی ایک انمول یاد ہوا کرتی ہے۔'' ابراہیم

UUNOVELS.COM

نے اپنا تجربہ بتایا۔''جوانی کے جوش میں آپ کو سفر کی طوالت کا احساس نہ ہوا ہوگا۔''

''بالکل درست کہا میرے عزیز! اس وقت خشکی کے راستے مراکش سے حجاز جانے کے لیے سولہ ماہ کا سفر درکار ہوتا تھا۔ جون 1325 میں اونٹوں' خچروں اور گھوڑوں پر مشتمل ایک قافلے کے ساتھ مراکش سے سفر کا آغاز ہوا تو مجھے اندازہ ہی کہاں تھا کہ اگلے چوبیس برس تک اپنے وطن کا رخ ہی نہیں کر پاؤں گا۔''

''سفر کا آغاز تو بہت پُرکیف ہوگا حضرت! اس وقت کیا جذبات تھے آپ کے؟''عبداللہ مشتاق تھا۔

''ہاں! بالکل درست کہا تم نے۔''اس نے تائید کی۔

''کیف و سرور اور ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ پہلے سفر کی کیفیات کو پہلی محبت جیسا ہی سمجھ لو۔ داخلی کیفیت بالکل انوکھی ہو جایا کرتی ہے۔ منزل تک پہنچنے کی سرشاری میں رستوں کی کٹھنائیاں خاطر میں ہی نہیں لائی جاتیں۔ دل و دماغ پر خمار طاری رہتا ہے۔ تسخیر کا خمار' دریافت کا جنون اور کامیابی کا جنون۔ انہی جذبوں کو زادِ راہ بنائے ہم طنجہ سے 'تلمان' پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں کا فرماں روا' ابو تاشفین عبدالرحمٰن بن موسیٰ بن عثمان بن یغمراسن بن زیان' تھا۔ اپنے علاقہ سے نکل کر کسی دوسرے علاقہ میں جانے کا وہ تجربہ بڑا انوکھا تھا۔ مجھے آج بھی اپنی کیفیات یاد ہیں کہ میں کس قدر پُرشوق نظروں سے ہر ایک شے کا جائزہ لے رہا تھا۔ گلیاں' کوچے' بازار' لوگوں کی بود و باش' ان کے لباس حتیٰ کہ چلنے پھرنے کا انداز بھی میرے لیے ایک منفرد شے تھی۔ تلمان میں ہماری ملاقات 'ابو عبداللہ بن ابی بکر بن علی بن ابراہیم نفرادی' اور شیخ صالح 'ابو عبداللہ محمد بن حسین قریشی زبیدی' سے ہوئی۔ یہ دونوں بزرگ تونس شہر میں عہدہ قضائے نکاح پر فائز تھے۔ اس علاقہ میں ہمارا قیام صرف تین روز تک رہا لیکن سچ بتاؤں تو ان تین دنوں کا ہر ایک لمحہ میرے لیے نت نئے انکشاف اور معلومات کا خزانہ لایا تھا۔ ملیانہ اور الجزائر میں کچھ وقت بسر کرنے کے بعد ہم لوگ 'بجایہ' پہنچ گئے۔ سفر کی تھکاوٹ' آب و ہوا کی تبدیلی نے میری صحت کو بہت متاثر کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں یہاں سے آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں کر پاؤں گا۔ نقاہت' آب و ہوا سے عدم توازن اور بیماری میرے لیے بہت مسائل پیدا کرنے لگی تھی۔ کبھی ایسا لگتا کہ میرا شوق اور آرزو وہیں دفن ہو جائیں گے تو کبھی آخری وقت کی آمد بہت قریب محسوس ہونے لگتی۔ کوئی دوا اثر کر رہی تھی' نہ ہی حربہ۔''وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ غالباً اس وقت کی کیفیات اور آزار ایک بار پھر حملہ آور ہوگئی تھیں۔

''غالباً یہ قدرت کی طرف سے آپ کے لیے آزمائش ہی ہوگی... بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ پروردگار نے آپ کے لیے کسی نہ کسی روپ میں کوئی آسانی بھی پیدا کی ہی ہوگی۔'' ابراہیم نے اس کے خاموش ہوتے ہی لقمہ دیا۔

''ہاں! درست کہا تم نے۔''ابن بطوطہ نے ماضی کے آئینے سے مزید گرد جھاڑتے ہوئے بتایا۔''وہ وقت بڑا ہی عجیب تھا۔ بخار اترنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ ابو عبداللہ زبیدی دوستانہ انداز میں مصر ہوگئے کہ مزید سفر کا ارادہ ترک کرکے وہیں مقیم رہ لوں لیکن میرا دل کیسے تسلیم کر لیتا؟ میں ان سے کہتا اگر موت لکھی ہے تو وہ دیارِ رسولؐ کے راستے میں کیوں نہ آئے؟ اس سے بڑھ کر میری خوش نصیبی کیا ہوگی بھلا؟''

''سبحان اللہ...... مرحبا، ابو عبداللہ نے کیا جواب دیا پھر؟''ابراہیم جھوم اٹھا۔

''یہ سن کر ابو عبداللہ مسکرا اٹھے تھے۔ پھر کہنے لگے اگر ارادہ سفر اتنا پختہ اور شوق سفر اتنا ہی مہمیز ہے تو ایک کام کیجیے کہ اپنی سواری کے ساتھ بھاری سامان بھی فروخت کر دیں۔ آپ کے لیے خیمہ اور سواری کا انتظام میں کسی نہ کسی طرح کر دوں گا۔ اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم ہلکے پھلکے ہوکر اطمینان سے سفر جاری رکھ سکیں گے۔ راستہ کی خطرناکی سے آپ واقف ہی نہیں۔ عرب قزاق موقع پاتے ہی لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ مصلحت کا یہی تقاضا ہے کہ ہم کم سے کم وقت میں بڑی منزلیں سر کرلیں۔ ابو عبداللہ کا یہ مشورہ میرے دل کو لگا۔ میں نے عن و عن عمل کرتے ہوئے زیادہ تر سامان فروخت کروا دیا۔ سفر کا آغاز ایک بار پھر ہوا اور حجاز مقدس کے خواب آنکھوں میں سجائے ہم قسطنطنیہ پہنچ گئے۔''

''وہاں پہنچ کر آپ کے مصائب میں کمی ہوئی تھی؟''عبداللہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ارے کہاں میرے عزیز؟''اس نے دھیرے سے قہقہہ لگایا۔''مشکلات نے تو ہماری راہ ہی دیکھ لی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں ہم سے شدید محبت ہوگئی ہے۔ اب سنو کہ آگے کیا ہوا؟ قسطنطنیہ میں ہمارا قیام حسب روایت بیرون شہر ہی تھا۔ ابھی تھکاوٹ بھی نہ اترنے پائی تھی کہ رات کو موسلا دھار بارش کا آغاز ہوگیا۔ بارش اس قدر شدید تھی کہ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

خیموں میں رات بسر کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ پچھلے پہر خیمے چھوڑ کے گھروں میں منتقل ہونا پڑا۔ خدا خدا کر کے سورج طلوع ہوا اور ہمیں 'ابوالحسن' نامی حاکم شہر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ خوش قسمتی ہی کہیے کہ ابوالحسن کافی فاضل اور شریف تھا۔ اس نے میرے لباس پر بارش اور کیچڑ کے دھبے دیکھے تو فوراً حکم دے کر لباس دھلوا دیا۔ میری تہبند نہایت کہنہ ہو چکی تھی۔ اس نے نفیس اعلیٰ سے بنی نئی تہبند دے کر اس کے دونوں گوشوں میں ایک ایک اشرفی باندھ دی۔''

''غالباً یہ اب تک کے سفر میں پہلی امداد تھی جو آپ کو ملی۔ ہے ناں؟'' عبداللہ نے فوراً نتیجہ اخذ کیا۔

''ہاں! بالکل ایسا ہی تھا۔ وہ پہلی امداد اور پہلی آسائش تھی۔ اس کے بعد مشکلات کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ قسطنطنیہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد ہم شہر 'بونہ' پہنچ گئے اور وہاں تین روز اندرون شہر قیام کیا۔ سوداگروں کے قافلے کے جو لوگ ہمارے ہمراہ تھے انہیں وہیں چھوڑنا پڑا۔ راستہ بے حد خطرناک تھا۔ اب میں ایک بار پھر تنہا تھا۔ دشوار گزار منزلیں اور رستوں کی صعوبتیں برداشت کرتے میں نے ہمت تو نہ ہاری البتہ شدید بخار سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ قزاقوں 'لوٹ مار کے خوف اور نقاہت سے سواری سے اترنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ چاروناچار اپنے آپ کو خود ہی سواری سے باندھ لیا کہ کہیں نقاہت اور بیماری سے گر کر روندا ہی نہ جاؤں۔ اسی گرتے پڑتے عالم میں تیونس تک رسائی ہوئی۔ اہل تیونس ابوعبداللہ زیدی اور ابوطیب سے واقف تھے۔ وہ ان کا گرمجوشی سے استقبال کرتے' بغلگیر ہوتے رہے لیکن میں اجنبی تھا۔ مجھ سے سلام تو در کنار' کسی نے علیک سلیک تک نہ کی۔ اس سرد مہری نے میرے دل کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ آج اگر اس واقعہ کو یاد کر کے دیکھوں تو آپ ان جذبات کی یہی توجیہہ سمجھ آتی ہے کہ بیماری' ضعف اور غریب الوطنی نے دل گداز کر رکھا تھا اسی لیے تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ وہاں موجود کچھ حاجیوں نے میری یہ کیفیت بھانپ لی اور مزاج پرسی کرتے ہوئے دلجوئی کرنے لگے۔ شہر میں داخلہ کے بعد قیام مدرسہ کتبیین میں ہوا۔ اس وقت تیونس کا حکمران 'سلطان ابویحییٰ' تھا۔ عید الفطر کا تہوار تیونس میں ہی منایا۔ عیدگاہ میں نماز عید کے لیے گیا تو ایک دلفریب نظارہ دیکھنے کو ملا۔ اہل شہر بڑے اہتمام کے ساتھ عمدہ اور پُرتکلف لباس زیب تن کیے عیدگاہ میں جمع تھے۔ سلطان ابویحییٰ کی سواری کی بہار بھی الگ ہی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار تھے۔ دوگانہ عید کی ادائیگی اور خطبہ ہوتے ہی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''آپ کی یہ کیفیت بتاتی ہے کہ عید کا وہ روز آپ کے لیے بہت بوجھل رہا ہوگا۔ وطن سے دوری اور تہوار اس کسک نے دل وجان میں اداسی کے رنگ بھر دیے ہوں گے۔'' ابراہیم نے اس کی آنکھوں سے چھلکتے اضطراب سے تجزیہ کیا۔

''ہاں! ایسا ہی تھا۔ اس روز میں نے جانا کہ وطن کی محبت انسانی روح میں کس قدر گہری ہوتی ہے۔ وہ سب بھی میری طرح مسلم ہی تھے۔ انہیں بھی عید الفطر کی مجھ جیسی ہی خوشی تھی۔ ہمارے درمیان اخوت اور محبت کا مضبوط رشتہ بھی موجود تھا لیکن فرق بہت معمولی سا تھا۔ وہ اپنے خونی رشتوں اور جڑوں سے پیوست تھے جبکہ میں پردیسی تھا۔ مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں میرے عزیز! کہ میں ایمان کے اس درجے سے واقف ہی نہیں جہاں اخوت کا ناتا دیگر بھی جذبات پر حاوی ہو جائے۔ انہی کیفیات سے الجھتے اور خود کو سمجھاتے ہوئے عید الفطر اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ کچھ روز بعد

ذرائع اسفار

ابن بطوطہ نے اپنے تمام تر اسفار میں اونٹوں پر رخت سفر باندھا۔ بعض اوقات یہ اونٹ کرایہ پر لیے جاتے' کبھی ذاتی بھی ہوتے اور بعض اوقات انہیں رستے میں ہی فروخت کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ کچھ ممالک میں گھوڑوں' گھوڑا گاڑیوں' خچر' ڈونگی اور بحری جہاز میں بھی یہ سفر طے ہوتے رہے۔

☆☆☆

اوقات سفر

ابن بطوطہ کے سفر کا آغاز عام طور پر علی الصبح نماز کے بعد ہوتا تھا۔ دوسرا کوچ عشاء کے بعد کیا جاتا۔ وہ زیادہ تر قافلوں کے ساتھ سفر کرتا تھا۔ دوران سفر اس کے ساتھ متعدد غلام ہوتے تھے۔ کئی ایک بار قافلوں کے ساتھ کنیزیں بھی ہوتیں۔ غلاموں کو سامان کی بار برداری کے لیے لے جایا جاتا تھا۔ واپسی کے سفر میں اس کے ساتھ چھ سو غلام تھے۔ اکثر راستے میں غلاموں کی تجارت بھی جاری رہتی تھی۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

حجاز روانگی کے لیے سلطانی قافلہ حجاج کا انتظام کر دیا گیا۔ 'اَبل' کے باشندہ 'ابو یعقوب سوسی' امیر قافلہ مقرر کیے گئے۔ اور مجھے سلطانی قافلے کا قاضی مقرر کیا گیا۔ سفر کا یہ آغاز تیونس کے ساحل سے ہوا۔ کارواں چلا تو راہ سمٹنے لگی۔ چار میل دور ایک پاکیزہ اور خوش وضع شہر 'سوسہ' تک جا پہنچے۔ یہاں کچھ روز قیام کے بعد ہم پھر چلے اور 'صفاقس' جا پہنچے۔ اس شہر نے میری زندگی کو ایک نیا رخ دینا تھا سو دے کر رہا۔

اتفاق کی بات ہے۔ میں شہر کے واحد بازار میں ٹہل رہا تھا کہ ایک سواری گزری۔ میں اس سواری کی شان دیکھ رہا تھا کہ ہوا سے پردہ ہلا اور ایک چاند چہرہ نظر آیا۔ اس فسوں ساز چہرے نے میرا چین لوٹ لیا۔ میرے اندر آئے اس تغیر نے سواری کے مالکان کا پتا کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ناقہ شہر کے ایک امیر کا ہے اور محمل میں بیٹھی دوشیزہ امیر کی بیٹی ہے۔ ابو یعقوب نے میری بے قراری کو محسوس کرتے ہوئے امیر سے بات کی اور میں صفاقس کے اس سربرآوردہ شخص کی بیٹی سے عقد نکاح میں بندھ گیا۔ صنف نازک سے جڑے اس خوبصورت رشتہ کی کشش دھیرے دھیرے مجھ پر خمار بن کر چھانے لگی تھی۔ وجود کی تکمیل اور نئی ذمے داریوں کا وہ احساس بڑا ہی دلفریب تھا۔ نئے سفر پر دل آمادہ نہ تھا مگر آگے بڑھنا ہی تھا سو ہمارا قافلہ اگلی منزل کے لیے چل پڑا۔ صفاقس سے اگلا پڑاؤ 'قابس' تھا۔ یہاں ہم نے اندرون شہر قیام کیا۔ دس روزہ پڑاؤ کے بعد طرابلس کا رخ کرنا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک سو سے زائد سوار تھے۔ انہی میں تیراندازوں کی ایک جماعت بھی تھی جس کے خوف سے ڈاکو ہمارے قافلہ پر حملہ کی ہمت نہ کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ طرابلس کے بدنام ترین راستے کو ہم پُرامن طریقے سے طے کرتے چلے گئے۔

طرابلس پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے خاص عزت بخشی۔ بے وطنی کا احساس مٹ گیا۔ طرابلس قیام کے دوران ہی عیدالاضحیٰ آگئی۔ غریب الوطنی کے جذبات میں سابقہ شدت تو نہ تھی البتہ ایک کسک ہنوز دامن گیر محسوس ہو رہی تھی۔ چھبیس محرم کو طرابلس سے رخصتی کا نقارہ بج گیا۔ میرے سسر اور میری اہلیہ بھی ہمراہ تھی۔ پرچم کارواں میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اس قافلہ میں سب سے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں مشکلات تو خیر نہ آئیں لیکن اس وقت ہم پہلی بار ڈاکوؤں سے متعارف ہوئے۔ عرب کے لٹیروں نے قافلہ پر حملہ کر دیا مگر ہمارے ساتھ تیرانداز و شمشیر زن تھے اس لیے وہ حملہ آور کامیاب نہ ہو سکے۔

ہم مسافر تھے' منزل کی تلاش میں اپنا گھربار' روزگار اور سب کچھ چھوڑ کر آئے تھے۔ ہمارا زادِراہ ہی کل متاع تھا۔ اس سے محروم ہو جاتے تو جانے اگلی منازل میں کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، یہ سوالات اور الجھنیں ایک میرے ہی ذہن میں نہیں بلکہ قافلے میں موجود اکثریت کے اعصاب پر حاوی تھیں۔ ان لٹیروں کی دہشت نے ہمارے مزاج میں ایک عجیب سی عدم برداشت اور چڑچڑاہٹ پیدا کر دی تھی کہ اگر ہم کمزور ہوتے تو لٹ چکے ہوتے۔ قبہ سلام پہنچنے تک ہم ایک دوسرے سے الجھنے لگے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اپنے 'خسر' سے ہونے والی معمولی تلخ کلامی اور اختلاف رائے میں بات اس قدر بڑھ گئی کہ میں نے بالآخر اہلیہ کو تین حرف بول کر رشتۂ ازدواج سے آزاد کر دیا۔''

ابن بطوطہ کے اس انکشاف اور سرسری انداز پر عبداللہ اور ابراہیم گنگ رہ گئے۔ ابراہیم کے چہرے پر اس قضیہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا تجسس جھلک رہا تھا لیکن عبداللہ نے اپنی آنکھ کے خفیف اشارے سے اسے کوئی بھی سوال کرنے سے روک دیا۔ وہ ابن بطوطہ سے کسی ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ پیشہ وارانہ نقطۂ نظر سے گفتگو کرنے بیٹھے تھے۔ ایک معزز اور معمر شخص کی نجی زندگی ٹٹولنے کی جسارت ان کے لیے ناپسندیدہ تھی۔ انہوں نے بھی سوال سے گریز کرتے ہوئے اپنی توجہ ایک بار پھر مقابل کے نئے انکشافات کی جانب مبذول کر لی۔

''ہماری مذہبی تعلیمات کہتی ہیں کہ بیوہ اور مطلقہ کی فوری شادی کر دینی چاہیے۔ تو میرے برادر! کچھ ایسا ہی حال مرد کا بھی ہوتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں بندھ جانے کے بعد وہ بھی زیادہ دیر تنہا رہ ہی نہیں سکتا۔ میں نے دوسری شادی میں تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور قبہ سلام میں ہی فاس کے ایک عالم کی لڑکی سے نکاح کر لیا۔ دوست احباب بہت خوش اور پُرجوش تھے۔ قافلہ کی یہ نفسیات بھی بہت عجیب ہوتی ہے۔ معمولی سا دکھ گراں محسوس ہوتا ہے اور ہلکی سی خوشی جشن کا روپ اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ احباب نے دعوت ولیمہ کی فرمائش کی تو میں نے بھی اہتمام اور تکلف کی انتہا کر دی۔ اس ضیافت میں سواروں کے دستے کو ایک دن مزید قیام کی زحمت بھی برداشت کرنا پڑی لیکن خوشی اور جشن میں ایک

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

جزوی باتوں کی پرواہ کسے تھی؟ بھرپور وقت گزاری کے بعد ہم پہلی جمادی الاول کو اسکندریہ پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔''

''اسکندریہ...... آہ! کیا یاد کروا دیا آپ نے حضرت! یہ میرا آبائی شہر ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں بزرگوں سے اس کی شان و شوکت کی کہانیاں تو سنی ہیں۔ عجیب الشان، مضبوط، جوہر تحسین سے آراستہ اور محکم عمارتیں۔ باوقار اور پرشکوہ مکان۔ میرے دادا جان کہتے تھے کہ اسکندریہ جمال و کمال کے اعتبار سے لاثانی ہے۔ عمارتوں کو درخشانی و تابانی کے لحاظ سے کسی چمکدار اور بڑے سے موتی سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی رعنائی، دلکشی اور خوبی عروس نو ہے۔ بس کیا بتاؤں کہ کس قدر داستانیں سن رکھی ہیں۔'' ابراہیم نے خوابناک لہجہ میں کہا۔

''پھر بھی بہت کم سنی ہوں گی۔'' ابن بطوطہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اور تم تو صرف سن کر ہی اتنے شیدا نظر آرہے ہو۔ ذرا تصور کرو کہ میں نے اس فضا میں سانس لی ہے۔ اس کی دلکشی اپنے مکمل حواس میں محسوس کی ہے۔ تمہاری سب باتیں اپنی جگہ بجا۔ میں نے اس کا ایک انمول روپ بھی دیکھ رکھا ہے۔''

''وہ کیا روپ تھا محترم؟ ہم جاننے کے لیے مشتاق ہیں۔'' عبداللہ فرطِ جوش سے آگے جھکا۔

''اولیائے کرام۔'' ابن بطوطہ نے ایک توقف سے کہا۔ ''اپنی سیاحت کے دوران ہر شہر اور علاقہ میں اولیائے کرام سے ملنے اور ان کے ساتھ وقت گزاری کے بعد حکمت و دانش کے موتی چننا مجھے بہت مرغوب تھا۔ اسکندریہ میں ان دنوں ایک بزرگ 'برہان الدین اعرج' تھے۔ متقی، عابد اور خشیت الٰہی میں یکتا۔ اسکندریہ قیام کے دوران مجھے نہ صرف ان سے ملاقات کا موقع ملا بلکہ تین دن تک ان کی میزبانی کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ ایک روز انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا بھیجا۔ میں اس اچانک طلبی پر دل ہی دل میں کئی قیاس لگاتا ہوا ان کے سامنے دوزانو ہو کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

''کیسے ہو مسافر؟ یہاں کسی چیز سے کوئی تکلیف تو نہیں؟''

''نہیں یا حضرت! آپ کے سایہ شفقت میں مجھے بھلا کس چیز کی تکلیف ہو سکتی ہے؟ میں نے تو یہاں راحت اور سکون کو ہی اپنا ہمدم پایا ہے۔ اپنے یہاں قیام اور سعادت کے لیے آپ کا سدا احسان مند رہوں گا۔''

''احسان شناس لوگ ہی پروردگار کو پسند ہیں۔ میری دعا ہے کہ کامیابیاں ہمیشہ تمہارے قدم چومیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ تم بلاد اور اس سے بھی آگے دور دراز کے علاقوں کی سیاحت کرو گے۔ تمہارا ارادہ فی الحال کیا ہے؟'' انہوں نے پُراسرار سے انداز میں پوچھا۔

''ارادہ تو مسافت اور سفر حجاز کا ہی ہے۔ باقی جو اللہ کو منظور۔''

''اللہ کی رضا میں راضی رہنے سے ہی اس کی خوشنودی ملا کرتی ہے۔'' وہ مسکرائے اور پھر ایک توقف سے بولے۔ ''میرے لیے ایک کام کرو گے مسافر؟ تمہیں میری ایک امانت کسی کو پہنچانی ہے۔ پہنچا دو گے ناں؟''

''آپ حکم تو کیجیے حضرت! آپ کے کام آنے سے بڑھ کر میرے لیے کیا خوش نصیبی ہو گی بھلا؟''

''تم ان شاء اللہ ہندوستان میں میرے ایک بھائی فرید الدین سے، سندھ میں رکن الدین زکریا سے اور چین میں برہان الدین سے ضرور ملو گے۔ ان تینوں سے ملاقات ہو تو انہیں میرا اسلام پہنچا دینا۔ سلامتی کی یہ دعا تمہارے پاس میری امانت ہے۔ اس امانت کا حق لازماً ادا کرنا۔''

''سبحان اللہ...... یقیناً وہ بہت بلند پایہ ولی اللہ ہوں گے۔ پروردگار کے حکم سے انہوں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ آپ کو مستقبل میں کیسی مہمات درپیش ہوں گی۔'' ابراہیم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''لیکن میری کیفیات تمہاری سوچ سے بالاتر ہی تھیں۔'' ابن بطوطہ نے بتایا۔ ''برہان الدین اعرج کی اس بات نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ اس زمانہ میں ہند اور چین وغیرہ کی سیاحت یا ان علاقوں تک رسائی ناممکن تصور ہوا کرتی تھی۔ بہرحال میں ان سے اتنا ہی کہہ سکا کہ پروردگار نے مجھے ہمت عطا فرمائی تو میں بشرط زندگی آپ کی امانت کا حق ضرور اتاروں گا۔ میرے اس عزم پر وہ شفقت سے مسکرا دیئے اور چند درہم عنایت فرما کر کہنے لگے۔ ''انہیں اپنے پاس سنبھال کر رکھنا مسافر! یہ تمہیں خرچ کی کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔'' ان کی اس مبہم سی بات میں بھی بہت گہرے مطالب پوشیدہ تھے۔ میں نے درہم اپنی آنکھوں سے لگائے اور عقیدت و احترام سے اپنی پوشاک میں رکھ لیے۔ اس ملاقات کے بعد مجھے اپنی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

واردات قلبی میں بہت سی تبدیلیاں محسوس ہونے لگی تھیں۔ نئی منزلوں کی پکار سماعت میں رس گھولا کرتی تھی۔ اسی دوران اسکندریہ میں واقف کار بنے ایک شخص نے نئی راہ بھادی۔"

"تم شیخ صالح عابد ابوعبداللہ المرشدی سے ملے ہو کیا؟" اس واقف کار نے پوچھا۔ میں نے صاف گوئی سے انکار کردیا۔

"وہ اپنے ایک مریدکے تعمیر شدہ 'زاویہ' میں رہائش پذیر ہیں میرے دوست!" واقف کار نے بتایا۔ "گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سادگی ایسی کہ کوئی خادم پاس رکھتے ہیں نہ رفیق۔ تمام وزراء، امراء اور قبائل کے سرداران کی قدم بوسی کیا کرتے ہیں۔ ان کی 'رسائی' کا اندازہ تم اس بات سے لگالو کہ ان کی خدمت میں جو شخص جس بھی چیز کی نیت کرکے آتا ہے شیخ المرشدی اسے وہی شے کھلاتے ہیں۔ شیرینی، میوہ، کھانا غرضیکہ وہ ہر طلبگار کی خواہش بنا پوچھے ہی جان لیا کرتے ہیں۔ بے فصل اجناس مہیا کردینا بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ ان کے پاس عوام ہی نہیں بلکہ .... بڑی بڑی شخصیت بھی آتی ہیں۔ انہیں مناصب کے حصول کی طلب ہوتی ہے۔ شیخ صاحب کسی کو عہدہ پر ماموری کا حکم دیتے ہیں تو کسی کو عہدہ سے معزولی کی پیش گوئی کردیتے ہیں لیکن ایک بات تو پتھر پر لکیر کی طرح طے ہے کہ جو بات ان کی زبان سے ایک بار نکل جائے وہ مشیت الٰہی کے تحت ظہور میں لازم آتی ہے۔"

"الٰہی تیری قدرت! اس دنیا میں ریاضتوں کے کیسے کیسے پھل ملتے ہیں۔" ابراہیم پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ابن بطوطہ نے متانت سے اس کی طرف دیکھا اور اپنا سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میری بھی کیفیت کچھ تم جیسی ہی تھی۔ شوق دیدار نے مجھے اسکندریہ سے ایک نئی مسافت طے کرنے پر اس قدر محرک کیا کہ میں 'تروجہ' نامی قصبہ سے دمنہور شہر اور پھر شہر فوا سے ہوتا ہوا نماز عصر سے قبل شیخ کے زاویہ تک جا پہنچا۔ اس وقت امیر سیف الدین یلملک خاصگی بھی وہیں موجود تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی زاویہ کے باہر اپنے لشکر سمیت اترے تھے۔ میرے اندر جاتے ہی شیخ نے اپنی نشست سے اٹھ کر معانقہ کیا۔ انہوں نے سیاہ بالوں کا جبہ زیب تن کیا ہوا تھا۔ بہت نورانی شخصیت تھی ان کی۔ مجھے کھانا منگوا کر کھلایا گیا۔ کچھ ہی دیر میں نماز عصر کی جماعت تیار ہوگئی۔ شیخ صاحب نے میری جانب دیکھتے ہوئے فوری اعلان کردیا کہ امامت معزز مہمان کروائیں گے۔ میں نے سر تسلیم خم کردیا۔ رات نے پر پھیلائے تو نیند نے بھی گرفت مضبوط کرنی شروع کردی۔

"موسم گرما کی وجہ سے نیچے بہت گرمی ہوتی ہے۔ تمہارے سونے کا بندوبست چھت پر کردیا گیا ہے۔" شیخ صاحب نے مجھے بتایا۔

"آپ بھی چلیے ناں میرے ساتھ چھت پر؟" میں نے امیر سیف الدین کو مخاطب کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنی جگہ کے علاوہ کسی مقام پر سو ہی نہیں پاتے۔ میں نے بھی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور چھت پر چلا گیا جہاں میرے لیے ایک بوریہ، چمڑے کا فرش، وضو کرنے کے لیے ایک برتن اور پینے کے پانی کا ایک گھڑا پہلے ہی رکھوا دیا گیا تھا۔ تھکاوٹ کے باعث میں لیٹتے ہی سوگیا۔ اس رات ایک خواب پھر آنکھوں کے دریچوں تک چلا آیا۔ میں ایک بہت بڑے پرندے پر سوار تھا۔ وہ پرندہ پہلے مجھے قبلہ کی سمت اڑا لے گیا۔ اس کے بعد پرواز کا رخ تبدیل ہوکر دائیں طرف (مشرق) اور پھر (جنوب) ہوگیا۔ یہ پرواز کچھ دیر مجھے یونہی سرشار کرتی رہی۔ تاحد نگاہ دکھائی دینے والے مناظر بہت دلکش تھے۔ میرا دل مچلنے لگا۔ پرندے نے مجھے ایک اندھیرے سبزہ زار میں اتار دیا۔ اس کے ساتھ ہی خواب کا خاتمہ بھی ہوگیا۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی مجھے ایک تحیر نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہ کیسا خواب تھا؟ کیا یہ بھی میرے لیے کوئی اشارہ تھا؟ قبلہ کی سمت پرواز تو مجھے سمجھ میں آرہی تھی۔ میں نے اپنے وطن سے سفر کا آغاز ہی حرم پاک کی زیارت کے لیے کیا تھا لیکن یہ مشرقی اور جنوبی مسافت کہاں لے جائے گی بھلا؟ اس نئی سوچ نے کچھ دیر تو الجھائے رکھا۔ پھر خیال آیا کہ اس خواب کی تعبیر مجھے شیخ صاحب سے ضرور مل جائے گی۔ اگر وہ رضائے الٰہی کے تحت خواہشات جان لینے کے تابع ہیں تو خواب کی تعبیر بھی بتادیں گے۔ اسی کشمکش میں فجر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ امامت کے فرائض حسب سابق مجھے ہی سونپے گئے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد امیر یلملک شیخ صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد تمام حاضر زائرین کو بھی ناشتے کی چھوٹی چھوٹی روٹی کی ٹکیاں دے کر روانہ کردیا گیا۔ اس دوران اشراق کی نماز کا وقت ہوگیا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد شیخ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

"اب وہ بات بتا ہی دو جو صبح سے تمہارے دل کو بے چین کیے ہوئے ہے۔ کیا خواب دیکھا ہے آج تم نے؟"
میں نے انہیں واضح طور پر بتا دیا کہ ایسے خواب تو میں بچپن سے ہی دیکھتا آ رہا ہوں۔ اس بار فرق صرف یہ تھا کہ مجھے طرفین بہت واضح طور پر نظر آئی تھیں۔ شیخ المرشدی نے بہت شفقت سے مجھے بتایا کہ یہ سب قدرت کی جانب سے مجھے حج اور زیارت مدینہ نصیب ہونے کے واضح اشارے تھے۔ بلاد یمن' ملک عراق' بلاد ترک کی سیاحت کے بعد ہندوستان کی مسافت بھی میرا مقدر ٹھہر چکی تھی۔ شیخ صاحب نے ایک توقف کے بعد مجھے ایک اور امانت کا بار سونپ دیا۔ کہنے لگے ہندوستان میں میری ملاقات ان کے بھائی 'دلشاد ہندی' سے ہوگی۔ مجھ پر ایک مصیبت بھی آئے گی۔ عین ممکن ہے کہ میں اس موقع پر دل ہار بیٹھوں۔ اس موقع پر ان کے ہندی بھائی مجھے اس مصیبت سے بچالیں گے۔ یہ بار عظیم سونپنے کے بعد انہوں نے مجھے ٹکیاں اور چند درہم عنایت فرمادیئے۔ کچھ دیر مزید وقت گزارنے کے بعد میں نے ان سے رخصت طلب کرلی۔"

شیخ المرشدی سے ملاقات کا احوال بتاتے بتاتے ابن بطوطہ نے توقف کیے اپنے سامعین کی جانب بغور دیکھنے لگا۔ ابراہیم اور عبداللہ سحر زدہ سے انداز میں اس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب گداز' عقیدت اور محبت نمی بن کر چمک رہی تھی۔ وہ یقینی طور پر ان نادر روزگار ہستیوں کے تصور میں کھو چکے تھے۔

"خاموش کیوں ہوگئے ہیں حضرت آپ؟ اس کے بعد کس علاقے کی سیاحت کی تھی آپ نے؟" عبداللہ کی تڑپ دیدنی تھی۔ ابن بطوطہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ماضی کے دھندلکوں میں ایک بار پھر جھانکا اور اپنے خیالات مجتمع کرتے ہوئے بولا۔

"تمہاری طرح میں بھی مسافت کی اس لت میں بری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ کاروان میں بھی شوق تمنا مہمیز ہو چکا تھا۔ ہم نے رخت سفر باندھ لیا اور منلوی' قصبہ منفلوط' سیوط سے ہوتے ہوئے شہر 'اخمیم' پہنچ گئے۔ اخمیم میں قیام یادگار تھا۔ یہ شہر بہت قدیم اور عجیب الشان ہے۔ اس میں 'بربی' کے نام کی ایک عمارت مجھے آج بھی بھلائے نہیں بھولتی۔ اخمیم بربی نام سے مشہور یہ عمارت پتھر سے تعمیر شدہ تھی۔ اس کے اندر خطوط قدیمہ میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کا رسم الخط اور تحریر کا متن آج تک پڑھا ہی نہیں جاسکا۔ آسمانوں اور ستاروں کے نقشے اس کے علاوہ نظر آتے ہیں۔ مقامی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ عمارت اس زمانہ میں بنائی گئی جب نسر طائر برج عقرب میں تھا۔ طرح طرح کے جانوروں اور دیگر اشیاء کی تصویروں کے متعلق مختلف لوگوں کے مختلف بیانات ہیں جو مجھے بعید از قیاس اور ناقابل اعتبار ہی محسوس ہوئے۔ یہاں سے روانگی کے بعد میں شہر 'ہو' میں چلا آیا۔ یہ بہت بڑا شہر دریائے نیل کے کنارے واقع ہے۔ شیخ تقی الدین ابن السراج کے مدرسہ میں پڑاؤ ڈالتے ہوئے میرے دل میں حجاز مقدس جانے کی تمنا شدت سے مچل رہی تھی لیکن تقدیر میری آزمائش طویل سے طویل تر کرتی جا رہی تھی۔ اس شہر میں سید شریف ابو محمد عبداللہ الحسنی' رہتے تھے جو کبار صالحین میں شمار ہوتے تھے۔ میں ان سے فیض و برکت کے حصول کے لیے حاضر ہوا تو دریافت کرنے لگے کہ میں کہاں کوچ کرنے پر مائل ہوں۔ میں نے عرض کی کہ براہ جدہ حج بیت الحرام کا قصد کر رکھا ہے۔ یہ سن کر وہ مسکرائے اور نرمی سے کہنے لگے کہ اس سال حج بیت اللہ میرے لیے ممکن ہی نہیں۔ مجھے واپسی کی راہ لینی چاہیے کیونکہ میرا پہلا حج 'درب شامی' سے ہوگا۔ اب تم دونوں تصور اور اندازہ کر ہی سکتے ہو کہ میرے دل و دماغ پر کیسی متضاد کیفیات طاری ہوئی ہوں گی؟" اس نے بات کے اختتام پر عبداللہ اور ابراہیم کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

ذرائع قیام گاہ

ہر منزل پر مسافروں کے لیے ایک خندق (ہوٹل) موجود ہوتا تھا جسے یہ لوگ 'خان' (سرائے) کہتے۔ ابن بطوطہ عموماً کرائے کے ہوٹلوں میں' خانقاہوں (زاویوں)' مساجد' مدارس میں قیام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ شاہی مہمان بھی بنتا رہا۔

☆☆☆

ابن بطوطہ نے زندگی میں کئی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ دوران سفر بدقسمتی اور ستم ظریفی بھی اس کی ہمنوا بنی رہی۔ اس نے والد کی فرمائش پر انہیں دمشق چھوڑ دیا تھا۔ کئی برسوں بعد جب دوبارہ دمشق گیا تو والد سے ملاقات کے بعد انہیں طنجہ لے جانے کا خیال کلبلانے لگا۔ یہ ارادہ لیے جب وہ دمشق پہنچا تو علم ہوا کہ والد کو وفات پائے تو پندرہ سال بیت چکے ہیں۔

UUNOVELS.COM

"جی ہاں! آپ پر مایوسی کے ساتھ خوشگوار حیرت بھی غالب آئی ہوگی۔" عبداللہ نے فوری جواب دیا۔

"سید صاحب کی بات بہت ذومعنی تھی۔" ابراہیم نے بھی اپنا تجزیہ بیان کیا۔ "انہوں نے فرمایا تھا کہ آپ کا پہلا حج دربِ شامی سے ہوگا۔ اس سے تو یہی مطلب نکلتا تھا ناں کہ پروردگار نے آپ کی قسمت میں ایک سے زائد بار اپنے در پر حاضری لکھ رکھی ہے۔"

"بالکل! تم دونوں کی بات سو فیصد درست ہے۔ لیکن میری دلی کیفیت پر مایوسی اور جھنجلاہٹ زیادہ غالب تھی۔ دل و دماغ واپس جانے کا اشارہ سنجیدہ لینے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہے تھے۔ میں خاموشی سے واپس تو چلا آیا لیکن ان کے ارشادِ عالی پر عمل بالکل بھی نہ کیا۔ میں نے سفر بدستور جاری رکھتے ہوئے 'عیذاب' میں پڑاؤ ڈالا تو بیماری نے اس شدت سے دبوچا کہ آگے بڑھنے کی قوت ہی نہ رہی۔ ناچار واپس آنا پڑا۔ کچھ عرصہ بیماری سے کشمکش میں بیت گیا۔ اس کے بعد شہر تحراریہ' آب یار' محلۃ الکبیرہ' رملہ' ولیا' فارس' اشمون الرمان اور منوو سے ہوتے ہوئے 'مصر' کے شہر 'قاہرہ' کا رخ کر لیا۔" ابن بطوطہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے سامعین کی جانب سے کسی بے ساختہ ردِعمل کا منتظر تھا۔ نتیجہ بھی حسبِ توقع برآمد ہوا۔

"مصر...... آہ...... کیا ذکر چھیڑ دیا آپ نے...... انبیا کی سرزمین...... حسن و خوبصورتی سے مالا مال...... عظیم اسلامی روایات کا مرقع...... ایک ایسا شہر جسے دیکھنا ایک خواب ہے جو جانے کب تعبیر پائے گا؟" ابراہیم نے مچل کر کہا۔

"کیا یہ بات واقعی حقیقت ہے کہ مصر 'ام البلاد' ہے؟" عبداللہ اپنے تجسس کو محض اتنی ہی گویائی دے سکا۔

"جی ہاں میرے عزیز! مصر کی شان و شوکت واقعی لاجواب ہے۔ عمارتوں کی کثرت حدِ بیان سے باہر سمجھو۔ یہاں ہر طرح کے لوگ ضعیف و توانا' عالم و جاہل' ذہین و غبی' شریف و شریر' منکر و معروف امواج کی طرح باہم پیوست دکھائی دیتے ہیں۔ شہر بھر پر نشاط و شباب کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ ملکی حکومت کے حلقہ طاعت میں بڑی بڑی قوتیں اور ملتیں موجود ہیں۔ ملک عرب و عجم سب اس کے مطیع ہیں۔ شہر کی سب سے بڑی خصوصیت 'نیل' ہے۔ اسی کی وجہ سے یہ شہر روئے ارض پر ممتاز ہے۔ نیل ہی نے اسے بارش سے بے نیاز بنا رکھا ہے۔ اس کی زمین ایک ماہ کی مسافت کے برابر طویل و عریض ہے۔ زرخیز اور دلکش ایسی کہ جو بھی غریب الوطن یہاں آجائے واپسی کی راہ بھول جاتا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر کسی سہانی یاد میں کھویا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسے خاموش پا کر عبداللہ کہنے لگا۔

"آپ کی یہ دلنشین باتیں سن کر مجھے مصر کے ایک شاعر کا کلام یاد آ گیا ہے۔ اس نے خوب کہا ہے۔

"مصر کیا ہے؟"

"مصر تو! چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو جنت ہے۔"

یہاں کے لڑکے غلمان اور عورتیں حوروں کی مانند ہیں۔

"یہاں کے باغات فردوس اور نیل آبِ کوثر۔"

"بالکل درست منظر نگاری ہے۔" ابن بطوطہ نے تائید کی۔ "شہر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اونٹوں پر پکھال لاد کر پانی پلانے والے سقوں کی تعداد ہی بارہ ہزار ہے۔ لکڑیوں کی دکانیں تیس ہزار ہیں۔ مصر کے نیل میں جن سرکاری اور عوامی کشتیوں کی چڑھاؤ پر صعید تک آمد و رفت رہتی ہے اور اتار پر اسکندریہ و دمیاط تک ان کی تعداد چھتیس ہزار ہے۔ ان کشتیوں سے مختلف اقسام کی خیرات' میراث' اور مراعات جاری رہتی ہیں۔ مصر کے مقابل دریائے نیل کے اس کنارہ پر ایک مقام کو مقامی زبان میں 'روضہ' کہتے ہیں۔ عمدہ تفریح گاہ اور پُرفضا مقام ہے۔ عمائدِ مصر کے شاندار اور دلچسپ باغات ہیں۔ اہلِ مصر سرور و طرب اور عیش و نشاط کے بہت دلدادہ ہیں۔ ایک دفعہ ملک ناصر کے ہاتھ میں چوٹ آگئی۔ صحت یابی کے بعد لوگوں نے پُراہتمام جشن منایا۔ شہر بھر کے بازار آراستہ کیے گئے۔ ہر شخص نے اپنی اپنی دکانیں خوب سجائیں۔ عمدہ ریشمی اور قیمتی کپڑے اور بیش بہا زیورات لٹکائے گئے۔ چراغاں کیا گیا۔ یہ بازارِ جشن کئی دن تک خوب گرم رہا۔"

"وہاں کے مزارات بھی تو بہت مقبول ہیں ناں محترم؟ میں نے ان کے متعلق چند ایک باتیں سن رکھی ہیں۔" ابراہیم کو یکدم یاد آیا۔

"مزارات اور ان سے وابستہ ہستیاں تو کسی بھی شخص کو متوجہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں میرے عزیز! یہاں ایک عظیم الشان مقدس مقام ہے۔ ایک ایسا متبرک مقام جہاں حضرت امام حسینؓ کا سرِ مبارک دفن ہے۔" اس کی آواز جذبات کی شدت سے بوجھل ہونے لگی۔ "یہاں ایک بہت بڑی رباط بنی ہوئی ہے۔ اس کی عمارت حیرت انگیز اور

UUNOVELS.COM

پاکیزہ ہے۔ دروازوں کی زنجیریں' کنڈے اور کڑے سب چاندی کے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے کہ یہ مقام ہر طرح سے احترام واجلال کا سزاوار ہے۔ منجملہ مزارات مقدسہ جلیلہ حضرت سیدہ نفیسہ بنت زید علی بن علی بن حسین بن علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تربت ہے۔ یہ درگاہ درحقیقت اجابت دعا اور بہت بڑا عبادت خانہ ہے۔ اس مقبرہ عالی کی عمارت وساخت نادر' پاکیزہ' بارونق اور نورانی ہے۔ یہاں بھی ایک بہت بڑی رباط بنائی گئی ہے۔ منجملہ دوسرے مزارات کے امام ابن عبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کی تربت بھی ہے۔ یہاں بھی ایک بہت بڑی رباط بنی ہے جس کے مصارف کے لیے بہت بڑی رقم وقف ہے۔ اس کا گنبد بے حد مضبوط اور وسعت تیس گز سے زیادہ ہے۔ ان گنت صحابہ کرامؓ کے مزارات اس کے علاوہ ہیں۔

خیر! بات ہو رہی تھی دریائے نیل کی۔ اسے دنیا بھر کے دریاؤں پر اپنے پانی کے لحاظ سے شیرینی کی فضیلت حاصل ہے۔ کسی دریا کا پانی اس جیسا شیریں نہیں ہے۔ خوشبو اور ذائقہ ناقابل بیان ہے۔ وسعت اور طوالت میں بھی کوئی دریا ایسا لمبا چوڑا نہیں۔ اس دریا سے منافع پانے والے لوگ' اس سے ملحق شہر اور قصبات کی تعداد اپنی مثال آپ ہے۔ دنیا بھر میں اس قدر منافع کسی اور دریا سے حاصل نہیں ہوتا۔ وہ حدیث صحیح جو تم لوگوں نے سن ہی رکھی ہوگی۔ رسول اللہ شب معراج میں جب سدرۃ المنتہیٰ تک تشریف لے گئے تو ملاحظہ فرمایا کہ اس کی جڑ سے چار نہریں (دریا) نکلتی ہیں۔ دو نہریں ظاہر کی جانب ہیں اور دو اندر کی جانب۔ پس آپ نے جبرائیلؑ سے ان چاروں کا حال دریافت فرمایا۔ آپؑ نے جواب میں عرض کیا کہ دونوں نہریں جو اندر کی جانب ہیں وہ جنت میں ہیں اور دو جو باہر کی جانب ہیں وہ نیل اور فرات ہیں۔ ایک اور حدیث میں تو یہ بھی آتا ہے کہ نیل' فرات' سیحون اور جیحون جنت کی نہروں میں سے ہیں۔ خیر! نیل کا بہاؤ دوسرے دریاؤں کے بالکل برعکس جنوب سے شمال کی جانب ہے اس کے متعلق ایک عجوبہ یہ بھی ہے کہ جس زمانے میں دوسرے دریا چڑھاؤ پر ہوتے ہیں' یہ اتار پر ہوتا ہے اور جب دوسرے دریا گرمیوں میں اتار پر ہوتے ہیں' نیل بے حد چڑھاؤ پر ہوتا ہے۔ نیل کے چڑھاؤ کا آغاز 'حزیران' کے مہینے میں ہوتا ہے جسے 'یونیہ' کہتے ہیں جس سال نیل کا پانی سولہ گز بلند ہوا رضی پیداوار معتدل درجہ پر ہوتی ہے۔ اس پیداوار سے خراج سلطان بیباق ہو سکتا ہے۔ اگر سولہ گز سے پانی ایک گز بھی زیادہ بڑھ جائے تو اس سال پیداوار کی بہت فراوانی اور آب وہوا کی عمدگی ہوتی ہے۔ فصل بے حد اچھی ہوتی ہے۔ اگر پانی اٹھارہ گز سے زائد چڑھ جائے تو اس سال تمام چیزوں میں سخت نقصان ہوتا ہے۔ ہوا میں بھی وبائی مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر سولہ گز سے ایک گز پانی کم چڑھا تو پیداوار میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ اس سے خراج سلطان بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اگر سولہ گز سے دو گز پانی کم چڑھا تو پیداوار میں بہت زیادہ کمی ہو جاتی ہے۔''

''اور مصر کے اہرام...... اس کا اسرار بھی تو ہمیں مسحور رکھتا ہے۔ اس کے متعلق آپ نے کیا دیکھا اور تجزیہ کیا تھا؟ آخر ایسا کیا اسرار ہے ان اہرام میں؟'' ابراہیم ہیجان زدہ تھا۔

''میں تم لوگوں سے اسی سوال کی توقع کر رہا تھا۔''

ابن بطوطہ کی مسکراہٹ آنکھوں تک در آئی تھی۔ ''اہرام بھی عجائبات میں سے ہی ہیں۔ اب تک ان کے متعلق ہزاروں افراد نے اپنے تجربات ومشاہدات تحریری طور پر بھی بیان کر رکھے ہیں۔ ان کی تعمیر وتاسیس تو اب تک ایک اسرار ہی ہے۔ شنید ہے کہ طوفان نوح سے قبل جتنے علوم ظاہر ہوئے ہیں وہ سب ہرمس اول سے لے گئے تھے۔ ان کا مسکن سعید مصر اعلیٰ تھا جن کو خنوق بھی کہتے ہیں۔ یہی حضرت ادریسؑ پیغمبر ہیں۔ انہی نے پہلے حرکات فلکیہ اور اجرام علویہ پر بحث کی ہے۔ یہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ہیکل قائم کیے۔ حضرت ادریسؑ نے ہی لوگوں کو طوفان نوح سے ڈراتے ہوئے پیشگوئی کی تھی کہ اس طوفان کی آمد کی صورت میں تمام علوم نیست ونابود اور کل عمارات وکارخانے منہدم ہو جائیں گے۔ اسی طوفان سے حفاظت کے لیے اہرام وابرابی قائم کیے' جملہ صنائع اور آلات کی صورتیں نقشے ان عمارات میں ثبت کیے۔ تمام علوم کی پائیداری اور دوامی کے لیے انہیں عمارات میں مرسوم کر دیا گیا۔ اب اگر بات کریں اہرام کی عمارت کے متعلق تو یہ عمارت نہایت سخت پتھر کی ہے۔ یہ پتھر ایک دوسرے سے وابستہ اور عمارات بلند مخروطی شکل کی ہیں۔ ان کی بنا چوڑی اور اوپری حصہ پتلا ہے۔ نیچے سے اوپر گول چلتی جاتی ہیں۔ ان میں دروازے بالکل نہیں ہیں۔ ان کی بنا کے متعلق کیفیات بھی ناقابل فہم ہی سمجھو۔ شنید ہے کہ طوفان حضرت نوحؑ سے قبل مصر کے کسی بادشاہ نے ایک ہولناک خواب دیکھا تھا جس کی وجہ سے اسے نیل کی مغربی جانب اہرام کی عمارت قائم کرنے کی

UUNOVELS.COM

ضرورت محسوس ہونے لگی۔ وہ تمام علوم اور بادشاہوں کی نشیں یہاں امانتاً رکھوانا چاہتا تھا۔ عمارتیں بن جانے کے بعد اس نے نجومیوں سے دریافت کیا کہ آیا کبھی ان عمارات سے کسی عمارت کی کوئی جگہ کھود کر کھولی جاسکے گی یا نہیں؟ نجومیوں نے جواب دیا کہ شمال کی سمت فلاں مقام میں ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی نجومیوں نے کھلوانے والے کے لیے مال کا تخمینہ بھی بتادیا۔ اب اس بادشاہ نے یہ کیا کہ اس جگہ کو کھلوانے کو نجومیوں کا تخمینہ کردہ مال اسی میں رکھوا دیا۔ آٹھ سال کی مدت میں تکمیل کے بعد اس نے وہاں عرصہ مدت بھی کندہ کروادیا۔ اس کے استحکام کا یہ عالم تھا کہ کھدائی کے بعد کوئی بھی انہیں چھ سو برس تک بھی نہیں کھدوا سکتا۔ دیوار اہرام کا عرض بیس گز چوڑا ہے۔ ان عجائبات کی حیثیت تو جامد ہے ناں میرے عزیز! مصر میں مجھے ایک ایسا شخص بھی ملا جسے ہم زندہ عجوبہ کہہ سکتے ہیں۔''

''ایسا شخص کون تھا بھلا؟'' ابراہیم اور عبداللہ بیک وقت کہہ اٹھے۔

''وہ سلطان مصر ملک ناصر ابوالفتح محمد ابن ملک المنصور سیف الدین قلاوون الصالحی تھا۔ اس کا عرف الفی تھا جس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ملک صالح نے اسے ہزار اشرفیوں کے عوض خریدا تھا۔ وہ درحقیقت ملک قفچاق کا باشندہ تھا۔ ملک ناصر کی سیرت اور فضائل ناقابل بیان ہیں۔ میری ذاتی رائے میں اس کے شرف و عظمت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ حرمین شریفین کی خدمت اس کی طرف منسوب ہے۔ وہ ہر سال حرمین و شریفین میں بہت کچھ خیرات و مبرات کیا کرتا ہے۔ مصر اور شام کے درون سے جو بھی مساکین بغرض حج یا ہجرت وہاں کا قصد کریں ان سب کے لیے سلطان ہی زادِ راہ کا مفت انتظام کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں وہ ہر اس شخص کے لیے سفر حج کا بندوبست خود کرتا ہے جو چلنے پھرنے میں یا کسی بھی اور وجہ سے حج کی مسافت طے کرنے میں معذوری کا حامل ہو۔ اس کام کے لیے سلطان نے سینکڑوں اونٹ مقرر کر رکھے ہیں۔ اس نے قاہرہ کے باہر مقام سریاقس میں فقرا کی پرورش کے لیے ایک زاویہ تعمیر کروا رکھا ہے۔''

''سبحان اللہ!! پروردگار ایسے غیور اور ملی جذبے سے سرشار حکمران پوری امت مسلمہ کو عطا فرمائے۔'' عبداللہ نے صدق دل سے دعا کی۔ وہ دونوں اداس نظروں سے قرب وجوار کی سرگرمیاں دیکھ رہے تھے۔ تقریب کا اختتام کافی دیر پہلے ہی ہوگیا تھا اور اب مہمانوں کی اکثریت بھی رخصت ہو چکی تھی۔ اکا دکا مہمان باقی دیکھ کر ان کا اضطراب بالکل قابل فہم تھا۔ ابن بطوطہ کی زیرک نگاہوں سے ان کی کیفیات کیسے پوشیدہ رہتیں؟ وہ ان کی حالت پر متانت سے مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ دونوں سے یہ ملاقات بہت شاندار رہی ہے۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کل میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئیں۔ ابھی تو اس مسافت کا احوال سنانے اور اپنی سرگذشت کے بہت سے ان کہے پہلو باقی ہیں۔'' اسے بھی ماضی کے ان رستوں پر جمی گرد جھاڑنے میں لطف آنے لگا تھا۔ اس کی پیشکش سن کر عبداللہ اور ابراہیم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے ابن بطوطہ کا رہائشی پتا اچھی طرح ذہن نشین کیا اور اگلے روز ملاقات کا عہد کرلیا۔

☆☆☆

ابن بطوطہ کا وہ اگلا روز کافی مصروفیت میں بیتا۔ عہدیدارانہ ذمے داریاں نبھاتے ہوئے وہ کافی تھکاوٹ کا شکار بھی ہوگیا تھا۔ اس مصروفیت اور تھکاوٹ کے دوران بھی ان دونو جوانوں کا خیال ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے ذہن سے فراموش نہ ہوا۔ حقیقت تو یہ تھی اسے ان کی سیاحت میں دلچسپی دلی طور پر بہت بھلی محسوس ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ مادیت پرستی کی طرف بڑھتے رجحانات میں فطری مظاہر اور سیر و سیاحت میں یہ دلچسپی یقینی طور پر بہت خوش آیند تھی۔ دن بھر ابراہیم اور عبداللہ کے متعلق سوچتے ہوئے اسے ان کی آمد کے متعلق تو مکمل یقین تھا تاہم اتنا اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنے ہمراہ مزید ساتھی بھی لے آئیں گے۔

''امید ہے کہ آپ نے ان مہمانوں کی آمد کا برا نہیں منایا ہوگا۔'' عبداللہ نے شائستگی سے کہا۔

''ہرگز نہیں! مہمان تو رحمت خداوندی ہوتے ہیں۔ ان کی آمد بھلا کس کافر کو بری لگ سکتی ہے؟'' اس نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''دراصل یہ بھی ہمارے دیرینہ عزیز ہیں۔ کل رات آپ سے ملاقات کے بعد ہم نے انہیں آپ کے بیان کردہ واقعات کا احوال سنایا تو ان کا تجسس بھی سوا ہوگیا۔ وہ بقیہ ماندہ سفر کا احوال اور آپ کی یہ سرگزشت آپ ہی کی زبانی سننا چاہتے ہیں۔'' ابراہیم نے مزید وضاحت کی۔

''اس تمہید کی ضرورت ہی نہیں برادرم! مجھے سیر و سیاحت کے شائق اور عملی طور پر اس میدان کی جانب میلان

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کے حامل افراد سے دلی انسیت محسوس ہوتی ہے۔'' وہ بردباری سے بولا۔

''آپ کی اعلیٰ ظرفی سے ہمیں یہی اُمید تھی قاضی محترم!'' سلیمان نامی ایک درمیانی عمر کے تاجر نے کہا۔ ''آپ ہمیں بتایئے ناں کہ سلطان مصر سے فیض یابی اور مصر جیسے عظیم الشان شہر کی سیاحت کے بعد آپ نے کس کوچے کا رخ کیا تھا؟''

اس سوال پر ابن بطوطہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ دھند اور گرد میں لپٹے ماضی کے ان نقوش میں جھانکتے وہ اپنے تصور اور الفاظ کی سجا ایک بار پھر سجانے لگا تھا۔ حاضرین بڑی شدت سے اس کے بولنے کے متمنی تھے۔ بالآخر گلا کھنکارتے ہوئے وہ متوازن لہجہ میں گویا ہوا۔

''مصر سے روانگی کے وقت رجب کا مہینا طلوع ہو چکا تھا۔ یہ میرا ماہ ولادت بھی تھا۔ قدرتی طور پر ہی دل میں منزل تک پہنچنے کی لگن شدت اختیار کر چکی تھی۔ ایک مجھ پر ہی موقوف نہیں' زائرین کی اکثریت اسی ولولہ میں مبتلا تھی۔ زیارت بیت اللہ کی دید کے خواب آنکھوں کی قوت کا بہت امتحان لے چکے تھے۔ اب تو صرف مجسم منزل درکار تھی۔ مصر سے روانگی براستہ صعید ہونا تھی۔ روانگی سے قبل ایک بہت بڑی رباط میں شب باش ہوا۔ اس رباط کو صاحب تاج الدین نے دیرطین میں تعمیر کروایا تھا۔ دیرطین کی یہ عمارت بہت سی متبرک اشیاء کی حامل تھی۔ یہاں سرور کائناتؐ کے پیالے کا ایک ٹکڑا اور وہ سلائی بھی موجود ہے' جس کی مدد سے آپؐ سرمہ استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اس سوا کی دید نے ہمیں اشکبار کر دیا جس سے آپؐ اپنے نعلین مبارک سی لیا کرتے تھے۔ اس لمحہ میں اپنے تمام ساتھیوں سے بے نیاز تھا۔ میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کن کیفیات سے گزر رہے تھے۔ مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ اس وقت اپنی ذات اس سوا سے بھی کمتر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی شان مجھے اشک زن کر رہی تھی کہ اس نے نعلین مبارک کی قدم بوسی کر رکھی ہے۔ اس کے بعد جب ہمیں حضرت علیؓ کا تحریر کردہ قرآن پاک کا نسخہ دکھایا گیا تو دلوں پر ایک بار پھر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ ہمارے سامنے بکھرے وہ الفاظ ایسے مبارک ہاتھوں سے تحریر کردہ تھے جن کی مضبوطی اور تلوار کا ساتھ مقابل کو لرزنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ یہیں ہمیں یہ بھی علم ہوا کہ ان آثار شریفہ کے حصول کے لیے رباط کے مالک نے ایک لاکھ درہم ہدیہ دیا تھا۔ اس رباط کی خصوصی تعمیر کے بعد وہ تبرکات نبویؐ اس میں رکھ دیے گئے۔ خدام کی تنخواہیں اور مصارف مقرر کیے گئے تھے۔ اس رباط میں آمد اور قیام کرنے والوں کا سارا خرچا بھی اسی نے اپنے سر لے رکھا تھا۔''

''سبحان اللہ...... ایسی خوش نصیبی یقیناً قسمت والوں کو ہی نصیب ہوا کرتی ہے۔ ہم تو خود ان بے جان اشیاء کی شان کے برابر بھی نہیں ہیں۔'' داؤد نامی اس معمر شخص نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں عقیدت و محبت کی نمی چمک رہی تھی۔

''بجا فرمایا آپ نے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ 'خیر! ہمارے سفر کا آغاز ایک بار پھر ہو گیا تھا۔ نیل کے کنارے واقع چھوٹے سے شہر 'منیۃ القائد' سے ہوتے ہوئے بوش' دلاص' بیبا' بہنسا' قوص' اقصر' اسنا' ادفو' عیذاب کی مسافت کی۔ شعبان 726ھ میں ہم نے شام کے لیے رخت سفر باندھ لیا تھا۔ بلبیس' صوادہ' واردہ' مطب' عریش' خروبہ سے ہوتے ہوئے ہم 'غزہ' چلے آئے۔ یہ شام کا سب سے پہلا شہر تھا۔ وسیع اور کشادہ ایسا کہ دل خوش ہو جائے۔ عمارتوں کی کثرت حیران کن، بازار نہایت خوبصورت اور آراستہ۔ اس شہر کی سب سے منفرد بات یہ ہے کہ یہاں کوئی فصیل نہیں ہے۔ یہ قدیم جامع رعنائی اور حسن و جمال میں اپنی مثال آپ ہے۔ غزہ سے آگے بڑھتے ہی ہم دیار خلیل یعنی حضرت ابراہیمؑ (صلی اللہ علیہ نبینا وعلیہ وسلم تسلیمات) میں داخل ہو گئے۔ اس شہر کی وسعت تو کچھ زیادہ نہیں تھی البتہ عظمت و قدر کے اعتبار سے اس کا کوئی جوڑ بھی نہیں۔ منبع نور' وحدانیت کی تجلی پھوٹنے کا امین' حسن و مناظر میں یکتا' اپنی تاریخ کے دامن میں عجیب اور سبق آموز واقعات سموئے ہوئے یہ شہر ایک وادی میں واقع ہے۔ یہاں کی مسجد اپنی صنعت کاری' پائیداری' دیدہ زیبی اور بلندی میں لاجواب ہے۔ اس کی سنگی عمارت میں اینٹوں کی طرح ہر پتھر دوسرے سے پیوست ہے۔ جن پتھروں سے یہ تعمیر شروع ہے ان میں ایک تو اس قدر بڑا ہے کہ اس کا ہر پہلو سینتیس بالشت کا ہے۔''

''اس قدر نا قابل بیان تعمیر انسانی ہاتھوں سے کس طرح ممکن ہو سکی ہوگی؟'' ابراہیم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''میرے ذہن میں بھی اس کی دید سے یہی سوال پیدا ہوا تھا پھر مجھے علم ہوا کہ روایات کے مطابق حضرت

UUNOVELS.COM

سلیمانؑ نے اپنے جنوں کو اس کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔'' اس نے سرسراتے لہجہ میں انکشاف کر کے بھی حاضرین پر ایک اور نئی کیفیت طاری کر دی۔ ''اندرون مسجد ایک غار بھی ہے۔ اس کی تقدیس کے متعلق بھی بہت سی روایات مشہور ہیں۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی قبریں ہیں جن کے عین سامنے ان کی ازواج صالحات کی تین قبور بھی موجود ہیں۔ دیوار قبلہ سے متصل اور اس کے قدرے دائیں جانب ایک خصوصی مقام ہے جس کے زینے سنگ رخام کے ہیں۔ یہ راستہ سنگ رخام ہی کے فرش سے بنے صحن تک جاتا ہے۔ وہاں تین اور قبریں بھی موجود ہیں۔ اس کے بعد ہم نے حضرت ابراہیمؑ حضرت یوسفؑ حضرت لوطؑ کے مزارات کی زیارت کی۔ ہر ایک مقام سے وابستہ کیفیات اور گداز آج بھی میرے دل میں جوں کا توں برقرار ہے۔ اس لمحہ بھی اگر اپنے تصور میں وہ مناظر اجاگر کروں تو واللہ! اپنی ذات کسی حقیر تنکے سے بھی زیادہ ہلکی محسوس ہوتی ہے۔ حضرت لوطؑ کی تربت مبارک کے پاس 'مسجد الیقین' نامی ایک مسجد ہے جو بلند پہاڑی ٹیلے پر واقع ہے۔ یہاں محسوس ہونے والا انوار و روشنی کسی اور مقام پر محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسجد کے قریب ایک نشیبی مقام پر حضرت فاطمہ بنت حسین ابن علی علیہما السلام کی قبر مبارک ہے۔ اس مزار کے سرہانے اور پائنتی پر سنگ مرمر کی دو لوحیں نصب ہیں۔ ان پر نقش عبارات نے مجھے پل بھر میں ہی اشکبار کر دیا تھا۔ لکھا تھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اللہ ہی کے واسطے غلبہ اور بقا ہے۔ جو ظاہر ہوا اور عالم وجود میں آیا وہ اسی کا ہے۔ اسی نے اپنی مخلوق کے لیے فنا کا حکم لکھا۔ آں حضرت کی ذات ایک اسوۂ حسنہ ہے۔ یہ قبر ام سلمہ فاطمہ بنت امام حسین علیہ السلام کی ہے۔''

دوسری لوح پر کندہ عبارت ایک ہی لمحہ میں واردات قلبی تبدیل کر دینے کی اہل تھی۔ وہاں لکھا تھا۔

''یہ مصر کے رہنے والے محمد بن ابی سہل نقاش کی دست کاری ہے۔ آپ کی جگہ میرے دل میں تھی۔ مگر وائے بدبختی کہ آپ نے پتھر اور مٹی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اے فاطمہ بنتِ فاطمہ! ائمہ کی بیٹی! روشن اور درخشاں ستاروں کی بیٹی! اے قبر' دین' تقویٰ' عفت' نگہداشت اور حیا کون سی چیز ہے جو تیرے اندر دفن نہیں ہے۔''

''الٰہی! کھا گئی یہ زمیں آسماں کیسے کیسے۔ کیسی بلند مرتبہ ہستیاں خاک کا پیرہن اوڑھے نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ ہم گناہگار تو ان کے قدموں کی دھول کے برابر بھی نہیں۔ ہم ان ہستیوں کا ذکر مبارک سننے یا آخری آرام گاہیں دیکھنے کے قابل بھی ہو سکیں گے کیا؟'' ایک کونے سے ابھرنے والی اس نم صدا نے سبھی کو چونکا دیا۔ یہ آواز طلحہ نامی ایک طبیب کی تھی جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھا اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے الفاظ بھی حاضرین کی دلی ترجمان تھے۔ ابن بطوطہ نے شفیق نظروں سے انہیں دیکھا اور کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر سلسلہ کلام کا دوبارہ آغاز کیا۔

''دیار خلیل سے اگلی منزل بیت المقدس تھی۔ یہ مسجد دنیا کی ان تین بزرگ ترین مساجد میں سے ہے۔ فضیلت و رعنائی میں یکتا۔ یہی وہ مسجد ہے جہاں سے رسول اللہ نے آسمان کی طرف طعود فرما کر معراج کا شرف حاصل کیا تھا۔ خوبصورتی اور دلآویزی کے اعتبار سے بھی یہ مسجد دنیا کے عجائب میں شمار کی جا سکتی ہے۔ مشرق سے مغرب تک اس کا طول سات سو باون گز مالکی ہے۔ قبلہ کے سامنے کے رخ شمال و جنوب سے عرض چار سو پینتیس گز ہے۔ اس کے چہار اطراف میں بہت سے دروازے ہیں تاہم قبلہ کی سمت ایک ہی دروازہ ہے جہاں سے امام داخل ہوتا ہے۔ تمام مسجد بغیر چھت کے ایک میدان ہے البتہ مسجد اقصیٰ نہایت مضبوط ہے۔ اس کی عمارت نہایت پائیدار اور مستحکم ہے۔ ان عجیب و غریب اور مستحکم عمارات میں سے ایک قابل ذکر عمارت 'قبۃ الصخرہ' بھی ہے۔ خوبصورتی اور نادر کاری میں لاجواب۔ قبہ کے اندر سارا فرش سنگ رخام کی صنعت کاری سے بنا ہے۔ قبہ کا سارا دائرہ صنعت کی حیرت انگیز اور ناقابل بیان تصویر ہے۔ اس کا بڑا حصہ سونے سے منڈھا ہے جس کی جلا ایسی روشن اور چمکدار ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ قبہ صخرہ کے وسط میں ایک بڑا پتھر ہے۔ اس پتھر کے متعلق روایات یہی ہیں کہ رسول اللہ یہیں سے آسمان کی طرف تشریف لے گئے تھے۔ اس کی بلندی قد آدم ہے۔ پتھر کے نیچے ایک چھوٹی سی کوٹھری جیسی غار ہے۔ اس کی بلندی بھی قد آدم ہی ہے۔ وہاں زینہ سے اترا جاتا ہے۔ اندر محراب کی ایک شکل بنی ہے اور اس پر بے حد مستحکم دوہرے کٹہرے لگے ہیں۔ پتھر سے قریبی کٹہرہ لوہے سے بنایا گیا ہے۔ اس میں عجیب و غریب صناعیاں اور کاریگریاں ہیں۔ دوسرا کٹہرہ پہلے کے اوپر ہی لکڑی سے تعمیر شدہ ہے۔ قبہ کے اندر ایک بہت بڑی سپر بھی لٹکی ہے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

جس کے متعلق روایات یہی ہیں کہ وہ پسر حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی ہے۔ اس مقام کی زیارت نے مجھے پل بھر میں ہی شرمسار کر دیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی کہ جہاں سے ہمارے آقا کو معراج پر لے جا کر نماز کا عظیم تحفہ عطا فرمایا گیا تھا۔ جنت و دوزخ کا نظارہ کروایا گیا تھا۔ اس ایک لمحہ نے میرے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا کہ اگر میں اس تحفہ عظیم کی قدر نہ کر پایا تو افسوس ہے میرے وجود پر۔" وہ اپنی بات کے اختتام پر ہانپ سا گیا۔ داؤدؔ طلحہ ابراہیم عبداللہ اور سلیمان کے لیے بھی آنسو ضبط کرنے مشکل ہو رہے تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنے اعصاب کو پُرسکون کیا اور گویا ہوا۔

"بیت المقدس کی زیارت، وہاں کے آثار و مشاہد اور مزارات و مقابر کی زیارت کے بعد ہمارا رخ 'عسقلان' کی جانب تھا۔ یہ شہر اب ایک ویرانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ آبادی، شادابی، بلند و بالا قلعے اور مضبوط عمارتیں ماضی کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ اس کے عہد عروج میں کوئی دوسرا شہر عسقلان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا لیکن اب وہاں کھنڈرات اور جائے عبرت کے سوا کوئی شے نظر نہیں آتی۔ اسی شہر میں وہ مقام مبارک بھی ہے جہاں نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک قاہرہ لے جانے سے پہلے لایا گیا تھا۔ یہ مقام کافی بلندی پر ہے۔ یہاں ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے۔ پانی کے لیے خصوصی کنواں بھی موجود ہے۔ کربلا کے میدان میں پیاس کے عالم میں بلکتے، تڑپتے افراد کا تصور اور نواسۂ رسولؐ کے سر مبارک کا خیال ہی جسم بے جان کر کے اشکبار کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس مشہد مزار کے سامنے 'مسجد عمرؓ' نامی ایک مشہور مسجد بھی ہے۔ اس کی دیواروں اور ستون کے علاوہ اب کچھ بھی سلامت نہیں ہے۔ شہر عسقلان کے باہر ایک وادی نمل نامی مقام بھی ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ وہی وادی نمل ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ یہاں شہداء اور اولیائے کرام کے اس قدر مزارات ہیں کہ میں کوشش کے باوجود ان کی اصل تعداد یاد رکھ ہی نہیں سکا۔ عسقلان کے روح پرور ویرانوں کی سیاحت کے بعد میں نے فلسطین، نابلس، عجلون، عکہ، مزار حضرت صالحؑ، صور، صیدا، طبریہ کی خاک چھانتے ہوئے ہر ایک علاقہ کی انفرادیت سے متاثر ہوتے رہے۔ طبریہ میں ایک 'مسجد انبیاء' بھی ہے جہاں حضرت شعیبؑ اور ان کی صاحبزادی کی قبر مبارک موجود ہے۔ یہ صاحبزادی حضرت موسیٰؑ کی زوجہ بھی تھیں۔ یہیں پر سلیمانؑ، یہودا، روبیل صلوات اللہ وسلامہ علی نبینا علیہم کے مزارات بھی ہیں۔ ان کی زیارت سے مستفید ہونے کے بعد ہم 'چاہ یوسفؑ' کی زیارت کے لیے بھی گئے۔ یہ کنواں اس وقت ایک چھوٹی سی مسجد کے صحن میں ہے۔ گہرائی بھی کافی زیادہ تھی۔ اس میں جمع شدہ برسات کے پانی سے میں نے بھی اپنی پیاس بجھائی۔ مجاور نے ہمیں بتایا کہ کنویں کے منبع سے اب بھی پانی اُٹھتا ہے۔ طبریہ کے مقدس مقامات کی زیارت کے بعد ہماری اگلی منزل 'بیروت' تھی۔ یہ شہر وسعت میں تو زیادہ نہیں ہے البتہ اس کے بازار کافی پُررونق اور خوبصورت تھے۔ اس کے بعد طرابلس، حلب، انطاکیہ، صیہون کی سیاحت کرتے ہوئے پھرتے پھراتے 'جبل اقرع' پہنچ گیا۔ یہ ملک شام کے پہاڑوں میں بلند ترین اور برتر شمار ہوتا ہے۔ یہاں دریا، چشموں اور نہروں کی بہتات ہے۔ مقامی باشندے ترکمان کہلاتے ہیں۔ یہاں سے فراغت پاتے ہی میں دنیا کے پہاڑوں میں سے سرسبز و شاداب ترین اور عظیم الشان 'جبل لبنان' پہنچ گیا۔ انواع و اقسام کے میوہ جات اور پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں۔ پہاڑ کے دامن میں سایہ دار درختوں کی بہتات ہے۔ یہ پہاڑ کبھی زاہدوں اور عابدوں سے خالی نہیں ہوا جنہوں نے صرف اللہ کی خاطر دنیا کو خیر باد کہہ رکھا ہے۔ مجھے بھی صالحین کے ایسے گروہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو دنیا سے بے نیاز گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جبل لبنان کے بعد 'بعلبک' پہنچنے کا موقع ملا۔ یہ قدیم اور ملک شام کے بہترین شہروں میں سے ایک ہے۔ چاروں اطراف باغات اور اچھی پھلواریاں نظر آتی ہیں۔ جا بجا جاری چشموں کی وجہ سے شہر میں بڑی رونق رہتی ہے۔"

"آخاہ..... میں اب سمجھا۔ شاید انہی خوبیوں کی وجہ سے اسے دمشق کا ہم پلہ کہا جاتا ہے۔" ابراہیم چہکا۔

"یہاں کی دیگر خوبیوں کے متعلق بھی کچھ بتائیے ناں؟"

"بالکل درست کہا برادرم! یہ بادشاہوں کی نظر میں ہمیشہ محبوب رہا ہے۔ یہاں ایک طرح دبس یعنی قوام بنتا ہے جسے دبس بعلبکی کہتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کا شیرہ ہے جو انگور سے بنتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص قسم کی مٹی بھی ہوتی ہے جسے اس انگور کے شیرہ میں رکھ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا سیال پن کم ہو جاتا ہے اور جم کر ایک ڈھیلے کی طرح بن جاتا ہے۔ پھر اس میں پستے بادام ڈال کر ایک قسم کا حلوا 'ملبن' بناتے ہیں۔ یہاں دودھ بکثرت ہوتا ہے اور

UUNOVELS.COM

اسے تجارت کے طریقے پر دمشق بھی لے جاتے ہیں۔ تیز رفتار شخص کے لیے بعلبک اور دمشق کے درمیان صرف ایک روزہ مسافت ہے تاہم آہستہ رو بعلبک سے 'زبدان' نامی ایک چھوٹے سے شہر میں قیام کرتے ہیں۔ زبدان میں میوؤں کی خوب کثرت ہے پھر یہاں سے دوسرے دن دمشق میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بعلبک میں ایک خاص قسم کا کپڑا بھی بنا جاتا ہے جسے 'بعلبکی' کہتے ہیں۔ لکڑی کے برتن اور ایسے چمچے بنائے جاتے ہیں جن کی دوسرے شہروں میں کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ مقامی لوگ پیالوں کو 'دسوت' کہتے ہیں۔ بعض کاریگروں کو بھی دیکھا جو ایک بڑے پیالے میں ایک کے اندر ایک پورے دس پیالوں کی ترتیب اس طرح بناتے ہیں کہ بادی النظر میں ایک ہی پیالہ معلوم ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال چمچوں کا ہے۔ ایک کے اندر ایک دس چمچوں کی ترتیب بنتی ہے جو بظاہر ایک ہی چمچہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لیے چمڑے کا ایک غلاف بھی بنتا ہے جس میں رکھ کر ان سب کو اپنے توشہ دان میں رکھ لیتے ہیں۔ جب دسترخوان بچھتا اور سب ساتھی کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو اسے چمچے نکال کر دسترخوان پر رکھ دیتے ہیں۔ اوپر سے دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ اس قدر آدمیوں میں صرف ایک چمچہ رکھا ہے۔ اصل مزہ تب آتا ہے جس وقت اس کے جوف سے یکے بعد دیگرے نو چمچے اور نکل آتے ہیں۔ اچھا خاصہ عقلمند انسان بھی خود کو فریب نظر کا شکار اور پھر احمق محسوس کرنے لگتا ہے کہ بھلا اتنے آدمیوں کے لیے ایک چمچہ کیسے رکھا جا سکتا تھا؟'' وہ اپنی بات کے اختتام پر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ حاضرین کے قہقہے بھی بہت بے ساختہ تھے وہ سمجھ گئے تھے کہ ابن بطوطہ بھی ایسے ہی کسی فریب نظر کا شکار بننے کے بعد خفت میں مبتلا ہوا ہوگا۔

''ویسے بعلبک کی سیاحت کے بعد دمشق کوچ کرنے کی تمنا تو مزید مچل گئی ہوگی۔ دمشق کے متعلق داستانیں تو صرف سن کر ہی ہم ایک مدت سے اس کے نادیدہ سحر میں گرفتار ہیں۔'' سلیمان نے بڑے اشتیاق سے دریافت کیا۔

''ارے کوئی ایسی ویسی تمنا!'' وہ ہاتھ مسلتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ میری رگوں میں لہو نہیں بلکہ کوئی سنسنی دوڑنے لگی ہے۔ مجھے ایک رات قیام بھی بہت دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا فوراً سے بیشتر دمشق روانہ ہو جاؤں۔''

''وہ کیا شعر ہے بھئی شرف الدین بن الحسن کا؟''

داؤد نے پیشانی مسلتے ہوئے یادداشت پر زور دیا۔ سلیمان نے مسکرا کر داؤد کی جانب دیکھا اور بڑے متوازن لہجہ میں گویا ہوا۔

''یہ ایسا شہر ہے۔
جہاں سنگریزے گوہر کا حکم رکھتے ہیں۔
جس کی خاک عبیر اور بادشمال شراب کی تاثیر رکھتی ہے۔''

''واہ! بہت خوب!'' ابن بطوطہ نے سر دھنا۔ ''تو ہم بات کر رہے تھے دمشق داخلہ کی۔ میں 'نو رمضان المبارک 726ھ' کو اس شہر میں داخل ہوا تھا۔ میرا قیام ایک مدرسہ مالکیہ المعروف بہ 'شرالبشیہ' میں تھا۔ دمشق بلامبالغہ حسن و جمال، رعنائی و زیبائی، دلکشی و سحر طرازی میں اپنی مثال آپ ہے۔ میرے پاس الفاظ کا وہ ذخیرہ ہی نہیں ہے جس کی مدد سے اس کی خوبصورتی بیان کر سکوں۔ دمشق کی مغربی جانب 'صحرائے قبور شہداء' ہے۔ اس میں حضرت ابی الدرداء، ان کی اہلیہ حضرت فضالہ بن عبیدہ وثلہ بن الاسقع اور سہل ابن حنظلہ کے مزارات ہیں۔ شہر سے قبلہ کی طرف ایک کوس کے فاصلے پر حضرت ام کلثوم علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صاحبزادی کا مزار بھی ہے۔ روایات کے مطابق ان کا اصل نام زینب تھا، وہ اپنی خالہ ام کلثوم رسول اللہ کی صاحبزادی سے زیادہ مشابہت کی حامل تھیں اس لیے انہوں نے اپنی کنیت ام کلثوم کر دی۔ یہاں ایک اعلیٰ درجہ کی مسجد کے ساتھ اردگرد مکانات تعمیر کیے گئے ہیں۔ مصارف کے لیے اوقاف بھی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت سکینہؓ بنت حسین ابن علی، ام مریم علیہا السلام، ابی مسلم الخولانی اور ابی سلیمان الدارانی رضی اللہ عنہا کے مزارات بھی قابلِ دید ہیں۔ دمشق کے دو بابرکت مقامات میں سے 'مسجد الاقدام' بھی ہے۔ یہ شہر دمشق سے قبلہ کی جانب دو میل فاصلہ پر اس بڑی سڑک کے کنارے پر واقع ہے جو حجاز شریف، بیت المقدس اور مصر کو جاتی ہے۔ یہ ایک بہت شاندار اور کثیر البرکت مسجد ہے۔ اہل دمشق اس کی عظمت کے بہت قائل ہیں۔ اس شہر کی ایک ریت یہ بھی ہے کہ لوگ 'عرفہ' کے دن نماز عصر کے بعد باہر نکلتے ہیں اور بیت المقدس کی مسجد جامع بنی امیہ اور دیگر مساجد کے صحنوں میں برہنہ سر کھڑے ہو کر نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ برکت طلب کرنے کی دعائیں کرتے ہیں۔ انہیں شدت سے اس وقت کا انتظار ہوتا ہے جب

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

حجاج بیت اللہ عرفات پہنچیں اور برابر بتوسل حجاج بیت اللہ خشوع وخضوع کے ساتھ غروب آفتاب تک دعا اور بارگاہ الٰہی میں التجا کرتے ہیں پھر جس طرح حاجی عرفات میں واپس ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی نالاں وگریاں اپنے گھروں میں واپس آجاتے ہیں۔ ان کے نوحوں میں ایک ہی قلق شامل ہوتا ہے کہ وہ وقوف عرفات سے محروم رہے ہیں۔ ان کی التجاؤں میں ایک ہی التجا شامل ہوتی ہے کہ پروردگار انہیں وہاں پہنچنے کی سعادت نصیب فرمادے۔ دمشق میں جنازوں کی ہمراہی بھی عجیب الشان ہوا کرتی ہے۔ ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ جنازہ کے آگے آگے چلتے ہیں۔ قرآن پڑھنے والوں کی خوش الحانی اور سوز وگداز کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سننے والے کو اپنی روح پرواز کرتی محسوس ہوتی ہے۔ مقصورہ کے سامنے نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ اگر جنازہ جامع مسجد کے کسی امام، مؤذن یا خادم کا ہے تو نماز پڑھنے کی جگہ تک تلاوت جاری رکھتے ہیں۔ کسی عام انسان کے جنازے کی صورت میں جامع مسجد کے دروازے پر ہی تلاوت کا سلسلہ موقوف کردیا جاتا ہے۔ یہ شہر ہر ایک کے لیے بلا امتیاز رنگ ونسل میزبان بن جاتا ہے۔ یہاں کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ مذہبی روایات سے وابستہ مقامات اس قدر ہیں کہ روح پر جمی تمام تر کثافتیں دھوڈالیں۔ یہیں وہ غار بھی موجود ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے خدا کو پہچانا تھا۔ داستان ہابیل وقابیل سے منسلک 'خونریزی' بھی یہیں مجسم صورت میں موجود ہے۔ بس میرے ساتھیو! کیا کیا بیان کروں آپ سب کو؟ یہ رات قطرہ قطرہ پگھلتی جائے گی لیکن میری اس سرگذشت سے منسلک واقعات کبھی ختم نہیں ہوں گے۔'' وہ ایک توقف کے لیے خاموش ہوا۔

''ہم بھی اس حقیقت سے واقف ہیں محترم قاضی! دمشق اگر 'ام الشرق' کہلاتا ہے تو اس کے عقب میں ایک نہیں بلکہ ہزار ہا وجوہات ہوں گی۔ اب آپ یقیناً ہمارے دلوں میں مچلتی صدائیں سن چکے ہوں گے۔ آپ کے سفر کی یہ روداد اب اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں ہم بھی کی دھڑکن غیر... ازن ہو رہی ہے۔ دمشق سے آگے حجاز کے سفر کی بابت جاننے کے لیے ہم سراپا سماعت ہیں۔'' عبداللہ کی آواز جذبات کی شدت سے بوجھل تھی۔

''میں بخوبی واقف ہوں میرے عزیز! میرے اس سفر کی بنیاد اسی عظیم سرزمین کی زیارت ہی تو تھا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے، دل ودماغ پر سنسنی اور رگوں میں ہیجان غالب آنے لگا تھا۔ اسی سال جب شوال کا چاند نمودار ہوا تو حجاز جانے والوں کے اس قافلہ نے دمشق سے نکل کر موضع کسوہ میں پڑاؤ ڈال لیا۔ ہمارا امیر سیف الدین تھا جو کبار امراء میں شمار ہوتے تھے۔ کسوہ سے صمین 'زرعہ' اور پھر چھوٹے سے شہر بصریٰ تک چلے آئے۔ اس قافلہ کا دستور یہ تھا کہ بصریٰ میں چار روز قیام کیا جاتا تھا تاکہ جو اہل دمشق بعض ضروریات کی بناء پر پیچھے چھوٹ گئے ہوں اس عرصہ میں ساتھ شامل ہو جائیں۔ یہ وہی بصریٰ ہے جہاں بعثت سے قبل رسول اللہؐ حضرت خدیجہؓ کا سامان تجارت لے کر گئے تھے۔ جہاں آپ نے سانڈنی بٹھائی تھی وہاں ایک بہت بڑی مسجد تعمیر کروادی گئی ہے۔ تمام حاجی یہیں سے اپنے زاد راہ کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس سے اگلا پڑاؤ 'برکہ زہرہ' ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک روز کے لیے قیام کیا جاتا ہے۔ لجون 'قلعہ کرک' شہر صعان کے بعد صوان کی گھاٹی اور جنگل کا سفر درپیش تھا جس کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ اس میں داخل ہونے والا گم ہو جاتا ہے اور اس پرخطر مقام سے بحفاظت واپسی گویا حیات نو کی نوید ہوتی ہے۔ دو دن کی مسافت کے بعد ہم 'ذات حج' میں پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک ایسا ریگستان ہے جہاں آبادی کا کہیں نام ونشان نہیں۔ اس کے بعد اگلے پڑاؤ 'وادی بلدح' میں بھی پانی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ مقام تبوک پہنچنے کے بعد میری دلی کیفیات میں لحہ بہ لحہ گداز بڑھتا ہی جارہا تھا۔ مجھے اپنے چشم تصور سے گرمی اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے وہ سینکڑوں مجاہدین نظر آنے لگے تھے جو دین حق کی سربلندی کے لیے رسول اللہؐ کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے میدان جنگ میں چلے آئے تھے۔ یہی تو وہ مقام تھا جس تک رسائی کے لیے خلیفہ دومؓ نے اپنے گھر کا آدھا اور خلیفہ اولؓ نے گھر کا پورا سامان پیش کرکے اپنے اہلخانہ کے لیے خدا اور اس کے رسولؐ کا نام چھوڑ دیا تھا۔ تبوک سے چند روز کی مسافت کے بعد ہمارا یہ قافلہ بالآخر مدینہ منورہ پہنچ گیا۔''

''مدینہ...... میرے آقاؐ کا شہر...... میرے آقاؐ کے کٹھن روز وشب کا امین...... مسلمانوں کی ایک طویل جدوجہد اور عزم کا استعارہ...... کیسا لگتا ہوگا یہ عظیم شہر...... کیسی پرنور فضائیں ہوں گی...... کیا سہانا عالم ہوگا کہ جب ہوائیں روضۂ رسولؐ سے ٹکرا کر مزید معطر ہو جایا کرتی ہوں گی۔'' سلیمان کا نم لہجہ جذب وعقیدت سے سرشار تھا۔ ابن

بطوطہ کے چہرے پر بھی ایک افسردگی طاری ہوگئی۔ وہ ایک بار پھر یادوں کے بھنور میں گھر چکا تھا۔

"مجھے آج بھی وہ لمحات کسی سہانے خواب کی مانند یاد ہیں۔ حجاز مقدس میں گزرا ہر ایک پل تادم حیات فراموش نہیں ہو سکتا۔ میں اب بھی چشم تصور سے اپنی جوانی کے وہ ایام دیکھ کر کسک میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ جس روز ہم وہاں حاضر ہوئے تھے اسی دن شام کو ہم حرم شریف میں داخل ہو گئے تھے۔ مسجد کریم کو سلام کرتے ہوئے باب السلام میں قیام پذیر ہوئے۔ روضہ نبویؐ اور منبر نبویؐ کے مابین نماز کی ادائیگی کی۔ ستونِ حنانہ کے باقی ماندہ حصہ کو بوسہ دیا۔ یہ ستون روضہ نبویؐ اور ایک ستون کے منبر کی دائیں سمت (قبلہ رخ) کے مابین واقع ہے۔ اس چوبی ستون کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ نبی کریمؐ کے وصال کے بعد اس نے بھی گریہ کیا تھا۔ خود ہمارا یہ عالم تھا کہ جسم کا رواں رواں حمد و ثنا ادا کر رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ سراپا چشم بن کر یہ خوبصورت اور روح پرور مقامات اپنی بصارت میں ایسے سموئے جائیں کہ پھر دوبارہ آنکھ کھولنے کی کوئی حاجت ہی محسوس نہ ہو۔ مسجد نبویؐ کی دید کے بھی کیا کہنے۔ یہ مسجد مستطیل ہے۔ اس کے چہار اطراف سے سنگین گھومے ہوئے ہیں۔ اس کے وسط میں موجود صحن پر کنکریاں اور ریت بچھی ہوئی ہے۔ مسجد کے گرد اور سنگین فرش کا بل کھاتا راستہ بھی ہے۔ اس کا پتھر باہم متصل اور روضۂ مقدس قبلہ کی طرف مسجد کے مشرقی جانب سے ملا ہوا ہے۔ روضہ اقدس کی صورت نادر اور بے مثال ہے۔ عمارت میں پتھروں کا جڑاؤ بہت پاکیزہ اور شگفتہ ہے۔ اس کا گارا مشک اور دیگر خوشبوؤں سے اس قدر خوبی سے لگا ہے کہ صدیاں بیت جانے کے باوجود اس کے استحکام میں رتی بھر تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ صفحہ قبلہ میں روئے مبارک کے مقابل ایک چاندی کی میخ گڑی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگ عرض سلام کے لیے روئے مبارک کی طرف رخ کر کے اور پشت قبلہ کی جانب کیے کھڑے ہوتے ہیں۔ سلام پڑھا جاتا ہے۔ پھر دائیں سمت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف رخ موڑ لیا جاتا ہے۔ آپ کا سر مبارک رسول اللہ کے قدموں کے پاس ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر بن خطابؓ کی تربت نظر آتی ہے۔ ان کا سر مبارک خلیفہ اوّل کے شانہ مبارک کے پاس ہے۔ روضہ کے جوف میں ایک چھوٹا سا سنگ مرمر کا حوض ہے جس کی جانب محراب کی شکل میں قبلہ واقع ہے۔ روایت یہی ہے کہ یہاں حضرت فاطمہؓ بنت رسول کا مکان ہے۔ حقیقت سے بہرحال پروردگار کے سوا کوئی بھی واقف نہیں۔ مسجد کے وسط میں سطح زمین سے سطح ایک تہ خانہ ہے جو گول ڈھکن سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس تہ خانہ میں موجود سیڑھیوں کا سلسلہ حضرت ابوبکرؓ کے مکان تک چلا جاتا ہے۔ روایت یہی ہے کہ اسی تہ خانہ سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے والد کے گھر تشریف لے جایا کرتی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے مکان کے مقابل حضرت عمرؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مکانات بھی ہیں۔ مسجد نبویؐ کے قرب وجوار کی دید سے بصارت کی پیاس بجھاتے ہوئے میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ 'قبا' چلا گیا۔ اسلام کی اوّلین 'مسجد قبا' دیکھنے کے لیے، دل میں ہزاروں تمنائیں مچل رہی تھیں۔ یہ مسجد مربع شکل میں ہے۔ اس میں ایک مینار کا رنگ ایسا سفید اور بلند ہے کہ بے حد دوری سے دیکھنے پر بھی میرے دل و دماغ پر ایک ہیبت طاری ہوگئی تھی۔ اس کے وسط میں وہ مقام ہے جہاں نبی کریمؐ نے اپنی اونٹنی بٹھائی تھی۔ میں نے وہاں تبرکاً نماز ادا کی۔ صحن میں قبلہ کی جانب چبوترہ پر ایک محراب واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے سرکار دو عالمؐ نے نماز پڑھی تھی۔ قبلہ ہی کی جانب ایک مکان بھی ہے جو حضرت ابوایوب انصاریؓ سے منسوب ہے۔ چند ایک اور مکانات حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں۔ اسی کے مقابل 'بئر اریس' ہے۔ اس کا پانی پہلے بے حد کھارا اور ناقابل استعمال تھا۔ نبی کریمؐ نے اس میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا جس کی برکت سے اس کی شیرینی ناقابل بیان لطافت اختیار کر چکی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کنویں میں حضرت عثمانؓ سے رسالت مآب کی خاتم کریم گر گئی تھی۔ جبل احد کا نظارہ بھی ایک ناقابل بیان ہیبت تھی۔ کفر و اسلام کا وہ عظیم معرکہ 'مسلمانوں کی حکم عدولی اور نبی کریمؐ کی شہادت کی افواہ سن کر صحابہ کرام کا ردعمل یاد کرتے ہوئے مجھ سمیت ہر ایک شخص کی آنکھیں نم اور دل گداز تھے۔ مسجد نبویؐ میں میرا قیام چار روز تک رہا۔ ہماری ہر شب ہی مسجد کے صحن میں گزرتی تھی۔ زائرین کثیر تعداد میں شمعیں روشن کر کے ذکر الٰہی میں معروف رہتے یا قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے۔ مدینہ سے اگلا پڑاؤ مکہ معظمہ میں تھا۔ پہلا مقام 'ذی الحلیفہ' پر ہوا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے رسول اکرم

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

احرام باندھا کرتے تھے۔ یہاں سے مدینہ کا فاصلہ پانچ میل ہے۔ یہ مقام منتہائے حرم مدینہ ہے۔ یہاں سے وادی عتیق بہت قریب ہے۔ میں نے سلا ہوا لباس اتار کر احرام باندھا اور دو رکعت نفل پڑھ کر احرام حج باندھا تو میری قلبی کیفیت خود میرے لیے بھی ناقابل فہم ہو چکی تھی۔ ہر پہاڑ' میدان' نشیب اور فراز پر میری زبان سے یہی کلمات برآمد ہو رہے تھے۔

"لبیک اللھم لبیک...... حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں...... تیری بارگاہ میں جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر آیا ہوں۔ اس طرح آمد سے جانے یہاں رسائی کا حق ...... ادا کر پایا بھی ہوں کہ نہیں۔

لبیک لاشریک لک لبیک...... حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں...... تیرا کوئی شریک نہیں۔ تو یکتا ہے۔ تیری ذات ہی ارض و آسمان پر حاوی ہے۔ تیری بارگاہ میں سر جھکانے اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنے کے لیے یہ عاصی چلا آیا ہے۔ میری یہ حاضری قبول فرمالے۔ میرے دل سے گناہوں کی سیاہی دھو کر اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل فرمالے۔

ان الحمد والنعمت لک والملک...... میرے معبود! سب تعریفیں صرف تیرے لیے ہیں۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ تیری حمد وثنا بیان کرتا ہے۔ میرے مالک! میں بھی تیری بارگاہ میں ذکر و عبادت کا جو نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہوں اسے قبول فرمالینا...... سب کچھ تیرا ہی ہے۔ تیری ذات سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔ ہم گناہگاروں کو اپنی بارگاہ میں توبہ اور گریہ کا موقع فراہم کرنا۔ میں اسی موقع کی تلاش اور اپنی روح کی طہارت کے لیے تو آیا ہوں۔ یا اللہ! میں حاضر ہوں...... تیری بارگاہ میں سر جھکائے حاضر ہوں۔"

اس فقرے کے اختتام پر وہ آنسوؤں اور ہچکیوں میں ڈھل چکا تھا۔ حاضرین میں سے بھی کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں سے اشکوں کی لڑیاں نہ بہہ رہی ہوں۔ وہ اپنے وجود میں شدید تڑپ محسوس کر رہے تھے۔ گناہوں پر شرمساری کی تڑپ' روضۂ رسول کی دید کی تڑپ' خانہ کعبہ کا غلاف تھام کر اپنی گناہگار زندگی پر آنسو بہانے کی تڑپ۔ ماحول میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ سسکیوں اور آہوں پر ضبط کا بند باندھ کر ابن بطوطہ نے سلسلہ کلام کا دوبارہ آغاز کر دیا۔

"مقام صفرا کی زیارت کے بعد ہمارا اگلا پڑاؤ 'بدر' تھا۔ جی ہاں! وہی بدر جہاں تین سو تیرہ مجاہدین سر پر کفن باندھے جذبہ ایمانی کو اپنی قوت بنائے ہزاروں کے لشکر سے مقابلے کے لیے گئے تھے۔ بدر ایک موضع ہے جس میں بہت کم فاصلے پر خرموں کے کئی باغات ہیں۔ یہاں ایک بلند قلعہ بھی ہے۔ اس قلعہ تک رسائی پہاڑوں کے درمیان وادی میں ایک راستہ سے ہوتی ہے۔ صبح ہوتے ہی ہم مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم طواف قدوم سے فارغ ہوئے' حجر کریم کو بوسہ دیا' مقام ابراہیم پر دو رکعت نفل پڑھے' باب کعبہ اور حجر اسود کے مابین ملتزم کے قریب پردۂ کعبہ پکڑ کر دست دعا بلند کیے۔ یہاں مانگی ہوئی مراد بھی رد نہیں ہوتی۔ آب زم زم سے سیر ہو کر باب ابراہیمؑ سے متصل ہی ایک مکان میں قیام پذیر ہو گئے۔ مکہ معظمہ کے ان روح پرور نظاروں کی سعادت پر جسم کا ہر ایک رواں شکرانہ بجالا رہا تھا۔ اس مقدس شہر سے وابستہ عجائبات ہر گزرتے لمحہ میرا ایمان مضبوط سے مضبوط تر کرتے تھے۔ جس وقت حرم پاک کا دروازہ کھولا جاتا ہے وہاں اس قدر مخلوق ہوتی ہے کہ خالق و رزاق کے سوا کوئی اس کی اصل تعداد نہیں جان سکتا۔ اس قدر جم غفیر کے باوجود کعبہ میں داخلے کے بعد کوئی تنگی یا کوتاہی محسوس نہیں ہوتی۔ طواف سے کوئی بھی شب و روز خالی نہیں گزرتا۔ مکہ معظمہ میں پرندوں کی بہتات کے باوجود کوئی بھی پرندہ پرواز کے دوران کعبہ کے اوپر بیٹھتا ہے' نہ ہی اس کو عبور کرتے ہوئے پرواز کی جسارت کرتا ہے۔ کعبہ تک پہنچتے ہی وہ اپنا رخ دائیں یا بائیں سمت کر لیا کرتے ہیں۔ کسی بھی بیماری کی صورت میں کعبہ تک چلا آتا ہے۔ اگر اس کی موت کا وقت قریب ہو تو وہیں بے جان ہو جاتا ہے۔ زندگی کی صورت میں وہ فوری طور پر ہی بیماری سے نجات پا کر اڑان بھر لیتا ہے۔ ان معجزات سے اپنے ایمان کو حدت دیتے ہوئے میں نے حضرت ہاجرہ' حضرت اسماعیلؑ کے مزار' ابولہب اور اس کی اہلیہ کی سنگسار کی جانے والی قبریں' ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا مزار' جبل ثور' غار حرا اور دیگر مقامات کی زیارت کے بعد بیس ذی الحجہ کو دوبارہ مدینہ روانہ ہو گیا۔ اپنی پیاسی آنکھوں کی تشنگی کسی نہ کسی طور دور کرتے بالآخر وقت رخصت چلا آیا۔ بوجھل دل سے اس مقدس سرزمین میں دوبارہ آنے کی ڈھیروں دعائیں کرتے ہوئے میں نے بصرہ کی جانب کوچ کیا۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے مزارات کی زیارت کرتے

UUNOVELS.COM

فارس اور پھر عباادان پہنچ گیا۔''

''یہ عبادان وہی شہر ہے ناں جہاں رہائشی عمارتوں سے زیادہ مساجد' عبادت خانوں اور عابد وصالحین کی رباطوں کی بے حد کثرت ہے۔'' داؤد نے کسی فوری خیال کے تحت تصدیق چاہی۔ ابن بطوطہ نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے تائید کردی۔

''عبادان کے متعلق اپنے ابن جزی نے بھی تو کیا خوب کہا ہے۔'' عبداللہ نے لقمہ دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں گویا ہوا۔

''ہے کوئی جو اندلس والوں کو خبر کردے کہ
عبادان میں جو دنیا کے سرے پر ہے
مناظر حد درجہ وحشت ناک ہیں۔
میری خواہش ہے کہ دنیا بھر کو اس راز سے آگاہ کر دو۔

یہاں روٹی کا یہ حال ہے کہ ہدیہ کے طور پر دی جاتی ہے اور پانی سو اس کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔''

''ہاں! بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو برادرم!'' ابن بطوطہ نے تائید کی۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادان کی زمین قابل زراعت نہیں ہے۔ پانی کی نہایت قلت ہے۔ ضروریات خوردنی اور نوشیدنی دوسری جگہوں سے لائی جاتی ہیں۔ اس شہر میں میری ملاقات ایک ایسی ہستی سے ہوئی جس نے خود کو دنیاداری ترک کر کے صرف عبادت وریاضت میں کھو جانے کے لیے مائل کرلیا تھا۔''

''کیا واقعی؟''

''حیرت انگیز!''

''کون تھی وہ ہستی؟'' حاضرین نے بیک وقت اور یک زبان ہو کر بے ساختہ صدائیں بلند کیں۔

''جی ہاں واقعی! یہ میری زندگی کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہی ہے۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ عبادان کے ساحل پر ایک کنڈ ہے جسے خضر والیاس علیہ السلام کا کنڈ کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابل ایک زاویہ ہے جس میں چار فقراء اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ کنڈ اور زاویہ کی خدمت پر مامور ہیں۔ ان کی گزر اوقات زائرین کے نذرانوں پر ہوتی ہے۔ اس خانقاہ کے لوگوں سے مجھے علم ہوا کہ عبادان میں ایک کبیرائی بزرگ ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ نہیں رہتے۔ مہینے میں صرف ایک مرتبہ سمندر پر آتے ہیں اور اپنی ضرورت کے مطابق سامان لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مہینے ختم ہونے پر ہی ان کی زیارت نصیب ہوا کرتی ہے۔ کئی سالوں سے اسی طرح زندگی بسر کررہے ہیں۔ عبادان پہنچنے کے بعد میں اس عابد کی تلاش پر جت گیا۔ اسی کوشش میں ایک مرتبہ میرا گزر کسی ویران مسجد سے ہوا۔ وہاں مجھے وہی بزرگ نماز میں مصروف نظر آئے۔ میں ادب سے ایک جانب بیٹھ گیا۔ انہوں نے میری موجودگی بھانپ کر نماز مختصر کردی۔ سلام پھیرنے کے بعد میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگے۔ ''کیسے ہو مسافر؟ حرم.... شریف کی زیارت سے سیر تو نہیں ہوئے ہو گے؟''

''نہیں محترم! دل تو اب بھی یہی چاہتا ہے کہ میں اسی سرزمین کی خاک بن کر رہ جاؤں۔ ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ اپنی ان گناہ گار آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہوتا کہ انہیں اس کائنات کے عظیم ترین مقامات کی دید نصیب ہوئی ہے۔ دوسری جانب خوش بختی کا احساس آتے ہی اپنا وجود قربان کر دینے کو جی چاہنے لگتا ہے۔'' میں سحر زدگی سے کہتا چلا گیا۔

''اللہ دنیا اور آخرت میں تیری مراد پوری کرے۔''

وہ اتنا کہہ کر ایک بار پھر عبادت میں مشغول ہوگئے۔

ان کی اس دعا نے میرے ذہن میں سوچ کے نئے دریچے وا کردیئے۔ پروردگار کے خصوصی فضل سے دنیا میں تو میری حاجت پوری کی ہی تھی۔ سیاحت کے میدان میں میری رسائی ایسے مقامات تک ہو چکی تھی جہاں فی الوقت میرے علاوہ کسی اور سیاح کے قدم نہیں پڑے تھے۔ میرا دل ایک انوکھی تال پر دھڑک رہا تھا۔ دنیا میں مزید کامیابیوں اور آخرت میں سرخروئی کا یقین وجود کو ہلکا پھلکا سا کیے آنکھوں کی نمی بننے لگا تھا۔ انہی خیالات میں غلطاں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا تو وہ بھی میری کیفیت دیکھ کر چونک سے گئے۔ ان کے استفسار پر میں نے اس زاہد شخص سے ملاقات اور ٹھکانہ کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ وہ سب لوگ بہت پُرجوش ہوگئے۔ بھاگم بھاگ میرے بتائے گئے ٹھکانے پر پہنچے لیکن وہاں پر کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ تعجب' تشویش اور مایوسی کی اس ملی جلی کیفیت میں شام کے وقت ہم کنڈ کے مقابل زاویہ میں چلے آئے۔ وہاں ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ نماز عشاء کے بعد چار فقراء میں سے ایک کی آمد ہوئی۔ اس کی عادت تھی کہ ہر رات عبادان جا کر تمام مسجدوں میں چراغ روشن کیا کرتا تھا۔ اس شب زاویہ میں واپسی ہوئی تو آتے ہی ہم سے پوچھنے لگا۔ ''آپ لوگوں میں سے آج الشیخ سے کون ملا

UUNOVELS.COM

تھا؟"

"میری ملاقات ہوئی تھی بھئی! کیوں کیا ہوا؟" میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"الشیخ نے مجھے تازہ مچھلی دی ہے۔ فرمار ہے تھے کہ یہ اس مہمان کو دے دینا جو آج میرے پاس آیا تھا۔ یہ اس کی ضیافت کے لیے ہے۔" اس اعزاز پر مجھ سمیت سبھی ساتھی انگشت بدنداں تھے۔ فقیہ نے ہمارے لیے وہ مچھلی پکائی۔ ہم سب نے بصد شوق تناول کیا اور میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ایسی عمدہ مچھلی میں نے آج تک دوبارہ نہیں کھائی۔ اسی وقت میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں دنیاداری ترک کر کے ایک نئے سرے سے زندگی کا آغاز کروں لیکن بھلا ہو اس نفس کا! یہ فیصلہ صرف وقتی ابال ہی ثابت ہوا اور سیاحت کا جنون مجھے ایک بحری سفر پر سوار کرائے فارس' اصفہان اور شیراز کی جانب ہانک کر لے گیا۔ ہر ایک علاقہ اپنی اپنی جگہ حسن و رعنائی کی مکمل مثال تھا۔ شیراز کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے کے بعد میرا اگلا پڑاؤ 'کربلا' تھا۔" ابن بطوطہ نے اختتامی الفاظ پر زور دیتے ہوئے حاضرین کی جانب دیکھا جہاں حسب توقع متغیر کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

"نواسۂ رسولؐ کی شہادت ہم سبھی کو اشکبار ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پیاس کے عالم میں ان 'بہتر' افراد کے سسکتے شب و روز ایک نہایت کٹھن تصور ہیں۔ آپ نے اس علاقہ کو مجسم اپنے سامنے کس طرح دیکھا ہوگا؟" طلحہ کے ہر ایک انداز میں نوحہ گری تھی۔

"مشکل تو تھا...... بہت ہی مشکل تھا۔ میں خواہش کے باوجود اس علاقہ کی بھرپور سیاحت نہیں کر سکا۔ بس اتنا جان لیجیے کہ ایک چھوٹا سا شہر ہے جسے چاروں اطراف سے کھجور کے درختوں نے ڈھانکا ہوا ہے۔ اسے دریائے فرات کا پانی سیراب کرتا ہے۔ شہر کے باشندے دو گروہوں میں تقسیم ہو کر قتل و غارت میں مصروف رہتے ہیں جس کے باعث اس کی ویرانی دل ہولانے لگتی ہے۔ مختصر قیام کے بعد میں نے بغداد کا رخ کر لیا۔ خلفاء کے مسکن اور علماء کے مرکز اس شہر میں داخلہ کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کی رعنائی پر آج تک جو بھی سنا تھا وہ تو اصل کا ایک ہلکا سا بھی پرتو نہیں تھا۔"

"بغداد کی ہجو میں چند ایک اشعار تو میں نے بھی سن رکھے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو آپ سب کے سامنے دہرا دوں؟" ابراہیم نے گلا کھنکار کر پوچھا اور ساتھیوں کا مثبت جواب پا کر کہنے لگا۔

"بغداد تو مالداروں اور دولت مندوں کا گھر ہے۔
مفلسوں کے لیے جائے مصیبت۔
میں اس کی گلیوں میں سراسیمہ اور پریشان پھرتا رہا۔
میری شان زندیق کے گھر میں قرآن کی سی ہے۔"

"یہ سب بھی اپنی جگہ درست۔ لیکن کیا کسی نے بغداد کی زہد شکن خواتین کے بارے میں وہ مشہور کلام نہیں سنا؟" سلیمان نے لقمہ دیا اور ساتھیوں کی رضامندی پا کر گویا ہوا۔

"ہائے بغداد اور عراق
وہ غزال رعنا' اور وہ ان کی چشم طراز
دریائے فرات کے کنارے ان کے چہرہ زیبا کی جلوہ گری۔
ہائے ان کی گردنوں کے وہ طواق جو ہلال کی طرح درخشاں تھے۔
اس نعیم (کنارہ دجلہ) میں ان کے وہ ناز و انداز جیسے عذرا کا عشق انہی کے اخلاق سے وجود میں لایا گیا۔"

ان کے مزاج میں اچانک در آنے والی یہ شوخ تبدیلی ابن بطوطہ کو کافی محظوظ کر رہی تھی۔ کچھ دیر یونہی ہنسی مذاق اور قہوے کا دور چلتا رہا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی لیکن اس کے باوجود شرکائے محفل ابھی تازہ دم ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ابن بطوطہ نے انہیں مختصراً تبریز' موصل' دیار بکر' یمن' مشرقی افریقا' حبشہ' بلاد ملمان' ہرمز' بحرین' بلاد روم ایشیائے کوچک' لاذق' قونیہ' اقصرا' اماصیہ' برکی' بروسہ' دشت قبچاق اور قرم سے وابستہ مزارات اور اہم مقامات کے متعلق بتایا۔ مزارات سے وابستہ ہستیوں کے ذکر نے محفل کا ماحول قدرے بوجھل کیا تو اس نے 'برکہ' سے وابستہ ہلکے پھلکے واقعات کا ذکر چھیڑ دیا۔

"لکڑی کے پلوں سے بنے اور انواع و اقسام کے پھلوں سے مالا مال اس شہر میں پہلی بار ہمیں زبان و بیان کی دقت محسوس ہوئی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ شہر کی سیاحت کے بعد ایک روز ہم ایک گاؤں میں شب بسری کے لیے پہنچ گئے۔ الاخیہ نامی اس زاویہ میں رہائش کے لیے ہم نے منتظم سے عربی زبان میں بات چیت کا آغاز کیا۔ اسے عربی زبان سے واقفیت نہ تھی۔ وہ ہمیں اپنا مدعا ترکی میں سمجھانے پر مصر تھا۔ تھک ہار کر ایک فقیہ کو طلب کر لیا گیا۔ اس سے گفتگو کے بعد ہمیں فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ مقامی لوگوں کے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

سامنے صرف ایک بھرم قائم رکھے ہوئے ہے۔اسے عربی سے بالکل واقفیت نہیں ہے۔اب منتظم اور دیگر افراد بڑی پُرتجسس نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے کہ وہ مہمانوں کا مطالبہ یا مدعا بیان کرے لیکن اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ نے تو ہمیں ششدر ہی کر دیا۔کیا اعلیٰ دماغ پایا تھا اس نے۔اپنا بھرم برقرار رکھنے کے لیے اس نے ایک ہی جھٹکے میں صورت حال کی کایا پلٹ دی۔''

''آخاہ......ایسا کیا کہہ دیا اس نے؟ کہیں آپ پر کوئی الزام تراشی یا من گھڑت بات تو منسوب نہیں کر دی؟'' ابراہیم نے سبھی حاضرین کے دلوں میں مچلتے سوالوں کو گویائی دی۔

ابن بطوطہ معنی خیزی سے مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''اس نے بھرپور اعتماد سے وہاں موجود مقامی افراد سے کہا۔ ایشان عربی کہنہ میتوان (میگویند) ومن عربی نومیدانم۔(یہ قدیم عربی میں گفتگو کرتے ہیں جبکہ میں جدید عربی سے واقف ہوں۔) اتنا کہہ کر وہ تو اطمینان سے چلتا بنا لیکن مقامی افراد بڑے مثبت انداز میں ہماری جانب متوجہ ہو گئے۔ہمیں سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ بار بار ایک ہی فقرہ دہرا کر ہمارے سامنے کیوں بچھے جا رہے ہیں۔اس فقرہ کی تکرار اس قدر ہوئی کہ ہم سبھی کے ذہن میں نقش ہو گیا۔ روانگی کے بعد اگلے پڑاؤ میں کسی شخص سے اس کا مطلب پوچھا تو علم ہوا کہ وہ لوگ ہمیں قدیم عربی سے واقفیت کی وجہ سے نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے عہد سے منسوب کر کے خدمت کو اپنی سعادت سمجھ رہے تھے۔یہ سن کر میرا ایک ساتھی کف افسوس ملتے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے وہاں ایک مقامی کی بیٹی بہت بھائی تھی۔اگر بروقت علم ہو جاتا کہ وہ ہمارے سامنے کیوں بچھ رہے ہیں تو میں لڑکی کا ہاتھ تھامنے میں ایک پل نہ لگاتا۔ہائے افسوس!'' اس کے بال نوچنے اور اظہار ملال کے انداز پر ہمارے قہقہے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔برکہ میں قیام کے دوران ایک اور دلچسپ واقعہ بھلائے نہیں بھولتا۔ہوا کچھ یوں تھا کہ ہمیں چوپایوں کے لیے گھاس اور کھانا بنانے کے لیے گھی کی ضرورت تھی۔ہم نے دو خادموں کو اس خریداری کے لیے روانہ کر دیا۔ایک تو گھاس لیے واپس آ گیا جبکہ دوسرا خالی ہاتھ ہی لوٹا۔دوبارہ بھیجنے پر وہ بھی گھاس تھامے چلا آیا۔ہم سبھی اس کی عقل پر حیران تھے کہ کھانا گھاس میں کیسے پکائیں گے۔ہمارا ایک ساتھی اس کے ہمراہ دوبارہ بازار گیا تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئے واپس آیا اور بتانے لگا کہ بازار بھر میں پھرنے اور ہر جگہ سے گھاس ہی ملنے کے بعد یہ عقدہ کھلا تھا کہ مقامی لوگ گھاس کو سمن (گھی) اور گھی کو اصل میں روغان کہتے ہیں۔''

اس نے ایک توقف کیا اور پھر کسی فوری خیال کے تحت کہنے لگا۔

''آپ لوگوں کو علم ہے کہ ایک بار میں دروں کی سزا پاتے بال بال بچا تھا۔'' اس کے ڈرامائی انداز پر سبھی چونک گئے۔ان کے چہروں پر بہت بڑے سوالیہ نشان واضح نظر آنے لگے۔

''ان دنوں میں خوارزم میں تھا۔ویسے تو اہل خوارزم سے زیادہ نفیس مہمان نواز اور شفیق افراد میں نے کہیں نہیں دیکھے لیکن ان میں ایک خوبی ایسی ضرور ہے جو دیگر علاقوں سے ممتاز تر کرتی ہے۔اذان ہوتے ہی امام اپنے پڑوس کے سبھی گھروں میں نماز کے لیے آمد کا پیغام بھجوا دیتا ہے۔اگر کوئی اس کی طلبی کو سنجیدہ نہ لے تو وہ خصوصی طور پر مسجد میں رکھے ایک درہ سے انہیں پیٹ ڈالتا ہے۔'' اس نئے انکشاف اور ابن بطوطہ کی اس وقت کی حالت کا تصور حاضرین کے دل لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔وہ ابھی اسی سزا کے مضمرات میں کھوئے تھے کہ فضا میں اذان فجر کی روح پرور صدائیں گونج اٹھیں۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہ محفل برخاست کر کے رب کے حضور حاضری دینی چاہیے۔'' داؤد نے بلا تامل کہا۔

''جی ہاں! اگر محترم قاضی کو اعتراض نہ ہو تو ہم کل اس محفل کے سلسلے کا آغاز یہیں سے دوبارہ کریں گے۔'' عبداللہ کے انداز میں تشنگی نمایاں تھی۔

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے برادرم! میں تو ذاتی طور پر آپ سب کی آمد اور سیاحت میں اس دلچسپی پر بہت خوش ہوا ہوں۔'' اس نے خلوص سے کہا۔

مہمان الوداعی معانقہ کے بعد یکے بعد دیگرے رخصت ہوئے تو اس نے بھی خشوع وخضوع سے نماز فجر ادا کی اور بستر پر لیٹتے ہی ایک بار پھر اپنے ماضی کی انہی بھول بھلیوں میں الجھ گیا۔اس نے مہمانوں کو اپنے حالات زندگی اور مختلف علاقوں میں سفر کے متعلق تو مکمل تفصیل سے بتایا تھا لیکن ایک پہلو پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی تھی۔اپنی اس جہاں گردی کے دوران اس نے بہت شادیاں کی تھیں۔جب بھاری ہونے کی صورت میں کئی ایک لونڈیوں سے بھی دل

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

بہلایا تھا' ان سے جسمانی تعلقات قائم کیے تھے۔ زوجین کے معاملہ میں وہ کبھی کسی تنگی کا شکار نہیں ہوا۔ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی صورت میں وہ بلاتامل انہیں اپنے رشتے سے آزاد کر دیتا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس لمحہ رنگین و سنگین زندگی کا کوئی بھی پل یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کی بجائے اسے شہر نخشب میں بسر کیے گئے وہ مختصر ایام یاد آ رہے تھے جب اس کی ایک اہلیہ دردِ زہ میں مبتلا ہوئی تھی۔ ابن بطوطہ کو جانے کیوں کامل یقین تھا کہ اس کے ہاں اولادِ نرینہ ہی جنم لے گی۔ قدرت کے کاموں میں کسے دخل حاصل ہے؟ اسے جب یہ علم ہوا کہ نوزائیدہ لڑکی ہے تو اولین ردِ عمل کے طور پر وہ دل مسوس کر رہ گیا تھا لیکن کچھ ہی روز میں اسے اپنی بیٹی سے اس قدر محبت ہو گئی کہ وہ خود بھی حیران تھا۔ بیٹی کی پیدائش اس کے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔ حالات حیران کن انداز میں اس کے موافق ہونے لگے' ہر ایک معاملہ میں خوشی و سرشاری محسوس ہونے لگی۔ وہ اسے بانہوں کے جھولے میں جھلاتا' اپنی ذات کی تکمیل پر شکرانہ بجا لاتا لیکن تقدیر کے ایک کاری وار سے واقف ہی نہ تھا۔ بیٹی دو ماہ کے بعد وفات پا گئی۔ اس ستم ظریفی پر وہ بلک کر رو دیا تھا مگر جانے والے واپس آتے ہی کب ہیں۔

بستر پر لیٹے ابن بطوطہ کے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ آج اگر وہ بچی زندہ ہوتی تو اس کی شادی ہو گئی ہوتی یا شاید شادی کی تیاری کی جا رہی ہوتی۔ عبداللہ یا ابراہیم جیسا ہی کوئی مؤدب' صالح اور خوش رو نوجوان اس کا داماد بن جاتا۔ بعد میں آنگن میں بچوں کی صورت کھلے پھول زندگی میں مزید مہک پیدا کر دیتے۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو گرے اور خاموشی سے تکیہ میں جذب ہو گئے۔

''پروردگار! ہمیں اپنی رضا میں راضی رہنے کا طریقہ سکھا دے۔ ایسے حوادث اور المیوں سے محفوظ رکھ کے اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمانا۔ اولاد کا دکھ ایک دائمی روگ بن جایا کرتا ہے۔'' نیند کی آغوش میں جانے سے قبل اس کے دل سے یہی صدائیں برآمد ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز مہمان سرِ شام ہی چلے آئے۔ اس بار بھی تین مزید افراد ان کے ہمراہ تھے۔ ان نئے مہمانوں کے چہرے بھی خوشی اور جوش سے چمک رہے تھے۔

''کیا بات ہے محترم؟ آج آپ کی طبیعت کچھ بوجھل اور نڈھال محسوس ہو رہی ہے۔'' طلحہ نے چونک کر دریافت کیا۔ ''کہیں ہماری آمد آپ کو گراں تو نہیں گزری؟''

''ایسی بات کہہ کر مجھے شرمندہ تو نہ کیجیے۔'' وہ مضبوطی سے بولا۔ ''طبیعت میں اتار چڑھاؤ تو اب ایک فطری بات ہے۔ عمر کے اس حصہ میں پہلے جیسی چستی اور توانائی تو سلامت نہیں رہ سکتی ناں۔''

''بجا فرمایا! لیکن اگر آپ کی طبیعت میں گرانی ہے تو ہم یہ محفل ملتوی کیے دیتے ہیں۔'' ابراہیم نے شائستگی سے کہا۔ اس کی فکر اور اظہارِ تشویش پر وہ ایک بار پھر گذشتہ رات کے جذبات میں مبتلا ہو گیا تاہم اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے میرے عزیز! ہم آج بھی اس محفل سے بھرپور لطف اندوز ہوں گے۔'' اس نے یقین دہانی کروائی۔ اسی اثناء میں خادم مہمانوں کے لیے قہوہ لیے چلا آیا۔ خوش گپیوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

''قسطنطنیہ' یلغار' تاتار' بخارا' سمرقند' ترمذ' خراسان' بلخ' ہرات' جام' طوس' مشہد مقدس' نیشاپور اور بسطام شریف کے علاقوں کی خاک چھانتے مجھے چنگیز خان کی برپا کردہ تباہی کے آثار بھی جابجا نظر آئے تھے۔ اس نے مساجد کی بے حرمتی کی انتہا کر رکھی تھی۔ خزانوں کی تلاش میں مسجد کا ایک ایک ستون اکھاڑ کر زمین کھدواتا رہا۔ مخالفین کو جسمانی اعضاء سے محروم کر کے وہ اعضاء تیل کی گرم کڑاہیوں میں بھونتا رہا۔ بچوں اور جوانوں کو نیزوں پر اچھالنے اور خواتین کی عصمت دری کے مناظر دہراتے مقامی افراد خون کے آنسو روتے تھے۔ اس تباہی و بربادی پر بوجھل دل لیے کوہ ہندوکش کی جانب کوچ کر گئے۔ یہاں قیام قدرے طویل ثابت ہوا تھا۔ اس پہاڑ کے نام کا مطلب 'قاتل الہنود' تھا۔ سخت سردی اور برفباری سیاحوں کے لیے ہی نہیں بلکہ مقامی افراد کے لیے بھی مہلک ثابت ہوا کرتی تھی۔ ہم نے سرما میں سفر سے گریز ہی کیا اور گرما آتے ہی کوچ کر لیا۔ یہ خطہ اب تک کے علاقوں میں سب سے منفرد محسوس ہو رہا تھا۔ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہاں پیش آنے والے حالات بہت یادگار اور کسی حد تک ہولناک بھی ہوں گے۔ میں نے اپنے اس خدشہ کا ذکر ساتھیوں سے بھی کیا لیکن انہوں نے بات ہنسی میں ٹال دی۔ وہ گمان کر رہے تھے کہ شاید میں اس سیاحت اور طویل سفر سے تھکاوٹ کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں

نے ان سے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی کیونکہ مجھے علم تھا کہ آنے والا وقت میرے خدشات کی سچائی خود بخود ثابت کردے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ہندوکش پر چڑھائی کے دوران ہمیں ایک چشمہ ملا۔ ساتھیوں کے لیے اس چشمہ کی دید ہی بہت سکون بخش تھی۔ ہم سب نے اس چشمہ کے پانی سے منہ ہاتھ دھونے کا آغاز کردیا اور اگلے ہی لمحہ ہندوکش کی فضا میں ہماری چیخ و پکار سے گونج اٹھی تھیں۔''

''ارے! ایسا کیا تھا اس چشمہ میں؟'' داؤد نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''وہ گرم پانی کا چشمہ تھا بھئی!'' ابن بطوطہ ہنسا۔

''ہماری کھال کافی جل گئی تھی۔ یہ بے احتیاطی ہمیں اگلے کئی روز کے لیے بہت مہنگی پڑی۔ سوختہ کھال اور آبلے شدید اذیت دے رہے تھے۔ خیر! اس حادثہ کا ایک فائدہ یہ ہوگیا تھا کہ ساتھیوں نے بے احتیاطی بالکل ترک کردی۔ کوہ ہندوکش کی مسافت طے کرکے ہم غزنہ اور پھر کابل تک چلے آئے۔ یہاں بھی ایک بہت زبردست پہاڑ تھا۔ 'کوہ سلیمان' نامی اس پہاڑ کے بارے میں روایت بھی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس پہاڑ پر چڑھ کر 'ہند' کی جانب دیکھا تھا۔ وہ سرزمین اس وقت تاریک تھی۔ اسی تاریکی کے باعث وہ اس کی جانب مزید بڑھنے کی بجائے واپس لوٹ آئے اور انہی کے نام کی مناسبت سے اس پہاڑ کا نام کوہ سلیمان رکھا گیا تھا۔ اس سفر میں ہمیں افغانی رہزنوں کے خطرات بھی درپیش رہے۔ ان پر تیراندازی کرکے بدقت اپنے جان و مال کی حفاظت کر پائے تھے۔ ان خطروں سے بچتے ہم شہر کرماش کی بادسموم کا شکار ہوگئے۔ یہ ہوا ایسی قاتل ہے کہ انسانی جسموں میں عفونت پیدا کرنے لگتی ہے۔ یہاں ہمارے بہت سے مویشی بیمار اور ناکارہ ہوگئے۔ سفر کی یہ صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے ہم بالآخر صحیح و سالم 'پنجاب' پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس یادگار مقام تک آتے ہوئے میں نے تقریباً 'تین سو سات' شہروں کی سیاحت کرلی تھی لیکن ایسا ماحول اور آب و ہوا مجھے کہیں اور نہیں ملی تھی۔''

''کیا یہ بات حقیقت ہے کہ پنجاب درحقیقت پانچ دریاؤں کی سرزمین ہونے کے باعث اس نام سے پکارا جاتا ہے؟'' طلحہ کے انداز میں اس انجانی سرزمین کے لیے بے پناہ تجسس اور ان دیکھا سحر تھا۔

''بالکل! اس وقت یہ نکتہ مجھے بھی بہت حیران کیے ہوئے تھا۔ اسی وجہ سے اس سرزمین کی کشش بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ اسی شب ہم نے محرم 734ھ (بمطابق 1333عیسوی) کا چاند دیکھا۔ ان دنوں ہند پر سلطان محمد شاہ تغلق کی حکمرانی تھی۔ سوئے اتفاق اس سلطان سے میں حرم شریف میں قیام کے دوران مل چکا تھا۔ اچھا شخص تھا۔ ہمارے پنجاب میں داخلہ کے ساتھ ہی سلطان کے پرچہ نویس ہمارے پاس چلے آئے اور ضروری معلومات حاصل کرکے آمد کی خبر حاکم ملتان قطب الملک کے پاس بھیج دی۔ پرچہ نویس ہر مسافر کا حال تفصیل وار لکھتے ہیں۔ صورت' وضع قطع' لباس' خادم' ہمراہی' جانور' حرکات و سکنات سمیت کوئی بھی معمولی بات نظرانداز نہیں کی جاتی۔''

''لیکن ان مختلف شہروں میں تو فاصلہ بھی سینکڑوں' ہزاروں میل ہوگا۔ اس صورت میں ڈاک کا یہ نظام کیسے مؤثر ہوتا ہوگا؟'' ابراہیم حیران تھا۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی برادرم! ان کا ڈاک کا نظام بہت متاثر کن تھا۔ جب ہم سندھ پہنچے تو امیر شہر سیوستان میں مقیم تھا۔ سیوستان سے ملتان کی مسافت دس روزہ ہے۔ ملتان سے دارالخلافہ دہلی تک پہنچنے میں پچاس دن درکار ہوتے ہیں۔ ڈاک پہنچانے کا نظام اس قدر برق رفتار ہے کہ محض پانچ دن میں ہرکارے بادشاہ کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ ڈاک کو اس ملک میں 'برید' کہا جاتا ہے۔ اس کی مزید دو شاخیں ہیں۔ پیادوں اور گھوڑوں کی ڈاک (اولاق)۔ ہر چار کوس کے بعد گھوڑا تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ گھوڑے درحقیقت بادشاہ کی طرف سے متعین کیے جاتے ہیں۔ پیادوں کی ڈاک کا یہ انتظام ہوتا ہے کہ ایک میل میں ہرکاروں کی تین چوکیاں (داوہ) ہوتی ہیں۔ تہائی میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہرکاروں کے لیے برجیاں بنی ہوتی ہیں۔ ہر برجی میں ہرکارے تیار اور مستعد بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہرکارے کے پاس ایک دو گز لمبی چھڑی ہوتی ہے جس کے سرے پر تانبے کے گھنگرو بندھے ہوتے ہیں۔ ڈاک چلتی ہے تو ہرکارہ ایک ہاتھ پر وہ پیغام پکڑ لیتا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں چھڑی لیے وہ پوری قوت سے دوڑنے لگتا ہے۔ اگلا ہرکارہ فاصلے سے ہی گھنگروؤں کی آواز سن کر مستعد ہو جاتا ہے اور اس سے ڈاک لے کر برق رفتاری سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح فوری طور پر خط اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ خراسان کے میوے بھی اسی طرح بادشاہ تک پہنچائے جاتے ہیں۔ سنگین مجرموں کی دارالخلافہ منتقلی بھی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ایسے ہی پار ۔ ک کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ ہماری آمد کی اطلاع بھی اسی طرح ملتان پہنچ چکی تھی۔ اب وہاں کے دستور کے مطابق بادشاہ کی جانب سے حکم روانگی تک ہمیں وہیں قیام کرنا تھا۔ انہی دنوں مجھے ایک انوکھے رواج کا علم ہوا۔ وہاں جو بھی مسافر بادشاہ کو سلام کے لیے جاتا ہے اپنے ہمراہ ہدایا لازماً رکھتا ہے۔ یہ ہدیے وصول کر کے بادشاہ اپنی شان و شوکت کے مطابق نووارد کو تحائف اور انعام و کرام سے نواز دیتا ہے۔ سندھ میں تاجروں کی اکثریت نے یہ پیشہ اختیار کر رکھا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو ہزاروں دینار بطور قرض دینے کے ساتھ خادموں، گھوڑوں اور سواری کا بندوبست بھی کر دیتے ہیں اور خود چاکروں کے روپ میں ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ نووارد جب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو اسے انعام و کرام سے مالا مال کر دیا جاتا ہے۔ واپس آ کر وہ سارا قرضہ بے باق کر دیتے ہیں۔ اس طرح تاجر بھی بہت نفع حاصل کرتے ہیں۔''

''تو کیا آپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟'' عبداللہ کی ہنسی ضبط ہی نہ ہو رہی تھی۔

''ہاں تو اور کیا؟'' ابن بطوطہ نے کھسیا کر کہا۔ ''میں نے عراق کے ایک سوداگر محمد دوری سے تیس گھوڑے اور تیروں کا پھل بردار ایک اونٹ خرید لیا۔ بعد ازاں مجھ سے قرض وصول کر کے وہ سوداگر اچھا خاصہ تاجر بن گیا تھا۔''

''مجھے تو یہ خطہ کوئی جادوئی نگری محسوس ہو رہا ہے۔ ہر نیا انکشاف پہلے سے بڑھ کر ہی ہوتا ہے۔'' سلیمان نے جھرجھری لی۔

''میری بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''ایسا لگ رہا تھا کہ زندگی نے یکدم ہی کوئی پلٹا کھا لیا ہے۔ ہر منظر اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلے سے زیادہ دلکش یا ہولناک دکھائی دیتا تھا۔ اب اس روز کی بات ہی سن لو جب ہم نہر سندھ عبور کر کے ایک بانس کے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں ایک عجیب الخلقت جانور نظر آیا۔ سیاہ رنگت، بھاری بھرکم ڈیل ڈول، سر کسی ہاتھی کے سر سے بھی بڑا اور دونوں آنکھوں کے برابر فاصلے پر پیشانی پر ایک سینگ۔ اس سینگ کا طول تین ہاتھ اور موٹائی ایک بالشت ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے علم ہوا کہ اسے گینڈا کہتے ہیں اور ہندوستان میں کسی شخص پر اس کے موٹاپے کے باعث طنز کرنا ہو تو اسے اسی جانور سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس گینڈا کے سامنے ایک سوار آ گیا۔ گینڈے نے گھوڑے کو سینگ مارا اور سوار کی ران چیر کر اسے بھی زمین پر گرا دیا۔ کسی کے کوئی بھی ہتھیار استعمال کرنے سے قبل ہی وہ بھاگ کر جنگل میں روپوش ہو گیا۔ دو منزل چلنے کے بعد ہم 'جنانی' شہر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ وسیع اور خوبصورت شہر دریائے سندھ کے کنارے ہی واقع ہے۔ اس کے بارے میں مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہاں آباد سامرہ (سومرو) قوم کے افراد حجاج بن یوسف کے سندھ فتح کرنے کے وقت سے ہی آباد ہیں۔ کچھ عرصہ بعد جب میری ملاقات شیخ برہان الدین اعرج کے مذکور 'شیخ رکن الدین' سے ہوئی تو انہوں نے بھی انکشاف کیا کہ ان کے جد اعلیٰ بھی محمد بن قاسم کے اس فاتح لشکر میں شامل تھا جو حجاج نے عراق سے بھیجا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ سامرہ قوم کے افراد کسی کے ساتھ رشتہ داری میں منسلک ہونا تو درکنار ان کے ہمراہ کھانا بھی نہیں کھاتے۔ ان عجیب و غریب رسومات اور حالات و واقعات سے آشنا ہوتے ہوئے ہمارا قافلہ سندھ کی قدیم بندرگاہ لاہری، بھکر، اوچ، ملتان کی سیاحت کرتے ہوئے قطب الملک کے پاس پہنچ گئے۔ اس کے پاس آمد بھی ایک یادگار تجربہ تھی۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم شہر میں شیخ رکن سید قریشی کے متعلقین کے ساتھ قیام کریں۔ ان کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ حاکم کی اجازت کے بغیر کسی کو اپنے پاس بطور مہمان ٹھہرنے ہی نہ دیتے تھے۔ اس شہر میں کئی ایسے بزرگ بھی موجود تھے جو بادشاہ کی ملازمت کے لیے دہلی جا رہے تھے۔ بادشاہ کا بھی حکم تھا کہ اگر کوئی شخص خراسان کی طرف سے آئے اور اس کا ارادہ اس ملک میں قیام کا ہو تو اس کو آگے نہ آنے دیں۔ جب میں نے اپنے قیام کے متعلق ارادہ ظاہر کیا تو قاضی اور گواہ طلب کر لیے گئے۔ اس کے بعد ایک عہد نامہ پر میرے دستخط بھی کروائے گئے۔ اسی اجازت نامہ کے بعد میں نے ملتان سے دہلی کی جانب سفر کی تیاری شروع کر دی۔ ملتان سے روانگی کے بعد پہلا پڑاؤ 'ابوہر' میں تھا۔ ابوہر سے چل کر ہمارا گزر ایک صحرا میں ہوا جس کی مسافت صرف ایک روز کی ہی ہے۔ اس کے کناروں پر بلند و بالا پہاڑ تھے۔ ان دشوار گزار پہاڑوں میں ہندو رہائش پذیر ہیں۔ ان کی اکثریت رہزنی سے وابستہ ہوتی ہے۔ ہندوؤں میں سے زیادہ تناسب رعیت میں شمار ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ کی حمایت میں دیہات میں بس جایا کرتے ہیں۔ ان

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کا حاکم مسلمان ہی ہوا کرتا ہے۔ اس حاکم کا افسر عامل یا جاگیردار ہوتا ہے جس کی جاگیر میں متعلقہ شہر یا گاؤں ہوتا ہے۔ اکثر ہندو نافرمان ہوتے ہیں۔ وہ بادشاہ سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان کی رہائش پہاڑوں میں اور پیشہ رہزنی ہی ہوا کرتا ہے۔ ابوہر سے چلتے وقت ہمارا آدھا قافلہ صبح ہی نکل گیا۔ مجھے اور چند ساتھیوں کو البتہ کچھ تاخیر ہوگئی۔ ہم لوگ دوپہر کے بعد وہاں سے روانہ ہو سکے۔ ہماری تعداد محض بائیس تھی۔ تھوڑا آگے بڑھتے ہی لگ بھگ اسی ہندوؤں نے ہم پر دھاوا بول دیا۔ حسن اتفاق میرے ہمراہی اچھے اور بہادر جوان تھے۔ خوب کانٹے دار مقابلہ ہوا۔ ہم نے بارہ آدمیوں اور ایک سوار کو ٹھکانے لگایا۔ اس مقابلہ میں مجھے اور میرے گھوڑے کو بھی تیر کے زخم آئے لیکن قدرت کی مہربانی سے زیادہ نقصان نہ اٹھانا پڑا کیونکہ ان کے تیر بہت کمزور ہوا کرتے تھے۔ ہمارا ایک گھوڑا کافی زخمی ہوگیا تھا۔ ہم نے اپنے ساتھی کو مقتول رہزن کا گھوڑا تھمایا اور خود زخمی گھوڑے کو ذبح کرلیا۔ ہمارے قافلے میں شامل ترکوں نے اسے کھانے میں بالکل تاخیر نہ کی۔ اس مقابلہ کے بعد ہم ذہنی طور پر سفاکی اور بے حسی کی ایسی سطح پر آگئے تھے کہ ہمیں مقتولین کے سر کاٹ کر ابی بکھر کے قلعہ میں لے جانے کے بعد فصیل پر لٹکا دینے میں بھی کوئی تامل محسوس نہ ہوا۔ ابی بکھر پہنچنے کے دو روز بعد ہم 'اجودھن' میں داخل ہو گئے۔''

''اجودھن وہی جگہ ہے ناں محترم جہاں فریدالدین گنج شکر نامی بزرگ رہتے تھے۔ میں نے ایک اور روایت سنی تھی کہ وہ دریا کے کنارے وضو کر رہے تھے۔ کسی نے آکر کہا کہ یہ جگہ پاک نہیں ہے۔ جواب میں وہ فرمانے لگے کہ نہیں یہ پتن پاک ہے۔ اس کے بعد اس جگہ کا نام پاک پتن مشہور ہوگیا۔ کچھ ایسا ہی تھا ناں؟ میں نے کسی دوست سے شاید سنا تھا۔'' داؤد نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں! ایسا ہی تھا۔ پنجاب کے بہت نامور صوفی شاعر گزرے ہیں۔ اجودھن ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ وہاں میری ملاقات ان کے دونوں بیٹوں علم الدین اور معزالدین سے ہوئی تھی۔ بہت عالم و فاضل تھے۔ اس روح پرور ملاقات کے بعد جب میں آگے بڑھا تو ایک ایسا سانحہ دیکھا کہ میری روح بلک اٹھی۔ مجھے آج بھی اس کی ہولناکی فراموش نہیں ہو سکی ہے۔'' وہ دہل کر لمحاتی طور پر خاموش ہو گیا۔ حاضرین کے چہروں پر اس کی یہ حالت دیکھ کر الجھن، سراسیمگی اور تجسس ابھر آیا تھا۔ ابن بطوطہ نے جھرجھری لیتے ہوئے سلسلہ کلام کا دوبارہ آغاز کیا۔

''شیخ صاحب کی زیارت سے واپس آتے ہوئے مجھے کچھ آدمی اپنی خیمہ گاہ کی جانب سے بھاگتے ہوئے آتے نظر آئے۔ ان میں سے چند افراد میرے ہی قافلے سے تھے۔ میں نے تشویش سے ماجرا دریافت کیا تو بتانے لگے کہ ایک ہندو کی وفات ہوگئی ہے۔ مذہبی روایات کے مطابق اس کی چتا تیار کر کے بیوی کو بھی ساتھ ہی زندہ جلا دیا گیا ہے۔ اس وقت تو اس خبر نے مجھ پر زیادہ اثر نہ کیا۔ میرے لیے یہ رسم صرف ایک مذہبی روایت کی خبر تھی۔ مجھے کیا علم تھا کہ اگلے چند روز میں ایک ایسے ہی دلخراش منظر کا چشم دید گواہ بن جاؤں گا۔ ان دنوں میں 'ابرہی' نامی ایک ایسے شہر میں تھا جہاں اکثریت ہندو آبادی کی تھی۔ اس کا حاکم سامرہ قوم کا مسلمان تھا۔ ابرہی کے نواح میں نافرمان ہندو رہائش پذیر تھے۔ ایک دفعہ ان کی رہزنی پر امیر نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کی سرکوبی کی۔ اس سخت جھڑپ میں سات ہندو مارے گئے جن میں سے تین شادی شدہ تھے۔ ان تینوں کی بیواؤں نے ستی ہونے کا ارادہ کرلیا۔''

''کیا ہندوستان میں ستی ہونا واجب ہے؟'' ابراہیم نے اپنے ذہن میں پنپتی الجھن بیان کی۔

''نہیں! لیکن جو خواتین یہ فیصلہ کرتی ہیں ان کا خاندان بے حد معزز اور خود انہیں وفادار شمار کیا جاتا ہے۔ جن خواتین کا فیصلہ متضاد ہوتا ہے انہیں بعدازاں بہت خوار زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ موٹے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ ان کی پیشانی پر داغ 'بدچلنی' کا جھومر سج جاتا ہے۔ ان تین بیواؤں نے پہلے تین دن کی رسومات ادا کیں۔ گانے بجانے اور کھانے میں مشغول ہوئیں۔ ان کی زیارت کے لیے ہر جانب سے مختلف خواتین آیا کرتی تھیں۔ چوتھے روز ان تینوں کے پاس ایک ایک گھوڑا لائے اور انہیں بناؤ سنگھار کے بعد خوشبوؤں میں بسا کر گھوڑے پر سوار کر دیا گیا۔ ان کے دائیں ہاتھ میں ناریل تھا جس کو مخصوص انداز میں اچھال رہی تھیں۔ بائیں ہاتھ میں البتہ ایک آئینہ تھا جس میں وہ اپنا چہرہ دیکھتی جاتیں۔ ان کے اردگرد برہمن جمع تھے۔ رشتہ دار بھی اسی قافلے کے ہمراہ تھے۔ قافلہ سے آگے نوبت اور نقارے بج رہے تھے۔ ہر ایک ہندو انہیں فرداً فرداً مخاطب ہو کر کہتا کہ میرے ماں باپ، بھائی یا فلاں دوست کو میرا اسلام کہنا۔ وہ ہنستے ہوئے ایسا کرنے کی ہامی

UUNOVELS.COM

بھر لیتیں۔ میں بھی اپنے چند دوستوں کے ساتھ اس قافلہ کا ہمراہی تھا۔ چلتے چلتے تین کوس کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں پانی بکثرت تھا۔ درختوں کی بھرمار بھی ایسی کہ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس مقام کے وسط میں چار گنبد تھے۔ ہر گنبد میں ایک ایک بت تھا۔ گنبد کے وسط میں پانی کا حوض بھی تھا جس پر درختوں کے سائے کی وجہ سے دھوپ نہیں پڑتی تھی۔ وہ عورتیں ان گنبدوں کے پاس پہنچ کر حوض میں غسل کے لیے غوطے لگانے لگیں۔ انہوں نے اپنے کپڑے اور زیورات پہلے ہی اتار کر خیرات کر دیے تھے۔ ایک موٹی ساڑی پہن لی۔ حوض کے پاس ایک نشیبی جگہ پر آگ دہکائی جانے لگی۔ کچھ لمحوں بعد جب اس پر سرسوں کا تیل ڈالا گیا تو شعلے بھنکارنے لگے۔ وہاں موجود پندرہ آدمیوں کے ہاتھوں میں گٹھے بندھے تھے جبکہ دس آدمیوں نے لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے تھام رکھے تھے۔ نقارہ اور نفیری والے بیوہ کے منتظر تھے۔ آگ کو ایک رضائی کی اوٹ میں کر لیا گیا تھا تاکہ عورت کی نظر اس پر نہ پڑ سکے لیکن ان میں سے ایک خاتون اس قدر ہیجان زدہ تھی کہ لوگوں کے ہاتھ سے جبراً رضائی چھینتے ہوئے کہنے لگی کہ اسے کیوں چھپاتے ہو؟ مجھے کیا علم نہیں کہ یہ آگ ہے۔ اس نے آگ کی طرف ڈنڈوت کی اور خود کو اس آتش میں جھونک دیا۔ اسی لمحہ فضا نقاروں اور نفیری کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہاں موجود لوگوں نے ہاتھوں میں تھامیں پتلی لکڑیاں آگ میں ڈال کر اس کے اوپر بڑے بڑے کندے ڈال دیے تاکہ عورت حرکت بھی نہ کر سکے۔ حاضرین کا شور اور نعرے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے آگ کے شعلوں کو کسی اژدہے کی طرح ایک نرم و نازک وجود سے لپٹے اور نگلتے دیکھ رہا تھا۔ انسانی گوشت کی چراند اور موت کی مجسم ہیبت میرے اعصاب پر اس قدر سوار ہوئی کہ میں چکرا کر گھوڑے سے گرا اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔''

اس کی کیفیت نے بھی افراد کو گنگ کر دیا۔ کئی لمحے یونہی خاموشی سے بیت گئے۔ بالآخر سلیمان نے یہ سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ''الحمدللہ...... الحمدللہ...... لاکھوں کروڑوں مرتبہ الحمدللہ......ہم سے بڑھ کر کوئی بھی خوش نصیب نہ ہوگا کہ پروردگار نے ہمیں مسلمان پیدا کیا۔ اس مذہب سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ پروردگار کی ذات سے ارفع کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ ایک جذب کے عالم میں کہتا چلا گیا۔

''بے شک میرے عزیز! بے شک! اور یقین جانیے سرزمین ہند پر پیش آنے والے کئی واقعات نے میرا ایمان پہلے سے کئی گنا مضبوط کر دیا تھا۔ اب دہلی کی مثال ہی لے لیں۔ اس خوبصورت شہر میں اولیائے کرام کے مزارات نے واردات قلبی تبدیل کرنی شروع کر دی۔ حضرت بختیار الدین کاکی' نور الدین کرمانی زندہ ہستیوں میں شیخ محمود' شیخ علاؤ الدین' امام صالح سے ملاقات ناقابل فراموش تجربات تھے۔ دہلی میں مسلم حکمرانوں نے عظیم الشان روایات چھوڑی ہیں۔ قطب الدین ایبک' سلطان شمس الدین التمش' سلطان رکن الدین' سلطانہ رضیہ' سلطان ناصر الدین' سلطان غیاث الدین بلبن' سلطان معز الدین کیقباد' جلال الدین فیروز خلجی' سلطان علاؤ الدین خلجی' سلطان شہاب الدین خلجی' سلطان قطب الدین خلجی' خسرو خان' سلطان غیاث الدین تغلق کے کارناموں سے تاریخ ہند اٹی پڑی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے قیام دہلی کے دوران 'سلطان محمد شاہ تغلق' کی حکومت تھی۔ اس شخص کے متعلق میں آج تک کوئی ایک رائے قائم نہیں کر سکا۔ دہلی قیام کے دوران ایک جانب میں نے اسے انسانیت نواز' غریب پرور' سخی' فیاض' رحمدل' دین دار اور جود و کرم میں یکتا پایا تو دوسری سمت اس کے شکنجہ انتقام' بے دریغ قتل' پھانسی کی کوٹھریوں کی نت نئی سزائیں اور جائیداد و املاک ضبط کرتے بھی کئی بار دیکھا۔ اس کے خلاف ہونے والی شورشوں' بغاوتوں اور ہنگاموں کا بھی عینی شاہد ہوں۔ دارالخلافہ دہلی میں میری حیثیت شاہی مہمان کی سی تھی۔ دربار میں پہنچنے کے اگلے روز وزیر نے مجھے ایک ریشمی خلعت اور ہزار ہزار دینار کی دو تھیلیاں دے دیں۔ ان دنوں بادشاہ دہلی میں موجود نہ تھا۔ مجھے وہاں قیام کیے ڈیڑھ ماہ ہی گزرا تھا کہ میری ایک سالہ بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ اپنی دوسری اولاد سے محرومی کا وہ دکھ آج بھی میرے سینے کا رستا ناسور ہے۔ بوجھل دل اور اشکوں کی برسات میں بیٹی کی تدفین کر کے لوٹا تو علم ہوا کہ 'مادر شاہ' نے محل سے سب کے لیے کھانا بھیجا ہے۔ میں نے کافی اشیاء غریبوں میں تقسیم کر دیں لیکن اس کے باوجود روٹیاں' حلوا' شکر اور مصری بچ گئی۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے میرے لیے جاگیر میں کچھ ایسے گاؤں مقرر کرنے کا حکم صادر کر دیا جن کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار دینار ہو۔ اس کے علاوہ وزیر نے لوٹ میں آئی کافر

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

عورتوں میں سے میرے لیے بھی دس لونڈیاں بھیجیں۔ میں نے ایک لونڈی لانے والے کو بخش دی۔ تین عدد میرے ساتھیوں نے لے لیں۔ باقی ماندہ کہاں گئیں میں نے جاننے کی زحمت ہی نہ کی۔"

"ارے بھئی! ایسی بھی کیا بے نیازی؟" طلحہ نے شرارت سے کہا تو ابن بطوطہ خوشدلی سے ہنس دیا۔

"لوٹ میں آنے والی لونڈیاں بہت سستی ہوتی ہیں برادرم! وہ تہذیب وثقافت سے بالکل نابلد ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں مجموعی تاثر میں ناپسندیدگی کا اندازہ اسی بات سے لگالو کہ جس ہرکارہ کو میں نے لونڈی بخشی تھی وہ شکریہ کے ساتھ لینے سے انکار کرتا واپس لوٹ گیا۔ خیر! کچھ روز بعد بادشاہ اپنے محل میں واپس آیا۔ میری اس سے ملاقات کروائی گئی۔ وہ وقت بھی بہت عجیب تھا۔ وہ عربی زبان سمجھ لیتا تھا لیکن بولنے پر قادر نہ تھا۔ مجھے فارسی سمجھ آتی تھی لیکن زباندانی رواں نہیں تھی۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی زبان میں دوسرے کو جواب دے کر مدعا سمجھتے رہے۔ بادشاہ نے مجھے دارالخلافہ کا 'قاضی' مقرر کر دیا تھا۔ تنخواہ بارہ ہزار سالانہ مقرر ہوئی۔ اس کے علاوہ اسی قدر جاگیر' ایک گھوڑا مع زین ولگام اور خلعت بھی دی گئی۔ خلعت کی پشت اور سینے پر محراب بنی ہوئی تھی۔"

"لیکن حضرت! آپ تو امام مالک کے مذہب پر ہیں جبکہ دہلی کے بارے میں سن رکھا ہے کہ وہ اہل حنفی ہیں۔ اس صورت میں یہ عہدہ کیونکر سنبھال پاتے آپ؟" داؤد کی حیرت بجا تھی۔

"میں نے اس لمحہ بادشاہ سے یہی استدعا کی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے زباندانی کا مسئلہ بھی تو درپیش تھا۔ بادشاہ نے جواب میں کہا کہ بہاؤالدین ملتانی اور کمال الدین بجنوری میری نیابت پر مقرر ہوں گے۔ وہ ہر معاملہ میں مجھ سے مشورہ لیں گے اور کلی دستاویزات پر بھی میری ہی مہر ہوگی۔ بادشاہ کی نوازشیں ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ مجھ سے بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ دیوان خاص میں مجھ سے عربی اشعار اور قصیدے سنتا' شکار پر مجھے اپنے ہمراہ لے جاتا۔ کچھ عرصہ بعد مجھے قطب الدین خلجی کے مزار کی تولیت اور انتظام بھی سونپ دیا گیا۔"

"الٰہی خیر! بادشاہوں کی اتنی کرم فرمائیوں کے بعد حاسدین کوئی نہ کوئی چال بھی چل دیا کرتے ہیں۔ کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاہی مزاج سے مغلوب ہو کر بادشاہ ہی کی کایا پلٹ جایا کرتی ہے۔" سلیمان نے اپنے تجربات کی روشنی میں کہا۔

"ہاں تو ایسا ہی ہوا ناں! کچھ ہی عرصہ میں مجھ پر بھی وہ وقت آ گیا جب میں محمد شاہ تغلق کا معتوب بن گیا۔ اصل میں ہوا یہ تھا کہ میں دہلی سے باہر شیخ شہاب الدین ابن شیخ جام کی زیارت کے لیے چلا گیا۔ وہ ایک غار میں رہتے تھے۔ اب میرا مقصد تو صرف ایک ولی اللہ کی زیارت ہی تھا۔ ماضی قریب وبعید میں بھی ایسی کئی ہستیوں سے میری ملاقاتیں ہو چکی تھیں لیکن قسمت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ شیخ اور بادشاہ کی کوئی چپقلش ہوگئی۔ بادشاہ نے اسے گرفتار کر لیا اور اس کے بیٹوں سے دریافت کیا کہ ان کے والد سے کون افراد ملاقات کے لیے آتے تھے۔ بیٹوں نے میرا نام بھی لے دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ میرے دیوان خانہ پر چار پہریدار متعین کر دیئے گئے۔ میں نے ایسی صورت حال میں معتوب کو کبھی بچتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ تشویش اور پریشانی میں کلام الٰہی سے رجوع کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس روز میں نے 'تینتیس ہزار' دفعہ 'حسبنا اللہ ونعم الوکیل' کا ورد کیا۔ رات دیوان خانہ میں ہی گزری۔ میں نے پانچ روز کا ایک روزہ رکھ لیا۔ سارا دن میں ایک کلام پاک مکمل کر کے شام کو پانی سے روزہ افطار کر لیتا۔ شیخ کے قتل کے بعد مجھے رہائی تو مل گئی لیکن اس ملازمت سے دل کھٹا ہو گیا تھا۔ میں شیخ کمال الدین عبداللہ غازی کی خدمت میں چلا گیا۔ ان کی ریاضت اور نفس کشی بہت مثالی تھی۔ وہ بیس روز..... ایک روزہ رکھ لیا کرتے۔ میرے دل میں بھی ایسا ہی کرنے کی خواہش مچلنے لگی لیکن انہوں نے ابتداء میں ہی نفس پر اس قدر جبر سے منع کر دیا۔ دنیاداری سے میرا دل اس قدر اچاٹ ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے پاس موجود سارا مال خیرات کر کے تن کا لباس بھی ایک فقیر کو دے دیا اور اس کا پیرہن خود پہن لیا۔ پانچ ماہ تک یونہی شیخ کی خدمت میں بیت گیا۔ ان دنوں بادشاہ سیوستان میں تھا۔ اسے میری تارک الدنیا کی خبر ملی تو اپنے پاس طلب کر لیا۔ میں اسی فقیرانہ لباس میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ بادشاہ نے بڑی ملائمت سے مجھے ملازمت دوبارہ اختیار کرنے کی پیشکش کی لیکن میں اپنے اس دل کا کیا کرتا؟ میں نے اس سے حج بیت اللہ کی اجازت طلب کر لی۔ بادشاہ نے میری بات تسلیم کر لی۔ اس ملاقات کے بعد میں ایک خانقاہ میں منتقل ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ 742ھ کے جمادی

UUNOVELS.COM

الثانی کا اختتام تھا۔ میں نے ماہ رجب اور شعبان کے ابتدائی دنوں میں چلہ کشی کی اور رفتہ رفتہ پانچ روزہ روزے رکھنے لگا۔ دن بھر قرآن پاک کی تلاوت اور رات عبادت الٰہی میں بسر ہوتی۔ کھانے کے نام پر میں تھوڑے بہت چاول کھالیا کرتا تھا۔ چالیس روز بعد بادشاہ نے ایک بار پھر اپنے ہرکارے میرے پاس بھیج دیئے۔ ان کے ہمراہ میرے لیے ایک گھوڑا مع زین 'لونڈیاں' غلام اور کپڑے بھی تھے۔ لباس اور سامان دیکھ کر میرے وجود پر ایک سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ لمحات بہت کٹھن تھے۔ میری ذات میں ایک شدید جنگ چھڑی تھی۔ کچھ دیر اس کشمکش میں رہنے کے بعد میں یہ جنگ ہار گیا۔ نفس کی لعنت ملامت کے باوجود میں نے وہ بادشاہی خلعت پہنی اور خاموشی سے ان کے ساتھ چل دیا۔ بادشاہ نے میری پہلے سے بھی زیادہ تعظیم کی اور مجھے چین میں اپنی سفارت کا پروانہ تھما کر بادشاہ چین کو بھیجا جانے والا ساز وسامان بھی میرے حوالے کر دیا۔ سفر کے آغاز کے بعد دسیوں ساحلی شہروں کی سیاحت ہوئی۔ ابھی منزل تک پہنچے بھی نہ پائے تھے کہ رستے میں سمندری طوفان نے گھیر لیا۔ ایک ساتھی کا سر ایسا پھٹا کہ مغز نکل کر فرش پر بہنے لگا۔ دوسرے ساتھی کے کان میں لوہے کی میخ لگی اور دوسری جانب سے باہر نکل آئی۔ تحائف بھی جانے کیا بہہ نکلے۔ جان بہت مشکل سے بچ پائی تھی۔ اگلا کچھ عرصہ شہر کولم میں گزرا۔ اس دوران دل میں کئی مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا کہ واپس جا کر تغلق کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دوں لیکن پھر اس کی سفاکی اور جلاد صفتی یاد آ جاتی۔ اگر وہ مجھ پر یہ الزام لگا دیتا کہ تحائف کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے تو میں اپنی صفائی کس طرح دے پاتا؟ اسی کشمکش میں سید ابوالحسن کے پاس 'ہنور' چلا گیا۔ میرا رجحان ایک بار پھر عبادت و ریاضت کی جانب ہو چکا تھا۔ انہی دنوں وہاں کے حاکم سلطان جمال الدین نے 'بلند اپور' کی طرف چڑھائی کا ارادہ کرلیا۔ وہ وہاں موجود غیر مسلموں سے جہاد کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی اس جہاد میں شرکت کی ہامی بھرلی۔ بفضل الٰہی مسلمانوں کو مدد ملی۔ ہم تلواریں پکڑ کر شہر میں داخل ہوئے۔ ہندوؤں کی اکثریت ہمیں دیکھ کر راجا کے محل میں روپوش ہوگئی۔ ہم نے ان پر آگ برسائی اور کسی طور گرفتار کر لیا۔ سلطان نے ان کو امان دے کر عورتوں کو انہی کے حوالے کر دیا۔ اس جہاد میں کامیابی کے بعد میں سیاحت کے مزید میدان مارتا ہوا 'مالدیپ' پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ گزرا تو یہاں بھی مجھے 'قاضی' کا عہدہ مل گیا اور اس کے ساتھ ہی ذہنی اذیت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔" وہ ڈرامائی انداز میں خاموش ہوگیا۔

"کیا وہاں پر جرائم کا سلسلہ زیادہ تھا؟" ابراہیم نے حیرت سے پوچھا تو وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔

"نہیں! وہاں کے رسوم ورواج ہی ایسے تھے کہ ہر وقت ایک کوفت طاری رہتی تھی۔ ان جزیروں کی عورتیں اپنا سر نہیں ڈھکتی تھیں۔ ان کی ملکہ کا بھی یہی عالم تھا۔ وہ بھی بالوں میں کنگھی کیے سر پر جوڑا بنا کر ایک طرف ڈال لیتی ہیں۔ اکثریت تو صرف ایک چادر سے ناف سے نیچے پاؤں

تضمین کا لفظ "ضمن" سے مشتق ہے۔ اس کا شمار صنائع لفظی میں ہوتا ہے۔ یہ ایک کثیر المعانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ملانے، شامل کرنا قبول کرنا، ضامن کرنا، پناہ میں لینا، ضمانت دینا۔ شامل کرنے یا کسی شے کو دوسری چیز میں ملا دینے کا عمل کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں جب کوئی شاعر اپنے یا کسی دوسرے شعر یا مصرعے کے کچھ حصے کو اپنے کلام میں داخل کرتا ہے، کسی معروف مصرعے پر مصرع یا بند لگاتا ہے تو اسے تضمین یا گرہ لگانا کہتے ہیں۔ ناقدین نے عام طور پر تضمین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ مصرعے یا اس سے کم کی تضمین کو تابید، ایداع اور رفو کہتے ہیں اور تضمین شعر یا اس سے زائد کی تضمین استعانہ یا استعانت کہلاتی ہے۔ مصنف بحر الفصاحت رقمطراز ہیں۔ "پورے شعر یا اس سے زائد کی تضمین کو استعانت کہتے ہیں اور مصرعے سے کم کو ایداع اور رفو بولتے ہیں۔" فن شاعری کے اعتبار سے تضمین کو شعری محاسن میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس فن کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ادبیات میں ہر بڑے شاعر نے اپنے پیشرو یا معاصر شعراء کے کلام کو کہیں نہ کہیں ضرور تضمین کیا ہے۔

مرسلہ: نگار چنگیزی۔ کوئٹہ

UUNOVELS.COM

26 جنوری 1926ء کو علی گڑھ میں سجاد حیدر یلدرم اور نذر زہرہ کے آنگن میں آنکھ کھولنے والی قرۃ العین حیدر 21 اگست 2007ء کو کارِ جہاں مکمل کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ وہ جب پیدا ہوئیں تو انہیں ان کے والد اور والدہ کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اور جب رخصت ہوئیں تو اردو ناول ایک ہی نام سے پہچانا جاتا ہے اور وہ نام خود قرۃ العین حیدر کا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم اردو افسانے کا ایک ایسا نام کہ جسے کبھی نظر انداز نہ کیا جا سکے گا اور قرۃ العین کی والدہ نذر زہرہ جنہوں نے 20 ویں صدی کے اوائل میں خواتین افسانہ نگاروں میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی تھی۔ اس دور کے تقاضے تھے کہ قرۃ العین حیدر کی والدہ اپنے اصل نام سے افسانے تحریر نہ کر سکیں۔ انہوں نے بیشتر خواتین کی طرح اپنے والد کے نام سے افسانہ لکھا بنت نذر الباقر کے افسانے اور مضامین تہذیب نسواں، پھول، زمانہ، تمدن، انقلاب اور دیگر جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم سے شادی کے بعد قرۃ العین کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل ان کی والدہ پردہ ترک کر کے سیاسی، سماجی و ادبی سرگرمیوں میں متحرک ہو چکی تھیں۔ قرۃ العین حیدر نے جس علمی و ادبی ماحول میں آنکھ کھولی اس نے ان کی شخصیت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ کم عمری میں انہوں نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ پھر افسانے کی طرف آئیں اور بہت مختصر وقت میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں نے اس دور کے ناقدین کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ سجاد حیدر یلدرم ان کی آئیڈیل شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے بہت کچھ سیکھا اور انہی کی نگرانی میں تعلیم مکمل کی۔ ایک روشن خیال گھرانے میں پرورش پانے والی قرۃ العین حیدر 1947ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد پاکستان منتقل ہو گئیں۔ 1947ء سے 1960ء تک ان کا قیام کراچی میں رہا۔ یہ تقسیم ہند کے بعد کی سیاسی و معاشرتی شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ قرۃ العین حیدر 1950ء میں

تک بدن ڈھانپ لیتی ہیں اور بالائی بدن برہنہ ہوتا ہے۔ بازاروں اور گلیوں میں بھی وہ اسی طرح پھرتی ہیں۔ بحیثیت قاضی میں نے اس دستور کو تبدیل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ تھک ہار کر مجھے یہ کہنا پڑا کہ مقدمات کی پیشی کے دوران خواتین مکمل لباس میں میرے سامنے آیا کریں۔ اس وقت مجھے یہ علم ہی نہ تھا کہ مکمل لباس زیب تن کرنے کو مقامی ثقافت میں بہت معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ میری کنیزیں اہل دہلی کی طرح لباس پہن کر اپنا سر ڈھکتی تھیں تو یہ خواتین ان کے متعلق بہت غلط رائے قائم کر کے بدسلوکی بھی کر جایا کرتی تھیں۔ اس جزیرے کے کئی عجیب و غریب رواج تھے لیکن کچھ باتیں بہرحال مثبت بھی تھیں۔ وہاں نکاح بہت آسانی سے ہو جایا کرتا تھا۔ مہر کی ادائیگی کا کوئی خاص قانون ہی نہیں تھا جس کے باعث مرد کئی کئی خواتین سے شادیاں کر لیتے۔ جزائر مالدیپ کی عورتیں حسن معاشرت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ مرد کو صرف جنسی تسکین ہی فراہم نہیں کرتیں بلکہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا بھی خیال رکھتی ہیں۔ کھانے کے وقت برتن لانا اور لے جانا' کھانے کے بعد ہاتھ دھلوانا' وضو کے لیے پانی لانا اور سوتے وقت پاؤں دبانے تک کی ذمے داری وہ ذاتی دلچسپی سے نبھاتی ہیں۔''

''بھئی واہ!'' عبداللہ شرارت سے مسکرایا۔ ''ایسی خواتین مجھے دستیاب ہوں تو میں شرعی تعداد تک تو فوری بیاہ رچالوں۔''

''نکاح تو خیر میں نے بھی وہاں کئی ایک کیے تھے۔'' ابن بطوطہ نے متانت سے بتایا۔ ''بہت اچھا وقت گزرتا رہا ان سب کے ساتھ۔ اسی دوران مجھے علم ہوا کہ وہاں خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ کھانا ہی نہیں کھاتیں۔ میں نے اپنے رسم و رواج کے مطابق ان کی یہ عادت تبدیل کرنے کی کافی کوشش کی لیکن چند ایک مواقع کے علاوہ کبھی جان ہی نہ سکا کہ ان کے آداب طعام کیا ہیں یا یہ کہ ان خواتین کو اشیائے خورونوش میں کیا کیا پسند ہے؟''

''بہت خوب! میں تو آج سے دلی طور پر یہ دعا کروں گا کہ ایسی خدمت شعار بیویاں ہم سب کو کثرت سے نصیب ہوں۔'' ابراہیم کے معصومانہ انداز پر محفل پل بھر میں ہی کشت زعفران بن گئی۔

''خواتین کی اس ثقافتی تبدیلی کے علاوہ آپ نے مالدیپ میں اور کون سی اصلاحات نافذ کی تھیں؟'' سلیمان

UUNOVELS.COM

وزارت اطلاعات کراچی میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئیں، پھر لندن میں پاکستان ہائی کمیشن کی پریس اتاشی کی حیثیت سے ان کی تعیناتی ہوئی۔ 1955ء میں پی آئی اے میں انفارمیشن افسر اور پھر 1956ء سے 1960ء تک وزارت اطلاعات و نشریات میں دستاویزی فلموں کی پروڈیوسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران انہوں نے اپنا شہرۂ آفاق ناول ''آگ کا دریا'' تحریر کیا جو 1959ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول کی اشاعت تک وہ بہت سے تلخ تجربات سے گزر رہی تھیں۔ کچھ اپنی سیماب صفت طبیعت اور کچھ تند مزاجی کے باعث وہ کسی ایک ادارے میں یکسوئی سے کام نہ کر پاتی تھیں۔ کئی بار انہیں کسی نہ کسی دباؤ یا امتیازی سلوک کے نتیجے میں ملازمت چھوڑنا پڑی لیکن ''آگ کا دریا'' کے بعد ان کے خلاف گویا ایک محاذ کھل گیا۔ اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ انہیں بھارت نواز کہا گیا۔ ''آگ کا دریا'' میں بھارتی دیومالائی کہانیاں بیان کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ انتہا پسندوں نے اس وقت کی حکومت سے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ وہ قرۃ العین حیدر کے خلاف کارروائی کرے۔ ''آگ کا دریا'' کا جو پہلا ایڈیشن شائع ہوا اس کے صفحات 786 تھے۔ یہ اعتراض بھی سامنے آیا کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول کے صفحات کو بسم اللہ کے اعداد کے برابر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس ساری ہنگامہ آرائی کے دوران قرۃ العین حیدر نے خاموشی اختیار کیے رکھی تاہم وہ اس صورتِ حال سے دلبرداشتہ ہوگئیں اور 1980ء میں خاموشی سے پہلے لندن گئیں اور پھر وہاں سے اپنی والدہ کے ہمراہ مستقل طور پر بھارت منتقل ہوگئیں۔

اقتباس: قرۃ العین حیدر..... کارِ جہاں کی تکمیل۔ از: رضی الدین رضی

مرسلہ: قرۃ العین زینب۔ ملتان

UUNOVELS.COM

نے دانستہ طور پر موضوع گفتگو تبدیل کیا۔

''بہت سی۔ اس ملک میں دستور تھا کہ طلاق کے بعد بھی خواتین اگلی شادی ہونے تک سابقہ شوہر کے گھر ہی رہتی تھیں۔ میں نے پچیس ایسے آدمیوں کو اپنے پاس بلوا کر درے لگوائے اور علاقہ بھر میں منادی کروائی کہ شرعی سزا سے بچاؤ کے لیے ایسی خواتین فوری طور پر سابقہ شوہروں کے گھر چھوڑ دیں۔ نماز کی پابندی کا سختی سے حکم نافذ کیا۔ اذان جمعہ کے بعد بازار میں دکھائی دینے والے افراد کے لیے سخت سزا مقرر تھی۔ اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ اسی دوران میرا دوسرا نکاح ایک وزیر کی بیٹی سے ہو گیا لیکن چند سازشوں کے باعث اس رشتہ میں بغض پنپنے لگا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان جزائر میں میری زندگی بہت شاہانہ اور رنگین رہی۔ زوجین کی آمد و رفت بھی خوب جاری رہی۔ کچھ عرصہ بعد بیویوں کی رضامندی سے میں انہیں طلاق دے دیتا۔ میں اس معاملہ میں مکمل طور پر اسی ماحول میں رنگتا جا رہا تھا اور اس وقت اس تبدیلی یا صورتِ حال پر کوئی ملال بھی نہیں تھا۔ زندگی بہت شاندار بسر ہو رہی تھی۔ اس پُرسکون زندگی میں تلاطم اس وقت آیا جب کچھ وزراء نے میرے خلاف سازشوں کا بازار گرم کر لیا۔ میری سیلانی طبیعت بھی ایک ہی مقام پر رہتے ہوئے اکتا چکی تھی۔ میں نے رخت سفر باندھا اور 'لنکا' روانہ ہوگیا۔ وہاں کے راجا نے میری خوب آؤ بھگت کی۔ میرے سفروں کا احوال سن کر بہت خوش ہوتا رہا۔ لنکا کے مختلف سیاحتوں کے بعد سراندیپ' بلاد معبر کی سیر کرتا کچھ روز کے لیے پھر مالدیپ پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی علم ہوا کہ میری ایک سابقہ بیوی کے ہاں میرے بیٹے نے جنم لیا ہے۔ بیٹے کی پیدائش کی خوشی اپنی جگہ سہی لیکن اپنی سیلانیت سے بھی مجھ سے زیادہ بھلا کون واقف تھا؟ بہت سوچ بچار کے بعد دل پر پتھر رکھتے ہوئے میں نے بیٹا اس کی والدہ کے ہی حوالے کر دیا۔ سفر کا آغاز ایک بار پھر ہوا اور تینتالیس روز بعد میں بنگال پہنچ گیا۔ وہاں کے مختلف شہروں کی خاک کھنگالتے سیام' کمبوڈیا اور پھرتے پھراتے چین جا نکلا۔ چین کا ہر ایک شہر منفرد اور تہذیب و ثقافت میں اپنی مثال آپ تھا۔ چین سے واپسی پر جاوا' کالی کٹ' مسقط سے ہوتے ہوئے دمشق میں پڑاؤ ڈال لیا۔ اس بار دمشق آمد بیس برس بعد ہوئی تھی۔ یہاں آتے ہی میرے دل میں اپنے ایک بیٹے کی یاد چٹکیاں لینے لگی۔ ہندوستان قیام کے دوران اس کی ولادت کی خبر ملنے پر میں نے اہ

کے نانا کو چالیس دینار طلائی بھیجے تھے۔ وہاں ایک مسجد میں امام مالکی شیخ نورالدین سخاوی سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے خسر کا نام اور پتا بتا کر ان کا احوال دریافت کیا۔ انہی سے علم ہوا کہ میرا وہ بیٹا بھی بارہ سال پہلے ہی وفات پا چکا ہے۔'' وہ افسردگی سے خاموش ہوگیا۔

''اوہ...... انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' محفل کے شرکاء بھی تاسف میں گھر گئے۔ اولاد کے معاملہ میں ابن بطوطہ کی یہ بدقسمتی انہیں بہت افسردہ کررہی تھی۔

''اس خبر نے میری قلبی کیفیت عجیب ہی انداز میں متغیر کردی۔ دل میں ایک کسک سی ابھری تھی کہ اگر آج وہ حیات ہوتا تو جوانی کی منازل طے کررہا ہوتا۔ اس کی بھی شادی ہوتی اور اولاد کی صورت میں ڈھیروں پھول اس کے گلشن میں کھلے ہوتے۔ پھر جانے کیا ہوا۔ میرے دل میں وطن واپسی کا خیال جڑیں پختہ کرنے لگا۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے سیاحت سے اکتاہٹ یا کسی قسم کی بیزاری محسوس ہونے لگی تھی۔ سفر کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور اب بھی جاری تھا۔ فارس' دیارعرب' اندلس' سوڈان' مالی' ٹمبکٹو' بردامہ' تکدا کے مختلف علاقے کھنگالے لیکن وطن واپسی کا خیال تھا کہ دل سے نکلنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ بس اب بڑھاپے اور چل چلاؤ کا وقت ہے۔ وطن واپسی کے بعد آباؤ اجداد کی قبر پر حاضری کے بعد اپنے لیے بھی دوگز زمین تیار کروالی جائے۔ چوبیس سالہ طویل مسافت کے بعد بالآخر میں اپنی سرزمین پر لوٹ ہی آیا۔ (کچھ روایات میں یہ عرصہ اٹھائیس سال بھی ہے۔) یہاں پر میرے ہم وطنوں نے ہی بلکہ حکام نے بھی بہت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ میرے سفر کے حالات میں دلچسپی ظاہر کی اور آج میں قاضی کا عہدہ سنبھالے آپ سب کے سامنے موجود ہوں۔'' اپنی سرگزشت کے اختتام پر اس نے گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔

''آپ کی یہ زندگی اور طویل جدوجہد ہم جیسے نوجوانوں کے لیے ایک بہت مثبت مثال ہے محترم قاضی! زندگی کا اصل مزہ تو اسی طرح سخت جانی اور ریاضتوں میں ہے۔ ہم جیسے تن آسان اور کاہلی کا شکار لوگ زندگی کا حق بھلا کیسے ادا کریں گے؟'' عبداللہ اس وقت مکمل سنجیدہ تھا۔

''وقت ابھی بھی آپ سب کے ہاتھ میں ہے۔ اپنی زندگی کا مقصد پہچانیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے لیے بھی کسی نہ کسی میدان میں تسخیر کے کئی آسمان موجود ہیں۔'' اس نے خلوص سے جواب دیا۔

''ویسے میرے ذہن میں ابھی ابھی یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ آپ اپنے اس سفرنامہ کی روداد قلمبند کیوں نہیں کرتے؟ اگر ایک بار یہ سفرنامہ شہر بہ شہر روداد کی صورت میں منظرعام پر آگیا تو مجھے یقین ہے کہ ہزاروں افراد کے سوچنے اور جینے کا نظریہ تبدیل ہوجائے گا۔''

''خیال برا نہیں ہے۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ فارس کے بادشاہ ابوحنان نے بھی کئی بار اسی بات کا مطالبہ کیا ہے۔''

''ہوسکے تو کردیجیے۔ دیر کس بات کی بھلا؟'' طلحہ نے بھی تحریک دی۔

''ٹھیک ہے ساتھیو! میں آج سے ہی اس خیال پر عمل کا آغاز کیے دیتا ہوں۔'' وہ مسکرایا اور مہمانوں کی مزید بہترین انداز سے خاطر مدارات کے بعد انہیں رخصت کردیا۔

سفرنامہ کی تصنیف کا آغاز ہوگیا۔ پچھتر ہزار میل کا طے شدہ سفر کی تصنیف میں سمونا ہرگز آسان نہیں تھا۔ ابن بطوطہ کے شب و روز بے حد مصروف گزرنے لگے تھے۔ یہ کار خیر بھی بہت جلد تکمیل پا گیا لیکن اس دوران ابن بطوطہ کے مزاج میں تنہائی پسندی اور قنوطیت کے عناصر غالب آتے جارہے تھے۔ اس نے اپنا حلقہ احباب نہایت مختصر کرلیا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ بڑھاپے نے اعضاء کو اپنی گرفت میں لینا شروع کردیا تھا۔ پیشہ وارانہ ذمے داریاں نبھاتے مختلف امراض نے بھی جکڑنا شروع کیا لیکن اس نے خاطر خواہ توجہ ہی نہ دی۔ بیرونی دنیا میں کسی کو بھی علم نہ تھا کہ اندرون خانہ وہ کس قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔ بالآخر ایک روز بیماری ضعف اور کہنہ سالی نے بدن کی معیاد ختم کردی۔ کوئی بھی جان ہی نہ سکا کہ ایک طویل و عریض دنیا کی خاک چھاننے والا وہ جہاں گرد 779ھ بمطابق 1377 عیسوی (کچھ روایات میں 1369 عیسوی درج ہے۔) فرشتہ اجل کے ساتھ ایک اور 'جہاں گردی' کے لیے روانہ ہوگیا۔ ایک ایسا جہان جس کی مثالی و دائمی خوبصورتی اپنے مسافر کو واپسی کی راہ ہی فراموش کروادیتی ہے۔

ماخذات:

سفرنامہ ابن بطوطہ...... مترجم رئیس احمد جعفری

ابن بطوطہ...... کامران اعظم سوہدروی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

بے خوف چہرہ

زرین قمر

اسے خوف پسند تھا، دہلا دینا اس کے شوق میں شامل تھا۔ اس کے قلم سے نکلتے الفاظ دل کی دھڑکنوں کو بڑھا دیتے تھے۔ اسی کمال کا ثمر تھا کہ اس کے ناول بازار میں آتے ہی غائب ہوجاتے۔ اسے ساحر قلم کہا جاتا تھا۔ اس کی تحریریں دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں، ناول پر فلمیں بنیں۔ یہ عروج اس قلمکار کو کیسے ملا، کس نے ڈسٹ بن سے اس کے رد کردہ ناول کو اٹھا کر پبلشر تک پہنچایا شہرت کا تاج حاصل کروایا؟

ایک عالمی شہرت یافتہ قلم کار کے واقعات

ہال میں اندھیرا تھا۔ تمام تماشائی اپنی اپنی سیٹوں پر ساکت تھے گویا سانس روکے بیٹھے تھے۔ سنیما گھر کے لاؤڈ اسپیکرز سے ایکو لگی گونج دار آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اسی ہال میں ٹیبی بھی اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے اسٹیفن کا ہاتھ سختی سے پکڑا ہوا تھا شوہر بھی دلاسے کی خاطر بیوی کو سنبھالے ہوئے تھا کیونکہ بیوی کی سانس تیز چل رہی تھی مگر نظریں اسکرین پر جمی تھیں۔ اچانک اسپیکرز سے پھر چیخوں کی آوازیں آئیں اور اسکرین پر فلم کی ہیروئن کیری خوف زدہ

حالت میں نظر آئی۔ وہ کمرے میں تنہا تھی اس کا بیڈ زمین سے اونچا اٹھا ہوا تھا اور کمرے کی چیزیں بیڈ کے ارد گرد گردش کر رہی تھیں۔ وہ ہزیانی انداز میں چیخ رہی تھی اور مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ٹیبی نے اسٹیفن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا تھا۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی اور اسٹیفن کنگ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

اگلے سین میں کیری خوب صورت پنک فراک پہنے اسٹیج پر موجود تھی اسے سالانہ کارکردگی پر انعام سے نوازا جا رہا تھا۔ اس کا ساتھی کلاس فیلو سوٹ میں ملبوس اس کے قریب موجود تھا پھر کیری کو گفٹ دیا گیا اور کیری کے دوست نے اسے سینے سے لگا کر مبارک باد دی۔ اس کے ساتھ ہی فلم کے منظر میں ہال میں بیٹھی کیری کی والدہ کی نظریں ایک لڑکی پر پڑیں جو اسی اسکول کی طالبہ تھی اور حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز ایک رسی تھی جو اسٹیج کے اوپر سے گزر کر پیچھے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ رسی کے ساتھ اس کی سمت میں بڑھتی ہوئی اسٹیج کے پیچھے پہنچی۔ کیری کی والدہ بھی اس کے تعاقب میں وہاں پہنچ گئی پھر وہ لڑکی نیچے جھکی اور اسٹیج پر پڑی ہوئی فرشی چادر کو اٹھا کر اسٹیج کے نیچے جھانکا جہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکا اس رسی کا دوسرا سرا پکڑے بیٹھے تھے اور رسی کھینچنے کے منتظر تھے پھر اس سے پہلے کہ کیری کی والدہ اس لڑکی سے کچھ پوچھتی کہ لڑکے نے اس کا سرا کھینچا اور خون سے بھری ایک بالٹی اسٹیج پر کھڑی کیری پر الٹ گئی۔ وہ خون میں نہا گئی۔ اس کے قریب کھڑے لڑکے نے کیری کو بچانا چاہا تو دوسرے ہی لمحے وہ خالی بالٹی گھومتی ہوئی نیچے آئی اور اس کے سر سے ٹکرا گئی۔ لڑکا لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ ہال میں موجود طلباء و طالبات چیخیں مارتے ہوئے باہر کی طرف بھاگے۔ ایک ایک کر کے ہال کے دروازے بند ہونے لگے اور ہال میں سرخ روشنی پھیل گئی۔ پانی کے ایک ایمرجنسی پائپ سے تیزی سے پانی کی تیز زوردار دھار نکل کر وہاں موجود لوگوں پر گرنے لگی۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی اسی اثناء میں پانی سے بھیگے ہوئے شخص پر بجلی کا تار ٹوٹ کر گرا۔ جسے ہال میں قمقمے روشن کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ کرنٹ لگنے سے وہ شخص ہلاک ہو گیا۔ کیری خوفزدہ نظروں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسٹیج کے پردوں میں آگ لگ گئی تھی اور کیری جلتی ہوئی چیزوں کے درمیان سے خوف ناک حالت میں چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی جہاں اس کو اس مصیبت کا نشانہ بنانے والی لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ کار میں بیٹھی تھی جس نے کیری پر نظر پڑتے ہی اسے ایک بار پھر مارنے کی کوشش کی۔ اس پر کار چڑھانے کی سعی کی لیکن اس موقع پر اچانک کیری میں کچھ غیر مرئی قوتیں جاگ اٹھیں اس نے ہاتھ کے ایک اشارے سے کار کو روک دیا تھا اور کار میں آگ لگ گئی۔ سینما ہال سے باہر نکلنے کے بعد بھی ٹیبی پر خوف کی کیفیت طاری تھی لیکن اسے اس فلم کی کامیابی کا بھی یقین تھا۔

''میں یقین سے کہتی ہوں جونی کہ carrie تمہاری زندگی کی پہلی فلم ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب فلم بھی ہے۔'' ٹیبی نے مسکراتے ہوئے اسٹیفن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس کے پہلے ناول carrie پر بات کر رہی تھی جس پر بنی فلم دیکھ کر وہ دونوں ابھی ابھی واپس آئے تھے۔

''تمہیں یاد ہے ٹیبی میں جب یہ کہانی لکھ رہا تھا تو اس کے تین باب لکھنے کے بعد میں نے اسے ڈسٹ بین میں ڈال دیا تھا پھر جب تمہاری نظر پڑی تو تم اسے اٹھا لائی تھیں اور اس کے یہ باب پڑھنے کے بعد تم نے مجھ سے اصرار کیا تھا کہ میں اسے ضرور پورا کروں؟'' اسٹیفن نے کہا۔

''ہاں مجھے یاد ہے جونی۔'' ٹیبی نے کہا۔ وہ پیار سے اسٹیفن کو جونی کہتی تھی۔

''پھر تم نے اسے مکمل کرنے میں میری مدد کی تھی۔'' اسٹیفن نے اسے یاد دلایا۔

''ہوں۔ اور ہماری یہ کوشش رنگ لے آئی۔ بہت اچھی فلم بنی ہے اور تم نے تو اس میں ہارر اور سسپنس کا جو جادو جگایا ہے اس کا تو جواب ہی نہیں، واقعی تم ہارر اور سسپنس کے بے تاج بادشاہ ہو۔'' ٹیبی نے اس کی تعریف کی۔

''ابتدائے عشق ہے ٹیبی۔ آگے آگے دیکھتی جاؤ ہارر اور سسپنس میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ میں آئندہ اور بھی خوف زدہ اور حیران کر دینے والے دھماکے کروں گا۔'' اسٹیفن کنگ نے کہا۔

☆......☆

وہ بیوی کو سونے کے لیے بیڈ روم میں بھیج کر خود اسٹڈی روم میں آ گیا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ماضی کو یاد کرنے لگا۔ اس کے والد ڈونلڈ ایڈون بحری تاجر تھے۔ والدہ نیلی روتھ کی شادی اس کے والد سے مین پورٹ لینڈ میں 23 جولائی 1939ء کو ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ اپنی فیملی کے ساتھ شکاگو میں رہنے لگے مگر وہ زیادہ عرصہ وہاں گزار نہ سکے اور نیویارک ہڈسن کے علاقے میں شفٹ ہو گئے لیکن وہاں بھی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ان کا دل نہ لگا تو وہ اپنی فیملی کے ساتھ واپس "مین" آ گئے۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب کوئی ترقی کرتے ہوئے آسمان کو چھو رہا تھا اور کوئی غربت کی گہرائی میں پہنچ رہا تھا۔ انہیں بھی ایک موقع مل گیا۔ وہ اسکاربرگ کے علاقے میں آ گئے۔ یہاں امراء کی رہائش تھی۔ انہوں نے بھی ماڈرن گھر میں رہائش اختیار کی۔ کنگ جب دو برس کا ہوا تو اس کے والد نے بیوی بچوں کو چھوڑ دیا اور خود نجانے کہاں چلے گئے۔ بچوں کی ذمے داری ماں پر آ گئی تھی۔ اسٹیفن کنگ کی والدہ نے اسٹیفن اور اس کے بڑے بھائی ڈیوڈ کو سنبھالا۔ اعلیٰ طریقے سے ان کی پرورش کی۔ وہ دور اسٹیفن کے گھرانے پر بہت سخت تھا۔ کسمپرسی کی زندگی بسر کرنا پڑ رہی تھی لیکن گھر میں کوئی مرد نہ تھا، بحالتِ مجبوری وہ اپنے ایک عزیز کے گھر شکاگو منتقل ہو گئیں۔ کنگ گیارہ سال کا ہوا تو اس کی والدہ پھر "مین" میں لوٹ آئیں جہاں ان کے والدین نے دیکھ بھال کی ذمے داری .... اپنے کندھوں پر لے لی تھی۔ وہ ماں باپ کی خدمت بھی کرتیں اور بچوں کو بھی سنبھالتیں۔ سر چھپانے کو چھت تو مل گئی تھی مگر اخراجات کا مسئلہ منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اس مسئلے کا یہ حل تلاش کیا کہ ایک مقامی نفسیاتی ادارے میں کیئرٹیکر کی ملازمت کر لی۔

اسٹیفن کنگ کی پرورش ایک مذہبی ماحول میں ہوئی تھی لیکن اسے مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اپنے اسکول کے زمانے میں وہ اس ڈگر سے ہٹ گیا لیکن خدا پر اس کا یقین باقی رہا۔

اسی دوران کنگ کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے اسے ذہنی طور پر توڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ تھا۔ اس کا دوست ریلوے ٹریک پر چل رہا تھا کہ ریل گاڑی آ گئی۔ اس نے تو چھلانگ لگا کر خود کو بچا لیا۔

گھر والے بتاتے ہیں کہ اس دن جب وہ گھر واپس آیا تو خاموش اور اداس تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی بات سے اسے صدمہ پہنچا ہے۔ گھر والوں نے پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا بعد میں انہیں پتا چلا کہ اس کا دوست ریل کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا ہے۔ اس حادثے نے اسے گم صم کر دیا تھا وہ خالی وقت اپنے کمرے میں گزارنے لگا۔

خود کو کمرے میں محصور کرنا آسان ہے لیکن وقت گزارنا بہت مشکل ہے۔ اس نے وقت گزاری کے لیے مطالعے کا سہارا لے لیا۔

اس کی پسندیدہ کتابوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ تھیں۔ وہ Ec's horror comics پڑھتا تھا۔ جو لوگ مطالعے کے شوقین ہوتے ہیں ان کا قلم خود ہی کہانیاں لکھنے لگتا ہے۔ اس نے بھی اسکول کے زمانے میں کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ وہ مشغلے کے طور پر لکھتا تھا۔ اس کا بھائی ڈیوڈ جو مقامی اخبار کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل تھا۔ اس کی کہانیاں اپنے اخبار میں شائع کرتا تھا جو Dave's Rag کے نام سے چھپتا تھا۔ یہ اخبار ایک میموگراف مشین پر چھپتا تھا۔ اخبار کی وجہ سے وہ مشہور ہونے لگا تھا کہ اسکول کے ایک استاد نے تنبیہہ کی کہ تمہارا یہ شوق تعلیمی میدان میں تمہیں پیچھے کر دے گا۔ ابھی تعلیم کی جانب توجہ دو، بعد میں شوق پورا کر لینا۔ اس تنبیہہ پر اس نے یہ کام چھوڑ دیا۔

ایک کم عمر لکھاری کے طور پر اس کی پہلی کہانی I was a teen age grave Robber کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ یہ چار قسطوں پر مشتمل تھی پھر یہی اسٹوری اگلے سال In a half wold of terror کے نام سے بھی شائع ہوئی اس نے ایک نوعمر لکھاری ہونے پر ایک scholastic Art and writing انعام Award حاصل کیا تھا پھر بھی اس نے استاد کی تنبیہہ پر قلم روک لیا۔

لیکن جب وہ پہنچا تو پرانا شوق پھر سے بیدار ہو گیا۔ 1966ء میں اس نے یونیورسٹی آف مین میں داخلہ لیا تھا اور 1970ء میں انگلش میں بیچلر آف آرٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس سال اس کی بیٹی نومی ریکل پیدا ہوئی۔ اسی سال اس نے ایک اخبار میں Steve Kings Garbage truck کے عنوان سے آرٹیکل لکھا اور ایک رائٹنگ کے مقابلے میں بھی حصہ لیا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے بھی چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا تھا۔ اس نے گیس پمپ اسٹیشنز پر کام کیا اور ایک انڈسٹریل لانڈری میں بھی کچھ وقت گزارا جہاں اس کی ملاقات اپنی ہونے والی بیوی Tabitha spruce سے ہوئی جسے وہ پیار سے ٹیبی کہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ وہیں دونوں میں پیار بڑھا اور انہوں نے 1971ء میں شادی کر لی۔

کنگ نے اپنی پہلی پیشہ وارانہ کہانی The glass floor 1967ء میں فروخت کی۔ مین یونیورسٹی سے بیچلر کرنے کے بعد اسے ہائی اسکول میں پڑھانے کا سرٹیفکیٹ بھی مل گیا لیکن اسے فوراً ہی کوئی ٹیچنگ کی ملازمت نہیں ملی چنانچہ اس نے ایک میگزین Man's کو اپنی شارٹ اسٹوریز

UUNOVELS.COM

فروخت کرنا شروع کر دیں۔

ان دنوں اس کا ایک شوق آسمان پر تھا۔ وہ لکھنے سے قبل کار لے کر مرکزی شاہراہ پر آ جاتا اور کہانی کے تانے بانے بُننے لگتا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے کہانی پر سوچنا آسان نہیں پھر بھی وہ اس عادت کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس روز بھی وہ کار بھگائے لیے جا رہا تھا کہ پولیس نے روک لیا اسے تیز رفتاری کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس پر 250 ڈالر کا جرمانہ بھی رکھا گیا تھا۔ یہ رقم اس نے اپنی ایک شارٹ اسٹوری The Raft کے معاوضے سے ادا کی پھر 1971ء میں کنگ کو Hampden Academy میں ٹیچر کی ملازمت مل گئی جس کے ساتھ ساتھ وہ شارٹ اسٹوریز بھی لکھتا رہا اور ناولز کے مختلف آئیڈیاز پر بھی کام کرتا رہا۔

1973ء میں کنگ کا ناول Carrie ایک پبلشنگ ہاؤس Doubleday نے منظور کر لیا۔ دراصل وہ اس کا چوتھا ناول تھا لیکن شائع ہونے والے ناولوں میں وہ پہلا تھا اسے کنگ نے ایک چھوٹے ٹائپ رائٹر پر لکھا تھا جو اس کی بیوی ٹیبی کا تھا۔ وہ ناول کنگ نے ایک شارٹ اسٹوری کے طور پر شروع کیا تھا اور یہ ایک میگزین کے لیے لکھا جا رہا تھا لیکن اس کے کچھ صفحات لکھنے کے بعد کنگ نے اسے کچرے کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا جہاں سے ٹیبی نے اسے اٹھایا اور پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ اتنے صفحات لکھ کر پھینک رہے ہو، کیوں؟"

"میں اسے نہیں لکھ سکتا۔" کنگ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"تم لکھ سکتے ہو۔ میں جانتی ہوں لکھنا تمہارا شوق ہے۔" ٹیبی نے کہا۔

"یہ خالصتاً خواتین کے موضوع پر ہے میرے لیے نہایت خشک اور بورنگ ٹاپک ہے۔"

"نہیں میں تمہاری مدد کروں گی، میں عورتوں کے جذبات سے واقف ہوں جہاں ضرورت ہو گی میں تمہیں بتاؤں گی۔"

"ہاں ممکن تو ہے۔ اگر تم ساتھ دو تو یہ ہو سکتا ہے۔" کنگ نے ہنس کر کہا اور ٹیبی سے وہ کاغذات لے لیے۔

اس ناول کو کنگ اور ٹیبی نے مل کر مکمل کیا۔ ٹیبی نے اپنا ٹائپ رائٹر بھی اس کام کے لیے دے دیا تھا۔ Guardian کے مطابق کیری ایک لڑکی کیری وائٹ کی اسٹوری ہے جو ہائی اسکول میں پڑھتی ہے پھر اسٹوری میں کئی جگہوں پر وہ اپنی ٹیلی پیتھی کی مہارتوں کا مظاہرہ بھی کرتی ہے جو دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔"

جب کیری کو پبلش کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تو کنگ کا فون کام نہیں کر رہا تھا چنانچہ کنگ کے ایڈیٹر نے اسے ٹیلی گرام کیا جو کہ اس کا دوست بھی تھا۔ یہ ٹیلی گرام اس نے اپریل 1973ء میں بھیجا تھا جس میں لکھا تھا۔

"کنگ تمہیں مبارک ہو تمہیں carrie کے سلسلے میں رائلٹی کے طور پر 2500 ڈالر دیئے جاتے ہیں تمہارے آگے تابناک مستقبل کھڑا ہے۔"

یہ ٹیلی گرام دیکھ کر کنگ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

"ٹیبی..... میں تمہیں مان گیا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا اس ناول کو ہم دونوں نے مل کر پڑھنے لائق بنا دیا ہے۔" کنگ نے ٹیبی کو ٹیلی گرام دکھاتے ہوئے کہا۔

اس ٹیلی گرام کے بعد آنے والی رقم سے کنگ نے اپنے لیے چھوٹی فورڈ کار لی تھی۔ اس ناول نے بازار میں آتے ہی دھوم مچا دی پھر تو پبلشروں کی بھیڑ لگ گئی۔ ہر ایک کی خواہش یہی تھی کہ وہ اس کے لیے 13 مئی 1973ء کو نیو امریکن لائبریری نے 400,000 ڈالرز میں اس کتاب کے حقوق خرید لیے تھے جو کہ Doubleday کے تعاون سے ممکن ہوا تھا۔ اس طرح ناول کیری کے ذریعے کنگ کا کیریئر سیٹ ہو گیا۔ اس ناول نے ہارر ناولز کی دنیا میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ 1976ء میں اس ناول پر فلم بھی بنی۔

اس ناول کے بعد اس کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کا شمار منجھے ہوئے قلم کاروں میں ہونے لگا تھا۔ اپنی ساکھ بچانے کے لیے وہ لکھتا اور پھر اسے پھاڑ دیتا۔

1982ء میں کنگ کی different season's پبلش ہوئی تھی جو چار ناولٹ کا مجموعہ تھی۔ اس مجموعہ نے بھی ریکارڈ شہرت حاصل کی اور تین کہانیوں پر بعد میں فلمیں بنائی گئیں۔

The ،stand by me 1986
Apt ،shawshank Redenption 1994
1998 pupil میں اس سے پہلے 1975 سے 1978 تک اس کی جو کہانیاں منظر عام پر آئیں ان پر بھی فلمیں بنیں مگر کیری کی طرح ریکارڈ بزنس نہ کر سکیں۔ 1985ء میں کنگ نے X-men کے لیے comic books کے سلسلے کی کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ یہ سلسلہ بھی مقبولیت حاصل کر گیا۔ اس کامیابی کے بعد اس نے کامکس کو وقت دینا شروع

UUNOVELS.COM

کر دیا۔

جوں جوں کنگ ترقی کرتا جا رہا تھا اس کی شہرت آسمان تک پہنچتی جا رہی تھی۔ اس کی کتابوں کا سلسلہ بڑھ رہا تھا۔ اخبارات، میگزینز اور ٹی وی پر اس کے انٹرویوز پر انٹرویوز ہو رہے تھے۔

اس شام وہ بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی شاندار کامیابی پر اپنی بیوی کو دعوت دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس شام ٹیبی نے بھی اپنی تیاری میں خاصہ وقت لگایا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایک اچھی لکھاری تھی، جانتی تھی کہ نئی کتاب آنے پر کسی لکھاری کے کیا جذبات ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے شوہر کی خوشی کو دوبالا کرنا چاہتی تھی۔ جب وہ کنگ کے ساتھ شہر کے مشہور ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی تو کنگ نے اسے ڈائمنڈ کا لاکٹ تحفے میں دیا۔

''یہ میری نئی کتاب کے آنے کی خوشی میں۔'' کنگ نے لاکٹ اس کے گلے میں پہناتے ہوئے کہا تو ٹیبی فرطِ جذبات سے مسکرا دی۔

''کنگ تم میرا کتنا خیال کرتے ہو، اپنی کسی خوشی میں کبھی مجھے نہیں بھولتے۔'' ٹیبی نے آنسوؤں سے جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ کیا؟ تم رو رہی ہو؟'' کنگ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہ خوشی کے آنسو ہیں جونی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ خدا تمہیں ایسی کامیابی دے گا۔''

''لیکن تم نے بھی تو اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی ہے۔'' کنگ نے محبت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن کریڈٹ تو تمہیں ہی جاتا ہے۔'' ٹیبی نے کہا۔

''لیکن اس جدوجہد میں تم نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میں تو ہمت ہار چلا تھا لیکن تم نے میری ہمت بڑھائی مجھے کیری مکمل کرنے پر اکسایا۔'' کنگ نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' ٹیبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہال میں آرکسٹرا کی دھیمی دھیمی موسیقی گونج رہی تھی اور ٹیبی خود کو محبت کی وادی میں محسوس کر رہی تھی۔

''تم میری زندگی میں خدا کا بہترین تحفہ ہو ٹیبی...... تمہارے بغیر میں نامکمل تھا اور تم سے ملنے کے بعد ہی مجھ پر میری صلاحیتیں آشکار ہوئیں یا یوں کہہ لو کہ تم نے میری صلاحیتوں کو جلا بخش دی۔''

''یہ تو تمہارا بڑا پن ہے کنگ...... لیکن تم اپنی محنت سے ہی یہاں تک پہنچے ہو۔'' ٹیبی نے کہا پھر وہ چند لمحے خاموش ہو کر کچھ سوچتی رہی تھی۔

''ایک بات پوچھوں؟'' ٹیبی نے دھیرے سے کہا اس کی آنکھوں میں کچھ خوف کے سائے لہرائے تھے اسے ڈر تھا کہ کنگ اس کے اس سوال کا جواب نہیں دے گا جو وہ اب پوچھنے جا رہی تھی کیونکہ کنگ نے کبھی بھی کسی کو بھی اس سوال کا جواب نہیں دیا جب کہ وہ خود بھی اس کا جواب جاننا چاہتی تھی۔

''پوچھو۔'' کنگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یاد ہے۔ تمہارے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا جس کے بعد تم بالکل خاموش ہو گئے تھے اور کسی سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک ایکسیڈنٹ تھا لیکن کبھی کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایکسیڈنٹ کیسے ہوا تھا۔''

''یہ جان کر کیا کرو گی ٹیبی اب تو بہت وقت گزر گیا۔ میں اسے بھول جانا چاہتا ہوں۔'' کنگ نے اداس لہجے میں کہا۔

''لیکن میں جاننا چاہتی ہوں جون...... اس حادثے کی وجہ سے تمہاری زندگی بالکل بدل گئی تھی تم دنیا سے کٹ کر رہ گئے تھے اس وقت گھر پر بھی تم اکیلے ہوتے تھے کیونکہ تمہاری والدہ جاب کرتی تھیں۔ تمہارے کام کون کرتا تھا تمہاری مطلوبہ چیزیں تمہیں کون لا کر دیتا تھا؟''

''شاید میری ماں یا میرا کوئی دوست جو کبھی سامنے نہیں آیا۔'' کنگ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''مجھے بتاؤ...... میں اس بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''مجھے اب بھی صاف طور پر کچھ یاد نہیں ٹیبی، میں گھر میں اکیلا ہوتا تھا مجھے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ میں اپنے کمرے میں لگے بورڈ پر لکھ دیا کرتا تھا اور ہفتے کے آخر میں مجھے میری مطلوبہ چیزیں مل جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے مجھے آٹھ یا دس ڈالر بھی ملتے تھے جو میری میز پر رکھے ہوتے تھے۔''

''اوہ، تمہیں کون دیتا تھا؟'' ٹیبی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔ شاید میری ماں یا میرا کوئی دوست لیکن ان پیسوں کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں اکثر وہ پیسے باہر نالی میں پھینک دیا کرتا تھا کیونکہ ضرورت کی چیزیں مجھے مل جاتی تھیں تو پیسوں کا میں کیا کرتا؟'' جون نے کہا اور ٹیبی حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بولتا رہا۔ ''میں ہفتے میں

UUNOVELS.COM

صرف ایک بار باہر جاتا تھا، صرف جمعے کی رات کو۔ وہ بھی اپنی پسند کی کوئی مووی دیکھنے اور جب واپس آتا تھا تو بورڈ پر لکھی ہوئی میری مطلوبہ چیزیں میرے کمرے میں موجود ہوتی تھیں۔''

''حیرت انگیز۔'' ٹیبی نے کہا۔

''ہفتے میں ایک بار جب میں باہر جاتا تھا تو واپسی پر میرا گھر مجھے بالکل صاف ستھرا ملتا تھا۔ صفائی کون کر جاتا تھا میں نہیں جانتا۔'' کنگ نے کہا، ٹیبی غور سے سن رہی تھی۔

''اگر بتانا نہیں چاہتے تو ان باتوں کو چھوڑو، سڑک حادثے کے بارے میں بتاؤ۔ وہ ایکسیڈنٹ کیسے ہوا تھا؟''

''آہ..... وہ ایکسیڈنٹ۔'' کنگ نے دماغ پر زور دیتے ہوئے دہرایا۔ ''میں اس وقت اپنے دوست اسکیپر کے ساتھ اس کی مرسڈیز میں بیٹھا تھا۔'' کنگ نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم گھر جا رہے تھے کہ اس کی کار بے قابو ہو کر ایک قریبی نہر میں گر گئی۔ اس کے پھیپھڑوں میں پانی چلا گیا تھا میں سمجھا کہ وہ ڈوب گیا ہے۔ میں کسی طرح کار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہیں پڑا رہا تھا بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ مر گیا ہے اس کے سر میں زیادہ چوٹیں آئی تھیں بعض کا خیال تھا کہ اس کی موت ایکسیڈنٹ سے ہوئی اور کچھ کا کہنا تھا کہ اس نے خودکشی کی لیکن مجھے اس بات پر یقین نہیں وہ زندگی سے پیار کرتا تھا اور اس کی رونقوں میں کھو جانا چاہتا تھا وہ خودکشی نہیں کر سکتا تھا۔''

''اور تم اس کی ہر ایکٹی وٹی کا حصہ ہوتے تھے۔ اس کے دوست تھے؟'' ٹیبی نے پوچھا اسے کنگ کی آنکھوں میں آنسو نظر آ رہے تھے وہ اپنے دوست اسکیپر کو بہت چاہتا تھا۔

''ہاں یہ درست ہے۔'' کنگ نے جواب دیا۔ ہال میں سنائی دینے والی موسیقی کی آواز تیز ہو گئی تھی اور کنگ ٹیبی کا ہاتھ تھام کر ڈانسنگ فلور پر آ گیا تھا جہاں پہلے سے کئی جوڑے موسیقی کی دھن پر جھوم رہے تھے۔

اس واقعے کے چند روز بعد کنگ کو ایک ٹیلی ویژن کمپنی کی جانب سے انٹرویو کی کال آئی، وہ اس کی آڈیو بک Everythings Eventual پر پروگرام کرنا چاہتے تھے۔ یہ بک کچھ شارٹ اسٹوریز کا مجموعہ تھی جنہیں تین شخصیات نے پڑھا تھا لیکن بک کے شروع میں کنگ نے اپنے بارے میں کچھ معلومات دی تھیں یہ اسی زمانے کی باتیں تھیں جب وہ ایکسیڈنٹ کے بعد کومے میں چلا گیا تھا اور اس میں زندگی کی کوئی نشانی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے بڑے باکمال انداز میں اپنی اس زمانے کی کیفیات بیان کی تھیں۔

''بہت اندھیرا تھا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں، بالکل اسی طرح جیسے کسی بے ہوش شخص کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہے لیکن میں اپنے سر سے لے کر پاؤں کی ایڑیوں تک ایسی بو محسوس کرتا تھا جیسے میرے پاس کوئی موجود ہو میں اسے بے خبری یا بے ہوشی نہیں کہہ سکتا۔ میرا ذہن سوچتا تھا میں کون ہوں، میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں حرکت کیوں نہیں کر سکتا۔ میرے آس پاس بہت سے لوگ ہیں۔ مجھے آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ بہت آہستہ حرکت کرتے تھے کہ ان کی قدموں کی آہٹ بھی کم محسوس ہوتی تھی شاید مجھے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کبھی مجھے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی تھی اور میں سوچتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں انہیں محسوس کر سکتا تھا لیکن نہ بول سکتا تھا اور نہ حرکت کر سکتا تھا۔ کبھی میرا بیڈ حرکت کرتا جیسے مجھے کہیں لے جایا جا رہا ہو پھر میری سمجھ میں آیا جیسے میں کسی اسپتال میں ہوں۔ ذہن میں عجیب خیالات آتے مجھے لگتا میرا آپریشن کیا جا رہا ہے اگر ایسا تھا تو میں بول کیوں نہیں سکتا تھا، دیکھ کیوں نہیں سکتا تھا۔ مجھے آوازیں سنائی دیتی تھیں جیسے کوئی نسوانی آواز کہہ رہی ہو۔'' آج تم بہت اچھے لگ رہے ہو ڈاکٹر۔''

''مجھے سات بجے شام ایک بچے کو دیکھنا ہے۔'' جواب سنائی دیتا۔ لیکن میرے ذہن میں اندھیرا تھا میں نے کئی بار چیخنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میری زبان تالو سے چپٹ گئی تھی میں نے اس حالت میں دعا مانگی۔ میرے خدا میری روح کو واپس میرے جسم میں ڈال دے۔ میں حرکت کر سکوں کوئی آواز نکال سکوں کہ دوسروں کو احساس ہو کہ میں زندہ ہوں''

اپنی پوری کہانی میں اس نے بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح کومے میں ہونے کے باوجود خود کو زندگی کی طرف لانے کی کوشش کرتا رہا اور آخر کار خاصی حد تک کامیاب ہو گیا۔ شروع میں اسے اپنے بازو میں سوئی لگنے کا درد محسوس ہوا پھر اس نے اپنے پاؤں کا انگوٹھا ہلایا اور آہستہ آہستہ اس میں زندگی کی نشانیاں نظر آنے لگیں اور پھر وہ کچھ ڈاکٹرز کی اور کچھ اپنی کوشش سے ہلنے جلنے کے قابل ہو گیا اور زندگی کی طرف اس کا سفر شروع ہو گیا۔

اپنی کہانی پڑھنے کے بعد کنگ خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا پروگرام کا اینکر اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں کنگ کی دوسری زندگی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ اینکر نے سوال کیا۔ ''اپنی ریکوری کے کتنے دن بعد

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

آپ پھر سے لکھنے کے قابل ہو سکے؟'' اینکر نے پوچھا۔

''تقریباً چھ ماہ بعد۔ لیکن لکھنے کے لیے نئے نئے خیالات میرے ذہن میں آتے رہتے تھے۔''

''آپ کے خیال میں لکھنے کے لیے سب سے زیادہ اہم کیا بات ہے؟''

''میرے خیال میں لکھنے کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ رائٹر چاہے طالب علم ہو یا تجربہ کار، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی سے اہم ترین چیزوں سے دستبردار ہو جائے جیسے پیار، کوئی تقریب کوئی رشتہ، کوئی اور اہم معاملہ آپ کو ہر چیز سے توجہ ہٹا کر صرف لکھنے پر توجہ دینا ہوتی ہے تب ہی آپ شاہکار تخلیق کر سکتے ہیں۔''

''لکھنے کے لیے آپ کے دماغ میں آئیڈیاز کہاں سے آتے ہیں؟''

''اس کا میں کوئی ایک جواب نہیں دے سکتا کبھی یہ آئیڈیاز مجھے عام روزمرہ زندگی سے مل جاتے ہیں اور کبھی خوابوں سے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں تو مجھے پتا نہیں ہوتا کہ وہ کتاب مکمل بھی ہو سکے گی یا نہیں پھر میں لکھتا چلا جاتا ہوں اور کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔''

''زندگی میں کسی عام واقعے سے آپ کو لکھنے کی تحریک ملی ہو اس کی کوئی مثال دے سکتے ہیں؟''

''ہاں پچھلے دنوں میں ایک سفر میں تھا کہ اوکلوہاما کے مقام پر ایک میکڈونلڈ ریسٹورنٹ کے پاس رکنا ہوا، وہاں باہر بورڈ لگا تھا انہیں کچھ ملازمین کی ضرورت ہے۔ باہر سینکڑوں کی تعداد میں لوگ جمع تھے اور اس کوشش میں تھے کہ انہیں اندر جانے کا موقع ملے۔ اچانک ایک کار آ کر رکی جس میں سے ایک لڑکی اتری اور وہ مجمع میں جگہ بناتی لوگوں کو دھکے دیتی آگے بڑھتی ہوئی آئی اور ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ باہر آئی تھی اور اپنی کار میں بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی تھی وہ شاید ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور انتظار میں باہر کھڑے لوگ کھڑے ہی رہ گئے تھے۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس لڑکی کے بارے میں لکھوں گا۔ میں اپنے سامنے پیش آنے والے واقعات کو دیکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں اور پھر ان میں سے اپنے لیے اچھا عنوان چن لیتا ہوں۔''

''پھر آپ نے اس عورت کے بارے میں لکھا؟''

''ہاں، میں نے لکھا۔ ٹھیک نو مہینے بعد میں اس عورت پر ناول لکھ چکا تھا اور میں نے اپنے خیال میں اس ریسٹورنٹ کے باہر موجود تمام لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا جنہوں نے اس عورت کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا اور وہ وہاں سے کامیاب ہو کر چلی بھی گئی تھی۔'' کنگ کے جوابات اتنے مکمل ہوتے کہ اینکر کو سوال در سوال کی ضرورت محسوس ہوتی اس لیے وہ اگلا سوال کر دیتا۔

اس سوال کی وجہ یہ بھی تھی کہ کئی نقادوں نے تبصرے میں لکھا تھا کہ ایسا لگتا ہے، کنگ کا وہ دوست جو بچپن میں مر گیا تھا وہ مدد کرتا ہے۔ اس کی روح معاونت کرتی ہے ورنہ روح کے بارے میں اتنی باریک بینی سے کوئی لکھ نہیں سکتا۔

''آپ کی زیادہ تر کتابیں تصورات پر مبنی ہیں یا حقیقت پر؟''

''میری زیادہ کتابوں کے موضوع تصوراتی ہیں زیادہ کتابوں پر موویز بھی بن چکی ہیں۔ مووی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آپ واش اوور کر دیتے ہیں۔ آپ جس کریکٹر کے بارے میں لکھ رہے ہوں اس کی زبان بھی آپ کو آنا چاہیے جب آپ لکھتے ہیں تو کئی بار آپ ریجیکٹ بھی کرتے ہیں اور خود بھی ریجیکٹ ہوتے ہیں تب ایک ناول مکمل ہوتا ہے۔''

''آپ نے کبھی کوئی فلم کم وقت میں بھی لکھی؟''

''ہاں، میری ایک مووی ''آرنلڈ آرنلڈ'' کے نام سے بنی وہ میں نے ایک ہفتے میں لکھی تھی لیکن میرے ساتھ میرا دوسرا ساتھی بھی تھا پھر دونوں نے مل کر لکھی تھی۔ مجھے لوگوں کو خوفزدہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں اپنی ایک ہی پہچان رکھنا چاہتا ہوں۔ میری پہلی کتاب carrie بہت خوف والی فلم تھی اسے پسند بھی کیا گیا اور وہ میری پوری زندگی پر چھا گئی۔ میں نے خوف کو ہی اپنا موضوع بنا لیا دراصل میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنا آسان ہوتا ہے۔'' اس انٹرویو کی خوبی یہی تھی کہ اینکر کے سوالات اس کے اندر چھپے کنگ کو باہر لے آتے تھے۔

''کیا آپ نے کوئی ایسی کتاب پڑھی جس سے آپ بہت متاثر ہوئے؟''

''ہاں مجھے نام یاد نہیں لیکن میں نے ایک کتاب پڑھی جس کا آخری جملہ مجھے یاد رہ گیا۔ Sailor would save the boy but who save the sailor میں نے وہ کتاب دوبارہ پڑھی۔''

''آپ کو کن چیزوں سے خوف محسوس ہوتا ہے؟'' اینکر نے خوف کا ماحول پیدا کر کے کامیابی حاصل کرنے والے سے پوچھا۔

UUNOVELS.COM

"مجھے مکڑی، سانپ، موت اور اپنی سانس سے خوف محسوس ہوتا ہے۔" کنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے ہر انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی چیز سے خوف زدہ ضرور ہوتا ہے۔"

"آپ کا ہر ناول دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔"

"ہاں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہر بار کچھ نیا لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"آپ اپنی کتابوں کے لیے کردار کیسے بناتے ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب اپنے اندر ایک اچھی شخصیت بھی رکھتے ہیں اور میں اسی پر لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے ایک کردار لکھا Holly the mumbler" وہ ایک ایسی عورت کو دیکھ کر لکھا جو منہ ہی منہ میں ہلکے ہلکے بڑبڑانے کے انداز میں بولتی تھی میں نے اس کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا اور پھر اس میں خوف کا عنصر شامل کر دیا میرا ماننا ہے کہ

you begin by observing

you have to look

you have to see

"لوگوں کو بغور دیکھیں، کوئی ناخن نوچتا ہے، کوئی تنکا دانتوں میں ڈالتا ہے، کوئی سگریٹ مروڑتا ہے، ہر کوئی کچھ نہ کچھ عجیب حرکت کرتا ہے جو اسے دوسروں سے نمایاں کرتی ہے۔" اس نے نفسیات کا اہم کلیہ سامنے لا دیا۔

"آپ جو ہارر اسٹوریز لکھتے ہیں......"

کنگ نے بات کاٹی۔ "آپ کی تصحیح کر دوں۔" کنگ نے میزبان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل سسپنس لکھتا ہوں لیکن لوگ اسے ہارر کہتے ہیں۔"

"کیا آپ بتا سکیں گے کہ سسپنس اور ہارر میں کیا فرق ہے؟" ہوسٹ نے جھک کر پُراسرار انداز میں پوچھا۔

"ہارر میں ہمیں اکثر ہنسی بھی آ جاتی ہے وہ خوفناک ہوتے ہوئے بھی مزاح کے قریب ہوتا ہے جبکہ سسپنس سنجیدہ ہوتا ہے۔ اس میں ہنسی نہیں آتی بلکہ پڑھنے اور دیکھنے والوں کی آوازیں بند ہو جاتی ہیں۔ سینے میں دل تیزی سے دھڑکتا ہے اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔"

"آپ کے ذہن میں آئیڈیاز کیسے آتے ہیں؟" اس نے پھر اسی نکتے کو اٹھایا جسے کنگ نے واضح نہیں کیا تھا۔

"یہ میں نہیں جانتا، جیسے یہ نہیں جانتا تھا کہ میری آنکھوں کا رنگ مجھے کہاں سے ملا ہے، میری ماں مجھے کہانیاں سناتی تھی، میرا باپ کہانیاں لکھتا تھا، میرے ذہن میں آئیڈیاز خودبخود آتے ہیں۔ میں لکھتا ہوں اور عوام کو دے دیتا ہوں۔"

"کیا آپ جیسے چاہیں کردار بنا سکتے ہیں؟"

"ہاں، میں بنا سکتا ہوں۔ بعض اوقات میں اپنے کردار سے خود خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ جب میں جوان تھا، یہ 50ء کی بات ہے۔ میں نے ایک کردار لکھا جو سیریل کلر تھا۔ میری والدہ کے ہاتھ میری کتاب لگ گئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تم اس سبجیکٹ میں کیوں دلچسپی لیتے ہو؟"

"تو آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا کہ بعض اوقات میں اپنے خطرناک کرداروں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آپ میں لکھنے کا شوق کب اور کیسے پیدا ہوا؟"

"جب میں نو یا دس سال کا تھا تب میری والدہ میرے بھائی کو اور مجھے کہانیاں سناتی تھیں۔ میں بہت دلچسپی سے سنتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ میں بھی ایسا ہی لکھوں اور لوگ پڑھیں۔ کہانیاں لکھنے کو مہمیز کیا تھا میرے والد کی ڈائری نے۔ اس ڈائری میں والد کی کچھ کہانیاں تھیں، انہیں پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ یہی میری منزل ہے۔ ایسی کہانیاں میں بھی لکھ سکتا ہوں۔"

"آپ کے خیال میں آپ کے قارئین کی نظر میں کون سی چیز قابلِ ستائش ہے جسے وہ بہت پسند کرتے ہیں؟"

ایسے واقعات جو تقریباً ناممکن ہوں۔" مثلاً اگر کوئی بچہ مرجاتا ہے تو اس کے والدین کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندہ ہو جائے جو عام حالات میں ناممکن ہے لیکن فنکشن میں ایسا ہوتا ہے اور یہی کہانی بنتی ہے اسے لوگ پسند بھی کرتے ہیں۔"

"کیا کبھی آپ نے اپنی کسی کہانی میں اپنے ذاتی خوف کو بھی موضوع بنایا ہے؟"

"ہاں کئی بار ایسا ہوا ہے۔ میری ایسی کہانیوں میں Rainy season اور دوسری The moving finger قابل ذکر ہیں۔"

"آپ کی کہانیوں پر جو فلمیں بنتی ہیں اگر ان میں کوئی تبدیلی کر دی جائے تو آپ کو کیسا لگتا ہے؟"

"اچھا نہیں لگتا۔ میری ایک فلم The shining ہے اس میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں اور وہ ناکام ہوگئی۔ وہ لوگ اس کی کہانی کو سمجھ نہیں پائے۔"

"کیا آپ نے اپنی کسی فلم میں کام بھی کیا ہے؟"

UUNOVELS.COM

"ہاں میں نے stand اور kojack میں کام کیا ہے۔"

"آپ کو حقیقی زندگی میں کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟" اپنے قلم کی قوت سے خوف پیدا کرنے والے سے خوف کے متعلق پوچھا گیا۔

"بچوں سے، وہ سمجھتے ہیں کہ اچھی کوالٹی کیا ہے۔ انہوں نے بہت سے لکھنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور میں چاہتا ہوں کہ لوگ ہمیشہ مجھے اچھا ناول نگار سمجھیں۔"

"آپ کی زندگی میں کس چیز کی زیادہ اہمیت ہے؟"

"میرے لیے پیسا بھی اہم نہیں رہا، جب میں غریب تھا۔ میرے ساتھ میرے والد نہیں تھے۔ میری والدہ ملازمت کر کے مجھے اور میرے بھائی کو پال رہی تھیں تب مجھے ہفتے میں سات ڈالر ملتے تھے جن کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی اور میں انہیں گٹر میں بہا دیتا تھا کیونکہ دولت کتنی بھی ہو ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔"

"پھر آپ کی نظر میں کون سی چیز اہم ہے؟"

"میرا کام...... مجھے لکھنے سے عشق ہے کیونکہ میں جو لکھ دوں گا وہ میرے مرنے کے بعد بھی پڑھا جائے گا اور میرا نام لوگوں کو یاد رہے گا۔ میرے پاس آج دولت بھی ہے، گھر بھی، گاڑیاں بھی، غرض زندگی کی ہر آسائش موجود ہے میرے پاس میرا آفس اور میرا اپنا اسٹاف ہے میں جب چاہوں اور جو چاہوں لکھ سکتا ہوں ہمیشہ اپنی مرضی سے لکھتا ہوں۔"

"آپ کے آخری دو ناول قارئین کے مطابق بہت اہم ہیں۔"

"ہاں ایسا ہے...... لوگوں نے انہیں بہت پسند کیا ہے۔"

"آپ اتنا پاگل کرنے والا کیوں لکھتے ہیں؟"

"میں حقیقت لکھتا ہوں اور کبھی بور نہیں ہوتا۔ مجھے یہ چیز خوش رکھتی ہے کہ میں ایک پاپولر ناول نگار ہوں حالانکہ یہ کام بہت مشکل ہے۔"

"جب آپ کوئی کہانی لکھنا شروع کرتے ہیں تو کیا آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"ہاں زیادہ تر مجھے معلوم ہوتا ہے۔"

"کیا آپ ناول شائع ہونے سے پہلے اس پر کسی کی رائے بھی لیتے ہیں؟"

"جی ہاں اپنی بیوی ٹیبی کی...... وہ بہت سخت ہے، میرے کام میں خامیاں نکالتی ہے اور اچھے مشورے بھی دیتی ہے۔"

"آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ اپنے ناول میں قتل ہونے والوں کی فہرست بھی آپ بناتے ہیں؟"

"ہاں یہ درست ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے۔" کنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک کتاب لکھی جس میں ایک سرجن ڈاکٹر ایک جزیرے میں تنہا پھنس جاتا ہے۔ وہ خود کو جگہ جگہ سے کاٹ کر کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے میں نے اپنے پڑوس میں رہنے والے ایک سرجن ڈاکٹر سے پوچھا کہ ایک انسان اپنے جسم کو کہاں کہاں سے تھوڑا تھوڑا کاٹ سکتا ہے کہ اس کی موت واقع نہ ہو اور وہ زندہ رہے، بس ایسی حرکتوں پر لوگ مجھ سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔"

"تمہیں کس چیز کا ڈر رہتا ہے؟"

"کہ کہیں میرے بچے مر جائیں، کبھی کسی رات کوئی پولیس افسر آ کر یہ نہ بتائے کہ تمہارا کوئی بچہ خطرے میں ہے۔" کنگ نے کہا۔

"آپ نے اتنا پیسا بنا لیا جتنا آپ بنانا چاہتے تھے اور اب اس پیسے سے آپ جو بنانا چاہیں وہ بنا سکتے ہیں۔ اب مزید کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

اب میں کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ سوائے لکھنے کے ویسے مجھے انڈین فوڈ بہت پسند ہے۔ خاص طور سے پلاؤ...... میں اپنی پسند کے یہ کھانے کھانا چاہتا ہوں۔ you die or you hijack yourself to die.

اس انٹرویو کے بعد کنگ کے لگاتار انٹرویوز شروع ہو گئے ہر ٹی وی چینل اس پر پروگرام کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کا نام اور اس کی کتابیں ادب میں خاص مقام بنا چکی تھیں۔ ایک موقع پر ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ شوقیہ لکھتے ہیں یا یہ آپ کے خون میں شامل ہے۔ یعنی آپ سے پہلے آپ کے خاندان میں بھی کوئی رائٹر ہوا ہے؟ تو اس نے کہا لکھنا میری سرشت میں شامل ہے۔ مجھ سے پہلے میرے والد بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کی کہانیاں ایک میگزین میں شائع ہوتی تھیں۔ آپ اگر ایسے ماحول میں پلیں بڑھیں جہاں آپ کے گرد کتابیں ہوں، لکھا جا رہا ہو، ٹی وی پر بھی اسی کے تذکرے ہوں تو آپ لامحالہ اس طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، پھر مجھے اللہ تعالیٰ نے بیوی ایسی دی جسے لکھنے سے شوق ہے اس کی بھی پانچ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور اب میرا بیٹا owen king بھی لکھ رہا ہے۔"

"72 سال کی عمر میں آپ نے 61 کتابیں لکھی ہیں

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کیا اب ریٹائر ہونا نہیں چاہیے؟''

''نہیں، ریٹائر ہونے کا خیال میرے دل میں کبھی نہیں آیا۔ لکھنے کا پیشہ ایسا ہے کہ جیسے جیسے آپ کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے آپ اپنے کام کو زیادہ انجوائے کرنے لگتے ہیں اور جتنا ہم جب تک چاہیں لکھ سکتے ہیں۔'' کنگ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ جس پر آپ کو اپنے رائٹر ہونے پر فخر محسوس ہوا ہو؟'' اینکر نے بھی مسکراتے ہوئے سوال جڑ دیا۔

''ہاں، ایک بار میں اور اسٹیفن لوئیس (مشہور سنگر) ایک ساتھ ایک تقریب میں شریک تھے۔ میں اپنے معمول کے مطابق جینز اور شرٹ پہنے ہوئے تھا اور لوئیس بہت شاندار سوٹ میں تھا۔ اس نے مہنگی گھڑی اور عینک لگائی ہوئی تھی۔ اس کی پتلون میں لگی ہوئی بیلٹ بھی خاصی قیمتی تھی اور انداز میں فخر، وہ ہر کسی سے ہاتھ لہرا لہرا کر بات کر رہا تھا کہ اچانک وہاں ایک اٹھارہ سالہ خوب صورت لڑکی آگئی۔ اس نے ہاتھ میں ایک ڈائری اور پین پکڑا ہوا تھا۔ میں اور لوئیس قریب قریب ہی بیٹھے تھے اس نے ہماری طرف دیکھا۔

''اوہ...... میں آپ کا انٹرویو لوں گی اور مجھے آپ کا آٹو گراف بھی چاہیے۔'' اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرا دل زور سے دھڑکا، اتنی خوب صورت لڑکی میرا انٹرویو لینا چاہتی ہے اور ساتھ میں آٹو گراف بھی۔ میں مسکرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی لوئیس نے بڑے فخریہ انداز میں گردن کو اکڑاتے ہوئے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ لڑکی تیزی سے آگے بڑھی اور لوئیس کے قریب سے گزرتی ہوئی میرے سامنے آرکی تھی۔ لوئیس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔''

''آٹو گراف پلیز...... آپ بہت زبردست لکھتے ہیں۔'' اس لڑکی نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''آپ کا ناول تو ہاتھ سے رکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ آپ اتنا خوفناک لکھتے ہیں کہ ہم پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ڈر لگنے لگتا ہے۔''

''لیکن میں تو برسوں سے لکھ رہا ہوں۔ مجھ پر تو کبھی خوف طاری نہیں ہوا، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ میرے جواب پر وہ ہنس دی تھی اور پھر میرا انٹرویو شروع کر دیا تھا۔ لوئیس نے برا سا منہ بنایا... اور وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں قارئین میں کتنا مقبول ہو چکا ہوں۔''

''جب بھی آپ کوئی نیا کردار تخلیق کرتے ہیں تو اس میں حقیقت کا رنگ کیسے بھرتے ہیں؟'' لڑکی نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

''میں کردار کا تفصیلی جائزہ لیتا ہوں اور خود کو اس کے رنگ میں ڈھال لیتا ہوں یا یوں سمجھ لیں کہ اس کے اندر اتر جاتا ہوں۔'' کنگ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اور جب کہانی لکھ چکتے ہیں تو اس کردار سے باہر کیسے آتے ہیں؟''

''میں ایک ایسے رائٹر کی کہانی جانتا ہوں جو کہانی لکھنے کے بعد اس کردار سے باہر نہیں آسکا لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ میں آرام سے یہ کام کر لیتا ہوں۔ میرا رشتہ باہر کی دنیا سے جڑا رہتا ہے لیکن میں لکھنے میں اتنا منہمک ضرور ہو جاتا ہوں کہ اگر میرے قریب آگ لگ جائے تو دھواں خود تک پہنچنے تک مجھے اس کا احساس نہیں ہوتا۔''

اس روز شو سے واپسی پر جب کنگ اپنی بیوی کے ساتھ کار میں واپس جا رہا تھا تو ایک جگہ اس کی کار کے سامنے والی کار کے رک جانے کی وجہ سے بلاک ہو گئی اگلی کار آگے نہیں جا سکتی تھی شاید اس میں کچھ خرابی ہو گئی تھی کنگ اپنی کار سے اتر کر اس کی طرف بڑھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس کی بیوی ٹیبی نے اسے ٹوکا۔

''دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے۔'' کنگ نے جواب دیا۔

''چھوڑو...... تمہیں کیا ضرورت ہے۔''

''نہیں...... نہیں کوئی بات نہیں پتا تو کرنا چاہیے۔'' کنگ نے کہا اور پھر ٹیبی کی بات سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔

''کیا بات ہے دوست؟'' کنگ نے آگے والی کار میں بیٹھے شخص سے کہا جو حیثیت سے خاصا امیر نظر آرہا تھا اس نے قیمتی کوٹ اور جوتے پہنے ہوئے تھے۔

''میری کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے میرا ڈرائیور بھی ساتھ نہیں آج میں اکیلا ہی نکلا ہوں اور مجھے جلدی ایک تقریب میں پہنچنا ہے۔''

''تو ٹائر بدل لو دوست۔ جلدی کرو، مجھے بھی راستہ مل جائے گا۔''

''لیکن میں ٹائر نہیں بدل سکتا۔''

''کیوں؟''

''میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔''

''پھر؟''

''کیا تم میری کار کا ٹائر بدل سکتے ہو؟''

UUNOVELS.COM

"میں؟"

"ہاں تم..... اگر تم ٹائر بدل دو گے تو میں تمہیں دس ڈالر دوں گا۔"

"دس ڈالر۔" کنگ نے دہرایا۔

"ہاں اور اگر تم زیادہ تیزی سے کام کرو گے اور ٹائر جلدی بدل دو گے تو میں بیس ڈالر دوں گا۔"

"بیس ڈالر؟" کنگ نے کہا حالانکہ اب اس کی نظر میں اس رقم کی کوئی اہمیت نہیں تھی اسے ایک کتاب کے لاکھوں ڈالرز ملتے تھے لیکن اس نے یہ پیشکش قبول کرلی اور اپنی کار سے کچھ سامان نکال کر لایا۔

"کیا ہوا؟" ٹیبی نے پوچھا۔

"کچھ سامان چاہیے میں اس کی کار کا ٹائر بدل رہا ہوں۔" کنگ نے جواب دیا۔

"تم کیوں ٹائر بدل رہے ہو؟" ٹیبی نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہیں کیا ضرورت ہے ٹائر بدلنے کی وہ خود اپنی کار کا ذمے دار ہے۔"

"کوئی بات نہیں ٹیبی کسی کی مدد کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔" کنگ نے کہا اور ٹائر بدلنے کے اوزار لے کر چلا گیا پھر اس نے بڑی تیزی سے کار کا ٹائر بدل دیا تھا اور کار کے مالک نے اسے بیس ڈالر معاوضہ ادا کردیا تھا جسے لے کر کنگ بہت خوش ہوا۔

"بدل دیا ٹائر؟" ٹیبی نے اس کے واپس آنے کے بعد پوچھا اگلی کار آگے روانہ ہو چکی تھی۔

"ہاں بدل گیا۔" کنگ نے فخریہ انداز میں کہا اور خوش ہوتے ہوئے ٹیبی کو بیس ڈالر دکھائے۔

"میں جانتی ہوں تم نے ان بیس ڈالرز کے لیے یہ کام نہیں کیا ہوگا تمہیں ان کی ضرورت نہیں ہے تمہارے پاس تمہاری کتابوں کے لاکھوں ڈالرز کی رائلٹی آتی ہے۔" ٹیبی نے منہ بنا کر کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے ٹیبی۔" کنگ نے پیار سے کہا۔ "لیکن تم جانتی ہو میں نے پچھلے بہت برسوں سے ناولیں لکھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا ہے اور یہ بیس ڈالرز میری محنت کی، خون پسینے کی پہلی کمائی ہے۔" کنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سچ کہا ہے کسی نے انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔" ٹیبی نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

1970ء میں کنگ نے اسٹوریز کی ایک سیریز لکھنا شروع کی جو Man in black کے نام سے پیش کی گئی۔

گوجر

گوجر پنجاب میں آٹھویں بڑی ذات ہیں۔ غالب ذاتوں میں سے صرف جٹوں، راجپوتوں اور پٹھانوں، آرائیوں کی مخلوط ذات اور برہمنوں، بھائیوں اور چوہڑوں سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ جنرل کننگھم انہیں مشرقی تاتاریوں کے ایک قبیلہ کشان یا یوچی یا توچاری کے ساتھ شناخت کرتے ہیں۔ کوئی ایک صدی قبل مسیح میں ان کے سردار نے کابل و پشاور کا علاقہ فتح کیا جب کہ اس کا بیٹا ہیما کدفیس (جو پنجاب کے سکہ شناسوں میں کافی مقبول ہے) نے سارے بالائی پنجاب اور نیچے متھرا اور وندھیاس تک جمنا کے کناروں پر اپنا غلبہ قائم کرلیا اور اس کے بعد آنے والے پہلے بدھسٹ انڈو، سیتھین شہزادے، کنشک نے کشمیر کو بھی سلطنت توچاری میں ملالیا۔ توچاری یا کشان تولی کے Kaspeiraei ہیں اور دوسری صدی عیسوی کے وسط میں کسپیرا کسیپ پور یا ملتان چند اہم شہروں میں سے ایک تھا۔ غالباً تیسری صدی عیسوی کے اوائل میں سفید ہنوں کے حملوں نے مغرب میں متحدہ یوچی کے آخری بادشاہ کو واپس بلالیا اور اس نے آزاد صوبہ کا انتظام اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دیا جس کا صدر مقام پشاور میں تھا۔ اس وقت کے بعد سے کابل کے یوچی بطور بڑے یوچی جانے جاتے ہیں اور پنجاب والے بطور کثور یا چھوٹے یوچی۔

مرسلہ: قرۃ العین زینب۔ ملتان

پہلے یہ ایک میگزین میں قسط وار شائع ہوئی اور اس کے بعد ٹی وی پر۔ اس کہانی پر فلمیں بھی بنائی گئیں۔ یہ کہانیاں فینٹسی اور فکشن پر مشتمل تھیں۔ کنگ نے یہ کہانیاں 1981 تک چار دہائیوں پر محیط عرصے میں لکھیں۔ اس عرصے میں کنگ نے بہت سے شارٹ ناولز بھی لکھے۔

کنگ اور اس کی بیوی ٹیبی کا اپنا ایک ریڈیو اسٹیشن بھی ہے جس کا نام zone redio ہے اور یہ کمپنی "مین" کے علاقے میں اپنے تین ریڈیو اسٹیشنز رکھتی ہے جن میں سے ایک WKIT ہے جو کلاسک قسم کے میوزک کے پروگرام نشر کرتا ہے اور اسٹیفن کنگ کے روک اسٹیشن کے نام سے مشہور ہے۔

اسٹیفن کو بیس بال گیم سے بھی بہت دلچسپی تھی اس نے بوسٹن ریڈ سوکس کے حوالے سے ایک کہانی بھی لکھی تھی بلکہ ایک فلم کی کہانی بھی لکھی تھی جس کا ہیرو بیس بال کا کھلاڑی تھا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

1999ء میں کنگ کا ایک وین سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ جگہ اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہ واقعہ Main کے علاقے ہی میں پیش آیا تھا۔ کنگ اس حادثے میں نا صرف کومے میں چلا گیا بلکہ اس کا ایک پھیپھڑا بے کار ہو گیا اور اس کے کولہے اور ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور سر میں بھی گہرا زخم آیا۔ کنگ نے اس وین کے ڈرائیور کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے اپنے وکیل سے کہہ کر وہ وین 1500 ڈالرز میں خرید لی اس کے بعد کنگ نے ایک بیان بھی دیا تھا۔ ''ہاں، میں نے وین خرید لی ہے اور اب میں ایک بڑا ہتھوڑا لوں گا اور اس وین کو روز مارا کروں گا۔''

جب وہ بچہ تھا تو اس کا ایک دوست ٹرین کے نیچے آ کر مارا گیا۔ کنگ کے پُراسرار ذہن نے اس پر بھی کہانیاں بنا لیں اور اصل زندگی کے واقعے میں اپنی ذہن میں پیدا ہونے والے پُراسرار خیالات شامل کر کے کئی کہانیاں لکھ دیں اس طرح کی کہانیوں میں اس کی ایک کہانی The body قابلِ ذکر ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ اس کی بہت سی کہانیوں پر اثر انداز نظر آتا ہے جب کہ خود کنگ کا کہنا ہے کہ اسے اس واقعے کی کوئی تفصیلات یاد نہیں اس نے اس سلسلے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میری ماں کے کہنے کے مطابق میں پڑوس کے ایک لڑکے کے ساتھ کھیلنے ایک گھر میں گیا ہوا تھا جو ریلوے لائن کے قریب واقع تھا۔ ایک گھنٹے بعد میں واپس آ گیا تھا۔ ان کے مطابق میرا رنگ کسی مردہ شخص کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ میں نے سارا دن کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی اور جب مجھ سے پوچھا گیا کہ میں نے گھر فون کر کے اپنے واپس آنے کے بارے میں مطلع کیوں نہیں کیا تھا تب بھی میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ میرے دوست کی والدہ ہمیشہ کی طرح مجھے گھر واپس چھوڑنے کیوں نہیں آئی تھیں اور میں تنہا واپس کیوں آیا تھا۔''

''میں نے کئی سال بعد اپنی والدہ کو بتایا تھا کہ ہم ریلوے لائن پر کھیل رہے تھے اور بار بار ریل کی پٹڑیوں پر سے چھلانگیں لگا رہے تھے۔ وہ مجھ سے آگے نکل گیا تھا۔ میری ماں نے بہت سالوں بعد مجھے بتایا تھا کہ اس کے ٹکڑے انتظامیہ کے لوگوں نے پٹڑی سے اٹھا کر باسکٹ میں جمع کیے تھے۔ میری والدہ کبھی نہیں جان سکیں کہ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا اس وقت میں اپنے اس دوست کے ساتھ تھا یا نہیں شاید انہوں نے اس بارے میں کوئی وجہ خود ہی سوچ رکھی ہو لیکن مجھے کچھ یاد نہیں۔''

کنگ نے 2012ء میں اپنے ایک دوست رائٹر John Mellen camp کے ساتھ مل کر انڈیانا میں ایک گھر خریدا تھا جو روحوں کے اثرات کی وجہ سے مشہور تھا۔ کنگ نے اپنے تین دوستوں کے ساتھ مل کر اس پر کہانیاں لکھیں لوگوں کا کہنا تھا کہ اس گھر میں رہنے والے تین بچے قریبی جنگل میں کھیل رہے تھے کہ ایک بچے کو گولی لگی اور وہ مر گیا بچنے والے لڑکے اور لڑکی نے اپنی کار میں بیٹھ کر جان بچائی اور مدد لینے چلے گئے لیکن جلد بازی یا خوف کی وجہ سے کار قابو میں نہ رکھ سکے اور ایک درخت سے ٹکرا گئے ان کی موت موقع پر ہی ہو گئی اور اب ان کی روحیں اس مکان میں اور اس کے گرد منڈلاتی ہیں۔

کنگ کو لکھنے کے ساتھ ساتھ میوزک کا بھی شوق تھا وہ اپنے فارغ اوقات میں ایک میوزک بینڈ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اسے گٹار بجانے کا شوق تھا۔ یہ میوزک بینڈ مشہور رائٹرز نے مل کر بنایا تھا اس کا نام The Rock Bottom Remainders ہے۔ یہ 1992ء سے کام کر رہا ہے اور سال میں ایک بار مختلف شہروں کا دورہ بھی کرتا ہے۔

کنگ نے اپنی تحریروں میں Maine کے بارے میں بہت لکھا ہے کیونکہ وہ چیڑ کے درختوں کی اس ریاست کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ وہاں پیدا ہوا، پلا بڑھا وہیں تعلیم حاصل کی اور اب بھی وہیں رہتا ہے اس کا ایک خوب صورت سا قلعہ نما گھر ہے، جس کا ذکر اس نے اپنی کئی کتابوں میں بھی کیا ہے۔

1980ء کی ساری دہائی میں کنگ منشیات کے نشے میں مست رہا اس وقت کے متعلق بات کرتے ہوئے اس نے تسلیم کیا کہ ''اس زمانے کے متعلق مجھے صرف ایک ناول Cujo یاد ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں میں جب بھی اپنے اس زمانے کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے مجھے یہ کتاب یاد ہے اور میری خواہش ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو اچھے حصے لکھے ہیں وہ ہمیشہ مجھے یاد رہیں۔''

اس کے بعد اس کی فیملی نے اس کی مدد کی اور اسے منشیات کے سیلاب سے باہر نکالا۔

کنگ کے بہت سے رائٹر ساتھیوں کا کہنا ہے کہ جب وہ Entertainment weekly میں کالم لکھتا تھا تو اس کے ساتھ دوسرے کئی رائٹر بھی شامل ہوتے تھے لیکن وہ ہمیشہ ان سب پر بازی لے جاتا تھا۔

کنگ فیملی میں اسٹیفن کنگ ہی اکیلا رائٹر نہیں ہے اس

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کی بیوی ٹیبتھا کنگ کئی ناول لکھ چکی ہے اس کا بیٹا جو کنگ جو اس کا بڑا بیٹا ہے اپنے والد کے نقش قدم پر بہترین قسم کے ہارر ناولز لکھتا ہے اور وہ Joc Hill کے قلمی نام سے لکھتا ہے۔ اس کا چھوٹا بیٹا Owen جس نے مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ لکھا ہے اس کے علاوہ اس نے اپنے والد کے ساتھ مل کر Sleeping beauties کے نام سے ایک ناول بھی لکھا ہے اس کے علاوہ Owen نے جس لڑکی سے شادی کی ہے وہ بھی رائٹر ہے۔ کنگ کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا نام Naomi ہے جو حکومتی اہم عہدے پر فائز ہے۔

2011ء میں امریکا کی جارج مسین یونیورسٹی میں مسین ایوارڈ کی تقریب میں کنگ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی کہانیوں میں اتنا ہارر اور سسپنس کیسے ڈالتے ہیں تو اس نے جواب دیا۔

”لوگ مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں اپنی تحریروں میں خوفناک واقعات، کردار اور مکالمے کثرت سے استعمال کرتا ہوں وہ کیوں اور کیسے کرتا ہوں تو اس کا جواب یہی ہے کہ لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ میں برسوں سے لکھ رہا ہوں اسے پسند کیا جارہا ہے اور میں نے اس سے ہی رقم بنائی ہے میں آپ کو ابھی ایک مثال دیتا ہوں۔

”فرض کریں آپ یہ پروگرام دیکھ کر واپس جارہے ہوں اندھیرا ہو اور آپ کی بیس منٹ میں کھڑی کار لاک نہ ہو۔ آپ اسے لاک کرنا بھول گئے ہوں۔“ کنگ نے کہا تو ہال میں موجود لوگوں پر سکتہ چھا گیا وہ ڈرانے والے انداز میں دھیمے دھیمے بول رہا تھا آواز میں خوف کا عنصر نمایاں تھا۔

”آپ چیک کرتے ہیں کار ان لاک ہے تو ممکن ہے کوئی قاتل، ڈاکو، چور آپ کی کار کی پچھلی سیٹ پر آپ کا انتظار کررہا ہو کہ آپ کے آتے ہی پیچھے سے آپ کی کنپٹی پر گن رکھ دے۔“

”اوہ..... نہیں.....“ ہال میں کئی آوازیں گونجیں۔

”چلو اگر ایسا نہ ہو تو آپ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ کسی نے کار ان لاک ہونے کی وجہ سے اس کی پچھلی اگلی سیٹوں کی تلاشی لی ہو اور آپ کے فلیٹ کی چابی اس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔“

”اوہ خدایا نہیں۔“ دو تین خوف زدہ آوازیں ابھریں اور کنگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔

”آپ اپنے فلیٹ میں پہنچتے ہیں ہر کمرے میں اچھی

UUNOVELS.COM

طرح چیک کرتے ہیں لیکن پھر باتھ روم کا خیال آتا ہے۔ اوہ وہاں کوئی چھپا ہو سکتا ہے۔'' کنگ خوفناک سرسراتی آواز میں کہتا ہے اور کئی لوگوں کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر محسوس ہوتی ہے۔

''میں جھوٹ تو نہیں بولتا..... ایسا ہوتا تو ہے نا؟..... یہ ممکن تو ہے نا؟'' کنگ آنکھوں میں شرارت سجائے مجمع کو گھورتا ہے۔ ''میں مانتا ہوں اس کے مواقع بہت کم ہیں لیکن یہ ممکن تو ہے۔''

''چلیں اگر یہ سب بھی نظر انداز کر دیں تو آپ کی اطلاع کے لیے میں کہیں جانے سے پہلے بار بار اپنا اوون چیک کرتا ہوں کہیں میں نے اسے کھلا تو نہیں چھوڑ دیا ممکن ہے آپ بھی آج.....'' کنگ نے بات ادھوری چھوڑ دی اور ہال میں موجود کئی لوگوں کے خوف زدہ قہقہے سنائی دیے۔ وہ جانتے تھے کہ کنگ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ محض خوف پیدا کرنا چاہتا ہے اور وہ اس میں کامیاب رہا تھا۔

''بس میں اسی طرح خوف زدہ کہانیاں لکھتا ہوں۔''

''آپ کا کوئی ایسا ناول جو آپ نے چھوٹے سے واقعے سے متاثر ہو کر لکھا ہو لیکن آپ زیادہ کامیاب رہے ہوں؟'' اس سے پوچھا گیا۔

''ہاں، میں ایک بار کلاراڈو جا رہا تھا۔ میں بائیک پر تھا اور راستے میں میری بائیک خراب ہو گئی۔ کسی شخص نے مجھے بتایا کہ آگے ایک فارم ہے وہاں کا گیراج مالک تمہاری بائیک ٹھیک کر دے گا۔ میں بائیک لے کر وہاں پہنچا فارم کا مالک بہت نخرے والا تھا۔ یہ مشکل بائیک ٹھیک کرنے پر راضی ہوا لیکن ساتھ ہی وہ مجھے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے سیٹی بجائی اور گیراج کے اندر سے ایک تیم تیم کتا برآمد ہوا تھا جو خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا تب اس شخص نے مجھے بائیک مرمت کرنے کی اجرت بتائی۔''

''20 ڈالر ہوں گے۔'' اس نے اکڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے خوف زدہ نظروں سے کتے کو دیکھتے ہوئے کہا جو مجھے دیکھ کر مسلسل غرّا رہا تھا۔

''لکی بہت اچھا ہے۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔'' لکی کے مالک نے کہا میں نے اثبات میں سر ہلایا اور لکی مجھے دیکھ کر بھونکا۔

''Sit lucky۔'' مالک نے کتے سے کہا تو وہ بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں مسلسل مجھ پر تھیں۔

''یہ شاید تمہیں پسند نہیں کرتا۔'' مالک نے مجھے ڈرانے والے انداز میں کہا۔

''میری بائیک ٹھیک ہو گئی میں نے اسے 20 ڈالر اجرت دی لیکن پھر میں نے اپنا ناول Kuju لکھا جو اس کتے پر تھا اور جس سے میں نے لاکھوں ڈالر کمائے۔''

1996ء میں کنگ کو O,Henry ایوارڈ سے نوازا گیا جو اسے اس کے ایک شہرۂ آفاق ناول Jeffery Deaver کا کہنا ہے کہ کنگ نے شارٹ اسٹوریز کو اہم مقام عطا کیا۔ وہ ہارر اور سسپنس لکھنے والوں میں استادوں کا استاد ہے۔

2003ء میں National Book Awards کی جانب سے اسے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا اس موقع پر Orson scott card کا کہنا تھا کہ ''کنگ کا لکھا ہوا انگلش لٹریچر میں ایک اچھا اضافہ ہے کیونکہ اسے شائع ہونے کے لیے لکھا گیا اور قارئین نے اسے پڑھا، پسند کیا اور تعریف کی۔''

2008ء میں کنگ کی ایک کتاب The New classic کو Entertainment ویکلی کے مطابق 1983ء سے 2008ء تک ریڈرز کی پاپولر کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ کنگ کے کہنے کے مطابق وہ ہر سال چار ملین ڈالرز لائبریریز، لوکل فائر ڈیپارٹمنٹس، اسکولوں اور آرٹس آرگنائزیشنز کو دیتا ہے۔ 2011ء میں Steplen and tabitha king foundation نے 2.8 ملین ڈالرز مختلف رضاکار تنظیموں کو دیئے اور پھر نومبر 2011ء ہی میں اس نے اپنی فاؤنڈیشن سے 70,000 ڈالرز مزید دیئے جو سردیوں میں Maine کے غریب لوگوں کی رہائشی ضروریات پوری کرنے کے لیے تھے۔

کنگ نے 1978ء سے لے کر 2013ء تک اپنی کتابوں، مضامین اور فلموں پر بے شمار انعامات حاصل کیے۔ 2014ء میں صدر اوباما نے اس کی بہترین کارکردگی پر انہیں میڈل سے نوازا۔ کنگ نے کئی بار اپنے ریٹائر ہونے کا اعلان کیا لیکن خود کو لکھنے سے دور نہیں کر سکا۔

2002ء میں اس نے کہا کہ یہ اس کے ناولز لکھنے کا آخری سال ہے اس کی کتابیں چند سال مزید شائع ہوتی رہیں گی جو وہ مختلف پبلی کیشنز کو دے چکا ہے۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

مارچ 2005ء میں اس نے ریٹائر ہونے کی افواہوں سے انکار کیا اور کہا کہ darktower سیریز کی وجہ سے وہ ریٹائر ہونا چاہتا تھا لیکن اب اس نے مزید لکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ ایک نیا ناول اکتوبر 2005ء میں The colorado kid منظر عام پر لا رہا ہے اور اب 2019ء میں اس نے اپنے برسوں پہلے لکھے گئے ایک ناول IT کو دو حصوں میں فلما کر پیش کیا ہے۔ IT کا دوسرا حصہ 2019ء میں عوام کے لیے پیش کیا گیا جب کہ یہ ناول کنگ نے 1986ء میں لکھا تھا۔ یہ بہت مقبول ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اب ایڈاپٹ کر کے دو حصوں میں فلمایا ہے اور عوام کے لیے پیش کیا ہے۔

اس ناول میں بچوں کا ایک گروپ دکھایا گیا ہے جسے The loser's club کا نام دیا گیا ہے۔ ان کا مقابلہ ایک عفریت سے ہوتا ہے جسے بچوں نے IT کا نام دیا ہے۔ یہ بلا انسانی خون اور انسانی خوراک پر پلتی ہے۔ خاص طور سے بچوں پر اور اپنے شکار تک پہنچنے کے لیے شکلیں بدلتی رہتی ہے لیکن ایک شکل میں زیادہ نظر آتی ہے وہ ہے penny wise جو ایک جوکر ہے۔

یہ فلم 6 ستمبر 2019ء کو ریلیز ہوئی اور اسی روز نیبی اسٹیفن کنگ کے ساتھ اس کا پہلا شو دیکھنے پہنچ گئی۔ وہ اندھیرے ہال کے اندھیرے بوکس میں کنگ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کنگ نے اپنی اس فلم کی اتنی تعریف کی تھی کہ اس کی نظریں اسکرین سے نہیں ہٹ رہی تھیں اس کے سامنے فلم کا پہلا سین منظر میں آ رہا تھا۔

ایک بچہ بارش میں پیلا برساتی کوٹ پہنے اپنی کاغذی ناؤ کے پیچھے بھاگ رہا تھا جو سڑک پر بہنے والے پانی میں آگے ہی آگے بہتی جا رہی تھی پھر اچانک وہ ناؤ ایک گٹر میں چلی گئی جس کا ڈھکن آدھا کھلا ہوا تھا بچہ وہیں بیٹھ گیا اور جھک کر گٹر کے اندر جھانکنے لگا۔ سڑک ویران تھی دور دور تک کسی ذی روح کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''آؤ...... جارجی...... تمہیں یہ ناؤ چاہیے۔'' گٹر کے اندر سے ایک جوکر کی شکل والا شخص جھانک کر کہتا ہے اور جارجی تجسس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ ہال میں بیٹھی نیبی کی سانسیں تیز ہو جاتی ہیں اور کنگ فلم میں پیدا کیا جانے والا خوف کامیاب ہوتے دیکھ کر مسکراتا ہے۔

''آؤ...... لے لو'' جوکر بچے سے بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ ہوتی ہے۔ جس سے ہمت پا کر بچہ آگے بڑھتا ہے اور ہاتھ گٹر کے ادھ کھلے ڈھکن میں ڈال دیتا ہے۔ تب ہی جوکر (پینی وائز) ایک خوفناک جانور کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اپنے تیز دانتوں

جابر رضی اللہ عنہ بن مسلم

صحابی الرسول۔ آپ کی کنیت ابو جری تھی۔ بنو تمیم سے تھے۔ اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک شخص کی رائے کو قبول کرتے جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا ''یہ کون ہے؟'' معلوم ہوا کہ رسول اللہ ہیں۔ میں نے آپ کے پاس جا کر کہا۔ ''علیکم السلام یارسول اللہ۔'' یہ سلام سن کر آنحضورؐ نے فرمایا کہ علیک السلام مردوں کا سلام ہے۔ السلام علیک یارسول اللہ کہا کرو۔ اس تعلیم کے بعد میں نے کہا۔ السلام علیک یارسول اللہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟'' فرمایا ''ہاں میں اللہ کا رسولؐ ہوں، میری دعا قبول ہوتی ہے۔ اگر میں تمہارے لیے دعا قبول کروں تو قبول ہو گی۔ اگر تمہارے خشک سالی ہو تو میری دعا سے تم سیراب ہو گے اور تمہارے لیے روئیدگی ہو گی۔ اگر تم بے آب و گیاہ میدان میں ہو اور تمہاری سواری گم ہو جائے تو میری دعا سے تمہارے پاس واپس آ جائے گی۔'' یہ سن کر میں نے کہا ''یارسول اللہ خدا نے آپ کو جو کچھ سکھایا ہے وہ مجھے بھی سکھایئے۔'' فرمایا ''نیکی کو حقیر نہ سمجھو، اگر چہ وہ اسی قدر ہو کہ اپنے بھائی سے خندہ روئی سے گفتگو کرو یا اپنے ڈول سے پیاسے کے برتن میں پانی ڈال دو۔ اگر کوئی شخص تمہارے راز سے واقف ہو اور وہ تم کو کسی بات پر شرم دلائے تو تم اس کے راز کا حوالہ دے کر اس کو شرم نہ دلاؤ۔ تا کہ اس کا وبال تمہارے اوپر نہ ہو۔ لٹکتے ہوئے آزار (تہمد) سے پرہیز کرو کیونکہ یہ غرور کی نشانی ہے اور غرور خدا کو ناپسند ہے۔ کسی کو گالی نہ دو۔ چنانچہ آپ کے ارشاد کے بعد سے میں نے کسی انسان بلکہ اونٹ اور بکری تک کو گالی نہیں دی۔

مرسلہ: نصرت جاوید، کراچی

UUNOVELS.COM

سے بچے کا بازو کاٹ لیتا ہے۔ بچہ چیختا ہوا پیچھے کھسکتا ہے لیکن جوکر تھوڑا باہر آکر بچے کو گھسیٹ کر گٹر کے اندر لے جاتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اسکرین پر اندھیرا چھاتا ہے اور ٹیبی اپنا سر کنگ کے سینے سے لگا لیتی ہے۔

''اوہ..... جونی..... تم یہ سب کیسے لکھ لیتے ہو؟'' وہ حیرت سے کہتی ہے۔

''آگے دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ میں ہارر پیدا کرنے میں کامیاب بھی رہا ہوں؟'' کنگ اس کی ہمت بڑھاتا ہے۔

پھر ساری فلم ایسے ہی ڈراؤنے مناظر سے بھری آگے بڑھتی جاتی ہے جسے ٹیبی دم سادھے دیکھتی رہتی ہے اس نے اس سے زیادہ سسپنس اور ہارر سے بھری فلم پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ آخری منظر آتا ہے جس میں فلم میں موجود سارے بچے ایک کنوئیں میں یکجا ہو جاتے ہیں جہاں اس عفریت سے ان کا مقابلہ ہوتا ہے جو مختلف شکلیں بدل بدل کر انہیں ڈراتی ہے لیکن پھر وہ سب مل کر اسے اس کے انجام تک پہنچا دیتے ہیں۔

گھر واپسی پر ٹیبی کنگ کے ساتھ تھی لیکن اس پر پینی وائز کا خوف طاری تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ابھی وہ خوفناک بونا کسی موڑ سے نکل کر سامنے آجائے گا۔ کنگ اپنی فلم IT میں بھی بہترین ہارر پیش کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔

''اگلی مووی کب آ رہی ہے؟'' ٹیبی نے تجسس سے پوچھا۔

''31 اکتوبر 2019ء کو۔''

''کون سی؟''

''In the tall grass'' کنگ نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''گویا ریٹائرمنٹ کینسل؟''

''ہاں، میں بے شک بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میرے کام پر تو اب شباب چڑھا ہے۔'' کنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''2020ء کیا نئے ارادے ہیں؟''

''لوگوں کی امیدوں سے بڑھ کر انہیں خوف زدہ کرنا۔'' کنگ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور ٹیبی نے مسکراتے ہوئے اس کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا یہ وہی جونی ہے جو پہلا ناول لکھتے ہوئے بور ہو گیا تھا اور ناول کے صفحات واش روم کے کوڑے دان میں پھینک دیئے تھے۔ آج کا کنگ کل کے جانی سے بہت مختلف تھا۔ ایک وقت تھا جب ایک حادثے نے اسے خوف زدہ کر کے کوے کا شکار کر دیا تھا اور ایک وقت آج ہے جب وہ اپنی ناولوں، فلموں اور ٹی وی سیریلز کے ذریعے دنیا کو خوفزدہ کر دینے والے شاہکار دے رہا ہے اور اس کی ڈیمانڈ اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ خود کو ریٹائرمنٹ لینے پر رضامند نہیں کر سکتا۔ اب 72 سال کی عمر میں اس کی صلاحیتیں عروج پر ہیں۔ ایک موقع پر اس نے اعتراف کیا کہ ایک وقت تھا جب اس کے پاس سکون سے بیٹھ کر لکھنے کے لیے جگہ نہیں تھی اور وہ ایک ریسٹورنٹ کے واش روم کے کونے میں بیٹھ کر اپنے ناول لکھا کرتا تھا۔ وہیں ایک دن ریسٹورنٹ میں کام کرنے والا ایک بوڑھا سوئپر اس کے پاس آیا اس کے ہاتھ میں پین تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کنگ کی طرف بڑھا کنگ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم اسٹیفن کنگ ہو؟'' بوڑھے سوئپر نے پوچھا۔ جب اسے پہلی بار کسی نے اس کے نام سے پہچانا تھا۔

''ہاں میں کنگ ہوں۔''

''وہی جس نے کیری لکھا ہے؟''

بوڑھے نے پھر پوچھا۔

''ہاں..... وہی۔'' کنگ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے احساس ہوا کہ اس کی کتابوں نے اسے اس قابل بنا دیا ہے کہ لوگ اسے پہچانتے ہیں۔ یہ موقع آسانی سے نہیں آتا اس کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

''مجھے آٹوگراف دے دو۔'' بوڑھے نے اس کی طرف پین بڑھاتے ہوئے کہا اور کنگ نے مسکراتے ہوئے اسے آٹوگراف دے دیا۔

کنگ نے ٹیبی سے کہا۔ ''تم نے میری ہمت بندھائی تو آج میں اس مقام پر ہوں ورنہ میں نے تو اپنا مستقبل کیری کے چند صفحوں کے ساتھ ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔'' کنگ نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے سامنے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''2020ء'' کنگ گنگنانے کے انداز میں گا رہا تھا۔

''نیا ہارر..... نیا سسپنس.....''

''2020ء میرا منتظر ہے۔''

ٹیبی آنکھوں میں روشن مستقبل کے دیئے جلائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''IT chapter three?'' ٹیبی نے سرگوشی میں پوچھا۔

''یس مائی ڈیئر۔''

++

UUNOVELS.COM

داستانِ عشق

منظر امام

عشق کی داستانوں میں رومیو جولیت اسی طرح مشہور ہے جس طرح عربی میں لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا، یونانی میں اور فیس ایوری ڈانز، فارسی میں شیریں فرہاد، سنسکرت میں شکنتلا و د شیانت، پنجابی میں سوہنی مہیوال، ہیر رانجھا، سندھی میں عمر ماروی، میراٹھی میں باجی راؤ مستانی، ہندی میں پرتھوی راج چوہان و سمیوکتا، گجراتی میں قلی قطب شاہ و بھاگمتی اور اردو میں سلیم و انار کلی۔ رومیو جیولٹ کی داستان کو شیکسپیئر نے ڈرامے کے انداز میں لکھ کر لازوال بنا دیا۔ اسی طرح قلو پیٹرا کی داستان ہے۔

مشہور داستانِ عشق پر ایک نظر

جب سے انسان نے تمدن کی زندگی اختیار کی ہے وہ محبت کرتا چلا آیا ہے۔ ہر زمانے میں، ہر عہد میں اور ہر قسم کے حالات میں۔

میرا خیال ہے کہ شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا خطہ ہو جہاں محبت کی داستانیں نہ ہوں۔ افریقا سے لے کر پاکستان تک، کیسی کیسی کہانیاں ہیں۔ کیسے کیسے گیت ہیں جو ایک دوسرے کو سنائے جاتے ہیں۔

جب راتیں سرد ہو جاتی ہیں تو الاؤ کے گرد بیٹھ کر

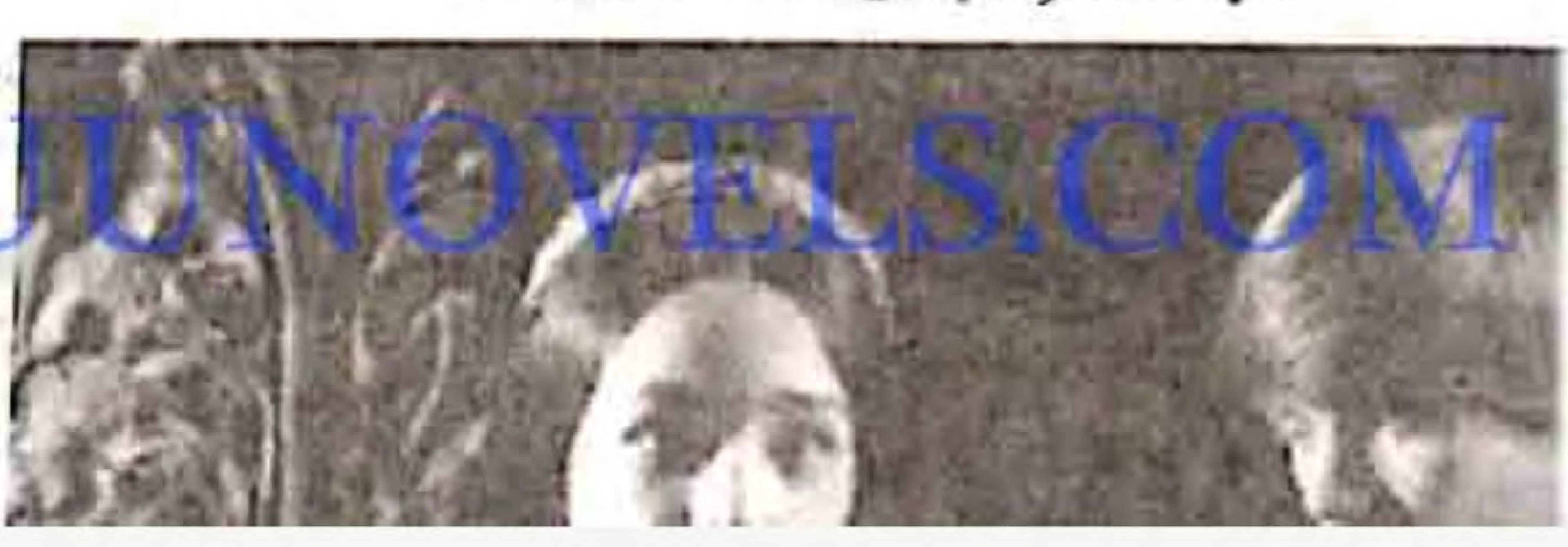

UUNOVELS.COM

پیار کرنے والوں کی کہانیاں سنائی جاتی تھیں اور سننے والے محبت کرنے والوں کے لیے دعائے خیر کیا کرتے۔ پوری دنیا میں ایسی کئی کہانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ خود ہماری تہذیب اور ہمارے ادب میں بھی ایسی بے شمار کہانیاں موجود ہیں۔

ایسی ہی چند محبتوں کا جائزہ لیا جائے اور ان کی کہانیاں بیان کی جائیں گی، جو آپ کو بھی پسند آئیں گی۔ ابتداء مغرب کی ایک ایسی محبت سے کرتے ہیں جو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ جس پر نہ جانے کتنی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ کتنے ڈرامے تحریر ہوئے ہیں۔ کتنی فلمیں بن چکی ہیں۔

یہ داستان ہے۔ رومیو اور جولیٹ کی۔ آپ نے بھی اس کے بارے میں پڑھا ہوگا، سنا ہوگا۔

عام طور پر اس قسم کی داستانوں کے انجام المیہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک المیہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو یہ محبتیں داستان ہی نہ بن پائیں۔ گھریلو کہانیاں ہو کر رہ جائیں۔ ان کے عشق کی ناکامیوں نے انہیں اس مقام تک پہنچایا ہے کہ پوری دنیا ان کے ناموں سے واقف ہے۔

مشہور ڈراما نگار اور شاعر شیکسپیئر نے رومیو جولیٹ کی کہانی پر ڈراما لکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شیکسپیئر کا مشہور ترین ڈراما ہے۔ اس میں اس کے قلم نے محبت کی اس المیہ داستان کو اتنی خوبی سے قلم بند کیا ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

ان دو کرداروں کا تعلق اٹلی سے ہے۔ اٹلی کا پس منظر، وہاں کا ماحول، وہاں کی معاشرت۔ یہ سب اس لافانی داستان میں مل جاتے ہیں۔ The tragical history of romeius and juliet 1562 عیسوی میں ایک نظم کی صورت میں آرتھر بروک نے یہ کہانی بیان کی تھی۔

1595ء میں ولیم شیکسپیئر نے ملکہ الزبتھ کے لیے اس لازوال کہانی کی ڈرامائی تشکیل کی۔ ایک سال بعد یہ ڈراما اسٹیج ہوا، ملکہ کو بہت پسند آیا۔ یہ کہانی دنیائے محبت کی ایک عظیم کہانی کے طور پر زندہ ہوگئی۔ اس لازوال کہانی کا خلاصہ بیان کردوں۔ "اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر ویرونا میں اس وقت دو خاندان رہتے تھے۔ ماشنگ خاندان اور کیپولیٹ خاندان۔ رومیو کو پتا چلا کہ کیپولیٹ فیملی کا آج سالانہ رقص ہونے والا ہے۔ رومیو کا تعلق ماشنگ فیملی سے تھا۔ جواں عمر، جوش اور ولولہ سے بھرا ہوا اس کے لیے زندگی یہی تھی کہ ایڈونچر میں گزار دی جائے۔

خاندان والے اس کو سر پھرا کہتے تھے۔

رومیو نے اپنے ایک دوست سے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ کیپولیٹ کے یہاں سالانہ رقص کی تقریب ہو رہی ہے۔"

"ہاں! وہ تو ہر سال ہوتی ہے۔"

"اس بار میں بھی اس میں شرکت کروں گا۔" رومیو نے کہا۔

"میرے دوست! یہ کوئی پرندوں کے شکار جیسا ایڈونچر نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارے خاندان اور کیپولیٹ خاندان میں صدیوں کی دشمنی چلی آرہی ہے اگر انہیں معلوم ہوگیا کہ ماشنگ خاندان کا کوئی آدمی اس رقص میں شریک ہے تو وہ تمہاری گردن اڑا دیں گے۔"

"ہاں جانتا ہوں میں کہ میرے لیے یہ کام آسان نہیں ہوگا لیکن نہ جانے کیوں میں جانا چاہتا ہوں۔" رومیو نے کہا۔ اس کا لہجہ دھیما ہوگیا تھا۔ "شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ کوئی مجھے پکار رہا ہے۔"

"کون پکار رہا ہے؟"

"میں نہیں جانتا لیکن وہ کوئی لڑکی ہے۔ اس کی آواز میری سوچوں میں بازگشت کر رہی ہے۔ گونج رہی ہے۔ وہ ہر رات میرے خواب میں آکر مجھے پکارتی ہے۔ کہاں ہو تم۔ آؤ میرے پاس آجاؤ۔ میرے دوست۔ وہ لڑکی مجھے بلا رہی ہے۔ میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا وہ خوب صورت ہے؟" اس کے دوست

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

نے پوچھا۔

"یہی تو میں نہیں جانتا۔" رومیو نے بتایا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ خوابوں میں اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دیتا۔ صرف اس کی درد بھری آواز سنتا ہوں۔ اسے محسوس کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔"

"چلو مان لیا کہ ایسا ہے تو بھی کیپولیٹ خاندان کے رقص کی پارٹی میں جانے کا کیا مقصد ہے؟"

"میں نے بتایا نا کہ میں اس بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔" رومیو نے کہا۔ "کوئی غیبی طاقت مجھ سے کہہ رہی ہے کہ تو وہاں چلا جا۔ کوئی کشش مجھے اس تقریب کی طرف لے جا رہی ہے۔"

"اب تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"خود میں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ کو مجبور پا رہا ہوں۔"

"لیکن تم جاؤ گے کیسے؟ وہ لوگ تمہیں اندر داخل ہی نہیں ہونے دیں گے۔"

"میں نے سنا ہے کہ اس تقریب کے لیے باقاعدہ دعوت نامے دیئے جاتے ہیں۔" رومیو نے کہا۔ "تمہاری دوستی اس فیملی کے کچھ لوگوں سے ہے۔ کیا تم میرے لیے ایک دعوت نامہ حاصل نہیں کر سکتے؟"

اس کے دوست نے دعوت نامہ حاصل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ رومیو نے کہا۔ "میرے دوست اگر تم میرے لیے دعوت نامہ نہ بھی لا سکے تو بھی میں کسی نہ کسی طرح اس پارٹی میں پہنچ جاؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔"

"کیسے پہنچو گے؟ تم نے دیکھا نہیں اس محل کی دیواریں کتنی بلند ہیں۔"

"تم جانتے ہو کہ میں رسی کے ذریعے اونچے اونچے درختوں پر چڑھ جایا کرتا ہوں۔ اس کی پریکٹس رہی ہے مجھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ہر حال میں اس پارٹی میں شریک ہو گے؟"

"ہاں، ہر حال میں، کوئی مجھے پکار رہا ہے، رومیو، کہاں ہو تم؟ کہاں ہو؟"

اس دوست نے اس پارٹی کا دعوت نامہ لا کر دے دیا۔ رومیو نے اپنا بھیس بدلا۔ اس نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے عام سے کپڑے پہنے اور اس پارٹی میں شریک ہو گیا۔

بہت زوردار تقریب تھی۔ کیپولیٹ فیملی نے باہر کے مہمانوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ سوائے رومیو کی فیملی کے سب ہی شریک تھے۔

ہر طرف مشعلیں اور چراغ روشن تھے۔ زندگی یہاں بہت خوب صورت معلوم ہو رہی تھی۔ خوب صورت چہروں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ خواتین کے لباس مہک رہے تھے۔ ان کے بدن مہک رہے تھے۔ ان کے قہقہوں کی سریلی آوازیں رقص گاہ میں گونجتی پھر رہی تھیں۔ رومیو بہت دیر تک اس تقریب میں رہا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر یہاں کیوں آیا ہے؟ جو کشش اس کو یہاں تک لے کر آئی تھی وہ کہاں چلی گئی ہے لیکن رومیو کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ دو نگاہیں اس پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ نگاہیں جولیٹ کی تھیں۔ اس قصر کے سربراہ کی بیٹی۔ خوب صورت، ذہین اور بلا کی خوش لباس۔

اس نے اپنی پارٹی میں آنے والے رومیو کو پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ یہی تھا جو اس کے خوابوں اور خیالوں میں بسا ہوا تھا۔ بالکل وہی۔ اس نے اپنے پاس کھڑی اپنی ایک دوست سے پوچھا۔ "کیا تم اس نوجوان کو جانتی ہو؟"

"کون نوجوان؟"

"وہ جو رقص میں حصہ نہیں لے رہا۔ ایک طرف کھڑا ہے۔"

"ہاں جانتی ہوں لیکن اس کے بارے میں اگر بتا دیا تو ایک قیامت آ جائے گی۔ تمہاری فیملی کے لوگ اس کو قتل کر دیں گے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس کا تعلق مانٹگف فیملی سے ہے۔" اس کی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

دوست نے بتایا۔ ''وہ اس فیملی کے سربراہ کا لڑکا ہے۔ اس کا نام رومیو ہے۔''

جولیٹ دل تھام کر رہ گئی۔ رومیو، یہ نام اس کے ذہن میں بازگشت کرنے لگا تھا۔ ہیں اجنبی مگر آشنا سے لگتے ہیں، ہمارا آپ سے رشتہ ہے غائبانہ کیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کا دل اسی نوجوان میں اٹکا ہوا تھا۔ ''میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔'' اس نے اپنی دوست کو بتایا۔

دوست نے اس کو روکنا چاہا لیکن وہ اس نوجوان کے پاس چلی گئی۔ اس نے ایک ادا سے جھک کر کہا۔ ''کیا میں تمہارے ساتھ رقص کر سکتی ہوں؟''

رومیو چونک پڑا۔ وہی آواز جو اس کے خیالوں اور خوابوں میں گونجتی رہتی تھی جو اسے پکارتی تھی۔ رومیو کہاں ہو تم، کہاں ہو؟

وہی آواز اور شاید وہی چہرہ، رومیو نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ دونوں تو شاید روزِ اوّل ہی سے ایک دوسرے کے ہو گئے تھے۔ تقدیر اس پارٹی کے بہانے رومیو کو وہاں لے کر آئی تھی۔ دونوں ڈانس فلور پر ہلکورے لینے لگے۔ رومیو کی خلش ختم ہو گئی تھی۔ اس کی منزل اس کی بانہوں میں تھی۔ جولیٹ کی نرم سانسیں اس کے وجود میں اترتی چلی جا رہی تھیں۔

دو ستاروں کا زمین پر ملن ہو رہا تھا۔ یہ وہ ملن تھا جس کو آگے چل کر محبت کی ایک لازوال داستان بننا تھا۔

دونوں رقص کرتے ہوئے بڑے دروازے تک آ گئے۔ ''وہ دیکھو۔'' جولیٹ نے ایک بالکونی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس بالکونی کے پیچھے میرا کمرا ہے اور میں وہیں خواب دیکھا کرتی ہوں۔''

''کیا تمہارے ان خوابوں میں میرا گزر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟'' رومیو نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''تم خود فیصلہ کر لو۔ تمہارے علاوہ کون ہوتا ہو گا۔''

اس وقت گھڑی کی سوئیاں رک گئی تھیں۔ وقت ساکن ہو گیا تھا۔ ازل سے جو دو نام لکھ دیئے گئے تھے، وہ نام ایک دوسرے کی بانہوں کے حصار میں تھے۔

''جولیٹ، میں ہر رات تم سے ملنے آیا کروں گا۔'' رومیو نے کہا۔

''یہ ناممکن ہے رومیو۔'' جولیٹ دھیرے سے بولی۔

''محبت کا یہی تو کمال ہے جولیٹ۔'' رومیو نے کہا۔ ''وہ ناممکن کو ممکن بنانا جانتا ہے۔''

''رومیو، ہمارے خاندانوں میں دشمنی ہے۔'' جولیٹ نے کہا۔

''محبت نے کبھی ایسی باتوں کی پروا نہیں کی ہے۔ میں تمہاری بالکونی کے برابر والے درخت سے تمہارے کمرے میں آیا کروں گا۔'' رومیو نے کہا۔ ''بشرطیکہ تم سو نہ جاؤ۔''

''نہیں رومیو، میری آنکھوں میں اب نیند کہاں۔ نیندیں تو تم نے چرا لی ہیں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی لیکن ہر حال میں اپنا خیال رکھنا۔''

''شب بخیر۔'' رومیو نے کہا۔ ''ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ بہت دیر ہو چکی ہے۔ نہ جانے کتنی آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ میں کل تمہارے پاس آؤں گا۔''

''الوداع رومیو۔''

رومیو اس محل سے نکل گیا۔ جولیٹ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت وہ ایک سرشاری کی کیفیت میں تھی۔ محبت حاصل ہو جائے تو انگ انگ بولنے لگتا ہے۔ محسوس کرنے والے اس کیفیت کو محسوس کر لیتے ہیں۔

جولیٹ کی دوست نے اس سے پوچھا۔ ''کیا باتیں ہوتی رہیں اس نوجوان سے؟''

''ایسی باتیں جو صرف دلوں کی زبان میں کی جاتی ہیں۔''

''اوہو! اتنی جلدی دلوں کی زبان بھی سمجھ میں آ گئی؟''

''ہاں، کیوں کہ محبت ہوتے ہی شعور نے ایک پرواز بھر لی ہے۔ اب ساری دنیا بہت مختصر دکھائی دینے

UUNOVELS.COM

لگی ہے۔"

"بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا کیوں کہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔"

"محبت نے کبھی ایسی باتوں کی پروا نہیں کی ہے۔"

جولیٹ کی وہ رات بہت بے کلی میں گزری تھی۔ ایک کیف ایک سرشاری نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ زندگی کبھی اتنی خوب صورت تو نہیں ہوئی تھی اور وہ جانتی تھی کہ دوسری رات اس سے زیادہ خوب صورت ہونے والی ہے۔ اس کا رومیو اس سے ملنے آنے والا ہے۔

جولیٹ کو اس ملاقات کے راستے کی دشواریوں کا اندازہ تھا لیکن رومیو کی محبت پر بھی یقین تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا محبوب ہر دیوار کو عبور کر کے اس کے پاس آ جائے گا۔ محبت لہجے کو خود اعتمادی بخش دیتی ہے۔ لہجے کی یہ خود اعتمادی رومیو کے لہجے میں موجود تھی۔

اور رومیو دوسری رات اس وقت اس کے پاس آ گیا جب پورا محل گہری نیند میں تھا۔ سب کے اپنے اپنے خواب تھے اور جولیٹ کا خواب تھا رومیو۔

اس نے ایک آواز سنی۔ "جولی...... لو دیکھ لو...... میں آ گیا ہوں۔" رومیو اس کے سامنے کھڑا تھا۔

جولیٹ اس کے سینے سے جا کر لپٹ گئی۔ "رومیو! تم کیسے آ گئے؟"

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا۔ اسی لیے آ گیا۔"

"لیکن کیسے؟ چاروں طرف تو اونچی دیواریں ہیں پہرے دار ہیں۔"

"تمہاری یہ دیواریں میرے ارادوں سے زیادہ اونچی نہیں ہیں جولیٹ۔" رومیو نے اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی رسی دکھائی۔ "اس رسی کے ذریعے۔ یہ میرا بہت پرانا مشغلہ ہے۔" جولیٹ نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔ "رومیو تم نے میرے لیے کتنی تکلیف اٹھائی ہے۔"

"کیسی بات کر رہی ہو۔ کیا محبت کرنے والوں کے درمیان اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں؟"

جولیٹ اس سے لپٹ گئی۔ اس رات چاند اپنے پورے جوبن پر تھا۔ اٹلی کی خنک رات میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور ان خوشبوؤں اور بالکونی سے آتی ہوئی چاندنی کے درمیان دو محبت کرنے والے دل ایک دوسرے کے لیے دھڑک رہے تھے۔

وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ رومیو صبح ہوتے ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

اس کے بعد اس کا معمول ہی یہ بن گیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی اس کی بے قراری بڑھ جاتی۔ وہ سارے کام چھوڑ کر جولیٹ کی طرف چل پڑتا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا لیکن محبت کی کہانیاں اتنی آسان نہیں ہوتیں۔ نہ جانے ملن کی راہ میں کتنے الٹ پھیر ہوا کرتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ قدرت محبت کرنے والوں کو طرح طرح کے امتحانات میں ڈال کر ان کا امتحان لیا کرتی ہے۔

ان دونوں کے درمیان محبت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے اگر کسی ایک کو کوئی پرابلم ہوتی تو دوسرے کو پتا چل جاتا تھا۔ "یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے کہ چوٹ تجھ کو لگے اور زخم آئے مجھے۔"

یہ ایک ایسی ہی طوفانی محبت تھی۔

پھر ہوا یہ کہ رومیو کی فیملی کے ایک شخص کو جولیٹ کی فیملی کے ایک فرد نے قتل کر دیا۔ اس دور کی روایت کے مطابق اس کا بدلہ لینے کے لیے اس آدمی کو قتل کر دیا گیا پھر کیا تھا، پورے شہر میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور یہ اتنی شدید تھی کہ رومیو کو اس شہر سے فرار ہونا پڑا۔ وہ اپنی محبت بھری یادوں کو اس شہر میں چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔

لیکن وہ اپنی محبت سے کیسے دست بردار ہو سکتا تھا۔ اس نے جولیٹ کی اس دوست سے رابطہ کیا جو جولیٹ کے قصر میں آیا جایا کرتی تھی۔ اس نے جولیٹ کو پیغام بھیجا کہ جولیٹ سے کہنا کہ وہ قصر کے دروازے کے باہر آ جائے۔

جولیٹ اس جگہ پہنچ گئی جہاں رومیو نے اسے بلایا

UUNOVELS.COM

تھا۔ رومیو اپنا گھوڑا لے کر موجود تھا۔ اس نے جولیٹ کو گھوڑے پر بیٹھایا اور دونوں ایک چرچ میں پہنچ گئے۔ وہ پادری کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے۔ ''محترم باپ ہم دونوں زندگی کے سفر میں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔''

پادری ان دونوں کو جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ دونوں دو مختلف گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں۔

''کیا تم دونوں کو یہ اندازہ ہے کہ تمہاری یہ شادی کیا گل کھلائے گی؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک بات بتائیں محترم باپ، کیا محبت جرم ہے؟ اگر اس کائنات سے محبت کے عنصر کو نکال دیا جائے تو کیا یہ کائنات سانس لے سکتی ہے؟''

''نہیں محبت ہی تو کائنات کے عناصر کا جزو اعظم ہے۔'' پادری نے کہا۔

''تو پھر آپ ہم دونوں کو ایک کر دیں۔ ہم ایک دوسرے کا جزو اعظم ہیں۔''

پادری نے ان دونوں کو دعائیہ کلمات کے ساتھ ایک کر دیا تھا۔ بہت مبارک رات تھی۔ یہ وہ رات تھی جس میں محبت کی تکمیل کچھ دیر کے لیے ہوئی تھی۔ اس رات نے صدیوں کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیا تھا۔

دوسری صبح بہت خوشگوار تھی۔ ہوائیں لوریاں دیتی ہوئی چل رہی تھیں۔ پرندوں کے نغمات گونج رہے تھے لیکن محبت کرنے والوں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ صبح کے اس حسن کے پیچھے ایک بھیانک سچائی بھی چھپی ہوئی ہے۔

اچانک جولیٹ کے گھر والے آ دھمکے۔ اس کا سخت گیر باپ۔ اس کے بھائی اور خاندان کے دوسرے لوگ۔ انہیں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ ان کی جولیٹ نے رومیو سے شادی کر لی ہے۔ جس کا تعلق مخالف خاندان سے ہے۔

رومیو جولیٹ کے آگے دیوار بن گیا تھا۔ وہ لوگ جولیٹ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔

رومیو نے ان کا مقابلہ شروع کر دیا لیکن وہ اکیلا تھا اور آنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ جولیٹ کو جب اپنے ساتھ لے جانے لگے تو جولیٹ نے بے بسی سے پکارنا شروع کر دیا۔

''رومیو، کہاں ہو تم۔ میرے پاس آؤ۔''

یہ وہی تڑپ تھی، وہی پکار تھی جو رومیو اپنے خوابوں میں سنا کرتا تھا۔ ان خوابوں میں جولیٹ اسی طرح اسے بلایا کرتی۔

رومیو نے حصار کو توڑ کر جولیٹ کے پاس جانے کی کوشش کی لیکن اس کو زخمی کر دیا گیا، وہ بے ہوش ہو کر گیا اور وہ جولیٹ کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ اب ایک محرومی تھی۔ ایک حسرت بھری چیخ تھی۔

جولیٹ کو اس کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس کے پاس سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ رومیو کو پکارا کرتی۔ آوازیں دیتی لیکن رومیو کو تو اس کی فیملی والوں نے شہر سے دور فرار کروا دیا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ اس محبت کا انجام دونوں خاندانوں کے درمیان ایک نئی جنگ کا آغاز ہوگا۔ نہ جانے کتنے لوگ مارے جائیں گے۔

اس طرف جولیٹ کے باپ نے اس کی شادی کاؤنٹ پیرس سے طے کر دی۔

یہ خبر جولیٹ کے لیے ایک قیامت سے کم نہیں تھی۔ اس کے تو سارے خواب رومیو کے لیے تھے۔ اس نے زندگی میں پہلی بار صرف رومیو کا لمس محسوس کیا تھا اور وہ اسی لمس کے نرم احساس کے ساتھ زندگی گزار دینا چاہتی تھی۔ اس کے لیے رومیو کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

اس کی دوست اس کے پاس تھی۔ جب اس نے کہا۔ ''سنو! میں مرجانا چاہتی ہوں۔ رومیو کے بغیر میرے لیے جینے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ میرا محبوب تھا، ہے اور اگر مجھے موت بھی آ گئی تب بھی میرا محبوب ہی رہے گا۔''

''جولی! اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ میں مر تو سکتی ہوں نا؟''

''ایک راستہ ہے میرے پاس۔'' اس کی دوست نے کہا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

''جلدی بتاؤ۔ کیا راستہ ہے؟''

''ہمیشہ کی موت سے بہتر ہے کہ چند گھنٹوں کی موت قبول کر لو۔'' اس کی دوست نے بتایا۔ ''میرے خاندان میں ایک ایسا باکمال حکیم ہے جو تم کو ایسی دوا بنا کر دے سکتا ہے کہ تم کچھ گھنٹوں کے لیے بالکل مر جاؤ گی۔ اس کے بعد تم کو ہوش آ جائے گا۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے؟''

''ہاں۔'' اس کی دوست نے کہا۔ ''لیکن شرط یہ ہے کہ اس دوران تم کو دفن نہ کر دیا جائے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ مجھے اتنی جلدی دفن نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے خاندان میں رسومات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو تین دنوں تک چلتا ہے۔ اس دوران اس لاش کو قبرستان میں بنے ہوئے ایک کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔''

''بس تو سمجھو۔ تمہارا کام بن گیا۔'' اس کی دوست نے کہا۔ ''تم کسی طرح رومیو کو خبر کر دو وہ دوسری شام کو آ کر تمہیں تابوت سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے۔''

لیکن کہانیاں تو اسی طرح بنتی ہیں۔ وقت اسی طرح راستے کی دیوار بن جاتا ہے۔ امر واقعات یوں ہی تخلیق ہوتے ہیں۔

رومیو تک پیغام نہیں پہنچایا جا سکا اور جولیٹ کی عارضی موت واقع ہو گئی۔

اس کی موت نے کیپولیٹ فیملی میں ایک کہرام برپا کر دیا تھا۔ وہ سب کی چہیتی تھی۔ وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی ملنسار بھی تھی۔ سب کو اس کی موت کا بے حد صدمہ ہوا تھا لیکن صرف اس کی دوست جانتی تھی کہ وہ مری نہیں ہے۔ چند گھنٹوں کے بعد زندہ ہو کر اپنے محبوب کے ساتھ چلی جائے گی۔

خاندانی رسومات کی ادائیگی کے بعد جولیٹ کو اسی کمرے میں رکھ دیا گیا، جہاں اس خاندان کی لاشوں کو رکھا جاتا تھا اور لوگ آ کر مرنے والے کا آخری دیدار کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف کسی طرح رومیو کو جولیٹ کی موت کی خبر مل گئی۔ اسے یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اس کی موت عارضی ہے اور وہ کمرے میں اپنے تابوت میں لیٹی اسی کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔

یہ المناک خبر سنتے ہی اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ انجام کی پروا کیے بغیر اس مقام تک پہنچ گیا جہاں اس کی محبوبہ کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت اس کمرے میں کاؤنٹ پیرس بھی موجود تھا۔ وہ شخص جس سے جولیٹ کی شادی ہونے والی تھی وہ جولیٹ کے چہرے کے آخری دیدار کے لیے آیا تھا۔

وہ رومیو کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھا۔ وہ تلوار نکال کر رومیو پر جھپٹ پڑا۔ رومیو نے بھی اپنی تلوار نکال لی دونوں میں مقابلہ ہوا۔ رومیو نے اس کو ہلاک کر دیا۔

اس کے بعد کیا رہ گیا تھا؟

اس کی جولیٹ مر چکی تھی۔ اس نے اپنے دشمن کو مار دیا تھا اور وہ خود زندہ تھا، آخر کیوں؟ کیا رکھا تھا اس زندگی میں؟ اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔

اس نے اپنی ہی تلوار سے خودکشی کر لی۔ اس کمرے میں اب دو لاشیں تھیں۔ ایک کاؤنٹ کی اور دوسری لاش رومیو کی۔ محبت کی اس کہانی کا ایک باب ختم ہو چکا تھا لیکن اس المناک کہانی کا الم ناک انجام باقی تھا۔

یہ انجام رومیو کی موت کے کچھ دیر بعد سامنے آیا تھا۔ جولیٹ اپنی مصنوعی موت کی نیند پوری کر چکی تھی۔ اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے تابوت سے باہر آ گئی۔ وہ زندہ تھی۔ قدرت نے اسے زندہ کر دیا تھا لیکن اس کی موت کا ڈراپ سین تو اب ہونے والا تھا۔

تابوت سے باہر آ کر اس نے اس کمرے میں دو لاشیں دیکھیں۔ ایک تو اس کے منگیتر کی تھی اور دوسری لاش اس کے محبوب رومیو کی تھی۔ وہ محبوب جس کو پانے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا جس کے بغیر اس کے لیے زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جب رومیو ہی نہیں رہا تو کیا رہ گیا تھا۔ اس نے رومیو کے پہلو سے لٹکا ہوا خنجر کھینچا اور اپنے پہلو میں اتار لیا اور رومیو رومیو پکارتی ہوئی اسی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کے اوپر ڈھیر ہوگئی۔

اس بے مثال کہانی کا یہی انجام ہونا تھا۔ ''آسیب وحشتوں کا مقدر میں رہ گیا۔ تم ہی نہیں رہے تو کیا گھر میں رہ گیا۔''

☆......☆

مارک انتھونی اور قلوپطرہ کی داستان کا شمار بھی عالمی ادب میں ہوتا ہے۔ اس داستان پر بھی سینکڑوں ڈرامے بن چکے ہیں۔ کہانیاں لکھی گئی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ محبت کی اس داستان کو بھی شیکسپیئر نے تحریر کیا تھا۔ یہ ایک ایسا اسٹیج ڈراما تھا جس کو کئی بار اسٹیج کیا جاچکا ہے۔ سب سے پہلے یہ ڈراما 1607 میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ شیکسپیئر کے بعد مشہور ادیب برناڈ شا نے بھی اس کہانی کو اپنے انداز سے تحریر کیا ہے۔ مختصراً اسے بھی بیان کردوں۔

''وہ اپنی دوستوں کے ساتھ اپنے شاندار محل میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ بلا کی ذہین اور معاملہ فہم۔ وہ ایک فرعون کی بیٹی تھی۔ اس سے بڑا اس کا بھائی تھا۔ اس محل کے در و دیوار سے شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ رات ہوتی تو ہر طرف مشعلیں روشن کردی جاتیں جن میں بے پناہ خوشبوجات کا استعمال ہوتا تھا جن کی وجہ سے وہ پورا محل خوشبوؤں سے مہکارہتا۔

اس کا نام قلوپطرہ تھا۔ اپنے بچپن ہی سے وہ کچھ مختلف تھی۔ رومان پسند اور خوابوں کے درمیان رہنے والی۔ وہ چاند کو دیکھ کر بے حال ہوجاتی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ پرواز کرتی ہوئی چاند تک پہنچ جاتی۔ وہ اپنی دوستوں سے کہا کرتی تھی۔ ''تم لوگ دیکھ لینا میں کسی دن چاند تک پہنچ جاؤں گی۔''

''شہزادی! چاند یہاں سے بہت دور ہے۔ ہم وہاں تک نہیں جاسکتے۔''

''لیکن میں جاؤں گی۔'' وہ کہتی۔

چاند جب بھی اپنے جوبن پر ہوتا اور اس کی چاندنی پورے محل اور محل کے درجنوں باغوں کو اپنی آغوش میں بھر لیتی تو قلوپطرہ اپنی دوستوں کے ساتھ درختوں، پودوں اور پھولوں کے درمیان کھیلتی رہتی۔

مصر کے آسمان پر طلوع ہونے والے چاند کی اپنی کشش ہوا کرتی ہے۔ جب اس کی کرنیں صحراؤں سے ہوتی ہوئی محل تک آتیں تو ان میں ایک طرح کی جادوئی کیفیت پیدا ہوجاتی۔

ایک بار اس کے باپ کے دربار میں ایک کاہن آیا۔ وہ جادوگر بھی تھا۔

وہ دربار میں مختلف کھیل تماشے دکھاتا رہا۔ اسی دوران قلوپطرہ بھی وہاں آکر بیٹھ گئی۔ کاہن نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

''کیا دیکھ رہا ہے؟'' قلوپطرہ کے باپ نے دریافت کیا۔

''بادشاہ! یہ بہت خوش قسمت اور بہت بدقسمت لڑکی ہے۔'' کاہن نے بتایا۔

''ایک بات کر۔ یہ دونوں ایک کیسے ہوسکتی ہے؟''

''بادشاہ! اس کو زندگی میں بہت سے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' کاہن نے بتایا۔ ''اس دربار میں آنے سے پہلے میں نے اس کا زائچہ نکال لیا تھا۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

''یہ اپنی ذہانت اور اپنے حسن کے جادو سے کام لے کر ان طوفانوں کے رخ پھیر دیا کرے گی۔ اس کی زندگی میں محبتوں کی بہت گنجائش ہوگی۔ نہ جانے کتنے اس پر قربان ہوجائیں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اس کا نام زندہ رہے گا۔ یہ ایک مثال بن جائے گی۔ اپنی موت کے بعد بھی اس کے چرچے ہوتے رہیں گے، لیکن......'' وہ بتاتے بتاتے رک گیا۔

''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ کہ یہ دیرپا محبت کے لیے ترستی رہے گی۔ اس کے علاوہ اس کی موت بھی بہت المناک ہوگی۔ اصل میں اس کی موت ہی اس کو زندہ کردے گی۔''

''تو نے پھر دو طرح کی باتیں کیں؟''

''نہیں بادشاہ! یہ ایک ہی طرح کی بات ہے۔ اس

کی موت کے چرچے پوری دنیا میں ہوں گے۔"

قلوپطرہ اس وقت صرف دس سال کی تھی۔ اسے آنے والے وقت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ جب شاہی باغ میں ہر طرف چاندنی بکھری تو کھیلتے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے یا چاند کو دیکھتے رہنا اسے پسند ہے۔

اس کے علاوہ وہ یہ جانتی تھی کہ اس کا تعلق مصر کے ایک طاقتور گھرانے سے ہے۔ اس کا باپ ایک فرعون ہے اور وہ اس کی بیٹی ہے۔ اس کے بھائی بھی ہیں۔ جب اس کے باپ کی موت ہو گئی تو اس کے بعد اس کے بڑے بھائی کو فرعون بنا دیا گیا۔

وہاں کی روایت رہی تھی کہ بھائی کی شادی بہن سے کرادی جاتی تھی۔

جس وقت کنیزوں نے اس کا بناؤ سنگھار شروع کیا تو وہ حیران رہ گئی۔ "کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" اس نے غصے سے پوچھا۔ "مجھے کیوں سنوارا جا رہا ہے؟"

"اس لیے کہ آج تمہاری شادی ہے فرعون کے ساتھ۔ اس شادی کے بعد تم ملکہ بن جاؤ گی۔"

قلوپطرہ کو ملکہ بننا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ دیکھا کرتی تھی کہ ملکاؤں کی کتنی عزت ہوتی ہے۔ کتنے ہی غلام اور کنیزیں ملکاؤں کے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ گیارہ سالہ قلوپطرہ کے خیال میں اتنا ہی بہت تھا۔

شادی ہو گئی۔ اس کو اپنے بھائی اور شوہر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ شادی کے تحفے کے طور پر اسے قیمتی جواہرات کا ایک ہار دیا گیا تھا۔ وہ رات اس کے لیے ایک حیرت انگیز تجربے کی رات تھی۔ وہ اس کے لمس سے آشنا ہو رہی تھی جو کل تک اس کا بھائی تھا۔

اس کے بعد وہ مصر کی ملکہ بن گئی۔ فرعون کے بعد سب سے طاقتور شخصیت۔

اس نے کئی سال بہت عیش سے گزارے۔ اس کے خواب پورے ہو گئے تھے۔ ابتداء ہی سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس دنیا میں طاقتور ہی کی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ ہر حال میں طاقت ور رہنا چاہتی تھی اس لیے خواب ہی ایسے دیکھے تھے۔

وہ جب اپنے خاوند اور بھائی کے ساتھ خوب صورت گھوڑوں پر سوار شہر کے دورے پر نکلتی تو ادب سے جھک جانے والوں کو دیکھ کر نہال ہو جاتی۔

وہ بہت خوب صورت تھی اور اسے بھی اپنی اس کشش کا اندازہ تھا۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں جادو جگایا کرتی تھیں۔ جب وہ کسی کی طرف اٹھا کر دیکھتی تو وہ ڈھیر ہو جاتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنے خاوند سے فرمائش کی۔ "تمہیں! یاد ہے ایک بار ایک کاہن کو دربار میں لایا گیا تھا، اس نے مجھے دیکھ کر بہت سی باتیں کی تھیں۔"

"ہاں یاد ہے مجھے۔"

"کیا وہ دوبارہ آسکتا ہے؟"

"اگر وہ زندہ ہے اور زمین کے نیچے نہیں گیا تو آجائے گا۔"

صبا گل

ایم آئی ٹی کی گریجویٹ اور یوپن جی کی بانی اور سی ای او صبا گل نے پاکستان میں محروم خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے انہیں مستقل طور پر ملازمت کا موقع فراہم کیا ہے۔ انہوں نے ان خواتین کی آرٹ، اور قابلیت کو ایلیٹ مارکیٹ سے منسلک کیا ہے۔ یوپن جی جو ایک سماجی ادارہ ہے جو خواتین کو معاشرے میں شراکت اور اپنے لیے بہتر زندگی حاصل کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

مرسلہ: عمیمہ جواد

شرمین عبید چنائے

شرمین صحافی، فلم ساز اور سماجی کارکن کے طور پر [illegible] پاکستان کے اہم سماجی مسائل پر روشنی ڈالی اور ان مسائل پر فلمیں بنائیں جس پر اکیڈمی ایوارڈز اور 16 من ایوارڈ نمایاں ہیں۔ شرمین عورتوں کو مردوں کی غلامی سے نکالنے اور برابری دلانے کی کوشش کر رہی ہیں یہ مظلوم خاتون کی بولڈ آواز ہیں۔

مرسلہ: شمرین حماد

UUNOVELS.COM

فرعون نے حکم جاری کر دیا کہ اس کاہن کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ وہ کاہن تیسرے دن دربار میں پیش کر دیا گیا۔ ان برسوں میں اس کے خدوخال ہی بدل گئے تھے۔ وہ بیمار رہنے لگا تھا۔

"کیا تجھے یاد ہے کہ تو نے میرے لیے کیا کہا تھا؟" قلوپطرہ نے پوچھا۔

"یاد ہے ملکہ۔"

"پھر اب کیا کہتے ہو؟"

"ملکہ میں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ اپنی طرف سے نہیں کہا تھا۔" کاہن نے کہا۔ "میرا کام تو ستاروں کے فیصلے سنا دینا ہے۔ وہ میں نے سنا دیئے تھے۔"

"اب ستارے کیا کہتے ہیں؟"

"ستاروں کے فیصلے بدلتے نہیں ہیں ملکہ......"

قلوپطرہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ اس نے کاہن کو چلے جانے کا حکم دیا۔

اس رات وہ دیر تک سوچتی رہی تھی۔ کیا لکھا تھا اس کی تقدیر میں۔ ابھی تک تو سب ٹھیک ہی تھا۔ وہ مصر کی ملکہ تھی۔ ہزاروں جانیں اس کے ایک اشارے پر قربان کر دی جاتی تھیں۔ وہ جو چاہتی وہ ہو جاتا تھا پھر بھی ایک بے چینی سی تھی۔ اس رات وہ بہت دنوں کے بعد اپنے پائیں باغ میں جا کر بیٹھ گئی۔ اس رات بھی چاند اپنے جوبن پر تھا۔ کبھی کبھی اسے ایسا لگتا جیسے چاند اس کی کیفیت جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کس سوچ میں مبتلا ہے۔ چاند ایک طرح سے اس کا دوست تھا۔

اس رات اس کے خاوند اور بھائی نے اسے ایک خبر سنائی۔ "مجھے کل ایک جنگ پر جانا ہے۔"

"کس کے خلاف؟"

"میری جان، جنگ دشمنوں ہی سے ہوتی ہے۔"

"کیا میں اس جنگ میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی؟" قلوپطرہ نے پوچھا۔

"تم فکر مت کرو۔ یہ ایک عام سی جنگ ہے۔ میری فوج انہیں کچل کر رکھ دے گی۔ میں فتح پا کر جلدی واپس آجاؤں گا۔"

لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ نہ تو وہ جنگ عام سی جنگ ثابت ہو سکی اور نہ ہی وہ فتح پا کر واپس آسکا۔ وہ جنگ میں ہلاک ہو گیا تھا۔ یہ خبر قلوپطرہ کو اس وقت سنائی گئی جب وہ اپنے پسندیدہ پائیں باغ میں بیٹھی اپنے دوست چاند کو دیکھ رہی تھی۔

خبر کو سن کر اس نے چاند کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کاہن کی باتوں کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ پہلا موڑ اس کی زندگی میں آچکا تھا۔

فرعونوں کی روایت کے مطابق اس کی شادی اب چھوٹے بھائی بطلیموس سے کر دی گئی جو اس سے پانچ برس چھوٹا تھا۔ قلوپطرہ اس وقت اٹھارہ برس کی ایک بھرپور خوب صورت عورت تھی جب کہ اس کا شوہر بطلیموس صرف تیرہ برس کا تھا۔

یہ اس کی ہنگامہ خیز زندگی کا دوسرا تجربہ تھا۔ وہ تیس برس کے جوان شوہر کو دیکھ چکی تھی اور اب وہ تیرہ برس کے کم عمر بچے کی بیوی بن گئی تھی۔ یہیں سے اس کی زندگی کا وہ موڑ شروع ہوتا ہے جس کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ دور اس کی فتنہ انگیزی کا دور تھا۔

قلوپطرہ ایک جنسی بلی بن کر رہ گئی تھی۔ تیرہ برس کے نابالغ شوہر کی بیوی بن جانے کے بعد اس نے اپنے شکار تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ یہ شکار تنومند نوجوان ہوا کرتے جو اس کی ہوس کا شکار ہو کر موت کے منہ میں پہنچ جاتے۔

اس کے اندر ایک آگ سی بھڑکتی رہتی تھی اور اس آگ کو بجھانے کا ایک طریقہ اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس نے ایک شام اپنے ایک وزیر کو بلا کر اسے یہ حکم دیا۔

"ایک رات کے لیے ایک ایسے قیدی کو میرے پاس لے کر آؤ جو تندرست اور جوان ہو۔"

قیدی کو حاضر کر دیا گیا۔ وہ ایک جوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ اس کو قلوپطرہ کے خاص کمرے میں بلا کر بٹھا دیا گیا تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ اس نے اپنے ایک رقیب کا خون کر دیا تھا جس کی وجہ سے

UUNOVELS.COM

اسے موت کی سزا دی گئی تھی۔ اس پر ایک ہیبت طاری تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد قلوپطرہ جب اس کے سامنے آئی تو اس حسن سراپا کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ قلوپطرہ نے اس وقت ایک ایسا لباس پہن رکھا تھا جس نے اس نوجوان کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اس کے احترام میں کھڑا ہو گیا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' قلوپطرہ نے حکم دیا۔

وہ اس کے حکم کی تعمیل میں سامنے والے کوچ پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک چیتا غراتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ قلوپطرہ کا پالتو چیتا تھا جو اس کے ایک اشارے پر عمل کیا کرتا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' قلوپطرہ نے چیتے کو حکم دیا۔ چیتا اس کے کوچ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ قلوپطرہ اس کے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا؟'' قلوپطرہ نے پوچھا۔ ''جی ہاں ملکہ، وہ بات یہ تھی کہ......'' اس نے بتانا چاہا۔

''میں کوئی کہانی سننا نہیں چاہتی۔ مجھے ہاں یا نہ میں جواب دے۔'' قلوپطرہ نے کہا۔

''جی ہاں ملکہ۔'' اس نے گردن ہلا دی۔

''اور تجھے موت کی سزا بھی ہو گئی ہے۔''

''جی ہاں ملکہ آپ سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ تو سب جانتی ہیں۔''

''اور تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ میں اگر چاہوں تو تیری یہ سزا معاف بھی ہو سکتی ہے؟''

''ملکہ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر قلوپطرہ کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔

''تو پھر خوش ہو جا۔ میں نے تجھے آزاد کر دیا۔'' قلوپطرہ نے کہا۔ ''کل سے تو آزاد ہے۔''

اس نوجوان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ دوسری صبح اس کے لیے آزادی کا پیغام تو لائے گی لیکن زندگی سے آزادی کا۔ قلوپطرہ نے اسے زہر سے بھرا جام دے کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔

یہ اس کے مزاج کی بے وفائی اور بے رحمی کا ایک پہلو تھا۔ وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی خطرناک بھی تھی۔ نہ جانے اس کی فطرت میں یہ عناصر کہاں سے شامل ہو گئے تھے وہ تو چاندنی راتوں میں دوستوں کے ساتھ مل کر چھپنے چھپانے کا کھیل کھیلنے والی لڑکی تھی۔ اس کو تو چاند پسند تھا لیکن وہ شعلہ بن گئی تھی۔

اس کا یہ مشغلہ بہت عرصے تک جاری رہا شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس کا پہلا شوہر اور بھائی اسے کج روی کی راہ پر ڈال گیا تھا۔ اس کا مداوا بطلیموس سے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو بہت کم عمر تھا۔ اس نے نہ جانے کتنے نوجوانوں کو اسی طرح موت سے ہمکنار کیا تھا۔

☆......☆

جولیس سیزر روم میں تھا۔ وہ ایک مشہور جرنیل تھا۔ اس کی شہرت آج تک قائم ہے۔ جولیس سیزر کی پیدائش ایک ہزار قبل مسیح کی ہے۔ اس کی وفات 15 مارچ 44 قبل مسیح کی ہے۔ یہی وہ جرنیل اور حکمران ہے جس نے رومی سلطنت کو اتنی وسعت دی تھی کہ وہ یورپ سے لے کر افریقا تک پھیل گئی تھی۔ روما ایک طاقت ور سلطنت بن گیا تھا۔ یہ سب جولیس نے اپنی حکمت عملی اور عسکری صلاحیتوں سے کیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ عظیم سلطنتیں کسی ایک یا دو افراد کی بہادری اور دانشمندی سے وجود میں آتی ہیں۔ ان کے بعد ان سلطنتوں کو اس پائے کا انسان میسر نہیں آتا اسی لیے وہ بکھر کر رہ جاتی ہیں۔

ہمارے یہاں بھی یہی ہوا۔ سلطنت عثمانیہ سے لے کر مغلیہ سلطنت تک۔ نہ جانے کتنے حکمران آئے اور ناکام ہو کر پوری سلطنت کو برباد کر دیا۔ تو وہ زمانہ روم کے عروج کا تھا۔ قلوپطرہ روم کے حالات سے واقف تھی۔ وہ وہاں کے درباروں کی شان و شوکت کی کہانیاں سنا کرتی۔ اسے معلوم تھا کہ روم کی سلطنت کتنی وسیع ہے۔ اس کی تمنا تھی کہ کسی طرح سلطنتِ روما تک رسائی حاصل ہو جائے۔ اتفاق سے اس کو یہ موقع اس وقت مل گیا جب جولیس سیزر ایک ثالثی کے لیے مصر آیا۔ اس

UUNOVELS.COM

کے آنے کی خبر نے قلوپطرہ کی اس خواہش کو مہمیز کر دیا تھا۔ جولیس کو اگلے دن فرعون کے دربار میں آنا تھا۔ قلوپطرہ نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ سیزر کو بھی اپنی زلفوں کے دام میں گرفتار کر لے گی۔ اس نے ایک مشاطہ کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ ”تجھے معلوم ہے کہ کل دربار میں کون آ رہا ہے؟“

”جی ہاں ملکہ، روم کا بادشاہ۔“

”بس تو مجھے ایسا سنوار اور سجا دے کہ جو بھی دیکھے وہ دیکھتا رہ جائے۔“ قلوپطرہ نے کہا۔

”ملکہ آپ کو تو ویسے بھی جو دیکھتا ہے دیکھتا رہ جاتا ہے۔“ مشاطہ ادب سے بولی۔

”میں کچھ اور بھی چاہتی ہوں۔“ قلوپطرہ نے کہا۔

”تو میرے بالوں میں موتی پرو دے۔ ان بالوں کو ایسی آب و تاب دے دے کہ میں خود اپنے حسن کو دیکھ کر حیران ہو جاؤں۔“

”ایسا ہی ہوگا ملکہ۔“

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ قلوپطرہ جب دربار میں پہنچی تو سیزر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس وقت بطلیموس بھی اپنے تخت پر موجود تھا لیکن سیزر کی اب ساری توجہ قلوپطرہ کی طرف تھی۔ قلوپطرہ کی نگاہوں کی بجلیاں اسے راکھ کیے دے رہی تھیں۔ اسے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ سلطنتِ مصر میں اگر کوئی خزانہ ہے تو وہ صرف قلوپطرہ ہی ہے۔ جس کی زلفوں کی گھٹا جولیس کے پورے وجود پر نرم نرم پھواروں کی طرح برس رہی تھی۔

وہ تو مصر آیا تھا چند مہینوں کے لیے لیکن قلوپطرہ کے سحر میں گرفتار ہو کر پورے دو سال تک مصر ہی میں رہا۔

اس دوران قلوپطرہ سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے اسیر ہو گئے تھے۔ سیزر دو سال تک مصر میں مقیم رہا۔ اس دوران قلوپطرہ اس کے ایک بچے کی ماں بھی بن گئی۔ دو سال بعد جب سیزر مصر سے روم واپس آیا تو قلوپطرہ بھی اس کے ساتھ چلی آئی۔ وہ پوری طرح سیزر کے تسلط میں تھی۔ اس طرح مصر عملی طور پر روم ہی کا ایک صوبہ بن کر رہ گیا تھا۔ اسی دوران اس کی ملاقات مارک انتھونی سے ہو گئی۔ وہ ایک بہادر شخص تھا اور رومی سلطنت کا سپہ سالار اس کے علاوہ سیزر نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔ وہ سیزر کے معاملات میں بہت دخیل تھا۔

سیزر کے ساتھ ایک بہت بڑا واقعہ پیش آ گیا۔ اس کے دوست اور جرنیل بروٹس نے اسے دھوکے سے بلا کر قتل کر دیا تھا۔ سینیٹ کے ارکان بھی اس سازش میں شریک تھے۔

سیزر نے جب سینٹ کی میٹنگ میں جانے کی خبر قلوپطرہ کو بتائی تو نہ جانے کیوں قلوپطرہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے سیزر کو جانے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ تم وہاں مت جاؤ۔“ اس نے کہا۔

”کیوں؟“

”میں نہیں جانتی کہ ایسا کیوں ہے؟ لیکن میرا دل یہ کہہ رہا ہے کہ تمہارے خلاف سازش ہو رہی ہے اور تمہارے لیے خطرہ ہے۔“

”میں تمہاری اس محبت کی قدر کرتا ہوں۔“ سیزر نے کہا۔ ”لیکن میرا جانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ وہاں میرا دوست بروٹس بھی ہوگا۔ وہ مجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تاریخ میں میرا نام بزدلوں میں شامل ہو۔“

قلوپطرہ نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ سیزر سینیٹ کی میٹنگ میں شریک ہونے چلا گیا۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی اس پر حملہ کر دیا گیا۔ سینیٹ کے کئی اراکین نے اس پر تلواروں سے حملہ کیا تھا اور ان کے ساتھ جب اس کے دوست بروٹس نے بھی حملہ کیا تو اس نے وہ تاریخی جملہ کہا جو آج بھی دہرایا جاتا ہے۔ You too brutus شیکسپیئر کے لکھے ہوئے اس جملے نے عالمی شہرت حاصل کر لی۔

سیزر کی موت کے بعد بھی قلوپطرہ کی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں۔ اس نے انتھونی سے دوستی کر لی۔ انتھونی اس سے بہت محبت کرنے لگا تھا اور قلوپطرہ بھی اس کا

UUNOVELS.COM

پوری طرح ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے بھی یقین دلا دیا تھا کہ وہ زندگی بھر جس محبت کی تلاش میں بھٹکتی رہی ہے وہ انتھونی کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ زندگی میں پہلی بار اسے سکون ملا ہے اور اپنی منزل کے مل جانے کا احساس ہوا ہے۔

قلوپطرہ اور انتھونی نے شادی کر لی۔ یہ اس کی تیسری شادی تھی۔

وہ ایسی عورت تھی جس نے زندگی میں کبھی بھی اقتدار اور قوت حاصل کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔ بہت سے مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ سیزر کی موت میں اس کا ہاتھ تھا۔ اس کی سازش تھی کہ سیزر کو راستے سے ہٹا دیا جائے تاکہ وہ انتھونی کے ساتھ اپنے کھیل کو جاری رکھ سکے۔

ان کی راتیں انتھونی کے محل کے باغ میں گزرنے لگیں۔ پہلے کی طرح چاند ابھی تک اس کو اپنی طرف بلاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

وہ انتھونی کی آغوش میں سر رکھے چاند کو دیکھتی رہتی۔

ایک بار انتھونی نے اس سے کہا۔ ''قلوپطرہ، تم نے یہ کیسا جادو سیکھا ہے کہ مجھ جیسا آدمی تمہارے سامنے ڈھیر ہو گیا ہے۔ میری ساری صلاحیتیں تمہارے سامنے بے بس ہو گئی ہیں۔''

''اس جادو کو محبت کا جادو کہتے ہیں انتھونی۔''

''لیکن مجھ سے پہلے بھی تو تم اس قسم کی محبت کا دعویٰ کر چکی ہو۔''

''ہاں، وقت گزارا ہے، سیاست کی ہے، لیکن محبت نہیں کی۔'' قلوپطرہ نے جواب دیا۔ ''یہ میری پہلی محبت ہے اور تم دیکھ لینا کہ میں اپنی محبت کا حق ادا کر دوں گی۔''

آسمان پر چاند اپنا سفر طے کرتا رہا۔

روزِ اول ہی سے یہ چاند نہ جانے کتنے محبت کرنے والوں کو دیکھ چکا ہے۔ وہ لوگ جو اس کی طرف دیکھ کر ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھایا کرتے ہیں۔ زندگی کا سفر یوں ہی جاری رہتا ہے۔ ''دائم آباد رہے گی یہ دنیا۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا''

انتھونی سے قلوپطرہ کے تین بچے ہوئے تھے۔

ایک صبح اس پرسکون زندگی میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جنرل آکٹوین نے انتھونی کے خلاف جنگ شروع کر دی تھی۔ ایک بار پھر وہی دھڑکا جو سیزر کے ساتھ ہوا تھا۔ قلوپطرہ نے انتھونی کو جنگ کے میدان میں جانے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی اور کو بھیج دو۔''

''نہیں میری جان، یہ نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھو فوج اپنی آدھی جنگ اپنے سپہ سالار کی وجہ سے جیتتی ہے اگر سپہ سالار میں کوئی کمزوری نظر آ جائے تو پھر ساری فوج کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ اس لیے مجھے جانا ہو گا۔''

انتھونی جنگ پر چلا گیا۔ قلوپطرہ نے دیوتاؤں سے دعائیں مانگنی شروع کر دیں لیکن انتھونی یہ جنگ ہار چکا تھا۔

وہ اپنی جان بچانے کے لیے فرار ہو گیا۔ اس نے کہیں پناہ لے لی تھی۔ قلوپطرہ نے یہ خبر وحشت کے عالم میں سنی تھی۔ اب اس کے پاس وقت کم تھا۔ اس نے اپنی قیمتی چیزیں سمیٹیں اور خود بھی محل سے فرار ہو گئی۔

اس کے بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ایک خفیہ جگہ پناہ لی تھی۔ وہ انتھونی سے دور ہو چکی تھی لیکن اس کا سازشی ذہن ابھی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جنرل آکٹوین پر ڈورے ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے تو ہر حال میں اقتدار چاہیے تھا اور آکٹوین اس وقت ایک طاقتور فاتح بن کر سامنے آیا تھا۔

اس نے آکٹوین کو پیغام بھیجا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے لیکن آکٹوین دوسرے مزاج کا انسان تھا۔ اس نے قلوپطرہ کے پیغام کے جواب میں کہا۔ ''آکٹوین کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کہ اس قسم کی ملاقاتیں کرتا پھرے۔''

قلوپطرہ کے لیے یہ بہت حیرت کی بات تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اس طرح اس سے ملنے

UUNOVELS.COM

سے انکار بھی کرسکتا ہے۔

کچھ عرصے کے بعد اس نے دوبارہ کوشش کی لیکن آکٹوین کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

وہ پاگل ہو کر رہ گئی۔ اس نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔ اس کا شوہر انتھونی کہیں جا کر چھپ گیا تھا۔ اس کی شان و شوکت کے چاند کو گہن لگنے والا تھا۔ وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔

انتھونی اسے بہت یاد آرہا تھا۔ اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کا مضبوط سہارا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ آسمان پر چمکنے والا چاند بھی وہی تھا۔ ہوائیں اسی طرح چل رہی تھیں۔

کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن ایک بہت بڑی تبدیلی خود قلوپطرہ میں ہو چکی تھی۔

اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ایک محبت کرنے والے کو گنوا دیا ہے۔ انتھونی بھی اس کے پاس نہیں آرہا تھا۔ اس کو بلانے کی ایک ہی ترکیب اس کی سمجھ میں آئی کہ وہ اپنی موت کا اعلان کردے۔ اس کے مرنے کی خبر سن کر انتھونی ضرور دوڑا ہوا چلا آئے گا۔

اس نے اپنی ایک معتبر کنیز سے کہا۔ ”تو میرا ایک کام کرے گی۔“

”حکم دیں ملکہ۔“

”کیا تو انتھونی کے پاس جا سکتی ہے؟“

”ہاں ملکہ ہزار دشواریوں کے باوجود چلی جاؤں گی۔“

”بس تو جا کر اسے میری موت کی خبر دے دے۔“

”جی ملکہ!“ کنیز بھی حیران رہ گئی تھی۔ ”ملکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“

”تجھ سے جو کہا جا رہا ہے، وہ کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے ملکہ میں چلی جاتی ہوں لیکن کہوں گی کیا۔ موت کا سبب کیا بتاؤں گی؟“

”کچھ بھی بتا دینا۔ موت کوئی انہونی چیز نہیں ہے۔ یہ ہر ایک کے لیے ہوتی ہے۔ قلوپطرہ بھی مر سکتی ہے اور قلوپطرہ مرگئی۔ بس اسے بتا دینا۔“

کنیز نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے کسی طرح انتھونی کے پاس پہنچ کر اسے قلوپطرہ کی موت کی خبر دے دی۔

انتھونی ویسے ہی اپنی شکست سے دلبرداشتہ ہو رہا تھا۔ قلوپطرہ کی موت کی خبر نے اس کی دنیا ہی اجاڑ دی۔

اس نے قلوپطرہ سے اس کی بے وفائیوں کے باوجود محبت کی تھی۔ پیار کیا تھا اس سے اور اب اس کا پیار ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے جا چکا تھا۔

اس کی زندگی میں اب کیا رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی تلوار سے اپنا سینہ چاک کر ڈالا اور دیکھتے ہی دیکھتے تڑپ کر مر گیا۔ خبر لے جانے والی کنیز حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ اس پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا تھا۔

اس نے واپس آکر جب قلوپطرہ کو یہ خبر سنائی تو وہ خود بھی سکتے میں رہ گئی۔ اس نے اس وقت محسوس کیا کہ محبت میں کتنی شدت اور دیوانگی ہوتی ہے۔ انتھونی نے اس سے محبت کی تھی ایسی محبت جس کی مثال مشکل تھی۔ اس کا محبوب چاند کے اس دیس میں چلا گیا تھا جس کو وہ چاندنی راتوں میں دیکھا کرتی تھی۔

اس نے کہا۔ ”اب میری بھی زندگی کا سفر ختم ہوا۔ میں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو قسمت نے مجھے دکھایا۔ وہ سارے عیش کرلیے جو لاکھوں کے لیے صرف خواب ہی رہتے ہیں۔ میں نے دلوں اور روحوں پر حکمرانی کی اور اب ایسی مملکت کی طرف جا رہی ہوں جہاں صرف دھند ہے۔“

اس نے ایک سانپ منگوا کر اس سے اپنے آپ کو ڈسوا لیا۔

اس کی موت تیس قبل مسیح اسکندریہ میں ہوئی تھی۔ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن قلوپطرہ ایک علامت کے طور پر آج بھی زندہ ہے۔

یہ علامت ہے حسن کی، بہادری کی، حکمرانی کی، عیاری کی اور محبت کی۔

UUNOVELS.COM

پاکستان کی فلمی صنعت کے عروج وزوال میں ہنر مندوں کا کمال رہا ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ساحر لدھیانوی تک پاکستانی فلموں میں گیت لکھنے کو فخر سمجھتے تھے۔ ہدایت کار ہوں یا عکاس، گیت کار ہوں یا موسیقار سب ہی اپنے اپنے کام میں ید طولیٰ تھے۔ اداکاروں کا بھی جواب نہ تھا تبھی تو ایسی فلمیں بن رہی تھیں۔ یوں تو پاکستانی فلموں میں بے شمار یادگار فلمیں ہیں لیکن یہاں چند ایک کا ہی تذکرہ کیا جارہا ہے۔

ان پاکستانی فلموں کا تذکرہ جنہوں نے غیر ممالک میں بھی دھوم مچائی تھی

فلم نگری

وطن عزیز میں پہلی فلم ''تیری یاد'' سے لے کر آج تک بے شمار فلمیں بنائی گئیں۔ جن میں سے بہت سی فلموں کا ذکر ضمناً میری تحریروں میں بھی ہوتا رہا ہے۔ ذکر کسی اداکار کا ہو، اداکارہ کا، ہدایت کار یا فلم ساز کا، موسیقار، نغمہ نگار اور گلوکار یا گلوکارہ کا ہو، ان کی فلموں کے بارے میں بھی بتایا جاتا رہا ہے مگر اس تفصیل کے ساتھ نہیں جس تفصیل کے ساتھ ان شخصیتوں کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ اب میرے کچھ پڑھنے والوں کی فرمائش ہے کہ میں فلموں کے

UUNOVELS.COM

بارے میں بھی تفصیلی معلومات بہم پہنچاؤں۔

فلم میکرز نے بے شمار فلمیں بنائی ہیں، ہر طرح کی ہر نوعیت کی فلمیں بنائی ہیں۔ فلم کا بنیادی مقصد تفریح ہوتا ہے لیکن تفریح کو بھی مفید بنانے کے لیے اس میں کچھ فلم والے معاشی، معاشرتی، تہذیبی، تاریخی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی مسئلے مسائل بھی پیش کرتے ہیں۔ فلم سازی چونکہ ایک کاروبار بھی ہے۔ اس میں لگایا ہوا سرمایہ منافع کے ساتھ واپس لانا بھی ضروری ہوتا ہے اس لیے زیادہ تر فلم ساز اس کے تفریحی پہلو پر زیادہ توجہ دیتے ہیں لیکن بہت سے سرپھرے فلم میکرز ایسے بھی ہیں جنھوں نے باکس آفس کی کامیابی کو نظر انداز کر کے فلم کے اعلیٰ معیار اور ارفع مقصد کو زیادہ اہمیت دی۔ ان کی فلموں نے بہت شہرت حاصل کی مگر وہ باکس آفس پر فلاپ فلم ثابت ہوئیں۔ اس کی بہترین مثال ''جاگو ہوا سویرا'' ہے جس نے بہت سے بین الاقوامی فلمی میلوں سے ایوارڈ اور اعزاز حاصل کیے مگر اندرونِ ملک اسے بھرپور نمائش کا موقع بھی نہیں ملا۔

آج، میں جس فلم کا تفصیلی... ذکر کروں گا... وہ آج سے نصف صدی پہلے ریلیز ہوئی تھی۔ یہ فلم ایک ایسے موضوع پر بنائی گئی تھی جو بین الاقوامی نوعیت کا حامل تھا اس لیے یہ بہت بڑی فلم بن گئی۔ اس نے قومی سطح پر ہی نہیں، بین الاقوامی سطح پر بھی بہت نام کمایا۔ یہ رنگین اردو فلم تھی اور پہلی پاکستانی ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کرنے والی فلم بھی تھی جو ہماری فلم انڈسٹری کی تاریخ کی ایک انمول اور اچھوتی فلم تسلیم کی جاتی ہے اور اس کا نام ''زرقا'' ہے۔

☆......☆

زرقا، مصنف، ہدایت کار اور فلم ساز ریاض شاہد کا ایک ایسا شاہکار ہے جس نے ہماری فلمی صنعت کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ ہمارے فلم میکرز جب لوک رومانی کہانیاں، جادو ٹونے اور ہنسی مذاق سے بھرپور بے مقصد فلمیں بنا کر اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔ ریاض شاہد نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کر کے اس پر فلم بنانے کا فیصلہ کیا جو عالم اسلام کے لیے ایک لمحہ فکریہ تھا۔ فلسطین پر جو صیہونی بربریت جاری تھی اسے اپنی فلم کے ذریعے اجاگر کرنے کا عزم کیا۔ یہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔ بہت مشکل ارادہ تھا مگر جواں ہمت اور جواں ارادوں کے حامل ریاض شاہد نے اپنے راستے میں آنے والی ہر مشکل، ہر رکاوٹ، کڑے سے کڑے امتحان اور آزمائش کا مقابلہ کر کے آخر اپنی سوچ کو اپنے خواب کو تعبیر دے دیا۔

''زرقا'' کی کہانی کا خلاصہ اگر پیش کیا جائے تو وہ کچھ اس طرح کا ہوگا۔

یہ 1948ء کی ایک زرد شام کی کہانی ہے جب فلسطین کے مستقبل کا سورج غروب ہوگیا اور غلامی کی شام اتر آئی۔

غلامی کی یہ شام فلسطین کے جسم میں ایک زہر کی طرح پھیلی۔ بدی کی تصویر کی طرح چھائی اور گناہ کی خواہش کی طرح وطن کی رگوں میں بسیرا کر لیا جب لوگوں کی آنکھیں کھلیں تو ستم کی یہ شام درد میں ڈوبے ہوئے وقت کی طرح ٹھہر چکی تھی۔ فلسطین کی وادیاں، صحرا اور پہاڑ بحیرۂ روم کی طرف سے آنے والی سازشوں کے اندھیروں میں لپٹ چکی تھی۔ شام اور گہری ہوگئی۔

''زرقا'' دراصل فلسطین کی اسی مستقل شام کی کہانی ہے جس کی صبح آج تک نہیں ہوئی اور نہ ہی یورپ کے بجھے ہوئے سامراجی نظام کا دھواں عربوں کے آسمان پر امید کی کوئی کرن پھوٹنے دے گا لیکن تاریخ گواہ ہے اور ہمیں بھی یقین ہے کہ الجزائر کی جمیلہ کا لہو پکار سکتا ہے تو ایک نہ ایک دن فلسطین کی زرقا اور دوسرے فلسطینیوں کا خون بھی ضرور رنگ لائے گا۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
خاکِ صحرا پہ جمے یا کفِ قاتل پہ جمے

☆......☆

ایک مدبر نے ایک بار کہا تھا ''ہالی ووڈ کی صنعت کا شہرۂ آفاق ادیب آرتھر ملر کی زندگی میں اگر مارلن منرو شریک نہ ہوتی تو اسے وہ عظیم مقام حاصل نہ ہوتا جو اسے حاصل ہوا۔''

کچھ ایسی ہی بات ریاض شاہد اور نیلو کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے اگر ریاض شاہد کی زندگی میں نیلو نہ آتی تو وہ ''زرقا'' جیسی عظیم فلم کبھی تخلیق نہ کر سکتے تھے کیونکہ حسن اور ذہانت جب یکجا ہوتے ہیں اور دونوں شریکِ سفر بھی ہوں تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ریاض شاہد کا ذہن اور نیلو کا حسن یکجا ہوا تو ''زرقا'' جیسی تخلیق وجود میں آئی۔

ریاض شاہد نے ''زرقا'' سے قبل بہت سی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھے اور کئی فلموں کی بطور ہدایت کار

UUNOVELS.COM

تخلیق بھی کی۔ جب ریاض شاہد نے نیلو کو شریکِ حیات بنایا تو بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ اتنے بڑے صحافی، ادیب، کہانی نویس اور ہدایت کار نے ایک عام سی اداکارہ کو اپنے گھر کی زینت کیسے بنالیا مگر نہ ریاض شاہد نے بولنے والوں کا کوئی اثر قبول کیا نہ نیلو نے ایسی باتوں کو اہمیت دی۔ اس نے اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا اور ریاض شاہد سے شادی کرلی۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کیونکہ اس سنگم سے ایک عظیم کام لینا تھا اور پھر اسی ملاپ کے نتیجے میں ''زرقا'' جیسی عظیم فلم منظرِ عام پر آئی جو نہ صرف پاکستان کے لیے قابلِ فخر تھی بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس فلم کو دیکھ کر ریاض شاہد کی اس کاوش کو سراہا اور عالمِ اسلام کے لیے اس فلم کو فخر کا باعث قرار دیا۔

''زرقا'' میں کس آرٹسٹ نے کون سا کردار ادا کیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

زرقا

یہ نام اس کردار کا ہے جس کی برداشت اور حوصلے کے آگے یہودیوں کا ہر ظلم پسپا تھا۔ وطن کا راز اپنے سینے میں لے کر تختہ دار پر شہادت پانے والی ایک ایسی لڑکی کا نام ہے جس نے فلسطین کی ایک نئی تاریخ رقم کی اور جسے فلم میں اداکارہ نیلو نے ادا کر کے پاکستان کی فلمی صنعت میں ایک ایسی تاریخ کا اضافہ کیا جس پر یہ فلم انڈسٹری ہمیشہ اپنا سر فخر سے بلند کرتی نظر آئے گی۔ عظمت اور عزیمت سے بھرپور یہ کردار نیلو شاہد کے فلمی کیریئر کا وہ کردار ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ایک شہید کی طرح جو کبھی نہیں مرتا۔ زرقا کا یہ لازوال کردار پورے فلسطین کی علامت بن گیا۔

عمار

زرقا کے منگیتر عرب مجاہد جو فلسطین کی آزادی کی تحریک ''الفتح'' کا ایک رکن ہے جس کی ناکہ (اونٹنی) کی رفتار ہوا سے بھی تیز تھی۔ زرقا عمار کی آواز سن کر فرطِ جذبات سے اس کے سامنے مجبورِ رقص ہو کر گائی:

میرا دل بے قرار تھا تمہارا انتظار تھا

اس صدا سے پوری وادی جھوم اٹھتی۔ خوشیوں کے ساز بجنے لگتے۔ عمار جسے رات کے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ فلسطین میں ظلم کی اندھیری راتوں کو اس کی بینائی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ عمار کا یہ کردار اعجاز نے کیا تھا جو فلم کا ہیرو تھا۔

انجیلا

یہودی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک باضمیر عورت تھی۔ اپنے ظالم خاوند میجر ڈیوڈ کے ظلم کی تصاویر دیکھ کر وہ خوف سے چلّا کر کہتی۔ ''حکومت لوگوں کے داؤں پر کی جاتی ہے سروں پر نہیں۔'' جب انجیلا نے زنجیروں میں جکڑی ایک عورت کو دیکھا تو اس نے اس عورت کو آزاد کر کے اس کی جگہ خود کو پابندِ زنجیر کر کے اپنی عزت کا سودا کرلیا۔ انجیلا کا یہ روپ بے چہرہ فلم میں ناصرہ نے ادا کیا ہے۔

بازی گر

ایک ایسا بازی گر جس کے کرتب اور شعبدے بازی نے یہودیوں کو بے حال کردیا تھا۔ الفتح کی تحریک کو اس بازی گر پر ناز تھا۔ مرحوم اداکار زلفی کا یہ ایک یادگار کردار تھا۔

رقاصہ

الآصف شہر کے ایک قہوہ خانے کی رقاصہ جہاں عرب جمع ہوتے تھے جس کے رقص کو دیکھنے کے لیے عربی شہزادے دیوانے تھے رقاصہ کا کہنا تھا

''میں ہوں لیلیٰ میں ہوں نغمہ''

معروف رقاصہ چھم چھم نے اس رقاصہ کا روپ اس فلم میں اپنایا تھا۔

حارث بن زیاد

شام کا رہنے والا ایک شہزادہ۔ عورت اور شراب جس کی کمزوری تھی۔ بے پناہ جسمانی طاقت والا یہ شخص ایک روز قہوہ خانے میں زرقا کا پیغام سن کر اپنی زندگی وطن کے نام کردیتا ہے۔ حارث بن زیاد جسے بچپن سے ہی آنکھ مارنے کی عادت تھی اور جب الفتح کے لیڈر استاد شعبان لطفی کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان پیش کرتا ہے تو اس وقت بھی آنکھ مار کر جامِ شہادت نوش کرتا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر فلم بینوں نے جذبہ جوش میں آ کر حارث بن زیاد کو تالیوں کی گونج میں آفرین آفرین سے نوازا۔ یہ کردار اداکار قوی نے ادا کیا تھا جو اس کے فلمی کیریئر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مختصر کردار تھا مگر جاندار پرفارمنس کی وجہ سے آج بھی زرقا دیکھنے والوں کو یاد ہے۔

سنائی

یہ ایک صحرائی چور کا کردار ہے جو استاد شعبان لطفی کے بچپن کا دوست تھا۔ لطفی کے وطن پرستانہ نظریات سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک آزاد طبیعت کا شخص تھا جو چوری کرتا اور خوش رہتا تھا۔ مگر لطفی کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتا تھا ایک موقع پر لطفی کی باتوں نے اس پر اس قدر اثر کیا کہ

UUNOVELS.COM

اس کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا اور اس نے لطفی سے کہا۔ "سنائی کو چھوڑ کر نہ جانا لطفی۔" اور پھر یہودیوں کے ہیڈ کوارٹر تل ابیب کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے تباہ کیا اور جام شہادت نوش کیا۔ یہ دلچسپ اور چونکا دینے والا کردار اداکار ساقی نے اس خوبی سے ادا کیا کہ تماشائی داد دیے بغیر نہ رہے۔ وہ اپنی بول چال اور تاثرات سے ایک صحرائی عربی لگا۔ خاص طور پر اس نے اپنے مکالمے عربی زبان میں ادا کیے۔ یہ کردار عربوں کی بحران کی علامت نظر آتا ہے۔

حبشی غلام بلال

العاصفہ کی تحریک کے اہم رکن خالد الحسینی کے وفادار نوکر کا کردار بھی اپنے اندر قربانی اور ایثار لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ عربوں کی تحریک کے لیے یہودیوں کی خبریں لانے والا یہ حبشی غلام بلال تھا جس نے میجر ڈیوڈ کے گھر ملازمت اسی مقصد کے لیے کی تھی کہ وطن کے خلاف ہونے والی سازش کے اصل کرداروں تک پہنچ پائے۔ کمال ایرانی نے حبشی غلام بلال کے اس کردار کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

خالد الحسنی

الفتح تحریک کا ایک اہم رکن اور زرقا کا باپ جسے یہودی میجر ڈیوڈ اس کے گھر میں آ کر شہید کر دیتا ہے۔ مرنے سے قبل اپنی بیٹی زرقا کو تحریک کی نشانی ایک انگوٹھی دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ استاد شعبان لطفی تک پہنچ جائے۔ اداکار فضل حق نے اس مختصر کردار کو بڑے ہی پُراثر انداز میں ادا کیا ہے۔

کیپٹن گولڈ

یہودی ہونے کے باوجود اس کا جرم یہ تھا کہ وہ فلسطین کی سرزمین میں پیدا ہوا تھا۔ باہر سے آئے ہوئے یہودی میجر نے اس کی وفاداری کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جب کیپٹن کو اس بات کا احساس ہوا تو اس نے باہر سے آئے ہوئے یہودی میجر کو ایسا آئینہ دکھایا جس میں وہ اپنا عکس دیکھ کر چلا اٹھا۔ اس کی بیوی کی عزت کا شیرازہ اسی کیپٹن کے ہاتھوں بکھرا جسے سمیٹنے کی طاقت نہ میجر میں تھی نہ ہی اس ہوس پرست قوم میں تھی جو معصوم فلسطینی عورتوں کی عزت لوٹنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کیپٹن گولڈ کا یہ کردار ایک نئے اداکار انور مرزا نے کیا تھا۔

بزرگ مجاہد

فلسطین کے شہر الآصف کے بازار میں تحریک کے لیے سرگرم بزرگ کے روپ میں مجاہد جسے اداکار رسیندو نے ادا کیا تھا۔

ڈاکٹر

یہودی ڈاکٹر جو زرقا کے شہید جسم کو چیک کرتا ہے کہ اگر ابھی اس میں سانسیں باقی ہیں تو تل ابیب ہیڈ کوارٹر کے حکم کے مطابق اسے تختہ دار پر لٹکایا جائے۔ یہ مختصر کردار معروف اداکار اسلم پرویز نے کیا تھا۔

کرنل

یہودی کرنل جو میجر کی کارکردگی سے ناخوش تھا۔ بطور مہمان اداکار الیاس کشمیری نے کرنل کا یہ کردار کیا تھا۔

حسن بن خالد

حسن بن خالد زرقا کا مجاہد بھائی جو آنکھوں سے معذور استاد شعبان لطفی کے بڑھاپے کی لاٹھی بنا اور جوان ہو کر العاصفہ کی تحریک کا ایک رہنما بن کر اٹھا۔ معروف اداکار یوسف خان نے اس مختصر کردار میں اپنے آپ کو پیش کیا۔ فلم کی کہانی اسی نوجوان مجاہد کی بہن زرقا کی عزیمت بھری داستان، استاد شعبان لطفی فلم کے شروع میں مجاہدین کو سناتا ہے اور پھر فلم فلش بیک میں جاتی ہے جہاں زرقا سے زرقا کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

زرقا کے ان کرداروں سے بہت حد تک اس کی کہانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود میں اس کی کہانی اور اس کے پس منظر کے بارے میں آپ کو مزید معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کروں گا۔

اس کہانی کا تعلق اس مٹی سے ہے جس میں مسلمانوں کا لہو تھا اسے انگریزوں نے شراب کے عوض یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کیا۔ جن کا نہ کوئی وطن تھا نہ کوئی زمین تھی۔ یہ بے گھر خانہ بدوش قوم تھی اور جب ہم اس فلم کی کہانی کے پس منظر میں جھانکتے ہیں تو اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ فلسطین دنیائے اسلام کی شہ رگ تھی جسے سامراجی تلوار نے کاٹ کر رکھ دیا اور زرقا اسلام کی شہ رگ پر جمے ہوئے اس لہو کا نام ہے جو شہیدوں کے خون کی طرح ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ یہ اس عرب لڑکی کی عظیم قربانی کی داستان ہے جسے آج سے 72 سال پہلے کربلا میں سولی پر چڑھایا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں دو ہزار 72 برس پہلے یسوع مسیح کو مصلوب کیا گیا تھا۔

"زرقا" کی کہانی عالم اسلام کے قبلۂ اول کی خونی داستان ہے جسے پہلی بار ریاض شاہد کی جرأت نے فلم کے روپ میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مرحلے پر انہیں کئی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کا جذبہ سچا تھا جو خواب انہوں نے خلیل قیصر کی فلم ''شہید'' کی تکمیل کے دوران دیکھا تھا ''زرقا'' اس خواب کی تعبیر بن کر 1969ء میں جب ریلیز ہوئی تو لوگوں نے ان کی جرأت کو سلام کرتے ہوئے اس فلم کا استقبال کیا جو اس سے پہلے کسی پاکستانی فلم کو نصیب نہ ہوا۔

''زرقا'' وہ پہلی پاکستانی فلم ہے جس نے جسم کی تفریح کو روح کی تفریح پر ترجیح دینے والے کمرشل فلم سازوں پر ثابت کیا کہ کسی الہڑ دل پھینک اور عاشق مزاج کھیتوں اور باغوں میں اچھل کود کرنے والی مٹیار پر اتنے جوش وخروش سے فلم بین نچھاور نہیں ہوتے جتنے جوش وخروش سے زنجیروں میں جکڑی ہوئی زرقا کا انہوں نے استقبال کیا۔

پہلی بار پاکستانی سنیما پر اس فلم کی صورت میں ایک نیا اور چونکا دینے والا تجربہ کیا گیا جس کا تعلق بالواسطہ دنیا سے تھا اور بلاواسطہ پاکستانی عوام سے تھا۔

آیئے ''زرقا'' کی کہانی کی طرف چلتے ہیں۔ دراصل یہ کہانی نہیں، بیت المقدس جو مسلمانوں کا دل ہے، اس پر لگا ہوا صیہونی استبداد کا وہ زخم ہے جس سے آج بھی لہو بہہ رہا ہے۔ اس زخم کا تعلق نہ تو دیکھنے سے ہے نہ ہی سننے سے ہے، صرف محسوس کرنے سے ہے۔

آج سے 72 سال قبل جب ایک یہودی سائنس داں وڈا ہمن نے لکڑی سے الکوحل تیار کرنے کا نسخہ تیار کیا تو انگریزوں نے اس نسخے کو حاصل کرنے کے لیے فلسطین کی دس ہزار مربع میل زمین اس یہودی قوم کے حوالے کر دی جس قوم کا کوئی وطن نہ تھا۔ یعنی مسلمانوں کے لہو کو شراب کے اس جوہر کے عوض فروخت کر دیا گیا جو آج بھی انگریزی شراب میں ملا کر پیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے مسلم ممالک کے سربراہ بھی اسے شوق سے پیتے ہیں جس میں فلسطین کے مسلمانوں کا لہو شامل ہے۔ یہ تھا وہ پس منظر جو فلسطین کے نیلام کا سبب بنا۔

☆......☆

دوستو! ''زرقا'' کے بارے میں جو کچھ بتا چکا ہوں اور جو کچھ آپ معلوم کر چکے ہیں، لگتا تو یہی ہے کہ یہی کافی ہے لیکن ایسی بات نہیں۔ اس عظیم فلم کے بارے میں ابھی بہت کچھ بتانے کی باتیں ہیں۔ میں خود حیران ہوں کہ کون سی بات کہاں سے شروع کروں۔ بہر حال مجھے جہاں جہاں

''زرقا'' کو آٹھ نگار ایوارڈز ملے۔ (1) بہترین اردو فلم (2) بہترین ہدایت کار (3) بہترین کہانی نویس (4) بہترین اداکارہ (5) بہترین نغمہ نگار (6) بہترین گلوکار (7) بہترین تدوین کار (8) بہترین آرٹ ڈائریکٹر۔

دیگر زبانوں میں: عرب ممالک میں جہاں اس فلم کو عربی سب ٹائٹل کے ساتھ پیش کیا گیا وہاں فلسطین میں اس فلم کو عربی زبان میں ڈب کر کے ریلیز کیا گیا اور اسے پاکستانی بھائیوں کی طرف سے عرب بھائیوں کے لیے ایک ''تحفہ'' کہا گیا۔

زرقا کا گیت بھارتی فلم میں

پاکستانی فلم ''زرقا'' کا یہ انقلابی گیت ''رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے'' اتنا مقبول ہوا کہ بھارتی فلم ''دوست'' میں بھی اسے شامل کیا گیا۔ بھارتی فلم کے لیے اس نغمے کو محمد رفیع کی آواز میں صدا بند کیا گیا لیکن چونکہ فلم کے سچویشن کے لحاظ سے پرفیکٹ نہیں تھا اور اس کی دھن بھی کمزور تھی اس لیے ''زرقا'' جیسی مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔

زرقا کے بعد۔ نیلو

ریاض شاہد سے شادی کے بعد نیلو بہت سیلیکٹڈ فلموں میں کام کرنے لگی تھیں۔ ''زرقا'' کے بعد نیلو کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ نیلو اب مزید اداکاری نہیں کریں گی مگر ریاض شاہد کے بعد نیلو کو اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کے لیے میدان عمل میں آنا پڑا۔ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے دوبارہ اداکاری شروع کی تو مفاد پرست فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے انہیں خطرناک، عزت، پنڈی وال اور واردات جیسی بے باک، بے ہودہ، ننگی اور گندی فلموں میں کام کرنے پر مجبور کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ''زرقا'' کے بعد انہیں ایسے ہی اعلیٰ وارفع کرداروں میں پیش کیا جاتا لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ ان سے بھرپور جسمانی نمائش کرائی گئی۔ بعض اوقات انسان نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ ایسے فیصلے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

سے جو جو باتیں معلوم ہوتی جا رہی ہیں میں انہیں بتاتا جاؤں گا۔

زرقا کا لفظی مفہوم نیلی آنکھوں والی۔ دور تک دیکھنے والی ہے۔ ''زرقا'' کی کہانی مئی 1948ء میں شروع ہوئی اور دو ہفتوں میں اس کا اختتام ہوا۔ یہ اس لڑکی کا قصہ ہے جس کا باپ خالد آسنی ایک خفیہ تحریک العاصفہ کا ممبر تھا۔ اس کے باپ کی شہادت یہودیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ہوئی اور زرقا کی شہادت یہودیوں کے فوجی ہیڈ کوارٹر بیگانہ کو بم سے اڑاتے وقت ہوئی۔

باپ کی شہادت کے بعد زرقا فلسطین کے شہر الآصف پہنچ کر استاد شعبان لطفی سے ملتی ہے جس نے زرقا کو حارث بن زیاد سے ملوایا۔ یہ بہت طاقت ور شخص تھا۔ اس قہوہ خانے کے مالک ابو سفیان آصف اور رقاصہ (چھم چھم) کو یہودیوں نے گرفتار کرلیا تھا۔ قہوہ خانے کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے زرقا کا رقص تحریک کے لیے ایک پیغام بن کر چھا گیا اور کئی نوجوان اس سے متاثر ہو کر اس عرب تحریک کا حصہ بنے۔ یہودی میجر ڈیوڈ کی بیوی انجیلا ایک حقیقت پسند عورت تھی جس نے اپنے شوہر کے مظالم کی ہمیشہ مخالفت کی۔

تحریک کے لیڈر شعبان لطفی اور اس کے ساتھی ایک روز گرفتار ہوگئے جن کو میجر ڈیوڈ کے ٹارچر سیل بھیج دیا گیا۔ میجر نے تمام گرفتار شدگان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے ہوئے ان سے سوال کیا۔

''بتاؤ تم میں تمہارا لیڈر شعبان لطفی کون ہے؟''

مگر سب خاموش رہے۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میجر نے غصے میں شعبان لطفی سمیت سب پر ٹارچر شروع کیا جو حارث بن زیاد سے دیکھا نہ گیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ''میں شعبان لطفی ہوں کیونکہ مجھ سے زیادہ طاقت ور اس تحریک میں کوئی دوسرا نہیں اور عرب اسی کو اپنا سردار بناتے ہیں جو سب سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔''

اب شعبان لطفی سے خاموش نہ رہا جاسکا۔ وہ چلایا۔

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اصل شعبان لطفی میں ہوں۔''

میجر ڈیوڈ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اصل شعبان لطفی کا پتا وہ کیسے چلائے آخر اس کے شاطر دماغ میں ایک ترکیب آئی اور اس نے کہا۔ ''تم دونوں آپس میں لڑو اور ثابت کرو کہ تم میں کون طاقت ور ہے اور کون کمزور۔''

دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے اور حارث بن زیاد نے جلد ہی شعبان لطفی کو چت کردیا کیونکہ وہ واقعی بہت زیادہ طاقت ور تھا۔ میجر نے مان لیا کہ وہی شعبان لطفی ہے اور وہیں اسی وقت اسے قتل کروادیا۔

سنائی جو صحرائے عرب کا مشہور چور تھا لیکن شعبان لطفی کا بچپن کا دوست تھا۔ اس نے کیپٹن گولڈ کو اغوا کرکے اس کے عوض لطفی کی رہائی کا سودا کیا اور لطفی کو ٹارچر سیل سے نکلوا لیا۔ بعد میں جب میجر ڈیوڈ کو پتا چلا کہ کیپٹن گولڈ کی رہائی کے لیے تاوان کے طور پر جس شخص کو رہائی دلائی گئی ہے، حقیقتاً وہی تحریک کا لیڈر اور رہنما تھا تو اسے بڑی شرمندگی ہوئی۔

میجر ڈیوڈ کی بیوی انجیلا نے جب اپنی آنکھوں سے زنجیروں میں جکڑی زرقا کو دیکھا تو اسے اپنی قوم سے نفرت ہوگئی۔ اس نے ایک روز ٹارچر سیل پہنچ کر زرقا کو رہا کردیا اور اس کی جگہ خود لے لی۔ کچھ دیر بعد کیپٹن گولڈ نشے میں دھت ٹارچر سیل پہنچا اور انجیلا کو مسلمان لڑکی زرقا سمجھ کر انجیلا کو اپنی ہوس کا شکار بنا ڈالا۔ اتفاق سے اسی دوران میجر ڈیوڈ ٹارچر سیل آگیا، اس نے کیپٹن گولڈ کو اپنی بیوی کے ساتھ اس حال میں دیکھا تو برداشت نہ کرسکا اور طیش میں آکر دونوں کو گولی مار دیا۔ کیپٹن نے مرنے سے پہلے تمام قیدیوں کو رہا کردیا تھا۔ میجر گولی مار کر غصے کی حالت میں فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

شعبان لطفی نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تل ابیب میں یہودیوں کے ہیڈ کوارٹر بیگانہ کو تباہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس موقع پر یہودی سپاہیوں نے ان کے ٹرک کا تعاقب کیا تو تمام ساتھی ایک ایک کرکے اپنے پیچھے آنے والی ان کی سواریوں کے ٹائروں کی زد میں آکر شہید ہوتے رہے۔ آخر میں استاد شعبان لطفی نے پوری فورس کے سامنے خود کو پیش کردیا تاکہ زرقا، عمار اور سنائی بیگانہ ہیڈ کوارٹر تک پہنچ کر اسے بم سے اڑادیں۔

شعبان لطفی کو میجر ڈیوڈ نے زمین پر گرا کر ایک فوٹو بنائی اور پھر ہائی کمان کی ہدایت کے مطابق اس کی آنکھیں نکال دیں۔ دوسری طرف عمار، زرقا اور سنائی نے ہیڈ کوارٹر کو اڑا دیا اور شہادت کا جام نوش کرلیا لیکن زرقا کی ابھی چند سانسیں باقی تھیں۔ میجر ڈیوڈ نے جب اسے اس حال میں دیکھا تو زرقا کو پھانسی پر لٹکانے کا حکم صادر کیا۔ اسے میدان میں لے جا کر تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ مرتے وقت زرقا کے لبوں پر لا الہ الا اللہ کا ورد تھا اور شیطان یہودی میجر تلملا رہا

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھا۔

☆......☆

جب زرقا شہادت کا رتبہ پانے کے لیے سولی پر لٹکا دی گئی تو یقین آ گیا کہ

ڈھلے گی اک دن ستم کی یہ شام اے فلسطین

ریاض شاہد کا قلم ہمیشہ باغی رہا۔ پہلے اس کا قلم معاشرے کی برائیوں کو بے نقاب کرتا رہا پھر اس کا قلم اپنے معاشرے سے باہر نکلا اور فلسطین کی سرزمین سے ایسے اٹھے کا خمیر اٹھا کہ عوام اس کے خیال پر چونک پڑے جب کہ بہت سی حکومتوں کے خود ساختہ ستون لرزنے لگے۔ اس نے ایک نئے معاشرے کے ایک نئے موضوع پر قلم اٹھایا۔ اس کی سوچ اس بار بہت بلند تھی۔ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، ایک منزل تھی۔ اس نے ایک ظلم کے خلاف قلم اٹھا کر قلمی جہاد کیا۔ ''زرقا'' کو ہم ریاض شاہد کا قلمی جہاد کہہ سکتے ہیں۔

''زرقا'' کی کامیابی سے جس بات کا شدت سے احساس ہوا وہ یہ ہے کہ کوئی کہانی نمائش سے پہلے کمرشل نہیں ہوتی بلکہ نمائش کے لیے پیش ہونے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آیا کہانی کمرشل ہے یا نہیں۔ ''زرقا'' کی ریلیز سے پہلے چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ ہمارے فلم بین کہانی کی ہیروئن کی موت کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ ہیرو ہیروئن فلم کے اختتام پر گلوں میں بانہیں ڈال کر اپنی محبت کی کامیابی ظاہر کریں لیکن ''زرقا'' عام فارمولا کہانیوں اور موضوع سے بہت مختلف تھی۔ اس میں ہیروئن وطن کے لیے قربانی دیتی ہے۔ اس کا لباس شہادت کے خون سے لتھڑا ہوا ہوتا ہے اور پیشانی جیسے جاگتے لہو میں جگمگا رہی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود فلم بین کی نظریں اسکرین پر جمی رہتی ہیں اور جب فلم اختتام پر پہنچتی ہے تو تماشائی کہتے ہیں۔

''کاش! آزادی کا پروانہ کبھی جل کر راکھ نہ ہوتا۔''

اور جب وہ سینما ہال سے باہر آتے تو ایک ولولے اور جوش کے ساتھ عام زندگی میں قدم رکھنے کی سوچتے۔ یہی ''زرقا'' کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

''زرقا'' کا منظر نامہ اتنا چست لکھا گیا تھا کہ تیزی سے بدلتے مناظر کہانی کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہیں۔ اس خوبی کی ایک مثال یہ ہے کہ زرقا کو جب العاصفہ کا رکن بنایا جاتا ہے اور پھر تحریک کا اہم فرض ادا کرنے کے لیے اسے قہوہ خانے کی رقاصہ کا کردار ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ عربوں میں قہوہ خانے کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہمارے ہاں بڑے بڑے ہوٹلوں اور سینما گھروں کو حاصل ہے اس لیے عربوں میں اپنے خیالات اور پروگرام کو عوام تک پہنچانے کے لیے جو طریقہ ریاض شاہد کے ذہن نے سوچا لائق ستائش ہے۔ واقعی عرب میں اس مقام کے علاوہ تبلیغ کے لیے کوئی اور مقام نہ ہو سکتا تھا جہاں حکومت سے چوری چوری پمفلٹ تقسیم کیے جائیں۔

''زرقا'' کے مکالمے جو ریاض شاہد نے تحریر کیے ہیں، نہایت جاندار اور معنی خیز ہیں۔ ان میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور وقت کی نزاکت بھی۔ ان سے ظلم کی بو بھی آتی ہے اور آزادی کے لیے مر مٹنے کا جذبہ بھی جھلکتا ہے۔

''زرقا'' کے فنکاروں کی اداکاری کا اگر جائزہ لیا جائے تو بہت کم فلمیں نظر آئیں گی جن میں اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے گئے ہوں جیسے ''زرقا'' میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً طالش اس سے پہلے ''شہید'' اور ''فرنگی'' میں فرنگی کا لافانی کردار ادا کر کے امر ہو گئے لیکن ان کی اداکاری میں پختگی، مکالموں کی بہتر ادائیگی اور چہرے کے تاثرات کا جتنا حسین امتزاج انہوں نے ''زرقا'' میں پیش کیا ہے پھر کسی فلم میں پیش نہ کر سکے۔ نیلو شاہد نے ٹائٹل رول ادا کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ اس فلم سے پہلے ''شہید'' میں بھی مسرت نذیر نے رقاصہ کا کردار کیا تھا جو وطن کی خاطر جان دے دیتی ہے لیکن نیلو نے جو کامیابی اپنے رول میں حاصل کی ہے وہ مسرت نذیر حاصل نہ کر سکی۔ مسرت پیدائشی رقاصہ ہوتی ہے اس کا بدن رقص کرتا ہے تو اس میں اس کی خواہش کا بڑا دخل ہوتا ہے جب کہ ''زرقا'' کے کردار میں رقص مجبور ہو کر کیا جاتا ہے بلکہ ظلم کا نشانہ بنانے کے لیے زرقا کو زنجیریں پہنا کر رقص کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس کے رقص کو دیکھ کر دیکھنے والوں کی سسکیاں نکلتی ہیں۔ آہیں اور کراہیں نکلتی ہیں اور ظلم کے خلاف نفرت کا جذبہ جوش مارتا ہے۔ دونوں کرداروں میں بڑا فرق ہے۔ زرقا سراپا ظلم کا شکار ہے اور اس میں نیلو اُمید سے کہیں زیادہ کامیاب رہی ہے۔ علاؤالدین نے ایک محب وطن اور تحریک کے سربراہ کا رول بڑی خوب صورتی سے ادا کیا ہے۔ دیگر اداکاروں نے بھی اپنے اپنے کردار بالکل ایسے ادا کیے ہیں جیسے انہیں سامنے بٹھا کر ان کے کردار لکھے گئے ہوں۔

''زرقا'' عکاسی کے حوالے سے نادر شاہکار ہے اور رنگوں کا حسین امتزاج بھی ہے۔ جتنا اچھا رنگ اس فلم میں

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

پیش کیا گیا ہے ذرا کم ہی دیکھنے میں آیا۔ کیمرا مین نبی احمد نے جو زاویے تلاش کیے ہیں وہ خوب تر ہیں۔ سرخ رنگ کا استعمال فلم کی شدت کو کھل کر ظاہر کرتا ہے۔

ریاض شاہد، پہلے ایک کامیاب ادیب تھے لیکن ''زرقا'' دیکھ کر فلم دیکھنے والا طبقہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ایک اچھا ادیب ایک کامیاب ہدایت کار بھی بن سکتا ہے؟ ''زرقا'' دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ریاض شاہد کا قد ہدایت کار کی حیثیت سے بہت اونچا اور بہت بلند ہے۔ ''زرقا'' میں وہ کہانی نویس سے زیادہ ہدایت کار کی حیثیت سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہر فریم میں محنت کی ہے اور جو بات وہ قلم سے نہ کہہ سکے انہوں نے کرداروں کی چال ڈھال اور چہروں کے تاثرات سے کہلوائی ہے۔

فلم ''زرقا'' جہاں فلسطین کا المیہ ہے وہاں پاکستانی فلمی صنعت میں ایک سنگ میل کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ ریاض شاہد نے فلم انڈسٹری کو ''زرقا'' کے روپ میں نئی سوچ، نئی منزل، نئے ارادے اور نئے حوصلے دیئے ہیں۔ ''زرقا'' ایک فلم کا نام نہیں ایک اسکول کا نام ہے جہاں سے ایسی ہی بھرپور موضوعاتی فلمیں تخلیق کرنے کی روشنی پھوٹتی ہے۔

''زرقا'' کی موسیقی اور نغمہ نگاری نے بھی فکر وفن کا ایک نیا باب وا کیا ہے۔

☆ رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

☆ میں پھول بیچنے آئی

☆ یا الٰہی یا رفیق

کی شکل میں جو نغمات پیش کیے گئے ہیں وہ بڑے مستحسن اور قابل تقلید ہیں۔ عام گیتوں سے ہٹ کر ہونے کے باوجود ان نغموں نے بہت شہرت حاصل کی جو اس ثبوت کی بین دلیل ہے کہ عوام ہر اچھی چیز کو ہمیشہ پسند کرتے ہیں بشرطیکہ وہ چیز موقع محل کی مناسبت سے پیش کی جائے۔

''زرقا'' ہماری فلم انڈسٹری میں اس لحاظ سے بھی اہم مقام رکھتی ہے کہ یہ ایک نیک جذبہ کے تحت بنائی گئی۔ اسے بنانے سے پہلے ریاض شاہد کے سامنے واضح مقصد تھا اور اس جمود کو بھی توڑنا تھا جو ایک عرصے سے ہماری فلموں اور ان کی کہانیوں میں موجود تھا۔

☆......☆

دوستو! اگر ''زرقا'' کی تکمیل کے دوران اور اس کی نمائش کے بعد کے حالات کا کچھ ذکر نہ کروں تو میرے خیال میں یہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوگی اس لیے کچھ پس پردہ باتیں بھی ضروری ہو جاتی ہیں۔

''زرقا'' کا آغاز ہوا تو موسیقار رشید عطرے نے اس کی موسیقی دیتے ہوئے اس کے تین گیت کمپوز کیے۔ اسی دوران ان کا انتقال ہو گیا۔ رشید عطرے کو چونکہ عربی طرز پر دھنیں بنانے پر ملکہ حاصل تھا۔ اس سلسلے میں ان کی فلموں عذرا، شہید، ہزار داستان اور الہلال کو ان کی موسیقی کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا تھا۔ ان فلموں کے نغمے سنتے ہی عرب کے نخلستانوں اور بازاروں کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ انہی باتوں کو پیش نظر رکھ کر ریاض شاہد نے ''زرقا'' کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا مگر وہ پوری فلم مکمل نہ کر سکے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند وجاہت عطرے نے جو باپ کی موجودگی میں ان کی معاونت کر رہے تھے، موسیقی کا باقی کام نمٹایا۔ وجاہت عطرے نے فلم کے باقی نغموں کی موسیقی اس انداز سے ترتیب دی کہ انہیں سننے کے بعد رشید عطرے کی کمی کا بالکل احساس نہیں ہوا۔ یہ بطور موسیقار وجاہت عطرے کی پہلی کاوش تھی جس نے ڈائمنڈ جوبلی منائی۔

اس فلم کی موسیقی اس انداز میں کمپوز کروائی گئی جس سے اسلامی کلچر کے ساتھ ساتھ عربی موسیقی کی روح کو بھی پیش نظر رکھا گیا اور پھر ان دھنوں پر ایسے نغمے لکھوائے گئے جن میں نغمگی کے ساتھ ساتھ صوتی عنصر بھی غالب رہے۔ مزہ اور نغمگی کا یہ سنگم بھی خوب رہا۔ دوسرے گیت ''یا الٰہی'' کی صدائیں نسیم بیگم اور اداکار ساقی نے ادا کی۔ پانچویں گانے میں رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔ مہدی حسن نے گایا لیکن اس گیت میں ''یا اللہ'' کے نام نامی کو خود نیلو بیگم نے اپنے گلے سے نکالا تو سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ آخری انقلابی ترانے میں منیر حسین نے ''اے فلسطین'' کا انقلابی نعرہ بلند کیا۔ ''زرقا'' کے گیتوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

☆ میرا دل تھا بے قرار، تھا تمہارا انتظار (آوازیں: نسیم بیگم، منیر حسین۔ بول: خواجہ پرویز۔ موسیقی: وجاہت عطرے۔ فلم بندی نیلو اور اعجاز پر ہوئی)

☆ یا الٰہی یا حبیبی یا خلیلی نفیس ہے (آوازیں نسیم بیگم، اداکار ساقی۔ بول: سلطان محمود آشفتہ۔ موسیقی: رشید عطرے۔ فلم بندی چھم چھم پر ہوئی)

☆ جلتی آگ کو شمع بنا کر رقص کرے پروانہ

UUNOVELS.COM

(آوازیں: مالا، منیر حسین۔ بول: ریاض شاہد۔ موسیقی: رشید عطرے۔ فلم بندی نیلو، اعجاز پر ہوئی)

☆ اے غمِ جہان ناچ خلق، بے زبان ناچ (آوازیں: مالا، منیر حسین۔ بول: ریاض شاہد۔ موسیقی: رشید عطرے۔ فلم بندی نیلو اعجاز پر ہوئی)۔

☆ تو کہ ناواقف آداب غلامی ہے ابھی۔ رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے (آوازیں: مہدی حسن، نیلو۔ بول: حبیب جالب۔ موسیقی: وجاہت عطرے۔ فلم بندی نیلو اعجاز پر ہوئی)

☆ میں پھول بیچنے آئی (آواز: نسیم بیگم۔ بول: خواجہ پرویز۔ موسیقی: وجاہت عطرے۔ فلم بندی نیلو پر ہوئی)

☆ اے فلسطین! اے فلسطین (آوازیں: نسیم بیگم، منیر حسین اور ساتھی۔ بول: حبیب جالب۔ موسیقی: وجاہت عطرے۔ فلم بندی علاؤالدین اور ساتھیوں پر ہوئی)۔

''زرقا'' کے نغمے عام فلموں سے ہٹ کر تھے۔ ان نغموں کی شاعری فلم کی کہانی کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔ یوں سمجھیے کہ العاصفہ کی تحریک اور الفتح کے نوجوانوں کا ایک پیغام تھا جو دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے لیے زندگی کی اس سحر کو لانا چاہتا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا کہ وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود۔ ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا۔ یہ وہ بات ہے جو اس فلم کے نغموں میں ملتی ہے۔

''ہمیں یقین ہے ڈھلے گی اک دن ستم کی یہ شام اے فلسطین''

اسے نغمہ کہیں یا ترانہ کہیں یا فلسطین کے المیہ کا وہ علاج کہیں جو اس کے شاعر نے اس میں بتائے ہیں کہ فلسطین میں جاری ستم کی یہ زرد اور لہو میں ڈوبی شام ایک نہ ایک دن ضرور ڈھلے گی اور رسول اللہ کی عظمتوں کی قسم کھا کر ایک عہد کیا گیا ہے کہ کسی شہید کا خون رائیگاں نہ جائے گا اور انشاء اللہ سامراجیوں کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ فلم کے ایک گیت میں یہ شعر

اے وطن تیری بربادی پر چپ کیوں کر رہوں
لٹ چکا ہے جو چمن اس کو چمن کیسے کہوں

ہمارے قبلۂ اوّل بیت المقدس جو نصرانیوں کے قبضے میں ہے، اس کی طرف اس کا اشارہ ہے یہ سوال ہماری غیرت اور ایمان کو جھنجوڑنے کے لیے کافی ہے کہ اس چمن کو اب چمن کیسے کہیں۔ تم کون سامنہ لے کر اپنے خدا کے سامنے جاؤ گے۔ مسلم قوم کا اتحاد اور ملت کی یک جہتی کا پیغام بھی اس نغمے میں پنہاں ہے۔ مومن کا ایمان کل پر نہیں، اس کے لیے تو آج ہی سب کچھ ہے کیونکہ کل جو کچھ کریں گے تو ابھی سے کر جا اور آزادی کی خاطر مر جا۔ اسی میں تمہاری کامیابی ہے۔ غلامی کی ذلت سے جینے سے بہتر مر جانا ہے۔ اسی طرح وطن کی آبرو اور آن بچ سکتی ہے۔ المیہ چاہے فلسطین کی شکل میں ہو یا کشمیر کی صورت میں ہو، وطن کی سرزمین کی پکار ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ اسی پکار پر لبیک کہو گے تو وطن بھی بچ سکتا ہے اور وہ لاکھوں آبروئیں بھی بچ سکتی ہیں جو شہداء کو سلام کرتی ہیں۔

بات صرف فلسطین کے اوپر ڈھائے جانے والے ظلم کی نہیں، دنیا بھر کے مظلوموں کی ہے کیونکہ ظلم سب جگہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے اور ظالم بھی ایک ہی ہے جو ہر قوم کا قاتل ہے۔ اس ظالم سے نجات کے لیے لبوں پر لا الہ الا اللہ کا ورد کرنا ہوگا۔ جس کے نتیجے میں دنیا بھر کے سحر ڈیوڈ ختم ہوں گے ورنہ ظالم اسی طرح پیدا ہو کر آزاد قوموں کو غلام بنانے کی سازشیں کرتے رہیں گے۔ اسی طرح انسانیت کو نچاتے رہیں گے۔ چاہے کوئی آداب غلامی سے واقف ہو یا نہ ہو، رقص زنجیر اسی طرح برپا ہوتا رہے گا۔ مسلم قوم کی آبروئیں زرقا کی صورت میں تختہ دار کی ٹہنی پر لٹکتی رہیں گی۔

آؤ اپنے تمام مسلک، قبیلے، قومیں، ذاتیں، زبانیں چھوڑ کر ایک کلمہ تلے جمع ہو جائیں۔ جس سے دلوں میں ایسا زلزلہ ہو تاکہ عدو بھی تلملا اٹھے۔ یہی ''زرقا'' کے نغمات کا اعلیٰ مقصد ہے۔ کس قدر اعلیٰ اور بلند سوچ تھی ریاض شاہد کی۔

پس پردہ باتوں میں ایک بات اس نغمہ ''تو کہ ناواقف آداب غلامی ہے ابھی'' سے متعلق بھی ایک قابل ذکر داستان ہے آج کی نئی نسل جس سے بالکل ناواقف ہے اس لیے انہیں بتانا ضروری ہوتا ہے۔

اس تاریخی اور انقلابی گیت کا تعلق دور ایوبی سے ہے۔ حکمران طبقے نے ایک جشن کا اہتمام کیا جس میں رقص و سرود کی محفلیں بھی رکھی گئیں۔ ایک ایسی ہی محفل کے لیے اداکارہ نیلو کو حکم نامہ بھیجا گیا کہ اسے رقص کرنا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب نیلو اور ریاض شاہد میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ جب ریاض شاہد کو اس حکم نامے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے نیلو سے کہا۔ ''تم انکار کردو۔ کسی صورت بھی تمہیں ناچنا نہیں چاہیے۔''

ایک طرف محبوب کا حکم تھا تو دوسری طرف صاحب

مسند کا فرمان۔ بڑی سخت آزمائش تھی نیلو کے لیے۔ نیلو نے واضح الفاظ میں منع کر دیا۔ ''میں اس محفل میں رقص نہیں کروں گی۔''

نیلو کا یہ انکار کسی بغاوت سے کم نہ تھا۔ اسے دھمکایا گیا۔ ''اگر تم خود نہیں آؤ گی تو ہم تمہیں اٹھا کر لے آئیں گے اور نچوائیں گے۔''

ایک طرف ایک کمزور عورت تھی اور دوسری طرف طاقت کے متوالوں کے لیے اسے اٹھا کر لے جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر ایک کمزور خاتون کا عزم وارادہ کتنا مضبوط ہوتا ہے اس کا مظاہرہ نیلو نے یوں کیا کہ بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں کھالیں اور ان کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ موت وحیات کی کشمکش میں تھیں۔ انہیں فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ ہرکارے آئے تو نیلو اسپتال میں تھیں۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر واپس چلے گئے۔

دوسرے دن کے اخبارات میں جلی حروفوں میں یہ خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ملک بھر کے تمام اخباروں نے اس وقوع کو ہائی لائٹ کیا تھا کہ ایک اداکارہ نے کس طرح اپنی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔

اس واقعے سے متاثر ہو کر انقلابی شاعر حبیب جالب نے ''نیلو کے نام'' سے ایک نظم لکھی جس کا پہلا بند یوں ہے۔

تو کہ ناواقف آداب شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی تو کیونکر
سایہ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے

اسی نظم کو حبیب جالب نے فلم ''زرقا'' کے لیے تھوڑی سی تبدیلی کر کے فلمی نغمے کی صورت دی اور ریاض شاہد نے نیلو کو زنجیروں میں جکڑ کر فلمی سچویشن کے مطابق اس گیت کی پکچرائزیشن کی جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے انہیں یاد ہو گا کہ اس منظر میں میجر ڈیوڈ اپنی ظالمانہ اور آمرانہ صورت میں کھڑا مظلوم زرقا کو جو زنجیر میں جکڑی ہوئی رقص کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جلتی ہوئی سگریٹ سے اس کے جسم کو داغتا ہے اور کہتا ہے۔ ''ناچو...... ناچو......'' اس موقع پر اعجاز یہی گیت گاتا ہے۔

تو کہ ناواقفِ آداب غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

بتائی جانے والی باتوں میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ''زرقا'' پاکستان کے علاوہ شام، اردن، لبنان، عرب امارات، دمشق اور الجزائر میں بھی عربی سب ٹائٹل کے ساتھ عام نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس فلم کے حوالے سے یہ بات بھی ناقابلِ ذکر ہے کہ......

یہ پاکستان میں بننے والی واحد فلم ہے جس کی اعلیٰ مقصدی کہانی کی وجہ سے عالم اسلام کی مجاہد تحریکوں نے اسے اپنے کارکنوں کو دیکھنے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں مصر میں اخوان المسلمین اور پاکستان میں جماعت اسلامی قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنے کارکنوں کو ''زرقا'' دیکھنے کی ترغیب دی۔

ایک بار جماعت اسلامی کے سابق امیر قاضی حسین احمد سے کسی صحافی نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے کبھی کوئی پاکستانی فلم دیکھی ہے؟''

''ہاں۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں نے صرف ایک پاکستانی فلم ''زرقا'' دیکھی ہے جسے دیکھ کر میں نے کہا۔ ''واقعی فلم کے ذریعے ہم عالم اسلام کو بیدار کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ ایسی فلم دوبارہ نہ بن سکی۔''

پس پردہ باتوں میں ایک بات ''زرقا'' کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ بیرونی ممالک سے ملنے والی رقم جو ''زرقا'' کی نمائش کے بعد حاصل ہوئی۔ ریاض شاہد نے وہ ساری رقم الفتح تحریک کو دے دی جو ان کے اس تحریک سے محبت کا ثبوت ہے۔

☆......☆

ریاض شاہد، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، ایک دبنگ صحافی اور اعلیٰ مصنف وہدایت کار تھے۔ انہوں نے اپنی فلم ''زرقا'' کے لیے جو مکالمے لکھے وہ اپنے اندر زندگی بندگی اور خودداری کے ابدی پیغام کے مظہر تھے۔ ایسے الفاظ ایسے جملے ایسے انداز جیسے سنیما کی اسکرین پر فلم بین پہلی بار دیکھ اور سن رہے تھے۔ اس فلم کا ہر مکالمہ یہودیوں کے چہروں سے نقاب اٹھاتے تھے۔ ان مکالموں کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ اس کے لکھنے والے کی سوچ اور نظریئے نے مسلم قوم کی حرمت اور آبرو کو غلامی کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے کیسے کیسے جرأت مندانہ جملے تحریر کیے ہیں۔ ریاض شاہد نے عالم اسلام کو جگانے کے لیے اپنا قلمی اور ذہنی جہاد کیا ہے۔

اس فلم میں کام کرنے والے تمام فنکاروں نے اپنے

UUNOVELS.COM

کرداروں کے مطابق مکالمے ادا کیے ہیں۔ خاص طور پر اداکارہ نیلو، اداکار، علاؤ الدین، آغا طالش، اعجاز، ساقی اور اداکارہ ناصرہ کے بعض مناظر میں جو مکالمے فلم بینوں کو سننے کو ملے۔ ان سے ریاض شاہد کی مکالمہ نگاری کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان طویل مکالموں کے کچھ مختصر جملے یہاں ہر اداکار کے کرداروں کے نام سے پیشِ خدمت ہیں۔

ایک منظر میں زرقا کا مکالمہ۔

''جب عورت پیغمبروں کو جنم دے سکتی ہے۔ جانبازوں کو پیدا کر سکتی ہے۔ شہیدوں کو لوریاں دے سکتی ہے، دیکھ سکتی ہے، محسوس کر سکتی ہے، تمام زندگی چپ رہ سکتی ہے تو وہ کون سا ظلم ہے جو عورت کی زبان سے وطن کا راز نکال سکتا ہے؟''

عمار کے ڈائیلاگ ملاحظہ فرمائیں۔ ''میجر کر چکے اپنے ظلم کا ہر وار آزما چکے زرقا کا حوصلہ، سنو میجر! اب کسی نئے ظلم کے لیے پلٹ کر آؤ گے۔ یہ نہ بھولنا تمہارا واسطہ ایک کمزور لڑکی سے نہیں اس زبان سے آن پڑا ہے جس میں خدا کے نام کے سوا تمہارے مطلب کی کوئی بات نہیں نکلے گی۔''

شعبان لطفی کا مکالمہ یہودی العاصفہ کا مرکز دل ہے اور مسلمانوں کے دل کا پتا جاننا چاہتے ہو تو قرآن کے دو صفحات پڑھ لو جس میں غلامی کی زندگی کو حرام قرار دیا ہے یا پھر فلسطین کی تاریخ کے دو ورق پلٹو جن پر عمر فاروقؓ کے قدموں کے نشان ابھی تک تازہ ہیں اور صلاح الدین ایوبی کی تلوار کے زخم بھی۔''

شعبان لطفی کا ایک اور مکالمہ ''او یہودی! جب تک کسی سوئی ہوئی قوم پر ناانصافی کا زخم نہ لگایا جائے، اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ تم نے جو ایک بڑی قوم سے مدد مانگ کر ہمارے سینے پر زخم لگایا ہے۔ اس نے ہماری رگوں سے بے غیرت کا خون خارج کر دیا ہے۔ تم نے ہماری نااتفاقی کا انجام تو دیکھ لیا۔ آنے والی نسلیں تمہارے ظلم کا انجام دیکھیں گی۔''

میجر ڈیوڈ کی بیوی انجیلا کے مکالمے ''منہ کیوں پھیر لیا ہے میجر! بوکھلا کیوں گئے ہو میجر! میرے چہرے پر بھی وہی لکیریں نظر آئیں گی میجر جن سے تم زرقا کا خاکہ بنانا چاہتے ہو۔ آنکھیں بند نہ کرو میجر۔ جو دیکھ رہے ہو، کھلی آنکھوں سے دیکھو۔ جو نہیں دیکھنا چاہتے وہ بند آنکھوں سے بھی نظر آ جائے گا۔ مجھے آئینہ سمجھ کر دیکھو۔ گریبان سمجھ کر جھانکو یا شرمندگی سمجھ کر منہ پھیر لو۔ میں پہلے بھی عورت تھی، اب بھی ایک عورت ہوں۔ تم مجھے یہودی سمجھو یا عربی۔ میرا مذہب بھی عورت ہے اور میرا ضمیر بھی۔''

میجر ڈیوڈ کا زنجیروں میں جکڑی زرقا سے مکالمہ ''تم سب کچھ جانتی ہو، شعبان لطفی کے اشاروں پر ناچنا بھی جانتی ہو اور قہوہ خانے کے اسٹیج پر رقص کرنا بھی۔ شعلہ بننا بھی جانتی ہو اور نغمہ بننا بھی۔ رقاصہ بن کر آنکھوں میں اترنا بھی جانتی ہو اور پیغام بن کر دلوں تک پہنچنا بھی جانتی ہو۔ عربوں کے لیے حیا کا ہر رنگ بدلنا بھی جانتی ہو اور ہمارے لیے کچھ نہیں۔ پاؤں کو حرکت دو زرقا! آج تم ہمارے لیے رقص کرو گی۔ آج ان زنجیروں میں غلامی کا طوق بن کر ناچو گی۔ عربوں کی بے بسی کی تصویر بن کر بھی رقص کرو گی۔ آج سب کچھ کرو گی۔ انکار نہیں کرو گی۔''

میجر ڈیوڈ اور زرقا کی بوڑھی ماں کے درمیان مکالمہ ''یہودی تمہارا قصور نہیں، تم نے آج تک ماؤں کو اولاد کی بے بسی پر ماتم کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ شہید بچوں کی ماؤں کے مسکراتے ہوئے چہرے نہیں دیکھے۔ حوصلہ نہیں دیکھا۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا یہودی۔ مجھے میری بیٹی نے وہ رتبہ عطا کیا ہے جو بیٹوں کی ماؤں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ شکست کھائے ہوئے جانور کی طرح شور نہ مچاؤ یہودی! ظلم کیا تو اتنا بھی دیکھو۔ آگ لگائی ہے تو تماشا بھی دیکھو۔ بھڑکتے کیوں ہو؟ دیوانے تم ہو یہودی! جو ایک مسلمان عورت سے وطن کا راز لینا چاہتے ہو۔ یہودی ایک ایسی ہی سولی اور منگواؤ اور مجھے بھی لٹکا دو۔ مجھے یہ دکھ ہے کہ میری ہی گود میں پلی ہوئی زرقا خدا کی راہ میں مجھ سے آگے نکل گئی۔''

☆......☆

''زرقا'' اکتوبر 1969ء میں سلور اسکرین پر دکھائی گئی۔ 29 اکتوبر 1970ء میں کراچی میں انعقاد پذیر ہونے والی نگار ایوارڈ کی تقریب میں اسے آٹھ ایوارڈز سے نوازا گیا۔ یہ تقریب کراچی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی اور اس کے مہمان خصوصی اس وقت کے نیشنل بینک آف پاکستان کے چیئرمین ممتاز حسین صاحب تھے۔

فلم ''زرقا'' کو 1970ء کے یہ نگار ایوارڈ دیے گئے۔

1۔ بہترین اردو فلم ''زرقا''
2۔ بہترین ہدایت کار ریاض شاہد۔ فلم ''زرقا''
3۔ بہترین کہانی نویس۔ ریاض شاہد۔ فلم ''زرقا''

UUNOVELS.COM

4۔ بہترین اداکارہ۔ نیلو۔ فلم ''زرقا''
5۔ بہترین نغمہ نگار۔ حبیب جالب۔ فلم ''زرقا''
6۔ بہترین سنگر۔ مہدی حسن۔ فلم ''زرقا''۔ نغمہ رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔
7۔ بہترین تدوین کار، علی۔ فلم ''زرقا''
8۔ بہترین آرٹ ڈائریکٹر حبیب شاہ۔ فلم ''زرقا''

فلم ''زرقا'' کے حوالے سے یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اس فلم نے عام لوگوں میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اس کے نام پر زرقا ڈریس اور زرقا چوڑیاں بھی سامنے آ گئیں۔ فلم ''زرقا'' کے ابتدائی مناظر میں اداکارہ نیلو نے جو لباس زیب تن کیا تھا وہ خواتین میں اس قدر مقبول ہوا کہ فیشن کے طور پر عام ہوا۔ اس کے علاوہ زرقا چوڑیاں حیدرآباد میں بنائی گئیں جو زرقا کے نام پر ہونے کی وجہ سے پورے پاکستان میں خواتین کی اولین ترجیح بنیں۔

''زرقا'' ایک ایسی فلم تھی جس نے پاکستانی فلمی صنعت کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ اس کے تخلیق کاروں نے نہ صرف اس فلم کو یادگار بنانے میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا بلکہ خود بھی پاکستانی فلمی تاریخ کے صفوں میں امر ہو گئے۔ فلمی محققین کا خیال ہے کہ اگر نیلو نے اپنے کیریئر میں صرف اسی فلم میں کام کیا ہوتا تب بھی اس کا شمار پاکستان کی تاریخ ساز ہیروئن میں ہوتا۔ اسی طرح آغا طالش نے یہودی میجر کے کردار میں اپنے سارے کیے ہوئے کرداروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ''فرنگی'' اور ''شہید'' میں بھی انہوں نے ایسے ہی منفی کردار نگاری کی ہے لیکن ''زرقا'' میں ان کی اداکاری سپر کلاس کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس فلم کے سارے ہی فنکاروں نے اپنے کرداروں کو اس طرح ادا کیا ہے جیسے وہ اسی کردار کے لیے پیدا ہوئے تھے اور اس کا کریڈٹ ہدایت کار کو جاتا ہے کہ انہوں نے مختصر سے مختصر کردار کرنے والے سے بھی بہترین اداکاری کروائی ہے۔

☆......☆

ریاض شاہد نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور صحافی شروع کیا تھا۔ اس حیثیت سے بھی انہیں خاصی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ وہ اپنی بے باک تحریروں کی وجہ سے علمی، ادبی، صحافتی اور ثقافتی حلقوں میں بہت جلد مقبول ہو گئے تھے اور پھر فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے انہیں ''اچک'' لیا اور صحافتی دنیا سے نکال کر فلمی دنیا کا بندہ بنا دیا۔ ریاض شاہد صحافی سے فلمی مصنف اور مکالمہ نگار بن گئے۔ ان کی فلمی صلاحیتوں سے فلم والوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ واقعی فلم والوں ہی کے لیے بنائے گئے تھے۔ مصنف اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے ان کی مشہور فلمیں شہید، فرنگی، شکوہ، خاموش رہو، بدنام، آگ کا دریا، حیدر علی، خاک و خون ہیں۔ فلم ساز و ہدایت کار خلیل قیصر کے ساتھ ان کی ہم آہنگی سب سے زیادہ تھی اس لیے ان کی ہر فلم میں ان کا قلمی تعاون جاری رہا۔ خلیل قیصر کے ساتھ رہ کر انہیں ہدایت کاری کے شعبے سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی تو انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر ڈائریکشن کے میدان میں بھی قدم رکھ دیا، بطور ہدایت کار ریاض شاہد کی پہلی فلم ''سسرال'' تھی جو ایک معاشرتی فلم تھی۔ اس کی کہانی اور مکالمے بھی انہوں نے خود تحریر کیے تھے۔ یوسف خان، لیلیٰ، لہری، دل جیت مرزا، علاؤالدین اور طالش اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ایک مقصدی اور اعلیٰ معیار کی فلم تھی مگر باکس آفس پر کامیاب نہ ہو سکی۔ ''سسرال'' 19 اکتوبر 1962ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اسی دن ان کی لکھی ہوئی فلم ''دوشیزہ'' بھی نمائش پذیر ہوئی تھی جس کے ہدایت کار خلیل قیصر تھے۔ نیلو نے اس فلم میں ٹائٹل رول کیا تھا۔ یہ فلم فلاپ ہو گئی تھی۔ اقبال شہزاد کی یادگار فلم ''بدنام'' کے بارے میں کچھ باخبر لوگوں کی دی ہوئی خبر یہ ہے کہ بظاہر تو اقبال شہزاد اس فلم کے ڈائریکٹر تھے مگر اس فلم کے مصنف ریاض شاہد اس کے حقیقی ہدایت کار تھے۔ اس فلم کو اتنی کامیاب بنانے میں ریاض شاہد کی ہدایت کارانہ صلاحیتیں کارفرما تھیں۔ ریاض شاہد جتنے اچھے فلمی کہانی نویس اور مکالمہ نگار تھے اس سے بھی زیادہ باصلاحیت ہدایت کار تھے۔ انہوں نے کچھ معاشرتی موضوعات پر فلمیں بنانے کے بعد انقلابی اور عالمی سطح کے سیاسی پس منظر کی کہانیوں پر فلمیں بنانے پر توجہ دی۔ اس سلسلے کی کامیاب فلم ''زرقا'' ہے جب کہ انہوں نے کشمیر کے سلگتے ہوئے پس منظر پر ''یہ امن'' کے نام سے دوسری تہلکہ خیز فلم بنائی تھی لیکن سیاسی مصلحت کے تحت پاکستانی سنسر بورڈ نے اس فلم کو اس کی اصلی شکل میں نمائش کی اجازت نہیں دی۔ اس پر پابندی لگا دی۔ اس پابندی کو ختم کرانے کے لیے وہ اسلام آباد کے چکر لگا لگا کر بیمار ہو گئے۔ فکر، پریشانی اور اس فلم پر کی جانے والی محنت اور سرمائے کی بربادی کے خیالات نے انہیں اس قدر دل برداشتہ کیا کہ وہ سرطان کے موذی مرض کے شکار ہو گئے۔ بڑی مشکلوں سے ''یہ امن'' کو نمائش کی اجازت ملی مگر سنسر بورڈ نے اس پر اتنی

UUNOVELS.COM

قینچی چلائی کہ اس فلم کے بنانے کا مطلب و مقصد ہی فوت ہو گیا۔ ریاض شاہد یہ صدمات برداشت نہ کر سکے اور یکم اکتوبر 1972ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے جس نے ان کی قدر نہیں کی۔ ان کے جذبہ حب الوطنی کا صلہ دینے کی بجائے سیاسی مصلحتوں کے وار سے انہیں موت کی وادی میں پہنچا دیا۔ ان کے صاحبزادے شان نے ایک بار اپنے ایک انٹرویو کے دوران بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا۔ ”میرے والد کو کینسر نے نہیں پاکستانی سنسر بورڈ نے مارا تھا۔“

☆......☆

اللہ تبارک تعالیٰ نے ان دونوں میں ایسی محبت، ایسا پیار اور ہم آہنگی دی تھی کہ ایک کا نام لو تو دوسرا یاد آ جاتا ہے۔ دوسرے کا ذکر کرو تو پہلے کے بغیر.... مکمل نہیں ہوتا۔ پیار محبت کا یہ رشتہ بہت کم لوگوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اب دیکھیے نا۔ دونوں ہمارے آپ کے درمیان موجود نہیں، نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے دونوں کے راہی ملک عدم ہوئے کو مگر آج بھی اگر ہم ریاض شاہد کا ذکر خیر کر رہے ہیں تو خلیل قیصر کا نام بھی اس ذکر میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر اگر میں خلیل قیصر اور اس کی فلموں کی باتیں نہ کروں تو میری بات بھی ادھوری سمجھی جائے گی۔ دونوں کی مشترکہ کوششوں سے بہت سی فلمیں تخلیق ہوئیں۔ بہت سے کارنامے دونوں نے مل کر کیے۔ دراصل دونوں کی سوچ، فکر اور وژن ایک ہی تھا۔ دونوں انقلابی سوچ کے حامل تھے۔ دونوں ترقی پسند اور روشن خیال تھے۔ خلیل قیصر نے انور کمال پاشا جیسے لیجنڈ ہدایت کار کی سرپرستی میں ہدایت کاری کی تربیت حاصل کی تھی۔ ان کے شاگرد کی حیثیت سے جب فلم بنانے کا خاصہ تجربہ حاصل کر لیا تو آزاد ہدایت کار کی حیثیت سے اپنی پہلی فلم ”یار بیلی“ شروع کی۔ یہ پنجابی زبان کی ایک اعلیٰ معیار کی فلم ثابت ہوئی جو 1959ء کو نمائش پذیر ہوئی۔ یہ ان کی پہلی اور آخری پنجابی فلم تھی۔ باقی نو فلمیں انہوں نے قومی زبان میں بنائیں جن میں سے سات فلموں میں ان کے شریک کار ریاض شاہد رہے۔ یہ فلمیں، کلرک، عجب خان، شہید، دوشیزہ، فرنگی، حکومت اور ماں باپ ہیں جن کی کہانیاں اور مکالمے ریاض شاہد نے تحریر کیے۔ ان فلموں میں کلرک، دوشیزہ اور ماں باپ میں سلگتے ہوئے معاشرتی مسائل پر سوچ اور فکر کے دروازے وا کیے گئے ہیں۔ یہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کی فلمیں تھیں مگر یہ دونوں مطمئن نہ تھے ان فلموں

مختصر زندگی۔ تہلکہ خیز کام

خلیل قیصر 36 سال کی عمر میں قتل کر دیے گئے۔ انہوں نے بطور ہدایت کار 1957ء میں اپنی پہلی فلم ”یار بیلی“ بنائی تھی جب کہ ان کی آخری فلم ”حکومت“ تھی جو 1967ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ ان کی دسویں فلم تھی۔ اس طرح ان کی ہدایت کارانہ زندگی صرف دس سال کی تھی۔ اس دوران انہوں نے دس فلمیں ڈائریکٹ کیں مگر اس دس برسوں کی مدت میں ایسے تہلکہ خیز کام کیے جسے مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ ان کی فنی زندگی انتہائی مختصر تھی مگر ان کے اعلیٰ درجے کا کام ہماری فلمی تاریخ کا ایک روشن باب رہے گا۔

مسلمان کی مس کاسٹنگ

کاسٹ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بہت بڑی فلم تھی اور آدھی سے زیادہ تعداد نامور فنکاروں پر مشتمل تھی مگر بعض بڑے ستاروں کو بہت معمولی اور مختصر کرداروں میں پیش کرنے کی تک سمجھ میں نہیں آتی۔ مثلاً دیبا، نغمہ اور زیبا بختیار سے بہت مختصر کام لیا گیا۔ جب کہ ان کے مقابلے میں رفعت تجلی سے زیادہ پرفارم کرایا گیا۔ اسی طرح بدر منیر جیسے دبنگ اداکار سے امام مسجد کا کردار کروایا گیا۔ ان کے مقابلے میں ان سے کم معروف طارق شاہ اور سلیم خواجہ سے زیادہ اہم کردار کروائے گئے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اقبال کشمیری سے ایسی بے تکی کاسٹنگ کی توقع نہیں تھی۔

سے زیادہ فکر انگیز اور اعلیٰ مقاصد کی فلمیں بنانا چاہتے تھے۔ اس خیال کے پیش نظر خلیل قیصر نے اپنے دفتر میں ریاض شاہد سے کہا۔ ”یار ریاض شاہد! قومی مسئلے مسائل پر تو کبھی فلم بنا رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم ان سے ذرا ہٹ کر ذرا مختلف اور چونکا دینے والے موضوع پر فلم بنانے کی طرح ڈالیں۔“

”ہاں میں بھی یہی سوچتا رہتا ہوں کہ ہم لوگ کب تک روایتی انداز کی فلمیں بناتے رہیں گے۔ اب جب کہ ہمارے ہاں اچھی اور معیاری فلمیں بنائی جانے لگی ہیں تو ہمارے فلم میکرز کو چاہیے کہ اپنی سوچ اور فکر کی کمندیں موجودہ حدود سے آگے پھینکیں۔ بڑی سوچ اور بڑے وژن کی فلمیں بنائیں۔“

”میں سوچ رہا ہوں۔“ خلیل قیصر بولے۔ ”کیوں

UUNOVELS.COM

نہ ہم مشرقِ وسطیٰ کے پس منظر میں کوئی فلم بنائیں۔"

"گڈ بہت اچھا خیال ہے تمہارا۔ کہو تو میں اس پس منظر میں ..."

"ہاں بھئی ہاں ... تم ہی لکھو گے اس موضوع پر کہانی۔" اتنا کہہ کر خلیل قیصر نے چہرے پر تاثرات کا جائزہ لیا۔ ریاض شاہد کا چہرہ چمکتا رہا تھا۔ "شکریہ میرے دوست!"

اور ریاض شاہد نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک کہانی لکھ دی۔ خلیل قیصر کو یہ کہانی بہت پسند آئی۔ "تمہارے خیال میں اس کہانی پر بننے والی فلم کا کیا نام ہونا چاہیے؟" خلیل قیصر نے کہانی نویس ریاض شاہد سے پوچھا۔

"پورٹ سعید۔"

"بہت اچھا نام ہے۔ اس پر ہم خوب محنت کریں گے۔"

"اور انشاء اللہ یہ ہماری بہت بڑی فلم ہوگی۔" مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا ریاض شاہد نے کہا

یہ بات پوری فلم انڈسٹری میں پھیل گئی اس لیے کوشش بسیار کے باوجود یہ فلم نہ بن سکی اور اسے بنانے کی آرزو لے کر خلیل قیصر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

دونوں کی پسندیدہ کہانی "پورٹ سعید" پر فلم کیوں نہ بن سکی اس کی اصل وجہ کا مجھے کوئی علم نہیں۔ نہ ہی کسی نے اس راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ بس قیاس کی بنیاد پر ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کہانی پر فلم بنانے کے لیے انہیں کوئی انویسٹر، کوئی سرمایہ کار نہیں ملا ہوگا۔ جس سے بھی انہوں نے بات کی ہوگی اس نے یہی کہا ہوگا کہ اعلیٰ معیار اور بلند مقصد کی فلمیں کاروباری طور پر کامیاب نہیں ہوتیں۔ ہمارے ہاں فلم دیکھنے والوں کا اکثریتی طبقہ پڑھا لکھا یا بالکل ناخواندہ ہوتا ہے، اس لیے وہ ہلکی پھلکی تفریحی فلمیں پسند کرتے ہیں۔

اے جے کاردار اور فیض احمد فیض کی فلم "جاگو ہوا سویرا" کا حشر سب کے سامنے تھا اور پھر غالباً یہ بات بھی تھی کہ اس وقت دونوں فلمی دنیا میں نئے نئے تھے اس لیے انہیں کسی نے سپورٹ نہیں کیا ہوگا۔

بہرحال انہوں نے ہلکی پھلکی فلم بنانے پر توجہ مرکوز کردی اور "کلرک" کے نام سے ایک فلم بنائی مگر یہ فلم تفریحی نوعیت کی نہیں تھی۔ دفتروں میں کام کرنے والے بابوؤں کے مسائل پر تھی۔ اس میں تعلیم کی ضرورت اور محنت مزدوری کرنے والے طبقے کی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ایک منفرد اور اثر انگیز فلم تھی اس کی کاسٹ میں رتن کمار، مسرت نذیر، خلیل قیصر، لیلیٰ، کلاوتی، ریحان، ساقی اور سلمیٰ ممتاز نمایاں فنکار تھے۔ اس کی موسیقی منظور حسین نے ترتیب دی تھی۔ کہانی اور مکالمے ریاض شاہد نے تحریر کیے تھے۔ خلیل قیصر کی ہدایت کاری بھی معیاری تھی۔ یہ فلم حیات فلمز پروڈکشن کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ فلم ساز وزیر علی تھے۔ "کلرک" جو 22 جون 1960ء میں ریلیز ہوئی تھی اپنے اعلیٰ معیار اور منفرد موضوع کے سبب سراہی گئی مگر تفریحی مسالا نہ ہونے کی وجہ سے کاروباری اعتبار سے ناکام ثابت ہوئی۔ اس فلم کے بعد خلیل قیصر نے پھر کبھی اداکاری نہیں کی۔

خلیل قیصر اور ریاض شاہد کی دوسری مشترکہ فلم "عجب خان" تھی مگر اس کی کہانی رحیم گل کی تحریر کردہ تھی۔ ریاض شاہد نے اس کے مکالمے تحریر کیے تھے۔ یہ فلم شوکت پکچرز کے لیے بنائی گئی تھی۔ صوبہ سرحد کے آفریدی قبیلے کے حریت پسند مجاہد اور غیور پٹھان عجب خان آفریدی کی سچی کہانی پر مبنی فلم تھی اور اس کا موضوع انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے سے متعلق تھا۔ لالہ سدھیر نے ٹائٹل رول میں غضب کی اداکاری کی تھی۔ حسنہ، ناصرہ اور آغا طالش نے دیگر کلیدی کردار کیے تھے۔ اس کے فلم ساز شوکت گل، موسیقار جی اے چشتی اور ہدایت کار خلیل قیصر تھے۔ 3 فروری 1961ء کو "عجب خان" سلور اسکرین کی زینت بنی تھی اور باکس آفس پر کامیاب ہوئی تھی۔

"عجب خان" کی کامیابی سے خلیل قیصر کو اس بات کا حوصلہ ملا تھا کہ ایسی فلمیں جن میں حب الوطنی کا جذبہ ہو اور عالمی استعمار کے خلاف آواز بلند کی جائے، انہیں پسندیدگی حاصل ہو سکتی ہے مگر ایسی فلموں کو آسانی سے انویسٹرز نہیں ملتے۔ لہٰذا ایک دن انہوں نے اپنے دوست ریاض شاہد سے مشورہ کیا۔

"یار! میں ایک بات بڑی شدت سے سوچ رہا ہوں۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ میں اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس بنا لوں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"اس سے یہ ہوگا کہ ہم اپنی پسند کی کہانی پر اپنی فلم بنا سکیں گے۔"

"ہاں! اس طرح تو اپنی پسند کی فلم بنائی جاسکے

UUNOVELS.COM

گی......مگر......"

"مگر کیا؟"

"ارے بھئی! فلم بنانے کے لیے تو سرمائے کی بہر حال ضرورت پڑے گی۔ اس کے لیے بھی تمہیں دوسروں کا سہارا لینا پڑے گا۔"

"اللہ مالک ہے۔" خلیل قیصر نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "جس صورت میں بھی فلم بنائی جائے جان جوکھوں میں تو پڑتی ہی ہے۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ بنا لو اپنا فلم ساز ادارہ۔"

اور خلیل قیصر نے کے، کے پکچرز کے نام سے اپنا ذاتی فلم ساز ادارہ قائم کر لیا اور جلد ہی اس ادارے کے بینر تلے اپنی اگلی فلم "شہید" بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس فلم کی کہانی اور مکالمے انہوں نے ریاض شاہد سے لکھوائے۔ اس فلم کی کہانی کا پس منظر بھی عرب ممالک کو درپیش عالمی استعماری قوت کی ریشہ دوانی سے متعلق تھا۔ اس فلم کی سرمایہ کاری کے سلسلے میں خلیل قیصر کو متوقع پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان کے ساتھی اور شریک کار حسن شاہ نے سو فیصد سرمایہ کاری کر دی جب کہ بطور فلم ساز بھی اپنا نام نہیں آنے دیا۔ فلم ساز کی حیثیت سے خلیل قیصر کا نام ہی استعمال کروایا۔ "شہید" بڑے اطمینان سے بنی۔ خلیل قیصر اور ریاض شاہد نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ رشید عطرے نے بطور موسیقار کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق بڑی ہی جاندار اور شاندار موسیقی ترتیب دی۔ جس کے نتیجے میں اس فلم کے گیتوں نے بھی فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ اعجاز، مسرت نذیر، علاؤ الدین، نیر سلطانہ، طالش، اسلم پرویز، حسنا اور آغا طالش نے زبردست کردار نگاری سے فلم کے معیار کو بلند کیا۔ 5 جنوری 1962ء کو "شہید" ریلیز کی گئی اور سپر ہٹ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

"شہید" کی کامیابی سے دونوں دوستوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ لہٰذا دونوں نے اس سے بڑی اور تہلکہ خیز فلم بنانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

"ریاض شاہد! اب تم اسی نوعیت کی مگر اس سے زیادہ اہمیت کی حامل کہانی پر کام شروع کر دو۔ انشاء اللہ اس پر میں "شہید" سے بڑی فلم بناؤں گا۔"

"ہاں، ہمارا اگلا قدم اگر آگے نہ بڑھا تو......"

"انشاء اللہ آگے ہی بڑھے گا۔ ہماری منزل ابھی بہت دور ہے اس لیے ہمیں اپنا فنی سفر تیزی سے طے کرنا ہو گا۔"

ریاض شاہد نے خلیل قیصر کے لیے اگلی انقلابی قلم کی کہانی پر کام شروع کر دیا اس سے پہلے کہ اس کہانی پر فلم سازی شروع کی جاتی ریاض شاہد سے خلیل قیصر نے کہا۔

"تم جب تک اس کہانی پر کام کرو میں فلم ساز جمال بٹ کی فلم "دوشیزہ" کی فلم بندی مکمل کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس طرح ہم یکسو ہو کر اپنی فلم پر زیادہ توجہ دے سکیں گے۔"

خلیل قیصر کو اپنا پروڈکشن ہاؤس قائم کرنے کے بعد بھی دوسرے فلم ساز انہیں اپنی فلم بنانے کی دعوت دیتے تھے۔ ایسی ہی ایک فلم "دوشیزہ" تھی جس کی کہانی ریاض شاہد نے لکھی اور اس کی ہدایت کاری خلیل قیصر نے کی تھی۔ جے آر فلمز پروڈکشن کے بینر تلے بنائی جانے والی یہ فلم ایک معنی خیز کہانی پر بنائی گئی تھی۔ اس کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین اور مصنف و مکالمہ نگار ریاض شاہد تھے۔ اس کی کاسٹ میں اعجاز، نیلو، دیبا، لہری اور اسلم پرویز شامل تھے۔ یہ فلم 19 اکتوبر 1964ء کو ریلیز ہوئی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

☆......☆

اب ذکر خلیل قیصر اور ریاض شاہد کی اس شہرۂ آفاق فلم کا جو خلیل قیصر کی شاہکار فلم تسلیم کی جاتی ہے اور اس کا نام ہے "فرنگی"۔

نئی نسل میں بہت ہی کم لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہو گی اس لیے اس کی مفصل داستان رقم کر کے معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"فرنگی" ایک ایسی فلم ہے جو پاکستانی فلمی تاریخ میں ایک بڑی اور یادگار فلم کی حیثیت سے ہمیشہ شمار کی جائے گی۔ یاد رکھی جائے گی۔ ریاض شاہد کے انقلابی قلم سے تخلیق پانے والی کہانی کا پس منظر حقیقی واقعات و حالات سے جڑا ہوا ہے اس لیے اسے آپ ایک سچی کہانی بھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے وطن عزیز کے علاقہ غیر کے دو پٹھان نوجوانوں اکبر خان اور قادر خان کے گرد گھومنے والی کہانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اکبر خان وطن پرست ہے جبکہ نادر خان وطن فروش ہے۔ وطن دشمنوں کا دوست ہے۔ یہ اس دور کی کہانی ہے جب انگریز ہند میں کاروبار کی نیت سے آئے لیکن ان کی نیت کچھ اور تھی۔ وہ اپنی ناپاک سازشوں سے آہستہ آہستہ یہاں اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے لگے۔ ہندوستانیوں کو

UUNOVELS.COM

آپس میں لڑا کر فائدہ اٹھانے لگے۔ اس فلم کی کہانی 1918ء کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ اکبر خان (لالہ سدھیر) علاقہ غیر کا نوجوان چھٹی پر گھر آتا ہے۔ وہ انگریز فوج کا توپچی ہے۔ وہ جب اپنے گاؤں پہنچ کر اپنے گھر میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اس کی ماں (صفیہ معینی) اسے دروازے پر ہی روک دیتی ہے۔ وہ بیٹے سے کہتی ہے۔

''فرنگی کے دیئے ہوئے لباس میں میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔''

فلم ''فرنگی'' کی ابتداء ایک کمنٹری سے ہوتی ہے جس کے ذریعے اس فلم کی کہانی کے پس منظر کو فوکس کیا گیا ہے۔ یہ کمنٹری محمد علی کی آواز میں کرائی گئی ہے۔ محمد علی اس وقت ریڈیو کے صداکار تھے۔ ابھی انہوں نے اداکاری شروع نہیں کی تھی۔

سلور اسکرین پر فلم کے مختلف مناظر کی عکاسی کے دوران کمنٹری کچھ یوں شروع ہوتی ہے۔

''جوں جوں وطن کی سرزمین پر دشمن کے گھوڑوں کی ٹاپیں گرواڑاتی رہیں خبریں چھلکتی رہی ہیں کہ انگریزوں کے ہاتھوں اکبر خان موت کی نیند سلا دیا گیا ہے اور یہ کہ ظلم و ستم کی یہ داستان رکے گی نہیں تاوقت کہ فرنگی پورے ہندوستان پر قبضہ نہ کرلے۔ وطن کے پتھریلے سینے پر ظلم کے قدم دوڑتے رہے لیکن غلامی کے طوفان کی ایک آواز تھی جو چٹانوں پر کھڑی چھینی ہوئی آزادی پر ماتم کررہی تھی۔ ایک ملنگ تھا جو گئی بہاروں کو واپس بلاتا تھا۔ وادیوں، پہاڑوں میں گونجتی ہوئی آواز نے شعلے کو جنم دیا۔ وطن کی کوکھ سے ایک بیٹا پیدا ہوا جو فرنگی اقتدار کے مقاصد کو دیکھتا اور سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دشمن نے ایک ہی وطن کے رہنے والوں کے درمیان دیوار کھڑی کردی ہے۔ وہ ہر مظلوم پر ہونے والے ظلم کو دیکھتا تھا اور اسے سزا پانے سے پہلے بجلی کی طرح ان کی امداد کو پہنچتا تھا۔ یہ شخص لوگوں کے ذہن پر ایک سوال بن کر اٹھا اور ایک کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی اکبر کی بیوی کے لیے انتظار بن کر رہ گیا جس کے جسم میں اکبر کی نشانی پرورش پارہی تھی۔ دن مہینے اور سال حالات کے نقشے پر اس طرح لکیریں کھینچتے رہے کہ ان لکیروں سے فرنگی کی موت کا ایک نیا خاکہ بن گیا۔ وقت گزرتا گیا اور فرنگی روز بروز طاقت ور ہوتا گیا۔ وقت بڑھتا گیا اور فرنگی کا رتبہ بھی۔ ترقی ہوتی رہی، ظلم پھیلتا رہا۔ ملک کو غلام ہوئے سات سال گزر گئے۔ دور کہیں اندھیروں میں جلتے ہوئے چراغ نے نئے چراغ کو روشن کیا۔ حالانکہ دل بجھ گیا تھا لیکن اکبر کی نشانی پالنے والی بیوہ ایک نئے شعلے کو اپنے پہلو میں لیے جدائی کی چنگاریوں کو تکتی رہی۔ ایک دن پہاڑ کے دامن میں فرنگی کے سپاہیوں پر اچانک ایک آفت ٹوٹ پڑی۔ یہ وہی سیاہ پوش تھا وہی اکبر خان تھا جو گمنامی میں رہ کر درندہ بن گیا تھا۔ اکبر خان نے دشمن سے مشین گن چھین کر ایک غار میں پناہ لے لی تھی اور فرنگی اقتدار کے ایک ایک محافظ کو موت کی نیند سلانا شروع کردیا تھا۔ فرنگی کی عزت روز بروز لٹتی رہی۔ فرنگی اپنی لٹتی ہوئی عزت کا ملبا سمیٹتے سمیٹتے تنگ آگئے۔ سات سال میں سینکڑوں فرنگی مارے جانے کے باعث فرنگی پریشان ہے کہ کہیں اس کی عزت کا پرچم نیچے نہ گرجائے۔''

اس کمنٹری کے بعد فلم شروع ہوئی اور وہیں سے شروع ہوئی کہ جب اکبر خان (لالہ سدھیر) چھٹی پر اپنے گاؤں آتا ہے تو اس کی ماں (صفیہ معینی) اسے دروازے پر روک دیتی ہے اور کہتی ہے۔

''فرنگی کے دیئے ہوئے لباس میں میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔''

فرنگی کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر خان کی ماں اس کی شادی زیبا (بہار) سے کردیتی ہے جب کہ گاؤں کی ایک الہڑ دوشیزہ زرینہ گل (شمیم آراء) اکبر خان سے محبت کرتی ہے۔ اکبر خان بھی گل کو چاہتا ہے لیکن ماں کے حکم کے سامنے انکار نہیں کرتا اور اپنی محبت کی قربانی دے دیتا ہے۔ اسی گاؤں کا ایک اور نوجوان نادر خان (مظہر شاہ) انگریز فوج کی وفاداری کا دم بھرتا ہے اور انگریز کپتان مسٹر بلک (آغا طالش) کے اشاروں پر چلتا ہے۔ وہ انگریز سرکار کا خریدا ہوا ایک غلام ہے جو مسلمانوں کے خلاف انگریز کا ایجنٹ ہے۔ اکبر خان چھٹی ختم ہونے پر واپس نوکری پر چلا جاتا ہے لیکن اس دوران نادر خان انگریز کپتان کو بتاتا ہے کہ انگریز سرکار جس گاؤں سے سڑک بنانا چاہتی ہے اکبر خان نے وہاں کے لوگوں کو بھڑکا دیا ہے اور وہ وہاں سے سڑک نہیں بنانے دے رہے ہیں۔ اس بارے میں جب کپتان اکبر خان کو بلا کر برا بھلا کہتا ہے اس کی سرزنش کرتا ہے تو جواب میں اکبر خان اپنا استعفیٰ پیش کردیتا ہے لیکن کپتان اس سے کہتا ہے۔ ''میں تمہارا استعفیٰ اگلے حملے کے بعد منظور کروں گا۔''

دراصل کپتان کا اگلا حملہ اکبر خان کے گاؤں پر ہونا

UUNOVELS.COM

تھا جس کو کپتان نے اس سے چھپا رکھا تھا۔ جب جنگی سازو سامان سے لیس فوج گاؤں پہنچتی ہے تو پہاڑ کی چوٹی سے اکبر خان کپتان کو بتاتا ہے۔

''سر! وہ جس گھر سے دھواں اٹھ رہا ہے، وہ میرا گھر ہے۔''

کپتان کہتا ہے۔ ''اس گھر سے دھواں اٹھنا ہی چاہیے۔'' اور پھر اکبر خان کو حکم دیتا ہے۔ ''گاؤں پر حملہ کردو۔ توپ کے دہانے کھول دو۔''

اکبر خان حملہ کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ اس نافرمانی پر کپتان اکبر خان کو گرفتار کرلیتا ہے اور گاؤں پر حملہ کردیتا ہے۔ اس حملے سے اکبر خان کا گھر تباہ ہوجاتا ہے۔ اکبر خان کی ماں مرجاتی ہے۔ اس کی محبوبہ زرینہ گل اندھی ہوجاتی ہے اور اس کی بیوی زیبا بھاگ کر کہیں پناہ لے لیتی ہے۔ اسی پناہ گاہ میں اکبر خان کی بیوی زیبا ایک بچے کو جنم دیتی ہے۔ ادھر انگریز سرکار اکبر خان کو بغاوت کرنے کے جرم میں کورٹ مارشل کا سزاوار ٹھہراتی ہے اور سزا کے طور پر اسے شوٹ کرنے کا حکم دیتی ہے۔ جب اکبر خان کو قتل کرنے کے لیے دریا پر بنے پل پر لایا جاتا ہے تو اکبر خان پل پر سے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور فرار ہوکر پہاڑوں میں چھپ جاتا ہے۔ فرنگی کپتان اسے بہت تلاش کرتا ہے لیکن وہ اسے کہیں نہیں ملتا۔ لہٰذا اسے مردہ تصور کرلیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اکبر خان ایک نقاب پوش شخص کے روپ میں راتوں کو انگریز فوج پر حملے شروع کردیتا ہے۔

دوسری طرف اکبر خان کی محبوبہ زرینہ گل اپنے باپ (ساقی) کے ساتھ گزر اوقات کے لیے ایک قہوہ خانہ چلاتی ہے اور قہوہ خانے میں گاتی بھی ہے۔

وقت کا پہیا رواں دواں ہے۔ اکبر خان کے حملے اور فرنگی سرکار اور نادر خان کی سازشیں جاری رہتی ہیں لیکن کپتان پُراسرار نقاب پوش کے شب خون سے پریشان رہتا ہے۔ ایک روز اچانک اکبر خان کی ملاقات زرینہ گل سے ہوجاتی ہے وہ اسے تمام گزرے ہوئے حالات سے آگاہ کرتی ہے لیکن زیبا کے بارے میں پوچھنے پر بتاتی ہے۔

''مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ زندہ ہے یا نہیں اگر زندہ ہے تو کہاں ہے۔''

اس ملاقات کے بعد زرینہ گل اپنے باپ کے ساتھ مل کر اکبر خان کے لیے جاسوسی کرتی ہے۔ دوسری طرف زیبا اکبر خان کے بیٹے کی پرورش کرتی ہے جو اب تقریباً 15 برس کا ہوچکا ہے۔ اچانک نادر خان کو معلوم ہوتا ہے کہ زیبا کہاں ہے چونکہ نادر خان بھی کبھی زیبا کا امیدوار تھا اس لیے وہ اسے پکڑنے کے لیے وہاں پہنچتا ہے جہاں زیبا رہتی ہے لیکن زیبا اپنی عزت بچانے کی خاطر اپنی جان دے دیتی ہے جب کہ اس کا بیٹا بھاگ کر اپنی جان بچاتا ہے۔ وہ بھاگتے بھاگتے اکبر خان کی کمین گاہ تک پہنچ جاتا ہے۔

دریں اثناء انگریز کپتان اور نادر خان جو اکبر خان کو مردہ سمجھ بیٹھے تھے انہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اکبر خان زندہ ہے اور وہی ان پر حملے کررہا ہے۔ ایک روز گل اکبر خان سے ملاقات کے دوران اسے بتاتی ہے کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے اور اس کی بیوی زیبا مرچکی ہے۔ انہی دنوں نادر خان قہوہ خانے پر چھاپہ مارتا ہے جہاں اسے اکبر خان اور زیبا کا بیٹا مل جاتا ہے۔ نادر خان لڑکے کو گرفتار کرکے اپنی ماں (سلمیٰ ممتاز) کے حوالے کردیتا ہے۔ یہ بات جب کپتان کو معلوم ہوتی ہے تو وہ نادر خان سے کہتا ہے۔

''بچے کو یہاں میرے پاس لے آؤ تاکہ اس کے ذریعے اکبر خان کی کمین گاہ تک پہنچا جاسکے۔''

کپتان کے کہنے پر جب نادر خان بچے کو لینے گھر آتا ہے تو اکبر خان بھی پہنچ جاتا ہے۔ دونوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ عین اس وقت جب اکبر خان نادر خان کو گولی مارنے لگتا ہے تو اس کی ماں (سلمیٰ ممتاز) سامنے آجاتی ہے اور منتیں کرتی ہے۔ ماں کے جُڑے ہاتھ دیکھ کر اکبر خان نادر خان کو زندہ چھوڑ کر اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے لیکن جب نادر خان پیچھے سے اکبر خان کو گولی کا نشانہ بنانے لگتا ہے تو نادر خان کی ماں اپنی بندوق سے نادر خان کا خاتمہ کردیتی ہے اور اس کے ساتھیوں سے کہتی ہے۔ ''اب تم لوگ انگریز حکومت کے خلاف اکبر خان کا ساتھ دو۔''

دوسری طرف انگریز کپتان کو اندھی زرینہ گل پر شک ہوجاتا ہے اور وہ اسے گرفتار کرکے طرح طرح سے اذیتیں دیتا ہے۔ اسے اکبر خان کا پتا معلوم کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن گل تمام تر اذیت برداشت کرتے ہوئے کسی طرح بھی کچھ نہیں بتاتی۔ لہٰذا کپتان مجبور ہوکر اس کے باپ (ساقی) کو گرفتار کرکے اپنے پاس منگواتا ہے اور اسے توپ کے آگے باندھ دیتا ہے اور کہتا ہے۔

''اگر تم نے اکبر خان کا پتا نہ بتایا تو ہم تمہارے باپ کو توپ سے اڑا دیں گے۔''

اس دھمکی کے باوجود زرینہ گل خاموش رہتی ہے،

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

اکبر خان کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تو اس کے باپ کو توپ سے اڑا دیا جاتا ہے اور جب اکبر خان کو فرنگی کی بربریت کا پتا چلتا ہے تو وہ انگریز کمپنی پر بھرپور طور پر حملہ کر دیتا ہے۔ دوسری طرف سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور آخر کار اکبر خان اور اس کے مجاہد جان ہتھیلی پر رکھ کر کپتان سمیت اس پوری فوج کا صفایا کر دیتے ہیں۔ کپتان اکبر خان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے جب کہ مجاہد انگریز سرکار کے پرچم کو اتار کر اسلامی پرچم قلعے پر لہرا دیتے ہیں۔ اس آخری جنگ میں اکبر خان کا بیٹا بھی بھرپور حصہ لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ کلاسک فلم اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔

دوستو! اس کہانی سے آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا کہ فلم ”فرنگی“ ایک دستاویز ہے انگریزوں کے ظلم اور ناانصافی کی۔ ”فرنگی“ فلم ہے ظلم اور ناانصافی کے خلاف اٹھنے والی آواز اکبر خان کی۔ ”فرنگی“ فلم ہے ایک وطن پرست دوشیزہ کی جو وطن کی خاطر اپنے باپ کی قربانی دیتی ہے۔ ”فرنگی“ فلم ہے ایک وطن فروش کی۔

خلیل قیصر اور ریاض شاہد یہ دونوں پس پردہ فنکار جو لی جنڈ کا درجہ رکھتے تھے، دونوں نے ہمیشہ اپنے قلم اور اپنے ذہن کو سامراجی قوتوں کی عیاری، مکاری اور ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے میں استعمال کیا اور سپر کلاس فلمیں بنا کر عوامی عدالتوں میں پیش کیا اور عوام سے داد وتحسین حاصل کی۔

اس موقع پر میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ آج کے دور میں فلم انڈسٹری کو ایسے انقلابی تخلیق کاروں کی اشد ضرورت ہے جو وطن عزیز پاکستان کے خلاف ہونے والی بین الاقوامی سازشوں کو بے نقاب کریں۔

فرنگی کے موسیقار رشید عطرے، نغمہ نگار فیض شفائی، فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی۔ پس پردہ گانے والے۔ میڈم نور جہاں، مہدی حسن، مالا بیگم، نسیم بیگم، احمد رشدی، تدوین کار علی، عملی کیمیائی خواجہ رشید۔ عکاس کامران مرزا۔ کوریوگرافر ماسٹر صدیق۔ معاون ہدایت کار سعود، رزاق۔ میک اپ مین ایم نذیر۔ آرٹ ڈائریکٹر اللہ دتہ۔ کاسٹیوم جی ایم ٹیلرز لاہور۔ پیش کار حسن شاہ۔

کاسٹ۔ سدھیر، شمیم آراء، مظہر شاہ، بہار، علاؤ الدین، صفیہ معینی، شوکت گل، جسونت، غزالی، ساقی اور آغا طالش۔

”فرنگی“ ایورنیو فلم اسٹوڈیو ملتان روڈ لاہور میں بنائی گئی جو 16 ریلوں پر مشتمل تھی۔ کراچی میں اس کا مین تھیٹر اوڈین سینما اور لاہور میں رتن سینما تھا۔ کراچی اور سندھ سرکٹ سمیت یہ فلم نگار فلم ایکسچینج کے توسط سے 18 دسمبر 1964ء میں آل پاکستان ریلیز کی گئی۔

اس فلم میں کلیدی کردار ادا کرنے والوں کے بارے میں اگر ذرا تفصیل سے روشنی نہ ڈالی گئی تو یہ ان کے حق میں بھی ناانصافی ہو گی۔

”فرنگی“ کے مصنف اور مکالمہ نگار ریاض شاہد ہماری فلم انڈسٹری کے لی جنڈز میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہوں نے فلم رائٹر کی حیثیت سے بھی منفرد موضوعات پر متعدد فلمیں لکھیں اور بطور ہدایت کار بھی اچھی فلمیں بنائیں۔ ان کی کہانیاں زندگی کے بہت قریب ہوتی تھیں۔ ریاض شاہد نے اپنے قلم سے ہمیشہ سامراجی قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی اور انہیں بے نقاب کیا ان کا ذہن شروع سے ہی انگریزوں کے خلاف باغیانہ تھا۔

موسیقی کے حوالے سے بھی ”فرنگی“ ایک سپر ہٹ فلم تھی۔ رشید عطرے نے اس فلم کے گیتوں اور غزلوں کے لیے سپر کلاس دھنیں ترتیب دی تھیں۔ مندرجہ ذیل نغمات کل بھی مقبول تھے اور آج بھی ان کی پسندیدگی برقرار ہے۔

☆ بن کے میرا پروانہ آئے گا اکبر خانا
☆ آ بھی جا دلدارا
☆ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے
☆ گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
☆ اے وطن اے وطن مرنے والوں کی دم توڑتی آرزو

اور نعت رسول مقبول ”میری ذات ہے مظہر نور خدا“ نے ”فرنگی“ کی کہانی میں جو رنگ بھرا اس کی تعریف نہ کی جائے تو بڑی زیادتی ہو گی۔ نور جہاں، مہدی حسن، احمد رشدی، مالا اور نسیم بیگم نے اپنی آواز کے جادو سے اس فلم کے نغموں کو اتنا پُراثر بنایا ہے کہ فلم دیکھنے والوں پر ”فرنگی“ کی کہانی کا صحیح تاثر قائم ہوتا ہے۔

اداکاری کے شعبے کی اگر بات کی جائے تو شمیم آراء نے فلم کی ہیروئن کی حیثیت سے بے حد متاثر کیا ہے۔ خاص طور پر جب وہ اندھی ہو جاتی ہیں اور اکبر خان کے لیے جاسوسی کرتی ہیں اور پھر جب ان کے باپ ساقی کو توپ کے آگے باندھ کر اڑا دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ان کی بے مثال اداکاری ہے۔ اسی طرح بہار بیگم نے اکبر خان کی بیوہ کے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

مختصر کردار میں بہت اچھی اداکاری کی ہے۔ عوامی اداکار علاؤ الدین نے بھی ملنگ بابا کے کردار میں سپر کلاس کی بے داغ پرفارمنس پیش کی ہے۔ ولن کے طور پر بھڑک کے بادشاہ مظہر شاہ نے بھی بہت عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ سلمیٰ ممتاز نے مظہر شاہ کی ماں اور صفیہ معینی نے سدھیر کی ماں اور ساقی نے نسیم آرا کے باپ کی اداکاری بھی قابل تعریف انداز میں کی ہے۔

فلم ''فرنگی'' کے دو لی جنڈ فنکاروں جنگجو ہیرو لالہ سدھیر اور ون اینڈ اونلی آغا طالش کے کرداروں کے بارے میں جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ''فرنگی'' کا ٹائٹل رول آغا طالش نے پرفارم کیا ہے۔ ظالم و جابر فرنگی کپتان بلک کا کردار انہوں نے اس خوب صورتی سے ادا کیا ہے کہ وہ سچ مچ کے انگریز کپتان لگتے ہیں۔ ان کی ایک ایک ادا، ایک ایک ایکشن پر ناظرین کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انہوں نے اسی نوعیت کا کردار اس سے پہلے ''شہید'' میں بھی کیا تھا۔ ''شہید'' بھی خلیل قیصر کی فلم تھی۔ مگر ''فرنگی'' میں ان کی اداکاری ''شہید'' سے زیادہ پُراثر ہے۔

لالہ سدھیر جو ''فرنگی'' کے ہیرو تھے۔ انہوں نے ایک وطن پرست پٹھان نوجوان کے کردار میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ ناقدین اور مبصرین نے ان کی کردار نگاری کو لاجواب اور سپر کلاس قرار دیا۔ اپنی شاندار اداکاری کی وجہ سے وہ پہلے سین سے آخری منظر تک پوری فلم پر چھائے رہے۔ اپنے سامنے کسی کو جمنے نہیں دیا۔ لالہ سدھیر نے ایک محب وطن اور غیرت مند پٹھان اکبر خان کے کردار کو صحیح معنوں میں امر کر دیا۔

دوستو! اس فلم سے متعلق کچھ ایسی باتیں جو اس دور کے بہت سے قارئین کو بھی معلوم نہیں ہیں جنہوں نے ''فرنگی'' ایک نہیں بار بار دیکھی ہے۔ لالہ سدھیر جو بڑی مشکلوں سے اخبار والوں کو انٹرویو دیا کرتے تھے انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اس بات کا اظہار کیا تھا۔

''اس فلم کے کردار میں میری زندگی کے حقیقی واقعات جڑے ہوئے ہیں۔ میرے والد اسلم خان انگریز فوج میں ملازم تھے۔ وہ جب چھٹی پر گھر آتے تو ان کی والدہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ان کے جسم پر موجود انگریز سرکار کی وردی اتروا کر گھر میں داخل ہونے کی اجازت دیتی تھیں۔ میرے والد نے باقاعدہ انگریز سرکار کی جنگوں میں حصہ لیا تھا اور بالآخر وہ انگریز سرکار کے باغی ہو گئے تھے۔ اس جرم میں انگریز سرکار نے انہیں پھانسی دے دی تھی۔''

یہ اتفاق ہے یا انہی واقعات کو سامنے رکھ کر فلم ''فرنگی'' کی کہانی میں بھی ایسے ہی مناظر دکھائے گئے ہیں؟ اس سلسلے میں انٹرویو لینے والے نے شاید لالہ سدھیر سے سوال نہیں کیا تھا۔

ہم بس یہ اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کہ لالہ سدھیر کی زبانی ان واقعات کے بارے میں ریاض شاہد کو معلوم ہوا ہو اور انہوں نے فلمی ضرورت کے تحت تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ وہ سارے واقعات فلم کی کہانی میں شامل کر دیے۔

اس موقع پر ایک اور چونکا دینے والی بات سے آپ کو مطلع کروں گا کہ ''فرنگی'' جیسے باغیانہ کردار لالہ سدھیر نے ''باغی'' اور ''ان داتا'' میں بھی کیے ہیں۔ ''باغی'' اشفاق ملک کی فلم تھی جو 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی جب کہ ''ان داتا'' اقبال یوسف کی فلم تھی جو 1976ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ تینوں ہی فلموں میں سدھیر نے ایک باغی کا کردار ادا کیا تھا۔ فلم ''باغی'' میں وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ ''فرنگی'' میں انگریز سرکار کے اور وطن فروش کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں اور ''ان داتا'' میں انہوں نے معاشرے کی ناانصافیوں کے خلاف بغاوت کی۔ اب اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان تینوں ہی فلموں میں ان کے کردار کا نام اکبر خان ہے۔ یہ تینوں ہی فلمیں سپر ہٹ کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ ''باغی'' نے تو بیرون ملک چین میں بھی دھوم مچائی تھی۔ جب کہ ''ان داتا'' کا کردار لالہ سدھیر کی فنی زندگی کا سب سے بڑا اور لازوال کردار ہے۔ علاوہ ازیں ان کے آخری دور کی ایک فلم ''بڑا آدمی'' میں بھی انہوں نے اکبر کے نام سے ہی کام کیا تھا۔ اتفاق سے ان کی یہ آخری فلم ناکام ثابت ہوئی تھی۔

''فرنگی'' کی موسیقی کے بارے میں کچھ باتیں بتا چکا ہوں کچھ مزید باتیں اور بھی قابل ذکر ہیں۔ دوستو! اس فلم کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کے لیے نامور بھارتی فلمی نغمہ نگار ساحر لدھیانوی نے ایک گیت بطور تحفہ تحریر کر کے دیا۔ جس کے بول ہیں۔

اے وطن اے وطن مرنے والوں کی دم توڑتی آرزو

''فرنگی'' میں ایک غزل ایک نعت اور پانچ گیت ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

"گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے" یہ شہرۂ آفاق شاعر فیض احمد فیض کی مشہور غزل ہے۔ "فرنگی" کے لیے اسے مہدی حسن کی آواز میں صدا بند کیا گیا۔ فلم میں علاؤ الدین پر پکچرائزیشن ہوا ہے۔ "فرنگی" میں علاؤ الدین کا کردار ایک ملنگ بابا کا ہے۔ گاؤں کے ایک منظر میں انہیں یہ نغمہ گاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

"تیری ذات ہے مظہر نور خدا" قتیل شفائی نے یہ نعت تحریر کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اور میڈم نور جہاں نے صدا بند کرایا ہے۔ شمیم آراء اور ساتھیوں پر فلمبند کروایا گیا ہے۔

"اے وطن مرنے والوں کی دم توڑتی آرزو" اسے ساحر لدھیانوی نے خاص طور پر "فرنگی" کے لیے لکھا اور اس انقلابی فلم میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے اسے تحفتاً پیش کیا۔ یہ نغمہ فلم میں ملنگ بابا (علاؤ الدین) پر پکچرائز ہوا ہے جسے وہ تباہ شدہ گاؤں میں گاتے ہیں۔

"بن کے میرا پروانہ آئے گا اکبر خانا" قتیل شفائی کا تحریر کردہ گیت۔ آواز گلوکارہ مالا کی۔ شمیم آراء پر پکچرائز کیا گیا۔

"آ بھی جا دلدارا آ بھی جا دلدارا" نغمہ نگار قتیل شفائی، صدا بندی گلوکارہ نسیم بیگم۔ قہوہ خانے میں شمیم آراء پر فلمایا گیا۔

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" نغمہ نگار فیض احمد فیض، گلوکارہ مالا نے اپنی پُرسوز آواز میں گایا۔ لکڑی کا پل کراس کرتے ہوئے فلم کی ہیروئن زرینہ گل (شمیم آراء) پر پکچرائز کیا گیا۔

"اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے" دعائیہ کلام الطاف حسین حالی، آواز نسیم بیگم۔ عکسبندی شمیم آراء پر ہوئی۔

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ "فرنگی" کے تقسیم کار نگار فلم ایکسچینج کے جناب الیاس رشیدی تھے جو خلیل قیصر کے بہت قریبی دوست تھے۔ انہوں نے اس فلم کی تکمیل کے دوران اس کی زبردست پبلسٹی بھی کی تھی۔ جب "فرنگی" ریلیز ہوئی تو اس سے بہت فائدہ بھی اٹھایا۔ بقول الیاس صاحب کے "میرے تقسیم کار ادارے سے ریلیز ہونے والی فلموں میں "فرنگی" وہ فلم ہے جس سے میں نے سب سے زیادہ فائدہ حاصل کیا۔"

مگر یہ عجیب بات ہوئی کہ جب اس سال (1964ء) کی فلموں اور اس کے فنکاروں اور پس پردہ آرٹسٹوں کو نگار ایوارڈ دینے کا وقت آیا تو نگار ایوارڈ کے ججوں کے پینل نے لالہ سدھیر کو ان کی بے مثال اداکاری کے باوجود نگار ایوارڈ کے قابل نہ سمجھا۔ یہ بات لالہ سدھیر کے پرستاروں کے علاوہ خود سدھیر کو بھی ناگوار گزری اور انہوں نے برملا کہا۔ "یہ میرے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔"

اور اس کے بعد انہوں نے نگار اخبار کو کبھی انٹرویو نہ دینے اور نگار ایوارڈ کی تقاریب کا بائیکاٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا اصل ایوارڈ میرے مداح ہیں۔"

لالہ سدھیر کو گویا منانے اور بائیکاٹ ختم کرنے کے لیے بالآخر 1970ء میں انہیں پنجابی فلم "لاٹری" میں نگار ایوارڈ دیا گیا اور بڑی مشکل سے منت سماجت کر کے نگار ایوارڈ کی تقریب میں لایا گیا لیکن چند سال بعد ہی 1976ء میں ایک بار پھر پاکستان کی ایکشن فلموں کی سرتاج فلم "ان داتا" میں سپر پرفارمنس دینے کے باوجود سدھیر کو نگار ایوارڈ نہ دے کر ان کے ساتھ ایک بار پھر ناانصافی کی مثال قائم کی گئی۔

دوستو! اس موقع پر اگر فرنگی، شہید اور ناگن جیسی سپرہٹ، اعلیٰ معیاری اور منفرد نوعیت کی فلمیں بنانے والے خلیل قیصر کے بارے میں ان کی ابتدائی اور فنی زندگی شروع کرنے کے دور کے حالات سے آگاہ نہیں کروں تو شاید آپ کو تشنگی کا احساس ہوگا کیونکہ ہمارا یہ نابغہ روزگار ہدایت کار آج سے کوئی 54 برس پہلے ہم سے رخصت ہو کر جنت آشیانی ہو چکا تھا۔ تو لیجیے ہم اس کی زندگی کے اوراق الٹتے ہیں۔

خلیل قیصر 1930ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے اور اسی شہر کے گارڈن کالج سے گریجویشن کیا۔ انہیں اپنے تعلیمی زمانے سے ہی اداکاری کا شوق تھا۔ اسی شوق کی خاطر انہوں نے راولپنڈی مظفر آباد کے ریڈیائی ڈراموں میں صداکاری کی اور اپنا نام ریڈیو آرٹسٹوں کی فہرست میں شامل کیا لیکن اس سے آگے کچھ کرنے کی خواہش نے انہیں فلم لائن کی طرف مائل کیا اور وہ لاہور آ کر ہدایت کار انور کمال پاشا کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر کام کرنے لگے اور فلم بنانے کی تربیت حاصل کرنے لگے، پھر جب انہیں احساس ہوا کہ اب وہ بطور ہدایت کار اپنی فلم بنا سکتے ہیں تو انہوں نے اللہ کا نام لے کر پہلی فلم "یار بیلی" کا آغاز کر دیا جو 1957ء میں ریلیز ہوئی اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب ثابت ہوئی۔ ان کی دوسری فلم "ناگن" تھی یہ فلم سانپوں کے موضوع پر بنائی گئی

UUNOVELS.COM

تھی۔ یہ 1959ء کی عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہوئی اور سپرہٹ ہوئی انہیں اس فلم کی بہترین ہدایت کاری پر سال کے بہترین ہدایت کار کا پہلا نگار ایوارڈ ملا جب کہ انہیں دوسرا نگار ایوارڈ 1962ء میں ان کی شہرۂ آفاق فلم ''شہید'' پر ملا جب کہ اس فلم پر دیگر 8 ایوارڈز بھی ملے۔ جن میں بطور فلم ساز حسن شاہ، بطور مصنف ریاض شاہد، بطور اداکارہ مسرت نذیر بطور مکالمہ نگار ریاض شاہد، بطور نغمہ نگار فیض احمد فیض، بطور موسیقار رشید عطرے، بطور معاون اداکار آغا طالش، بطور گلوکارہ نسیم بیگم شامل ہیں۔

ہدایت کار کی حیثیت سے خلیل قیصر کی اگلی فلم ''کلرک'' تھی جس میں انہوں نے اپنی اداکاری کا شوق بھی پورا کرنے کی کوشش کی تھی مگر نہ یہ فلم کاروباری طور پر کامیاب ہو سکی نہ ہی بطور اداکار وہ خود کامیاب ہو سکے۔ اس کے بعد ان کے سر سے اداکاری کا بھوت اتر گیا اور انہوں نے پھر کسی فلم میں بھول کر بھی ایکٹنگ نہیں کی۔ کلرک 1960ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں ان پر یہ گیت فلمائے گئے تھے۔

☆ سوجا درد بھرے دل اب تو سوجا (آواز: ناہید نیازی، سلیم رضا۔ موسیقی: صفدر حسین)

☆ یوں بھٹک رہے ہیں ہم یہاں قدم قدم پر (آواز: سلیم رضا۔ یہ گانا فلم میں شامل نہیں کیا گیا)

☆ خلیل قیصر نے بطور ہدایت کار 10 فلموں میں ہدایات دیں۔

1۔ یار بیلی۔ فلم ساز ادارہ ملک ٹاکیز۔ فلم ساز ملک باری، موسیقار صفدر حسین، کاسٹ مسرت نذیر، سدھیر، نیلو، ظریف، یہ پنجابی فلم تھی۔ 1957ء میں ریلیز ہوئی۔

2۔ ناگن۔ فلم ساز وزیر علی، موسیقار صفدر حسین، نمایاں فنکار رتن کمار، نیلو، یوسف خان، حسنہ اور ساقی۔ اس فلم میں رتن کمار نے ڈبل رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کا ری میک ناگ اور ناگن فلم تھی جس میں وحید مراد نے ڈبل رول کیا تھا۔ ناگن 1959ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی اور سپرہٹ کامیاب ہوئی تھی۔

3۔ کلرک۔ فلم ساز وزیر علی، موسیقار صفدر حسین، کاسٹ خلیل قیصر، مسرت نذیر، رتن کمار وغیرہ۔ ریلیز 1960ء لیکن باکس آفس پر ناکام۔

4۔ عجب خان۔ فلم ساز شوکت گل، موسیقی جی اے چشتی، فنکاروں میں حسنہ، سدھیر، ناصرہ اور طالش۔ 1961ء میں سلور اسکرین کی زینت بنی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

5۔ شہید۔ فلم ساز حسن شاہ، موسیقار رشید عطرے۔ کاسٹ علاؤ الدین، مسرت نذیر، طالش، اعجاز اور حسنہ۔ 1962ء میں ریلیز ہوئی اور فقید المثال کامیابی حاصل کی۔

6۔ دوشیزہ۔ فلم ساز رضا جمال بٹ۔ موسیقار عنایت حسین، کاسٹ اعجاز نیلو، دیبا، لہری اور اسلم پرویز۔ 1962ء میں نمائش پذیر ہوئی۔

7۔ فرنگی۔ فلم ساز خلیل قیصر، موسیقار رشید عطرے۔ کاسٹ سدھیر، شمیم آراء، بہار بیگم، ساقی، علاؤ الدین اور طالش۔ ریلیز 1964ء میں ہوئی اور سپرہٹ ثابت ہوئی۔

8۔ حویلی۔ فلم ساز سلطان جیلانی، موسیقار خواجہ رشید انور۔ کاسٹ شمیم آراء، سنتوش کمار، اعجاز، نذیر، طالش، 1964ء میں عام نمائش کے لیے پیش کی گئی۔

9۔ ماں باپ۔ فلم ساز عطاء اللہ شاہ ہاشمی۔ موسیقار تصدق حسین، کاسٹ وحید مراد، زیبا، علاؤ الدین اور طلعت صدیقی۔

10۔ حکومت۔ فلم ساز ادارہ کے پروڈکشن کے بینر تلے بنائی گئی۔ فلم ساز خلیل قیصر ہی تھے۔ موسیقار رشید عطرے۔ کاسٹ سدھیر، رانی، الیاس کاشمیری اور طلعت صدیقی 1967ء میں ریلیز ہوئی۔

ان فلموں کے کچھ مقبول گیتوں کے بارے میں بھی ذکر ہو جائے۔ ''یار بیلی'' کے دو گیت۔

☆ جدوں ہانہ پھڑ کے (آواز: زبیدہ خانم۔ بول: وارث لدھیانوی)

☆ میریاں زلفاں توں (آواز: زبیدہ خان۔ بول: احمد راہی)

''ناگن'' کے چند گیت

☆ سیاں جی کو ڈھونڈنے چلی (آواز: ناہید نیازی۔ بول: قتیل شفائی)

☆ ہٹ جاؤ میں تو سے نہ ہی بولوں (آواز: کوثر پروین۔ بول: قتیل شفائی)

☆ اب کے ساون تو سجن آجا (آواز: اقبال بانو۔ بول: قتیل شفائی)

کلرک کے نغمے

☆ گھر سے چھٹی آئی ہے بیمار بھائی ہے (آواز: سلیم رضا)

☆ کوئی کسی کو جلاتا ہے (آواز: منیر حسین۔ بول: احمد

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

راہی)

عجب خان کے گیت

☆ چپکے سے ادھر آ جائیے (بول: احمد راہی)

☆ کوئی مخمور نظریوں کر گئی (آواز: ناہید نیازی)

عجب خان کے گیت

☆ اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو (آواز: نسیم بیگم۔ بول: منیر نیازی)

☆ میری نظریں ہیں تلوار (بول: تنویر نقوی)

دوشیزہ کے گانے

☆ لو جی ہم جا رہے ہیں (آواز: مالا)

☆ ہر نظر سے ایک سوال (آوازیں: فضل حسین، ناہید نیازی۔ بول: تنویر نقوی)

فرنگی کے گیت تفصیل کے ساتھ پیش کیے جا چکے ہیں۔

حویلی کے نغمات

☆ میرا بچھڑا بلم گھر آ گیا (آواز: نسیم بیگم۔ بول: قتیل شفائی)

☆ جا کے سسرال گوری میکے کی لاج رکھنا (آوازیں: نور جہاں، مالا۔ بول: تنویر نقوی)

ماں باپ کے گیت

☆ دیکھا ہے تمہیں جب سے (آواز: احمد رشدی۔ بول: قتیل شفائی)

☆ مجھے تم پیار کرنے دو (آواز: مالا۔ بول: قتیل شفائی)

حکومت کے نغمے

☆ شباب اداس نہ رو دو پیکر میں (آواز: مالا۔ بول: تنویر نقوی)

☆ اے میرے طلب گار خبردار (آواز: آئرن پروین۔ بول: تنویر نقوی)

"حکومت" خلیل قیصر کی آخری فلم تھی۔ اس کی شوٹنگ آخری مرحلے میں تھی۔ اس سلسلے میں وہ کراچی میں ساحل سمندر میں شوٹنگ کر رہے تھے۔ ماہ ستمبر کا آخری عشرہ تھا۔ انہی دنوں نگار ایوارڈ کی تقریب کراچی میں انعقاد پذیر ہونے والی تھی۔ اس بار محترم الیاس رشیدی نے نگار ایوارڈ کی تقریب کے ساتھ ملکہ ترنم مادام نور جہاں کی تاج پوشی کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ اس کی پبلسٹی بڑے زور و شور سے ہوئی تھی اس لیے ہاکی اسٹیڈیم میں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ 21 ستمبر کو خلیل قیصر شوٹنگ سے فارغ ہو کر نگار کے دفتر تشریف لائے تو الیاس صاحب بولے۔ "کل نگار ایوارڈ کی تقریب ہے۔ تمہیں یاد ہے نا؟"

"بہت اچھی طرح یاد ہے کیونکہ ہماری بیگم صاحبہ نے اس تقریب میں شرکت کی خصوصی فرمائش کی ہے۔ میں شام کی فلائٹ سے لاہور جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ کل بیگم کے ساتھ کراچی آ کر تقریب میں شرکت کروں گا۔"

"آہ! کسے خبر تھی کہ اب وہ لاہور سے کبھی واپس نہ آسکیں گے۔ موت کا فرشتہ ان کے انتظار میں تھا۔ وہ کراچی سے لاہور گئے تو ان کی بیگم انہیں دیکھ کر نہال ہو گئیں۔"

"میں تو سمجھی تھی۔ پتا نہیں مجھ سے کیا ہوا وعدہ تمہیں یاد بھی رہے گا یا ہمیشہ کی طرح بھول جاؤ گے۔"

"ارے یار! کیسے بھول سکتا تھا کیونکہ اس بار تمہاری پسندیدہ گلوکارہ مادام نور جہاں کی تاج پوشی بھی اس تقریب کا حصہ ہے۔"

"شکریہ! کہ یہ بات بھی تمہیں یاد رہی۔"

"اچھا..... بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ کچھ کھلاؤ۔"

"جو کچھ تھا وہ تو ہم کھا پی چکے۔ تم ایسا کرو کہ بازار سے کچھ لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" کہہ کر خلیل قیصر گھر سے باہر نکلے۔ باہر قاتل ان کی تاک میں بیٹھا تھا۔ گولیاں چلیں اور وہ خون میں لت پت ہو کر گر پڑے۔ ذرا دیر بعد پورے لاہور شہر میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ "خلیل قیصر کا قتل ہو گیا۔ کسی سفاک قاتل نے ان کے گھر کے باہر ہی ان پر گولیوں کی باڑھ چلائی اور فرار ہو گیا۔"

21 ستمبر 1966ء کی خون آشام رات تھی۔ قاتل کون تھا۔ کس نے کس مقصد کے لیے انہیں مارا؟ اس راز سے آج تک..... نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود پردہ نہ اٹھ سکا نہ ہی قاتل قانون کی گرفت میں آسکا۔ طرح طرح کی باتیں کہی گئیں۔ کسی نے کہا۔ کسی رشتے دار نے قتل کیا ہے۔ کسی نے کہا ان کے کسی کاروباری حریف نے انہیں اپنے راستے سے ہٹایا ہے۔ کسی نے کہا انگریزی سامراجی قوتوں نے انہیں قتل کروایا ہے تاکہ وہ "شہید" اور "فرنگی" جیسی فلمیں بنا کر ان کی سازشوں کا پردہ نہ چاک کر سکیں۔

☆.....☆

اللہ نے انسان کو اس دنیا میں اس لیے بھیجا تھا کہ وہ زمین کو جنت کی طرح سجا بنا کر امن و آشتی کے ساتھ رہیں۔

UUNOVELS.COM

پیار محبت سے دنیا کو جنت بنا دیں لیکن ہابیل اور قابیل نے لڑائی جھگڑے اور مار کٹائی کی ابتداء بابا آدم کے زمانے سے ہی شروع کر دی جو اس طرح بڑھتی ہی گئی جس طرح آدم کی اولادوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ کچھ لوگوں نے اس دنیا کو جنت بنانے کے لیے بھی اپنی صلاحیتوں اور ذہانتوں کا مظاہرہ کیا اور دنیا والوں کو نت نئی آسانیاں اور سہولتیں فراہم کیں جب کہ کچھ لوگ قابیل کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ ابن آدم کو قتل کرتے رہے۔ خون بہاتے رہے۔ اپنے مذموم مقاصد کے لیے دوسروں کے حقوق پر ڈاکا ڈالتے رہے۔ یہ سلسلہ پہلے کی طرح آج بھی جاری و ساری ہے۔ ”فرنگی“ اور ”زرقا“ میں ایسی ہی غاصبانہ جبر و زیادتی کی داستانیں بیان کی گئی تھیں اور انہیں فلم کے روپ میں خلیل قیصر اور ریاض شاہد نے پیش کیا تھا۔

آج بھی ایسی ہی استعماری ریشہ دوانیاں اس خطہ ارض کے مختلف حصوں میں جاری ہیں جن میں کشمیر سرفہرست ہے۔ ایک طویل عرصے سے کچھ ظالموں نے اس خطہ پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے ضمن میں مختلف مکاتب فکر کے علاوہ ہماری فلم انڈسٹری نے بھی اسے اقوام عالم کے ضمیر کو جگانے کے لیے فلمیں بنائی ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی فلم ”تیری یاد“ کی ریلیز سے بھی قبل پاکستانی سنیماؤں میں ایک فلم دستاویزی فلم کی حیثیت سے نمائش پذیر ہوئی تھی جس کا نام تھا ”کشمیر ہمارا ہے“ بعد ازاں اداکار و ہدایت کار ظہور راجا نے اس موضوع پر فلم ”جہاد“ بنائی جو جنوری 1950ء میں ریلیز ہوئی تھی جب کہ اسی نام ”جہاد“ سے بنائی گئی فلم 2002ء میں بھی آئی تھی جس کا اسکرپٹ بشیر نیاز نے لکھا تھا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کو موضوع بنا کر بھی فلمیں تخلیق کی گئی تھیں جب کہ ریاض شاہد نے ”یہ امن“ کے نام سے بھی کشمیر کے موضوع پر ایک فلم بنائی تھی۔ ”یہ امن“ 1971ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اسی کشمیر سے سلگتے ہوئے موضوع پر ایک فلم ”مسلمان“ کے نام سے بھی بنائی گئی ہے جو 2001ء میں نمائش پذیر ہوئی آج اس موقع پر ہم اسی فلم کی تفصیلی کہانی سنائیں گے۔

☆......☆

”مسلمان“ کشمیر کے موضوع پر بنائی جانے والی ایک جرأت مندانہ تخلیق ہے۔ یہ فلم ساز حاجی محمد شفیق چودھری اور ہدایت کار اقبال کشمیری کی رنگین سینما اسکوپ اردو فلم ہے جو 2001ء میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر پاکستانی سنیماؤں کی زینت بنی۔

فیصل مدنی پروڈکشنز کے بینر تلے بنائی جانے والی اس فلم کے ستارے شان، زیبا بختیار، بابر علی، ثناء، جاوید شیخ، ارباز خان، میرا، نیہا، رفعت قلی، دیبا، نغمہ، عرفان کھوسٹ، نواز خان، عارف لوہار، نیر اعجاز، خواجہ سلیم، رضا، شفقت چیمہ، طارق شاہ اور بدر منیر تھے۔ جب کہ مصنف رشید ساجد، نغمہ نگار سعید گیلانی، ریاض الرحمٰن ساغر اور امجد حزیں تھے۔ موسیقار وجاہت عطرے، پس پردہ سنگرز، غلام عباس، امیر علی، حمیرا چنا، نصیبو لال، صائمہ جہاں، فاروق شاہ اور عارف لوہار تھے۔ عکاس فاروق بٹ، سلیم بٹ، عاکف ملک اور وقار بخاری تھے۔ ڈانس ڈائریکٹرز پپو سمراٹ، اشرف شیرازی اعجاز سمراٹ نگاہ حسین اور خانو سمراٹ جب کہ تدوین کار مرید حسین تھے۔

دوستو! کشمیر جو کبھی جنت نظیر ہوا کرتا۔ اس کی اصل کہانی یہ ہے کہ اسے 1846ء میں انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر کو 75 لاکھ روپے کے عوض ڈوگرہ راجا گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ کشمیر کی آبادی کا 80 فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندو مہاراجا ہری سنگھ نے مسلمانوں کی مرضی کے خلاف 26 اکتوبر 1947ء کو بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا اعلان کر دیا۔ اسی وجہ سے پاکستان اور بھارت میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ یکم جنوری 1949ء کو سلامتی کونسل نے 1948ء میں منظور شدہ قراردادوں کے تحت پاکستان اور بھارت کو کشمیر سے فوج نکالنے اور کشمیر میں رائے شماری کرانے کو کہا۔ اس وقت کے بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو نے رائے شماری کرانے کا وعدہ کیا مگر پھر اس سے منحرف ہو گئے۔ پاکستان نے بھارت سے آزاد کیے علاقہ کو آزاد کشمیر کا نام دیا۔ کشمیر کا تنازعہ اب تک جاری ہے جب کہ موجودہ مودی حکومت نے نئے قوانین کے تحت اس پر رہنے والے کشمیری مسلمانوں پر ظلم و تشدد کا جو نیا سلسلہ جاری کیا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ پہلے کے مقابلے میں کشمیر کا مسئلہ زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔

متذکرہ فلم ”مسلمان“ اسی کشمیر کے موضوع پر بنائی جانے والی ایک فلم ہے۔ اس فلم کے کہانی نویس رشید ساجد کہتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے دن رات گواہ ہیں کہ کشمیر کے حریت پسند بیٹے مادر وطن کی آزادی کے لیے ایک غاصب ملک کے خلاف اپنے لہو کو بارود و آہن میں ڈھال کر کشمیر کے پہاڑوں، وادیوں، میدانوں، بستیوں اور ویرانوں

UUNOVELS.COM

میں حوصلے وہمت کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ آج کشمیر میں کھلنے والا ہر پھول خون رنگ ہے۔ ہر کونپل مسلمانوں کے لہو میں نہائی ہوئی ہے۔ ہر کلی پر بارود جم چکا ہے۔ ہر آبشار کے کنارے پر آگ لگی ہے۔ ہر جھیل میں لاشیں تیر رہی ہیں۔ ہر چشمے سے سسکیاں ابھر رہی ہیں۔ ہر چنار سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ تاریخ کا قافلہ سفر جاری ہے مگر انصاف کے ایوانوں میں سناٹا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آنے والے دنوں میں کشمیر کے نصیب کا فیصلہ اقوام متحدہ کے ایوانوں میں نہیں، کشمیر کے میدانوں میں ہونے والا ہے۔

فلم ''مسلمان'' کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے۔ پس پردہ آواز ابھرتی ہے۔ ''ہنستی گاتی روشن وادی تاریکی میں ڈوب گئی۔ کشمیر دنیا کی وہ پہلی منڈی ہے جہاں زمین کے ساتھ انسان بکتے ہیں۔ یہ وہ بدنصیب سرزمین ہے جہاں ایک ناپاک سودے کے نتیجے میں زمین کے ساتھ پھول بکے، درخت بکے اور چشمے بھی بک گئے۔ یہ مظلوم انسانوں کا روتا ہوا ملک ہے جسے انگریزوں کے لالچ نے مہاراجا گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر کے تاریخ کا سب سے خوف ناک کاروبار کیا۔ 14 اگست 1947ء سے لے کر آج تک کشمیر کے بے بس مسلمانوں کی زبان پر ایک ہی نعرہ گونج رہا ہے۔ ''ہم لے کے رہیں گے آزادی''

اور یہی نعرہ، ہم لے کے رہیں گے آزادی، لگاتے ہوئے کشمیریوں کا جلوس دکھایا جاتا ہے یعنی یہیں سے اسکرین پر فلم کی کہانی شروع ہوجاتی ہے۔

نغمہ کا چھوٹا بیٹا کہتا ہے۔ ''ماں! میں بھی جلوس میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی جھنڈا دو۔''

نغمہ اپنا دوپٹا بیٹے کے حوالے کر دیتی ہے اور کہتی ہے۔ ''یہ لے بیٹا! ماں کے دوپٹے اور وطن کے پرچم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔''

میجر خالد (جاوید شیخ) اور میجر انیتا سنگھ (ثناء) جلوس کا راستہ روکتے ہیں۔ میجر خالد جلوس کو آگے بڑھ جانے کی صورت میں گولی برداشت کرنے کے لیے تیار رہنے کا کہتا ہے۔ جلوس والوں کے انکار پر میجر خالد ان پر فائر کا حکم دیتا ہے جس سے کئی کشمیری مسلمان شہید ہوجاتے ہیں۔

میجر خالد کی بیوی (رفعت تجلی) اپنے خاوند سے کہتی ہے۔ آج پھر مسلمانوں کے جلوس پر بھارتی فوجیوں نے حملہ کیا جس سے بے شمار مسلمان شہید ہوئے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ گولی آپ کے حکم پر چلائی گئی تھی۔''

میجر خالد کہتا ہے۔ ''ہاں کرنل کا یہی حکم تھا۔ دیکھو تم پہلی بار میری ڈیوٹی پر بحث کر رہی ہو۔ جاؤ میرے لیے کافی لے کر آؤ۔''

اسی دوران میجر خالد کی بہن اور بھائی شاہد (ارباز خان) آتے ہیں۔ شاہد کہتا ہے۔ ''بھائی! آپ یہ سرکاری وردی گھر میں نہ پہنا کریں۔ مجھے یہ وردی اچھی نہیں لگتی۔ وادی میں نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائی گئی ہیں۔ کشمیر کی سرزمین پر آگ لگائی گئی ہے۔''

میجر خالد اپنے بھائی شاہد سے کہتا ہے۔ ''شاہد! تم بس اپنی کتابوں پر دھیان دو۔ کتابوں میں سوالوں کے جواب تلاش کرو۔ کشمیر تمہارا سبجیکٹ نہیں ہے۔ جاؤ کالج کو دیر ہو رہی ہے۔''

اگلے سین میں اسسٹنٹ کمشنر جوشی کرنل ٹھاکر سے کہتی ہے۔ ''سر! بارہ مولا کے علاقے میں بہت ہنگامے ہو رہے ہیں۔ آپ کا حکم ہو تو وہاں کرفیو لگا دیا جائے۔''

کرنل ٹھاکر (نواز خان) وہاں کرفیو لگا دو اور جو مسلمان زیادہ شور مچائے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دو۔''

کیپٹن وجے (سلیم خواجہ) سرکل کے جلوس میں مرنے والے مسلمانوں کی تعداد سات رہے مگر نیوز میں مرنے والوں کی تعداد صرف پانچ۔ ہائے بھگوان۔''

کرنل ٹھاکر۔ ''صحیح کیا ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دوں گا جو آزادی مانگتے ہیں۔''

کیپٹن وجے۔ ''اگر ان کی آزادی مانگنے والوں کا لیڈر آزاد خان ہمارے ہاتھ آجائے تو سارے مسلمانوں کی زبان خود بخود بند ہو جائے گی۔''

کرنل ٹھاکر۔ ''کیپٹن وجے! تم پوری فورس کے ساتھ کشمیر میں پھیل جاؤ۔ جتنے مسلمان مارنے پڑیں مار ڈالو۔ جتنی بستیاں جلانی پڑیں جلا ڈالو۔ ہمیں ہر حال میں آزاد خان چاہیے۔''

کیپٹن وجے، کرنل کے حکم پر اپنا مشن شروع کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں سے آزاد خان کا پتا پوچھتا ہے ہر بوڑھا، نوجوان، عورت، مرد یہی جواب دیتا ہے۔ ''مجھے معلوم نہیں۔''

اس جواب پر کیپٹن مشتعل ہو کر ان پر ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑتا ہے۔ اسی اثناء میں آزاد خان (شان) ایک دم اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ کر بھارتی فوج پر فائر کھول دیتا ہے۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں بھگوڑی فوج بھاگ جاتی

UUNOVELS.COM

ہے۔ اس کے بعد کرنل ٹھاکر، میجر خالد (جاوید شیخ) اور میجر انیتا سنگھ (ثناء) کو ایمرجنسی ڈیوٹی پر مامور کرتا ہے۔

میجر انیتا سنگھ۔ ''میرے سخت اقدام بھی کارگل کے دہشت گردوں پر کارگر ثابت نہیں ہوئے۔ ہم دہشت گردوں کی زبان نہیں کھلوا سکے۔''

میجر خالد۔ ''مسلمانوں کی یہ خوبی ہے کہ ان کو موت بھی ڈرا نہیں سکتی۔''

کرنل ٹھاکر، میجر خالد اور میجر انیتا سنگھ سے کہتا ہے۔ ''کارگل کی پوزیشن ہینڈل کرنے کے لیے حریت پسند کشمیریوں کو کچلنا ہوگا۔''

میجر خالد۔ ''سر! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کشمیر کے لوگوں سے گولی کی بجائے زبان سے بات کریں۔ ان سے سمجھوتے کی کوشش کریں۔''

میجر انیتا سنگھ بھی میجر خالد کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے دلائل دیتے ہوئے کہتی ہے۔ ''ہم کب تک ان پر ظلم کرتے رہیں گے۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ اب تو ہمارے سپاہی بھی کہتے ہیں ہم کب تک مرتے رہیں گے۔ اور کب تک اپنے بیوی بچوں سے دور رہیں گے۔''

کیپٹن وجے دونوں کی مخالفت کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''بھارت ان مٹھی بھر دہشت گردوں کے سامنے جھک جائے۔ کیا تم لوگ یہی چاہتے ہو؟''

میجر خالد۔ ''میں بھارت کا دوست بن کے اسے تباہ ہونے سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کشمیر کی آگ اتنی پھیلے کہ دو ملکوں کی سرحدیں جھلس جائیں۔ آبادیاں راکھ ہو جائیں۔ میں صرف امن چاہتا ہوں۔ ایسا امن جو ایٹم بم کو بے معنی کر دے۔ ایٹم بم گرانے کے بعد بھی میز پر آنا پڑتا ہے۔ تاریخ بھی یہی کہتی ہے۔ جو تاریخ کو نہیں مانتے وقت ان کا جغرافیہ بدل دیتا ہے۔''

اس میٹنگ کے دوران کیپٹن وجے مزید کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کرنل ٹھاکر اسے روک کر کہتا ہے۔ ''یہ بحث کرنا ہمارا نہیں سیاستدانوں کا کام ہے۔'' پھر وہ میجر انیتا سنگھ سے پوچھتا ہے۔ ''کیا کارگل سے اترنے والے باغیوں نے کچھ بتایا؟''

میجر انیتا سنگھ جواب دیتی ہے۔ ''اب تک نہیں بتایا مگر بتا دیں گے۔ آج نہیں تو کل، ان کو زبان کھولنی پڑے گی۔''

اگلے سین میں میجر انیتا سنگھ ٹارچر سیل میں سلطان (بابر علی) سے پوچھتی ہے۔ ''سلطان کیا حال ہے؟''

سلطان (بابر علی) ''شیر لوہے کا ہے اور لوہے کے جال میں ہے۔''

میجر انیتا سنگھ۔ ''سلطان تمہیں ساری رات سزا کاٹتے ہوئے گزر جاتی ہے کیا تم پتھر کے بنے ہوئے ہو۔ میں پتھر کو بھی ریزہ ریزہ کر کے سچ بلوا سکتی ہوں لیکن مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم کارگل سینٹر پر بکھر جانے والے اپنے کشمیری ساتھیوں کا پتا بتا دو تو میں تمہاری سزا ختم کر دوں گی۔ آج زبان کھولو گے یا صبح مرنا چاہتے ہو؟ بولو کیا چاہتے ہو؟''

سلطان۔ ''کشمیر یا شہادت۔ ان دونوں میں جو دے سکتی ہو دے دو۔''

میجر انیتا سنگھ۔ ''تمہیں صرف موت دے سکتی ہوں۔ تم دہشت گردوں کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔''

کیپٹن وجے۔ ''سلطان تم صرف اتنا بتا دو کہ تم لوگ کارگل پر کیسے پہنچے اور کس نے مدد کی تمہاری؟''

سلطان۔ ''میرے خدا نے مدد کی تھی۔ بھارت سے کہو فوج لے کر کشمیر سے چلا جائے ورنہ کارگل فتح کرنے والے مجاہد لال قلعہ کا دروازہ بھی توڑ سکتے ہیں۔''

میجر انیتا سنگھ، سلطان پر سخت تشدد کرواتی ہے لیکن دل ہی دل میں وہ اس ظلم پر افسردہ بھی ہوتی ہے اور اسسٹنٹ مس جوشی سے کہتی ہے۔ ''اس قیدی کے اوپر سے برف کی سل ہٹا دو۔''

اگلے منظر میں دکھایا جاتا ہے کہ دیبا بیگم جنگلوں سے ہتھیار جمع کر کے مجاہدین کے اڈے میں دے جاتی ہیں۔ وادی میں مجاہدہ گل (زیبا بختیار) کا انڈین فورس پیچھا کرتی ہے لیکن آزاد خان اسے چھپا دیتا ہے۔

آزاد خان۔ ''کشمیر کی آزادی اور تیری محبت ہی میری زندگی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق آج کرنل ٹھاکر کی محفل میں ہندو لڑکیاں گانا گائیں گی۔ میری خواہش ہے کہ آج رات کرنل کی آخری رات ہو۔''

آزاد خان کی ہدایت پر گل ایک گانے والی کے روپ میں کرنل ٹھاکر کی محفل میں گانا گاتی ہے۔ گانا ختم ہونے کے بعد کرنل حکم دیتا ہے کہ آج رات اس کنیا (لڑکی) کو ہمارے بیڈروم میں پہنچا دیا جائے۔ گانے کے دوران آزاد خان کرنل کے بوٹ (کشتی) میں بم فٹ کر دیتا ہے۔ کرنل کے بوٹ میں جانے کے بعد بم پھٹ جاتا ہے۔ کرنل کی ہلاکت سے کیپٹن وجے اور بھارتی فوجیوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ کیپٹن وجے آزاد خان کا پیچھا کرتے ہوئے اس پر فائر کرتا

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ہے جس سے آزاد خان زخمی ہو جاتا ہے۔ زخمی ہونے کے بعد وہ ایک گھر میں پناہ لیتا ہے۔ یہ گھر میجر خالد کا ہوتا ہے۔ خالد کی بیگم (رفعت تجلی) آزاد خان کی مرہم پٹی کرتی ہے۔ اتنے میں میجر خالد آ کر پستول تان لیتا ہے۔

میجر خالد۔ ''تم نے جتنا بھاگنا تھا بھاگ چکے۔ اب بھاگے تو میری گولی تیرے سینے کے پار ہو گی۔''

اس موقع پر دونوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ اس دوران میجر خالد فائر کرنے لگتا ہے تو اس کی بیوی شان کے سامنے آ کر اپنے شوہر سے کہتی ہے۔ ''ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو مارنا حرام ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر تم مارنا چاہتے ہو تو مجھ پر گولی چلاؤ۔''

میاں بیوی کی اس بحث کے دوران آزاد خان موقع مناسب دیکھ کر وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ کرنل ٹھاکر کی موت کے بعد نیا کرنل کھنہ (نیر اعجاز) کیپٹن وجے سے پوچھتا ہے۔ ''کرنل ٹھاکر کا قاتل اب تک کیوں گرفتار نہیں ہوا؟''

اس موقع پر وجے دیگر افسران سے نئے کرنل کا تعارف کراتا ہے۔ میجر خالد کے بارے میں بتاتا ہے۔ ''یہ میجر خالد ہے۔ ہر موقع پر گولی کی طرح پہنچ جاتا ہے۔ اس کی وفاداری پر کوئی شک نہیں۔ بس مسلمان ہے اور کوئی ڈیفلکیٹ نہیں۔''

کرنل کھنہ۔ ''مسلمان ہونا ہی سب سے بڑا ڈیفلکیٹ ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی وفادار کیوں نہ ہو۔ مسلمان کو ہمیشہ دشمن سمجھو۔ چاہے وہ ہمارے لباس میں ہی کیوں نہ ہو۔ سانپ کو چھوڑ دو مگر مسلمان کو مت چھوڑو۔'' پھر وہ میٹنگ کے شرکاء کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''مجھے افسوس ہے کہ کشمیر میں سات لاکھ فوج ہونے کے باوجود ہمارے میجر کرنل ٹھاکر کو دہشت گردوں سے نہ بچایا جا سکا۔ انہیں کشمیری دہشت گردوں نے مار ڈالا۔''

کیپٹن وجے۔ ''یہ مسلمان کتنی پاگل قوم ہے۔''

میجر خالد۔ ''مسلمانوں کو یہ جنون ان کے مذہب نے دیا ہے۔ آگ اور خون سے کھیلنا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتے۔''

کرنل کھنہ۔ ''میجر خالد یاد رکھو تم انڈین آرمی کے آفیسر ہو۔ محمد بن قاسم نہیں ہو۔''

میجر خالد۔ ''میں نے انڈین آرمی آفیسر بنتے وقت جو حلف اٹھایا تھا وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

کرنل کھنہ۔ ''پھر تم جب تک آرمی آفیسر ہو مسلمانوں کی حمایت نہ کرنا۔''

میجر خالد۔ ''میں اپنی وردی کے پیچھے اپنے مذہب کو چھپا نہیں سکتا۔''

میجر انیتا سنگھ۔ ''ہم نے آج ایک فنکشن کا اہتمام کیا ہے۔ سر آپ بھی اس میں شامل ہو کر محفل کو رونق بخشیں۔''

اگلے منظر میں۔ ٹارچر سیل میں، میجر انیتا سنگھ، سلطان (بابر علی) سے کہتی ہے ''سلطان سرکار نے تمہاری موت کا آرڈر تیار کر دیا ہے۔ اگر تم اب بھی اپنے ساتھیوں کا پتا بتا دو تو تمہاری موت ٹل سکتی ہے۔ خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہیں اپنی زندگی سے محبت نہیں؟''

سلطان۔ ''بدنصیب ہے وہ جسے وطن کے سوا کسی اور سے محبت ہو۔''

کیپٹن وجے۔ ''او بھگوان! کون سا وطن؟ کس کا وطن؟ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔''

سلطان۔ ''جھوٹ بولتے ہو کیپٹن! سچ یہ ہے کہ کشمیر سے اٹھنے والے بادل پاکستان کے کھیتوں پر برستے ہیں۔ کشمیر کے چشمے پاکستان کے دریاؤں کی گود میں گرتے ہیں، کشمیر سے چلنے والی ہوائیں پاکستان کے پہاڑوں میں سانس لیتی ہیں۔ یہاں پھول کھلتے ہیں تو ان کی خوشبو کا رخ پاکستان کی طرف ہوتا ہے۔ کشمیر کو تو فطرت نے پاکستان کی گود میں رکھ دیا ہے۔ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ کیسے ہو سکتا ہے؟ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے اور ایک دن پاکستان بن کے رہے گا۔''

کیپٹن وجے۔ ''بند کرو یہ بکواس مسٹر جوشی۔ یہ چنگاری سلگتی رہی تو کشمیر سلگتا رہے گا۔ بھارت اجڑتا رہے گا۔ لے جاؤ اسے۔''

اگلا منظر۔ آزاد خان (شان) کے اڈے پر یہ خبر پہنچتی ہے کہ سلطان کو کرنل کھنہ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف جب سلطان کو بھارتی فوجی لے جا رہے ہوتے ہیں تو آزاد خان مجاہدین کے ساتھ راستے میں آ کر سلطان کو ان کے قبضے سے چھین کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی کرنل کھنہ آگ بگولا ہو کر غصے میں کہتا ہے۔ ''آزاد خان نے سلطان کو ہم سے چھین کر ہماری آرمی فورس کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ ایک دن اسی طرح کشمیر کو بھی آزاد کرا لے گا۔''

کیپٹن وجے۔ ''نہیں سر! کشمیر کو ہم سے کون چھین سکتا ہے۔ ہم آزاد خان اور سلطان کو زیادہ دنوں تک آزاد رہنے نہیں دیں گے۔''

کرنل کھنہ۔ ''میں حکم دیتا ہوں کہ سارے کشمیر میں کرفیو لگا دیا جائے۔ گھر گھر کونے کونے کی تلاشی لی جائے۔

UUNOVELS.COM

بستیاں تو بستیاں قبریں کھود کر بھی سلطان کو تلاش کیا جائے۔"

میجر انیتا سنگھ۔ "آج دیوالی کی شبھ رات ہے۔ اچھا ہو گا ہم اس موقع پر دیے جلائیں کسی کا گھر نہیں۔"

کرنل کھنہ۔ "ٹھیک ہے، دیوالی کی رات گزرتے ہی جہاد کی ایجنسی پر عمل کیا جائے۔" اس کے بعد کرنل کھنہ میجر خالد کو ایک سیکرٹ کام سے سری نگر جانے کا حکم دیتا ہے۔ میجر خالد اپنے گھر آ کر بتاتا ہے کہ آج شام مجھے سری نگر جانا ہے تو اس کا بھائی شاہد (ارباز خان) کہتا ہے۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

میجر انیتا سنگھ۔ "سنا ہے کہ سری نگر جا رہے ہو؟"

میجر خالد۔ "ہاں انیتا سنگھ! مجھے ایک سیکرٹ کام سے سری نگر جانا ہے۔ میرے ساتھ میرا بھائی بھی جا رہا ہے۔ تم میرے جانے کے بعد میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔"

کیپٹن وجے (کرنل کھنہ سے)۔ "سر میں نے انکوائری کر لی ہے۔ آزاد خان کو میجر خالد کی بیوی نے پناہ دے رکھی ہے۔ آزاد خان نے اسے اپنی بہن بنا لیا ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ان سے آزاد خان کا پتا معلوم کر لوں گا۔"

کرنل کھنہ۔ "میجر خالد تو کیا اگر گورنر کی بیوی بھی ہو تو اسے دشمن کا پتا معلوم کرنے کے لیے کٹہرے میں کھڑا کر دیں گے۔ اسے فوراً گرفتار کیا جائے۔"

اگلے منظر میں کیپٹن وجے میجر خالد کی بیوی اور بیٹی کو گرفتار کر کے کرنل کھنہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔

کرنل کھنہ۔ "اس عورت کی آنکھیں مت نکالو۔ صرف اس کی آنکھوں کا نور چھین لو۔" پھر بچی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ "لڑکی کہو اپنی ماں سے کہ یہ آزاد خان کا پتا ہمیں بتا دے ورنہ یہ شمع ہم ہمیشہ کے لیے بجھا دیں گے۔ یقین دلاؤ اسے کہ اگر اولاد کی آنکھوں کی روشنیاں بجھ جائیں تو ماں کی زندگی اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے۔"

بچی۔ "کرنل! اگر یہ صرف میری ماں ہوتی تو بیٹی کی آنکھیں بچانے کے لیے آزاد خان کا پتا ضرور بتا دیتی لیکن یہ تو کشمیر کی ماں ہے۔ بیٹی کے لیے سارے کشمیر کو اندھیرے میں ڈوبنے نہیں دے گی۔"

میجر خالد کی بیوی (رفعت بجگی)۔ "خدا کی قسم وطن کے اس رکھوالے کی خاطر ایک بیٹی تو کیا اپنی ساری نسل قربان کر سکتی ہوں۔"

کرنل کھنہ۔ "سلاخیں گرم کر کے بچی کی آنکھوں میں اتار دو۔"

اس موقع پر میجر انیتا سنگھ آ کر ٹوکتی ہے۔ "بچوں پر ظلم کرنا ہمارے مشن کی خلاف ورزی ہے۔"

کرنل کھنہ۔ "تمہاری بات درست، مگر یہاں یہ دیکھنے والا کون موجود ہے؟"

میجر انیتا سنگھ۔ "یہ عورت میجر خالد کی بیوی اور یہ بچی اس کی بیٹی ہے۔ کیا بھارت اپنی حمایت میں لڑنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کرے گا؟ اگر یہ خبر چار دیواری سے باہر چلی گئی تو انڈین فورس کا ہر مسلمان سپاہی بھارت سے وفاداری کی قسم توڑ دے گا۔"

کرنل کھنہ۔ "مجھے اس کی پروا نہیں۔ کل صبح تک ان کی زبان کھلواؤ۔ زبان نہ کھلنے پر یہ دونوں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیے جائیں گے۔ بھارت کے غداروں کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

اگلے منظر میں میجر انیتا سنگھ، میجر خالد کو فون پر بتاتی ہے کہ تم جس قدر جلد ہو یہاں پہنچو۔ کرنل کھنہ نے آزاد خان کیس میں تمہاری بیوی اور بچی کو گرفتار کر لیا ہے۔

میجر خالد۔ "اگر میری بیوی اور بچی کو کچھ ہو گیا تو میں کرنل کھنہ کی ساری نسل کو ختم کر دوں گا۔"

دوسری طرف کیپٹن وجے میجر خالد کی بیوی اور بچی کو اس قدر تشدد کا نشانہ بناتا ہے کہ دونوں موت کی نیند سو جاتی ہیں۔ یہ سانحہ دیکھ کر میجر انیتا سنگھ بھی مغموم ہو جاتی ہے۔ میجر خالد کی بیوی اور بچی کو دفنانے کے بعد بھارتی فوج مسلمانوں کو گھیر لیتی ہے۔

میجر کرشن (شفقت چیمہ)۔ "میجر خالد! کورٹ مارشل کے لیے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔"

میجر خالد۔ "میجر کرشن! میں دل کا زخم برداشت کر چکا ہوں۔ اب جسم کا زخم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چلاؤ گولی۔"

میجر کرشن۔ "مسلمان ہو، تمہیں گولی سے نہیں ماروں گا۔ پہلے تمہارا کورٹ مارشل ہو گا، پھر تمہارے جسم کا گوشت شکاری کتے کھائیں گے۔"

میجر خالد۔ "مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ تم کشمیر کی آزادی پر جو بدنما داغ ہو جسے میں اپنے خون سے مٹا دوں گا۔"

میجر کرشن۔ "مجھے تمہاری گرفتاری کے لیے انڈین آرمی نے بھیجا ہے۔ اب تمہارے بھاگنے کا راستہ صرف تمہاری موت ہی ہو گی۔"

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

اتنا کہہ کر میجر کرشن فائر کرنے کا حکم دیتا ہے عین اسی وقت آزاد خان اپنے مجاہد ساتھیوں کے ساتھ پہنچ کر انڈین فوج پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس موقع پر میجر خالد بھی مجاہدین کا ساتھ دیتا ہے۔

خالد کا بھائی شاہد (ارباز خان) اپنی کلاس فیلو موہی (میرا) سے محبت کرتا ہے۔ موہی ایک کروڑ پتی سیٹھ رام لال پانڈے (عرفان کھوسٹ) کی بیٹی ہے۔ موہی کے والدین کو ان کی بیٹی کی یہ محبت بالکل اچھی نہیں لگتی۔ رام لال پانڈے ہندو غنڈوں سے شاہد کو شدید زخمی کروا کے اسے دریا میں پھینکوا دیتا ہے۔ دریا کنارے مجاہدہ گل (زیبا بختیار) اسے بچا لیتی ہے۔ اس کے ہوش میں آنے پر اسے اپنے گروپ میں شامل کر لیتی ہے۔ دوسری طرف میجر خالد بھی انڈین فورس سے آزاد ہونے کے بعد آزاد خان کے گروپ میں شامل ہو جاتا ہے۔

نئے سین میں سلطان (بابر علی) خالد (جاوید شیخ) سے کہتا ہے۔ "تمہارے چہرے پر جما ہوا یہ خون یہ پھٹی ہوئی وردی۔ کیا کیا دیا تمہیں بھارتی فوج نے؟ تمہاری بیوی کی لاش، تمہاری معصوم بچی کا خون۔ بھارت سے وفاداری کرنے والے تمہاری زندگی شرمندگی بن گئی ہے۔ تم نے جو بغاوت اب کی ہے وہ بغاوت تمہیں پہلے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کرنی چاہیے تھی۔"

خالد۔ "انڈین آرمی کے مسلمان سپاہی بغاوت تو کیا اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ بھی نہیں کر سکتے۔"

آزاد خان۔ "خالد! تمہاری بچی اور بیوی کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔"

خالد۔ "اب میری آنکھیں تمہیں وہ راستہ دکھائیں گی جہاں بھارتی فوج نے مجاہدین کے خلاف بم، بارود، اسلحہ جمع کر رکھا ہے۔ اب ایسے دھماکے ہوں گے جن کی گونج سری نگر سے دہلی تک سنی جائے گی۔"

آزاد خان۔ "دنیا دیکھے گی کہ جو فیصلہ اقوام متحدہ کے ایوانوں میں نہیں ہو سکا وہ اب کشمیر کے میدانوں میں ہوگا۔"

منظر بدلتا ہے اور میجر کرشن اپنے سپاہیوں سے کہتا ہے۔ "میجر خالد کی غداری ہماری تباہی بن رہی ہے۔ ہر ڈپو، ہر اسلحہ خانہ دہشت گردوں کے سامنے آ چکا ہے۔ ان کے ارادوں کو ان کے سینوں میں دفن کر دو۔ ان کی چتائیں جلا دو۔"

میجر کرشن سلطان کے کمسن بھائی کو بھی گرفتار کروا لیتا ہے اور میجر انیتا سنگھ کے منع کرنے کے باوجود اسے فائر کر کے شہید کر دیتا ہے۔

آزاد خان کو خبر ملتی ہے کہ انڈین فورس کی ایک بڑی تعداد مجاہدین سے مقابلہ کرنے آ رہی ہے۔ آزاد خان میجر خالد سے مشورہ کرتا ہے۔ خالد اسے راستے میں بوٹیں لگوانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔ یہ مشن بڑا ہی خطرناک ہے کس کے ذمے ہوگا؟"

آزاد خان۔ "ہاں! واقعی خطرناک ہے لیکن کشمیر نے نڈر لڑکیاں بھی پیدا کی ہیں۔ وہ یہ کام انجام دیں گی۔ چوکیوں پر بھارتی فورس گل (زیبا بختیار) موہی (میرا) اور شاہد (ارباز خان) کو گرفتار کرتی ہے تو مجاہدین بھی مزاحمت کر کے گورنر (طارق شاہ) کی بیٹی سیتا (نیہا) کو یرغمال بنا لیتے ہیں دوسری طرف جب کیپٹن وجے، گل، موہی اور شاہد کو سزا دیتے ہوئے ننگا کیے جانے کا حکم دیتا ہے تو اسی وقت میجر انیتا سنگھ آ کر کہتی ہے۔"

"ان کو ننگا کرنے سے پہلے گورنر کی بیٹی سیتا کو ننگا ہونے سے بچا لو!" نئے سین میں میجر خالد سیتا سے کہتا ہے۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مسلمان اپنا دشمن طاقت سے لڑتے ہیں۔ ان کی عزت پر حملہ نہیں کرتے۔ تمہیں یہاں ضرورت کی ہر چیز ملے گی اور تمہاری حفاظت بھی کی جائے گی۔"

سیتا۔ "اتنا کہتے ہو تو پھر اٹھا کر کیوں لائے ہو مجھے؟"

خالد۔ "اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے۔ ہم نے تمہیں پتھر سمجھ کر اٹھایا ہے جب تک تم یہاں رہو گی ہم تمہیں پتھر ہی سمجھتے رہیں گے اور وقت آنے پر تمہیں بھارتی راج کے تاج پر دے ماریں گے۔"

اگلے سین میں گورنر (طارق شاہ) کرنل کھنہ کو حکم دیتا ہے۔ "میری بیٹی کو لے جانے والوں کو ختم کر دو۔ ایک باپ کے دل پر جو گزرتی ہے وہ آپ لوگ محسوس نہیں کر سکتے۔"

اسی وقت ایک سپاہی آ کر ایک خط گورنر کو دیتا ہے۔ گورنر اسے کھول کر پڑھتا ہے۔ لکھا ہے۔ "اگر کل شام تک گل، موہی اور شاہد کو آزاد نہیں کیا گیا تو...... گورنر کی بیٹی کی موت کی ذمے دار بھارتی ہائی کمان اور حکومت پر ہوگی۔"

میجر کرشن۔ "گورنر صاحب! آپ فکر نہ کریں میں کشمیر میں تمام دہشت گردوں کی چتا جلا دوں گا۔"

فجر کی نماز کے وقت بھارتی فوجی مسجد کو گھیر لیتے ہیں اور میجر کرشن مسجد کے پیش امام (بدر منیر) سے کہتا ہے۔ "آپ نماز جمعہ کے وقت کہہ دیں کہ مجاہدین سیتا کو رہا کر دیں تو ہم

UUNOVELS.COM

ان کے قیدی ان کے سپرد کردیں گے۔"

مسجد کے امام۔ "میرا مجاہدین سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں مگر میں تمہارے اس پیغام کو مسجد میں نماز پڑھنے والوں کو ضرور سنا دوں گا۔"

اگلے منظر میں مولانا کو خالد سے ملتے ہوئے اور کہتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مولانا کہتے ہیں۔ "کیپٹن نے یقین دلایا ہے کہ اگر سیتا واپس کردی جائے گی تو وہ لوگ گل، موسیٰ اور شاہد کو لے آئیں گے۔ اس نے بھگوان کی قسم کھائی ہے۔ انسان پر بھروسا ہونا چاہیے۔ کوئی بھی مسلمان کے دروازے پر آجائے تو مسلمان اسے مایوس نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے وہ ہمیں دھوکا نہیں دیں گے۔"

سیتا۔ "اگر کرنل نے دھوکا کیا، وعدہ خلافی کی تو ان مجاہد لڑکیوں میں ایک اور مجاہد لڑکی کا اضافہ ہوجائے گا۔"

خالد۔ "ٹھیک ہے مولانا! آپ کرنل کو یہ پیغام بھیجیں۔ وہ گل، موسیٰ اور شاہد کو لے کر درگاہ آجائیں۔ ہم بھی سیتا کو لے کر وہیں پہنچ جائیں گے۔"

جب یہ پیغام انڈین فورس تک پہنچتا ہے تو میجر انیتا سنگھ کرنل کھنہ سے کہتی ہے۔ "سر! آزاد خان، سیتا کو لے کر درگاہ پہنچ گیا ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں بھی ان کے ساتھیوں کو لے کر درگاہ پہنچ جاؤں۔"

کرنل کھنہ۔ "ان قیدیوں کو رہا نہیں کیا جائے گا۔ ہم سیتا کو لے کر واپس آئیں گے۔"

میجر انیتا سنگھ۔ "مگر سر! یہ تو ناانصافی ہوگی۔"

کرنل کھنہ۔ "ہم انصاف کریں یا ناانصافی۔ تم اپنی اوقات میں رہو۔ جو حکم ہم نے دیا ہے بس اسی کو سنو، اسی پر عمل کرو۔"

میجر انیتا سنگھ۔ "اگر میں آپ کا حکم ماننے سے انکار کردوں تو؟"

کرنل کھنہ۔ "تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو میجر خالد کی بیوی اور بچی کا ہوا۔"

میجر انیتا سنگھ۔ "میں کشمیری مسلمان بیٹیوں کی طرح تمہاری غلام نہیں ہوں جن پر تم ظلم کرسکو۔ میں سکھ قوم کی بیٹی ہوں اور سکھ قوم زبان کی پکی ہوتی ہے۔ میں ان کے ساتھیوں کو درگاہ شریف ضرور لے جاؤں گی۔"

کرنل کھنہ۔ "میں تمہیں مسلمانوں کی حمایت اور انڈین آرمی سے غداری کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔"

میجر انیتا سنگھ۔ "اور میں تمہارے لیے موت کا اعلان کرتی ہوں۔"

اور میجر انیتا سنگھ، کرنل کھنہ پر فائر کھول کر اسے ہلاک کردیتی ہے اور موسیٰ، گل اور شاہد کو آزاد کر کے درگاہ لے جارہی ہوتی ہے کہ کیپٹن وجے اسے ٹوکتا ہے مگر میجر انیتا سنگھ اسے خاطر میں نہیں لاتی۔

ادھر انڈین آرمی نے مسجد کو گھیر لیا ہے۔

آزاد خان۔ "جب تک ہمارے ساتھیوں کو نہیں لاتے۔ ہم سیتا کو نہیں چھوڑیں گے۔"

سیتا۔ "اگر تم مجھے آزاد کر بھی دو تو میں ان کے ساتھ جانا پسند نہیں کروں گی۔ میں جھوٹ بولنے والوں کے خلاف ہوں۔ میں مسلمان ہونا پسند کروں گی۔ مولانا صاحب! مجھے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

UUNOVELS.COM

کلمہ پڑھائیں۔"

سیتا مولانا صاحب کے ساتھ کلمہ پڑھتی ہے۔

میجر کرشن۔ (شفقت چیمہ)۔ "اگر مسجد کی حفاظت اور مجاہدین کی زندگی چاہتے ہو تو سیتا کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم مسجد سمیت سب مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے۔"

سلطان (بابر علی)۔ "ہمیں موت سے مت ڈراؤ میجر! ہم مسلمان جسم پر بم باندھ کر شہادت کی موت مانگتے ہیں۔"

اسی دوران میجر انیتا سنگھ مسلمان قیدیوں کو بحفاظت درگاہ شریف پہنچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

خالد (جاوید شیخ)۔ "انیتا سنگھ! انہیں تم لائی ہو۔"

انیتا سنگھ۔ "ہاں، میں سنگھ ہوں۔ ہندوؤں کی دوستی سے مسلمانوں کی دوستی ہزار درجہ بہتر ہے۔"

سلطان۔ "انیتا سنگھ! اگر تم نے ہم مسلمانوں کو اپنا دوست بنا ہی لیا ہے تو ہم تمہیں موت کے منہ میں اکیلا چھوڑ کے نہیں جانے دیں گے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی۔"

میجر کرشن (مائیک پر اعلان کرتا ہے)۔ "مولانا! اگر تم نے ہمارے حکم کی پیروی نہیں کی تو ایک منٹ کے بعد میں تم لوگوں کے ساتھ پوری مسجد کو بم سے اڑا دوں گا۔"

مولانا (بدر منیر)۔ "تم ہندو مسلمانوں سے صرف دھوکا کرتے ہو۔ تمہارے پہرے کی زنجیر کاٹ کر میرے مسلمان بھائی یہاں سے جا چکے ہیں۔ مسجد کو شہید کرنے سے پہلے میرے سینے پر گولی مار دو۔ میں شہادت کی موت مرنا چاہتا ہوں۔"

میجر کرشن، مولانا پر فائر کر کے انہیں شہید کر دیتا ہے۔ مجاہدین پیدل جا رہے ہوتے ہیں۔ انڈین آرمی گاڑیوں میں ان کا پیچھا کرتی ہے۔ آزاد خان سب کو سرحد پار کرا دیتا ہے اور اپنے جسم پر بم باندھ کر انڈین فوجیوں کو بھگاتا رہتا ہے۔ خوف سے انڈین فوجی بھاگتے چلے جاتے ہیں۔

آزاد خان، میجر کرشن سے کہتا ہے۔ "دیکھ میجر! مجھے شہادت کی موت نصیب ہو رہی ہے اور تجھے کتے کی موت۔"

بارڈر کے اس پار انیتا سنگھ مسلمانوں کو بارڈر کراس کرانے کے بعد کہتی ہے۔ "اب ہم پاکستانی سرزمین کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔" اتنے میں ایک گولی جو بابر علی پر چلائی گئی تھی، انیتا سنگھ اس کے سامنے آ کر گولی کا نشانہ بن جاتی ہے۔ وہ مرتے ہوئے کہتی ہے۔ "دیکھو سلطان! میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کشمیر۔"

فلم کے آخر میں بھی دیبا بیگم کو اسلحہ جمع کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہ ایک بچے کو اٹھاتی ہیں اور پس پردہ آواز ابھرتی ہے۔ "کل ہمارا ہے۔"

☆ ☆

یہ فلم "مسلمان" کی کہانی ہے جو مکالموں کے ساتھ آپ کو سنائی گئی۔ اس کہانی کو پڑھ کر آپ کے کیا تاثرات ہیں اس کا مجھے اندازہ نہیں۔ چونکہ یہ فلم کشمیر کے پس منظر میں بنائی گئی تھی اس لیے جب 2001ء میں سینماؤں کی زینت بنی تو اسے پسند کیا گیا تھا اور یہ فلم کامیاب ہوئی تھی لیکن اس کی بڑی وجہ میری سمجھ میں یہی آتی ہے کہ یہ موضوع چونکہ ہم سب پاکستانیوں کے لیے بہت اہم ہے اس لیے اسے بڑی تعداد میں تماشائیوں نے دیکھا اور اسے کامیاب کرایا۔

اس فلم کی کہانی کے تناظر میں آپ یہ بات تسلیم کریں گے کہ شہید، فرنگی اور زرقا کے مقابلے میں فنی طور پر "مسلمان" بہت کمزور فلم تھی۔ ریاض شاہد اور خلیل قیصر کی سوچ، فکر اور وژن کے رائٹر اور ڈائریکٹر ہونا ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ رشید ساجد بہت سینئر کہانی نویس تھے۔ انہوں نے کئی بڑی اور کامیاب فلموں کی کہانیاں لکھیں اسی طرح اقبال کشمیری بھی نامور ہدایت کار ہیں۔ ان کے کریڈٹ میں بھی بڑی اور کامیاب فلمیں ہیں مگر کشمیر کے موضوع پر نہ رشید ساجد کوئی اثر انگیز کہانی تحریر کر سکے نہ ہی اقبال کشمیری نے کشمیر کاز پر کوئی چونکا دینے والی فلم بنائی۔

دراصل ہر موضوع پر ہر کوئی معیاری اور کامیاب فلم نہیں بنا سکتا۔ ریاض شاہد اور خلیل قیصر دونوں انقلابی اور ترقی پسند تھے۔ ان کا سیاسی وژن بھی بہت وسیع تھا اس لیے انہوں نے عجب خان، شہید، فرنگی، زرقا اور یہ امن جیسی سیاسی پس منظر کی کامیاب فلمیں بنائیں اور ان کے فنی پہلوؤں کو بھی مضبوط سے مضبوط تر کیا۔

ہمارے ہاں اچھے لکھاریوں اور اچھے فلم میکرز ہر دور میں رہے مگر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ہر موضوع پر ہر میکر کامیاب فلم نہیں بنا سکتا۔ عام، تفریحی اور سماجی نوعیت کی فلمیں بنانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ تاریخی یا سیاسی نوعیت کی فلمیں بھاری پتھر کی طرح ہوتی ہیں۔ ان پر ہاتھ ڈالنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ایسی فلم اچھی بن بھی جاتی ہے تو باکس آفس پر کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کی بہترین مثال "خاک اور خون" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر فلم ساز و ہدایت کار ہلکے پھلکے تفریحی نوعیت کے سبجیکٹ پر فلمیں بناتے

UUNOVELS.COM

اور مالی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فلم ساز حاجی محمد شفیق چودھری نے کشمیر جیسے سلگتے ہوئے موضوع پر فلم بنانے کی ہمت کی۔ یہ ان کے جذبہ حب الوطنی کا ثبوت ہے۔ وہ اور ان کے معاون فلم ساز ایم ایف چودھری نے یقیناً کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو پروموٹ کرنے کی غرض سے ہی سرمایہ کاری کی جس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ یہ دونوں اس فلم سے پہلے بھی کئی فلمیں پروڈیوس کر چکے تھے۔

''مسلمان'' کے ہدایت کار اقبال کاشمیری کی فنی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ وہ ایک اندازے کے مطابق 75 سے زائد فلمیں ڈائریکٹ کر چکے ہیں۔ اقبال کاشمیری نے اپنے کیریئر کا آغاز نگو کے نام سے بطور ایکسٹرا کیا تھا۔ انہوں نے ماضی کی بہت سی فلموں میں چھوٹے موٹے رول پلے کیے تھے جن میں یکے والی، کرتار سنگھ، ہزار داستان، ستمگر اور ہمراہی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جن لوگوں نے محمد علی کی فلمیں ''ہزار داستان'' اور ''پرستان'' دیکھی ہیں وہ اگر اپنے ذہن پر زور دیں تو انہیں یاد آئے گا علی جب گاتے ہیں۔

دل بہت اداس ہے (فلم پرستان)

آنکھوں سے ملی آنکھیں (فلم ہزار داستان)

تو آپ کو ان نغمات میں محمد علی کے ساتھ نگو بھی نظر آئیں گے۔ مصنف و ہدایت کار عزیز میرٹھی سے اقبال کشمیری کو بڑی عقیدت رہی۔ ان کے ساتھ رہ کر انہوں نے فلم میکنگ کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ دوستو! لگن، دلچسپی اور دیانتداری سے کی ہوئی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ایکسٹرا کردار کرنے والے اقبال کشمیری کو ہی دیکھیے۔ انہوں نے ایمانداری کے ساتھ جدوجہد کی تو ایک کامیاب ہدایت کار بنے اور کشمیر جیسے قومی کاز پر ''مسلمان'' جیسی فلم بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔

''مسلمان'' کا مکمل اسکرپٹ کہنہ مشق فلم رائٹر رشید ساجد کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ رشید ساجد نے 1961ء کی فلم ''چھوٹے سرکار'' کا ایک نغمہ ''یہ حسیں شام اور آپ کے قریب ہیں ہم'' تحریر کر کے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ بعد ازاں ہدایت کار باقر رضوی نے اپنی فلم ''شیک ہینڈ'' کے مکالمات رشید ساجد سے لکھا کر انہیں فلم رائٹنگ کی طرف مائل کیا۔ یہ فلم 1962ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ان کی تحریر کردہ فلموں میں زمین، نغمہ صحرا، چٹان، کالا آدمی، شہنشاہ جہانگیر، کناری، گیت کہیں سنگیت کہیں، آنسو بن گئے موتی، رب دی شان، سوداگر، نیلام، یار دا سہرا، نیا طوفان، شک، آگ کا سمندر، نشانی، گورا کالا، خزانہ، ہم ایک ہیں، سن آف ان داتا، آگ کا دریا، راز، پیار ہی پیار میں، جان لیوا اور گھر کب آؤ گے قابلِ ذکر ہیں۔ فلم ''مسلمان'' میں رشید ساجد نے کئی مناظر کے لیے بڑے اثر انگیز مکالمے لکھ کر کشمیر کے حالات کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ رشید ساجد طویل علالت کے بعد 4 فروری 2020ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

''مسلمان'' کی موسیقی وجاہت عطرے نے ترتیب دی تھی۔ انہوں نے سبھی گیتوں کے لیے عمدہ دھنیں کمپوز کی تھیں۔ ان کی ترتیب دی ہوئی پس پردہ موسیقی بھی اچھی تھی۔ فلم کے آخری نغمہ ''ڈرتے نہیں جو موت سے'' کی دھن وجاہت عطرے کے والد محترم رشید عطرے کے مشہور نغمہ ''اے مرد مجاہد جاگ ذرا اب وقت شہادت ہے آیا'' کی دھن سے قدرے انسپائر ہے۔ سعید گیلانی اور ریاض الرحمن ساغر نے ''مسلمان'' کی مختلف سچوئشنز کے مطابق بہت پُراثر گیت تحریر کیے ہیں۔ فلم کا تھیم سانگ ''خون کشمیر رنگ لائے گا'' ذہن و قلب کو ہمنوا بنانے میں کامیاب رہا۔ اسی طرح ایک کورس نغمہ ''ڈرتے نہیں جو موت سے ہم ہیں مسلمان'' بھی ایمان افروز کلام ہے۔ فلم مسلمان کے نغموں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

☆ خون کشمیر رنگ لائے گا (آواز: غلام عباس)

☆ دل نے پہلے سلام کردیا (آواز: حمیرا چنا۔ پکچرائزیشن زیبا بختیار)

☆ پھول، خوشبو ہوا سب نے مل کر کہا (آوازیں: امیر علی، حمیرا چنا۔ فلم بندی: میرا، ارباز خان)

☆ ہائے صدقے جاواں کیویں گل نال لاواں

سدرا قاسم

مارخور نامی کمپنی کی حصہ دار ہے۔ یہ کمپنی پوری دنیا میں پاکستانی جوتوں کی مارکیٹنگ کرتی ہے۔ گزشتہ سال اس نے 700 آرڈر کی تکمیل کی ہے۔ انٹرنیٹ مارکیٹنگ پر ایک کمپئین چلا کر 107000 ڈالر کی مارکیٹنگ کی ہے اگر ہمت کرے تو انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔

مرسلہ: فاطمہ حسن

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

(نصیبولال، عارف لوہار۔ عکسبندی شاہ، عارف لوہار)

☆ عشق کی ابتداء آسماں پر ہوئی (آواز: حمیرا چنا۔ پکچرائزیشن زیبا بختیار)

☆ جے جے ہرے رام۔ سن بنتی میری بھگوان (بھجن سنگر حمیرا چنا۔ پکچرائزیشن میرا)

☆ ڈرتے نہیں جو موت سے ہم ہیں مسلمان (آوازیں: فاروق شاد، صائمہ جہاں)

دوستو! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جن دنوں فلم ''مسلمان'' بنائی گئی اور نمائش پذیر ہوئی ان دنوں پاکستانی فلموں میں انڈین سنگرز کی آوازوں میں گانے ریکارڈ کرانے کی روش عام تھی مگر ''مسلمان'' چونکہ کشمیر کے تناظر میں بنائی جا رہی تھی اس لیے اس فلم کے فلم ساز، ہدایت کار اور موسیقار نے متحد ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم اپنی اس فلم کے لیے کسی بھارتی گانے والے یا گانے والی کی آواز میں کوئی گیت، کوئی نغمہ صدابند نہیں کرائیں گے۔ موسیقار وجاہت عطرے نے اسی عزم کے تحت اپنی اس فلم کے سبھی نغمے پاکستانی سنگرز کی آوازوں میں صدا بند کروائے۔ یہ بات جب اس فلم کی نمائش کے وقت میڈیا کے توسط تک عوام میں پہنچی تو سب نے اس کی تعریف کی۔

اس فلم میں چار رقص شامل ہیں۔ ان کا معیار بھی بہتر ہے۔ پپو سمراٹ، نگاہ حسین، اعجاز سمراٹ اور اشرف شہزادی نے اس شعبے میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ شاہ اور عارف لوہار کا بھنگڑا ڈانس اپنے پچویشن کے اعتبار سے متاثر کن ہے۔ میرا نے بھجن گیت کے ساتھ جو رقص کیا ہے وہ بھی اچھا ہے جب کہ ارباز خان اور میرا نے ڈوئیٹ سانگ پر بھی عمدہ رقص کیا ہے۔ علاوہ ازیں زیبا بختیار پر فلمبند نغمہ ''دل نے پہلا سلام کر دیا'' میں ایکسٹرا گرلز کے ساتھ بھی خوب صورت رقص کیا ہے۔

اس فلم کی عکاسی کا معیار بھی اچھا ہے۔ ''مسلمان'' کی عکاسی کے لیے فاروق بٹ، سلیم بٹ، عاکف ملک اور وقار بخاری کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے حصے کا کام احسن طریقے پر انجام دیا ہے۔ شاہ کا سوئمنگ پول میں پیرا کی کا منظر نہایت خوش اسلوبی سے فلمایا گیا ہے۔ نغمات اور فائٹ کے مناظر کی عکس بندی بھی بڑی مہارت کے ساتھ کی گئی ہے چونکہ یہ فلم رنگین اور سنیما اسکوپ تھی اس لیے کلر کے لحاظ سے بھی اس کا معیار بلند تھا اور سنیما اسکوپ عکاسی بھی عمدہ تھی۔

اداکاری کے معیار پر اگر ''مسلمان'' کو پرکھا جائے تو مجموعی طور پر اداکاری کا شعبہ متاثر کن رہا۔ شان اور بابر علی نے کشمیری حریت پسندوں کی کردار نگاری بہت اچھی کی ہے۔ زیبا بختیار کشمیری مجاہدہ کے روپ میں مناسب رہیں۔ اداکارہ شاہ نے اپنے کردار میں سپر کلاس پرفارمنس دی اور انڈین فورس کی سیکیورٹی آفیسر میجر انیتا سنگھ کے رول میں اعلیٰ معیار کی اداکاری کر کے ثابت کیا کہ وہ ہیروئن کے رول سے ہٹ کر بھی ہر قسم کے کردار نبھانے کی بھرپور اہلیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح جاوید شیخ نے بھی اپنا کردار مہارت کے ساتھ ادا کیا اور کامیاب رہے۔ نئی اداکارہ نیہا اپنے مختصر کردار میں اچھی لگی جب کہ ارباز خان اور میرا کے کردار بھرتی کے تھے۔ تاہم انہوں نے عمدگی کے ساتھ پرفارم کیے۔ کیپٹن وجے کے منفی کردار میں ٹی وی اسٹار سلیم خواجہ گوارہ رہے۔ جب کہ نغمہ، دیبا، رفعت تجلی، عرفان کھوسٹ، نیر اعجاز، نواز خان، طارق شاہ، بدر منیر اور شفقت چیمہ نے اپنے اپنے کردار بخوبی نبھائے ہیں۔ عارف لوہار نے صرف بھنگڑا ڈانس میں حصہ لیا۔

اقبال کشمیری کی ڈائریکشن اوسط سے بالاتر ہے۔ انہوں نے فلم کے تمام شعبوں کو خوش اسلوبی سے ہینڈل کیا ہے۔ فنکاروں سے بہتر کام لیا ہے۔ فلم کا ٹمپو فاسٹ ہے جو اقبال کشمیری کی مہارت کا نتیجہ ہے۔ گیتوں کے لیے انہوں نے خوب پچویشنز نکالی ہیں مگر ان سے یہ چوک کیسے ہو گئی کہ انہوں نے مسجد کے پیش امام بدر منیر سے ''حرام زادے'' کا لفظ کہلوایا؟ کیونکہ ہمارا مذہب تو گالی گلوچ کی اجازت نہیں دیتا بہرحال مجموعی طور پر ''مسلمان'' میں اقبال کشمیری کی کارکردگی قابل ستائش ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے اسے ایک با مقصد اور معیاری فلم قرار دیا گیا۔

2001ء میں عیدالاضحیٰ کے مبارک موقع پر آل پاکستان سطح پر ریلیز ہونے والی اس فلم نے کراچی میں اپنے مدمقابل نمائش پذیر ہونے والی تمام فلموں سے بہتر بزنس کیا جب کہ لاہور اور پنجاب و سرحد کے دیگر مقامات میں بھی اسے عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اگرچہ کسی بڑے مقصد کے لیے بنائی جانے والی فلم کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی اور بسا اوقات تو اصل سرمایہ بھی واپس نہیں آتا لیکن کشمیر کے موضوع پر ہونے کی وجہ سے پاکستانی تماشائیوں نے اسے پذیرائی بخشی اور ''مسلمان'' باکس آفس پر بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ حالانکہ یہ فلم تیکنیکی اعتبار سے قدرے کمزور تھی۔

++

UUNOVELS.COM

جھوٹے

کشمالہ حسن

دنیا بھر میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو نت نئے فراڈ کرتے ہیں، جعلسازی کی مثال قائم کرتے ہیں۔ ایسے ایسے طریقوں سے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

مشہور جھوٹوں کا تذکرہ جنہوں نے ایک دنیا کو بے وقوف بنایا

اس دنیا میں کیا نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی یہ جان لینے کے باوجود کہ سب کچھ ممکن ہے، یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

جبکہ انسان کو ایسا ذہن ملا ہے۔ وہ ایسے ڈھونگ رچا سکتا ہے۔ ایسے کارنامے انجام دے سکتا ہے کہ اس کی شخصیت کا جب مثبت پہلو سامنے ہو تو وہ اپنی پاکیزگی کی انتہا پر نظر آتا ہے اور جب منفی رخ پر مڑ جائے تو شیطان بھی اس کا شاگرد نظر آئے۔ چند ایسے ہی واقعات جو ناممکن ہونے کے باوجود ممکن ہو گئے مختصر پیرائے میں بتا دوں۔

یہ پہلی کہانی ہے برطانیہ کے ایک چھوٹے سے قصبے کی۔ میری ٹافٹ اپنے گھر سے باہر نکلی۔ وہ مقامی مارکیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر تھا۔ اس کی چال میں نقاہت تھی۔ اس نے اپنی کمر کو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے شدید درد ہو۔

اس کی پڑوسن گروتھی نے اسے دیکھ کر آواز دی۔

''میری...... میری!''

میری اس کی آواز سن کر رک گئی۔ گروتھی اس کے پاس آئی۔ ''ارے کیا ہوا؟'' گروتھی نے پوچھا۔

"بہت تکلیف اور ویکنیس ہو رہی ہے۔" میری نے بتایا۔

"لیکن اتنی جلدی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تم کو چوتھا ہی مہینا ہوا ہے۔"

"ہاں! لیکن اس بار کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"تم ڈاکٹر برٹن کے پاس چلی جاؤ۔ وہ تمہیں دیکھ لے گا۔"

"لیکن میں ڈاکٹر شا کے علاج میں ہوں۔" میری نے بتایا۔

"ارے وہ بھی کوئی ڈاکٹر ہے۔ قصبے کی کوئی عورت اس کے پاس نہیں جاتی۔"

"نہیں اب وہ ایسا بھی نہیں ہے گروتھی۔ وہ ایک ہوشیار ڈاکٹر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کم خرچ بھی ہے۔ اس کی فیس بھی ہم برداشت کر لیتے ہیں۔"

میری حاملہ تھی۔ اس کے یہاں پھر ڈیلیوری ہونے والی تھی۔ اس کے پہلے سے تین بچے تھے۔

گروتھی کو اس سے ہمدردی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میری کا شوہر کئی مہینوں سے بے روزگار ہے۔ وہ ایک کارپینٹر تھا اور اس قصبے میں اس کا کام نہ ہونے کے برابر تھا اسی لیے بے چاری میری اکثر پریشان رہتی تھی۔

میری کچھ دیر بعد تھوڑا بہت سامان لے کر گھر واپس آ گئی تھی۔ اس کا شوہر بچوں کو سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔

"بچے بھوکے ہیں۔" جان نے کہا۔

"ہاں! میں اسی لیے تو جلدی واپس آ گئی۔" میری نے بتایا۔

"کوئی ملا تھا؟"

"ہاں پڑوسن گروتھی ملی تھی۔ اس نے میرا حال دیکھ کر افسوس کیا تھا۔"

"مارکیٹ میں بھی کوئی ملی ہوگی۔"

"ہاں ڈاکٹر شا ملے تھے۔ وہ بہت پُرجوش ہو رہے تھے۔ کچھ مشورے بھی دیے ہیں۔"

یہ بہت غریب لوگ تھے۔ تین بچے تھے اور جان کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ وہ بہت مشکلوں میں زندگی گزار رہے تھے۔ وہ اکثر سوچا کرتے تھے کہ حالات بدلنے کے لیے کیا کیا جائے۔ ان کے پاس کوئی پلاننگ نہیں تھی۔

جان کارپینٹر تو اتنا اچھا نہیں تھا لیکن وہ ایک شاطر ذہن کا انسان تھا۔ اس نے ایک پلاننگ تیار کی اور اس میں میری کو بھی شامل کر لیا بلکہ اس پلاننگ کی مرکزی کردار ہی میری تھی۔ اب انہیں قصبے کے کچھ اور لوگوں کو بھی اس پلاننگ میں شامل کرنا تھا۔

جان اکثر اپنے آپ سے کہا کرتا۔ ہم جو بھی کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہمارا حق ہے۔ جب معاشرہ سیدھے طور پر ہمیں کچھ نہیں دیتا تو کیوں نہ کسی اور طریقے سے کام لیا جائے۔

"لیکن اس کے لیے تو بہت محنت کی ضرورت ہوگی؟" میری نے پوچھا۔

"ہاں پیسے یوں ہی تو نہیں ملتے۔ محنت کرنی ہوتی ہے۔"

کچھ دنوں بعد میری کے یہاں ڈیلیوری ہو گئی۔

یہ کیس چونکہ ڈاکٹر شا کے پاس تھا، اسی لیے اس کی نگرانی میں بچوں کی پیدائش ہوئی تھی۔ جی ہاں بچوں کی پیدائش ایک دو نہیں بلکہ پورے پانچ عدد بچوں کی پیدائش اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ بچے انسان کے نہیں تھے بلکہ خرگوش کے تھے۔

اس خبر نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ اخباری رپورٹرز دوڑ پڑے تھے۔

پڑوسن مسز گروتھی نے بیان دیا۔ "میں تو میری کی حالت ہی دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے پہلے بھی تین بچے ہیں اور میں نے ہر بچے کے وقت اس کو دیکھا ہے لیکن جیسی حالت اس ڈیلیوری میں ہو رہی تھی۔ وہ ابنارمل محسوس ہو رہا تھا اور اب اس کی وجہ سامنے آ گئی۔ اس کے پیٹ میں خرگوش کے بچے پروان چڑھ رہے تھے اسی لیے۔"

ان بچوں کو دیکھنے کے لیے رش لگ گیا۔

جان اور میری کا گھر بھرا رہنے لگا۔ آس پاس کے ڈاکٹرز بھی اس انوکھے کیس کی اسٹڈی کے لیے میری کے گھر آنے لگے۔

لوگوں کے رش سے تنگ آ کر جان نے بچوں کو دیکھنے پر ٹکٹ لگا دیا۔ اس کے باوجود رش کم نہیں ہوا۔ لوگ قدرت کے اس عجوبے کو دیکھنے کے لیے لگاتار آتے رہے۔ ان عجیب بچوں کے وسیلے سے جان اور میری کے گھر کے حالات ہی بدل گئے۔

کچھ دنوں کے بعد ان بچوں کا بھید اس وقت کھلا جب ان پانچ میں سے تین بچے مر گئے۔ ان کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو پتا چلا کہ وہ خرگوش ہی کے بچے تھے اور یہ سارا ڈراما دونوں میاں بیوی نے مل کر رچایا تھا اور اس فراڈ میں ڈاکٹر شا بھی شامل تھا۔

ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے کہ کیسے لوگ تھے جو ایک عورت کے فراڈ میں آ گئے۔

عورت ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ لوگ اس کے فریب میں آ جاتے ہیں۔

آپ کو بھی یاد ہوگا کہ ایک دوسرے ملک کی عورت نے

UUNOVELS.COM

ہماری عوام کو بھی حیران کر دیا تھا۔ بہت ہی شرمناک صورت حال تھی جب زہرہ فونا نام کی ایک عورت نے آدھی دنیا کو بے وقوف بنا دیا تھا۔ ابھی بھی لاکھوں لوگ ہوں گے جنہوں نے اس کی تصویریں اخبارات میں دیکھی ہوں گی۔ اس کے حوالے سے خبریں پڑھی ہوں گی۔ اس عورت نے ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔

اس کے پیٹ سے تلاوت کی آواز آیا کرتی تھی۔ لوگ اس کے اردگرد احترام سے سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔

وہ انڈونیشیا کی تھی۔ اس نے اپنے پیٹ میں ٹیپ ریکارڈر چھپا رکھا تھا۔

نئی نسل کو تو شاید اس واقعے کا علم ہی نہ ہو لیکن پرانے لوگوں کو یاد ہوگا۔

ایسی بہت سی عورتیں گزری ہیں جنہوں نے نبیہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ایسی عورتوں میں ایک سجاع بنت حارث تھی۔

اس عورت میں کئی خوبیاں تھیں۔ یہ اپنے زمانے کی مشہور کاہنہ تھی۔ اس کے علاوہ فصاحت اور بلاغت میں بھی یکتا تھی۔ وہ جب بولتی تو سننے والے مسحور ہو جاتے تھے۔ عربوں کی مشہور زمانہ فصاحت کا بہت بڑا حصہ اس کے پاس آگیا تھا۔ وہ مذہباً عیسائی تھی۔

نہ جانے کب سے وہ موقع کے انتظار میں تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد ہی اسے اپنا شر پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اس نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ وہ ہر رات غیبی آوازیں سنا کرتی ہے۔ کوئی اس سے کہتا کہ کب تک غفلت میں رہے گی۔ اٹھ اپنا کام کر۔ اس نے بتایا کہ وہ اس آواز سے خوف زدہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ انسانی آواز سے بہت مختلف آواز ہے۔ اس میں بلا کی شیرینی اور کشش ہوتی ہے۔

کچھ سادہ لوگ بھی تھے جو اس کی بکواس پر یقین کر لیتے لیکن ابھی تک اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا۔

پھر اس نے اپنی پٹاری سے وہ سانپ نکال ہی لیا جس کے لیے اس نے بہت پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔

اس نے ایک دن دعویٰ کیا کہ اس کے پاس فرشتے آتے ہیں جو اسے بتاتے ہیں کہ وہ نبیہ ہے۔ دنیا کی تاریخ میں آج تک کوئی عورت پیغمبر نہیں ہوئی ہے اسی لیے خدا نے اسے پیغمبر بنا کر یہ شکوہ دور کر دیا ہے۔

اس سے کہا جاتا کہ آخری پیغمبر تو حضورؐ ہیں۔ وہ خود فرما گئے ہیں کہ ان کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔

اس پر وہ کہتی کہ بالکل درست۔ آپ کا فرمان بالکل درست ہے لیکن ان کا اشارہ مرد پیغمبر کی طرف تھا انہوں نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ کوئی عورت پیغمبر نہیں آئے گی اسی لیے میں آگئی ہوں۔

وہ چونکہ فصاحت اور بلاغت میں اپنی مثال آپ تھی اسی لیے وہ اپنی باتوں سے لوگوں کو سحر زدہ سا کر دیتی تھی اور لوگ اس کے معتقد ہوتے چلے گئے۔ لوگ اس کی نبوت پر ایمان لے آئے تھے۔

اس زمانے میں ایک اور جھوٹا نبی بھی اپنے عروج پر تھا۔ ''مسلیمہ کذاب۔''

سجاع کے پاس بہت قوت جمع ہو چکی تھی۔ بنی تمیم کا قبیلہ بھی اس پر ایمان لا کر مرتد ہو چکا تھا اسی لیے اس کے پاس بہت طاقت تھی۔ اس کے ذہن میں مدینہ پر حملہ کرنے کی سازش پروان پانے لگی۔

اس نے اپنی فوج اکٹھی کی اور مدینہ پر حملہ کرنے کا پلان بنا لیا۔ مسلیمہ کذاب ایک چالاک اور مکار انسان تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اور سجاع آپس میں مل جائیں تو بہت کامیاب ہوں مسلیمہ نے سجاع کو پیغام روانہ کیا۔ ''تم بھی پیغمبر ہو اور میں بھی۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے علاقے الگ الگ ہیں اور یہ ہونا بھی چاہیے ورنہ فساد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہم ایک دوسرے سے مل لیں تاکہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں اور جان لیں، میں تم سے ملاقات کے لیے بے چین ہوں۔''

سجاع کو بھی مسلیمہ کے بارے میں معلوم تھا۔

دونوں کی تنہا ملاقات ایک خیمے میں ہوئی۔ دونوں اس خیمے میں تین دنوں تک گناہ میں مشغول رہے جب کہ باہر کھڑے ہوئے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ دونوں کے درمیان نبوت کے مسئلے پر بات ہو رہی ہے۔

تین دنوں کے بعد پتا چلا کہ ان کا نکاح ہو گیا ہے۔ لوگ سجاع سے بدگمان ہونے لگے۔ فوج کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کی نبوت اب اس کے کام نہیں آئے گی۔ دوسری طرف مسلیمہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

سجاع اپنے قبیلے میں واپس چلی گئی۔ بعد میں اس نے توبہ کر کے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔

ویسے تو دھوکا دینے والے ہر دور میں اور ہر جگہ رہے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی بہت بڑی تعداد میں ہوئی ہیں۔

یہاں میں نے ان چند کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ایک معاشرے پر اپنا اثر ڈالا تھا۔ لوگ بے وقوف بن کر ان کے آگے پیچھے ہوتے رہے تھے۔

++

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

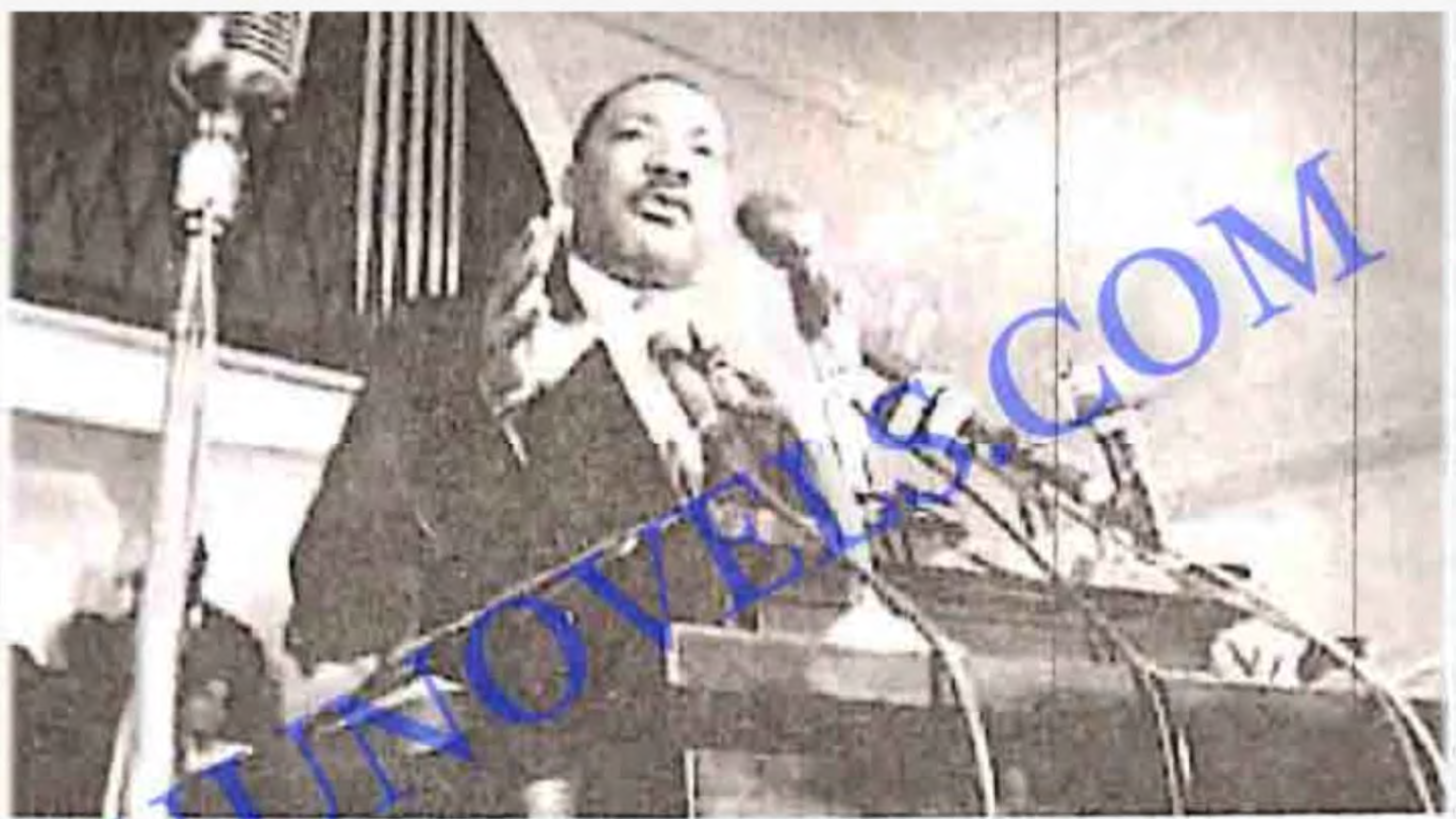

چھوٹے بڑے

شیراز خان

اکثر لوگ اپنے قد کی وجہ سے ذہنی طور پر خود کو کمتر محسوس کرتے ہیں جبکہ دنیا میں ایسے بے شمار افراد ہیں جو کوتاہ قدی کے باوجود نام وری میں بہت آگے ہیں۔ ان کا نام سنہری حرفوں میں آتا ہے۔

ایسے معروف افراد جو شہرت کی بلندیوں پر رہے

UUNOVELS.COM

انسان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہوا کرتا ہے۔
خدا نے انسان کو ہر روپ و رنگ میں پیدا کیا ہے اور وہ بھی اس کی بھرپور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ۔
ان لوگوں کے حالات دیکھ کر اور پڑھ کر یہ پتا چلتا ہے کہ انسان اگر باہمت ہو، اس کے سامنے ایک ٹارگٹ ہو تو پھر کامیاب ہونے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔
ہم نے یہاں ایسے لوگوں کا جائزہ لیا ہے جو پست قامت تھے لیکن یہ دیوہیکل لوگ تھے۔ ان کے قد ہزاروں لاکھوں سے بلند تھے۔ دنیا ان کے سامنے بونی دکھائی دیتی تھی۔ یہ اپنے اپنے شعبے کے ایسے قد آور لوگ تھے کہ انسانی

تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوا گئے۔

مارٹن لوتھر کنگ جونیر

اس کا قد صرف پانچ فٹ دو انچ تھا لیکن اس کی شخصیت اتنی قد آور تھی کہ دوسرے صرف تمنا کرتے رہ جاتے ہیں۔

اس کی پیدائش 15 جنوری 1929ء کو اٹلانٹا میں ہوئی تھی۔ وہ ایک افریقی تھا۔ امریکن پادری اور حقوقِ انسانی کا زبردست علمبردار۔ امریکی شہری حقوق کا اہم ترین رہنما۔ اس نے امریکا میں یکساں شہری حقوق کے لیے زبردست مہم چلائی۔

کنگ کی کوششوں کے نتیجے میں 1963ء میں واشنگٹن کی طرف زبردست مارچ کیا گیا جہاں اس نے اپنی شہرہ آفاق تقریر کی۔ "میرا ایک خواب ہے" I have a dream۔

اس تقریر کو انسانی تاریخ کی چند بہترین تقریروں میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے شہری حقوق کی مہم کے حوالے سے عوامی شعور اجاگر کیا اور امریکا کی تاریخ کے عظیم ترین مقرروں میں ایک قرار پایا۔

اس کی یہ تقریر جوش، جذبے اور ادبی کمال کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

1964ء میں نسلی تفریق اور امتیاز کے خلاف شہری نافرمانی کی تحریک چلانے اور پُرامن اندازِ احتجاج اپنانے پر کنگ کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اس وقت تک وہ یہ انعام حاصل کرنے والا کم عمر ترین شخص تھا۔

1968ء میں اس نے غربت کے خاتمے اور ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کیا اور مذہبی نقطۂ نظر سامنے لایا۔

مارٹن لوتھر کنگ کو 4 اپریل 1968ء کو امریکا میں میمفس کے مقام پر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

اس کی موت کے بعد پوری دنیا نے اس شخص کا سوگ منایا جو گرچہ پستہ قد تھا لیکن اس نے اپنا قد بہت بلند کر لیا تھا۔

اس کا نام پہلے مائیکل کنگ تھا پھر وہ اپنے باپ کے ساتھ جرمنی گیا۔ وہاں اس کے باپ نے جرمنی کے مشہور مصلح لوتھر کے احترام میں اپنے بیٹے کا نام مائیکل سے بدل کر مارٹن لوتھر رکھ دیا۔

ویسے اس کا باپ ایک بے رحم انسان تھا۔ وہ مارٹن پر بہت سختیاں کرتا۔ بہت مارا کرتا تھا۔ اس کے پڑوسی بتاتے ہیں کہ کبھی کبھی وہ اتنا مارتا تھا کہ مارٹن کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔

جب مارٹن چھ سال کا تھا تو اس کی دوستی ایک سفید فام لڑکے سے ہو گئی۔ دونوں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ دونوں کا ایک اسکول میں داخلہ بھی ہو گیا۔

لیکن اس سفید فام لڑکے کے باپ کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ اس کا بیٹا ایک سیاہ فام سے دوستی رکھے۔ اس نے اپنے بیٹے کو اس اسکول سے ہٹا لیا۔ اس طرح دوستی ختم ہو گئی۔ اس واقعے کا اثر بہت دنوں تک مارٹن پر رہا تھا۔

اس کی دادی کے انتقال نے بھی اس پر بہت اثر کیا تھا۔ اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی لیکن اسے بچا لیا گیا۔

وہ بہت حساس تھا۔ وہ سفید فاموں کی نفرتیں دیکھ دیکھ کر جوان ہو رہا تھا۔ بارہ برس کی عمر میں اسے بوکر ٹی واشنگٹن ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں اس نے مقبولیت حاصل کرنی شروع کر دی کیونکہ وہ بولنا جانتا تھا۔ تقریری مقابلوں میں اس نے کامیابیاں حاصل کیں۔

جب وہ صرف 13 برس کا تھا تو اٹلانٹس جرنل نامی اخبار کا اسسٹنٹ سرکولیشن مینیجر بن گیا۔ اس عمر کے کسی بچے کو یہ عہدہ شاید نہ ملا ہو۔ ایک بار جارجیا میں ہونے والے ایک تقریری مقابلے میں اس نے پہلا انعام حاصل کیا۔ وہ اپنے اسکول کی ٹیم کے ساتھ گیا تھا۔

واپسی کے سفر میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مارٹن کو احساس دلا دیا کہ سفید فام ابھی تک انہیں انسان نہیں سمجھتے ہیں۔

یہ ٹیم ایک بس کے ذریعے واپس آ رہی تھی۔ بس میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک سفید فام لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ مارٹن کی ٹیچر نے مارٹن کو حکم دیا کہ وہ کھڑا ہو جائے اور اس لڑکے کو جگہ دے لیکن مارٹن نے انکار کر دیا۔ اس پر اس ٹیچر نے سخت ردِعمل کا اظہار کیا۔

ان ہی باتوں نے مارٹن کو احساس دلا دیا کہ سیاہ فاموں کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ انہیں بہت جدوجہد کرنی ہے۔ اپنا جائز حق لینا ہے۔

1948ء میں مارٹن نے مور ہاؤس سے گریجویشن کر لیا۔ وہ ایک ذہین طالب علم ثابت ہو رہا تھا۔ اس طرف اس کے باپ کا رویہ بھی بہت نرم اور مہربان ہو گیا تھا۔ وہ مارٹن کے فیصلے پر اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔

مارٹن نے جس کالج میں آگے کی تعلیم کے لیے داخلہ لیا۔ اس کالج کی اسٹوڈنٹ یونین کا صدر بنا دیا گیا۔ اس کی تقریری صلاحیت اس کے کام آ رہی تھی۔ وہ ایک شعلہ بیان

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

مقرر تھا۔ مارٹن کی خدمات چرچ سوسائٹی نے حاصل کرلیں۔

اس نے انیس سو ترپن میں کوریٹا سے شادی کی تھی جس سے اس کے چار بچے پیدا ہوئے۔ کوریٹا ایک سماجی کارکن تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر سماجی خدمات میں حصہ لیا کرتی۔

جون 1955ء میں مارٹن نے بوسٹن یونیورسٹی سے P.H.D کی ڈگری حاصل کرلی۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جو امریکا کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کو منٹگمری بس بائیکاٹ کا نام دیا گیا ہے۔ یہیں سے مارٹن کی شہرت کا آغاز بھی ہوا۔ وہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک بس میں ایک سیاہ فام لڑکی کو زبردستی سیٹ سے کھڑا کردیا گیا کہ وہ ایک سفید فام کو جگہ دے دے۔ لڑکی نے انکار کردیا جس پر لڑکی کو زبردستی بس سے اتار دیا گیا۔

مارٹن کو معلوم ہوا تو اس نے اس سفید رویے کے خلاف تقریریں شروع کردیں جس کے نتیجے میں منٹگمری بس سروس کا بائیکاٹ ہوگیا۔ یہ بائیکاٹ ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ تک چلتا رہا۔ اس دوران مارٹن جگہ جگہ تقریریں کرتا رہا۔ ایک بار اس کے مکان پر بم حملہ بھی کیا گیا لیکن اس کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس نے سیاہ فاموں کو اپنی حیثیت کا احساس دلا دیا تھا۔ وہ نسل پرستی کے سخت خلاف تھا۔ اسے سماجی جدوجہد کی تحریک کا سب سے اہم آدمی سمجھا جانے لگا۔

1957ء میں آزادیٔ حقوق کے حوالے سے ایک تنظیم قائم ہوئی۔ مارٹن نے اس میں شمولیت اختیار کرلی اور اپنی عمر کے آخری حصے تک اس سے وابستہ رہا۔ اس پر قاتلانہ حملے بھی ہوتے رہے۔ لیکن اس نے اپنی جدوجہد ترک نہیں کی۔

اس نے کئی کتابیں بھی لکھیں جیسے stride toward freedom -what is man وغیرہ۔ ان کتابوں نے بھی مقبولیت حاصل کی۔

اس کے حوالے سے بے شمار تحریک ہیں، جہاں بھی وہ انسانی حقوق کو پامال ہوتے دیکھتا وہاں پہنچ جاتا۔

اس کی زندگی کے سفر کا خاتمہ میمفس میں ہوا جہاں اس نے اپنی شہرۂ آفاق تقریر کی تھی۔ اس جلسے میں اسے گولی مار کر ہلاک کردیا گیا تھا۔

اس کی موت نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

1977ء میں اسے بعد از وفات ''صدارتی تمغۂ آزادی'' اور 2004ء میں کانگریس طلائی تمغے سے نوازا گیا۔ 1986ء میں ''یومِ مارٹن لوتھر کنگ'' کو قومی تعطیل کا دن کردیا گیا۔ یہ ایک بڑا اعزاز ہے۔ نوبل انعام تو پہلے ہی مل چکا تھا۔

تو ایسے ہوتے ہیں قد آور لوگ۔ بظاہر ان کے قد چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ظاہری طور پر قد آور ان کے سامنے بونے ہی دکھائی دیتے ہیں۔

اس باکمال اور بڑے انسان کے کچھ اقوال بھی پڑھ لیں۔

''تعلیم کا مقصد دو چیزوں پر دھیان رکھنا ہے۔ ذہانت اور کردار۔ اگر یہ نہیں ہیں تو پھر تعلیم ایک مشقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

''آخر میں ہمیں اپنے دشمنوں کے الفاظ یاد نہیں رہتے۔ اپنے دوستوں کی خاموشی یاد رہتی ہے۔''

''اندھیرا اندھیرے کو دور نہیں کرسکتا۔''

بروس لی

جی ہاں۔ مارشل آرٹس کا یہ شہرت یافتہ شخص بہت چھوٹے قد کا تھا۔ اس کا قد پانچ اعشاریہ سات انچ تھا لیکن دنیا میں مارشل آرٹ سے دلچسپی رکھنے والا ایسا کون ہے جو اس کو نہیں جانتا۔

بروس لی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ دنیا اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھتی رہتی ہے۔

وہ نہ صرف ایک مارشل آرٹسٹ تھا بلکہ، فلم کا اداکار، ڈائریکٹر پروڈیوسر، کوریوگرافر اور فلاسفر بھی تھا۔ اس نے jeet kune do کی ابتدا کی۔ یہ اس کی اختراع تھی (یہ لڑائی کی ایک تکنیک کا ہے)

اس کا انتقال صرف 32 سال میں ہوگیا تھا۔ (چونکہ بروس لی کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اس لیے ہم نے چند سطور پر اکتفا کیا ہے)

سر ونسٹن چرچل

موجودہ دور کا ایک بڑا انسان۔ کون ہے جو چرچل کو نہیں جانتا۔

بہترین مقرر، کامیاب سیاست داں، دوسری جنگ کا ہیرو، ایک کامیاب اور مستند لکھاری۔ یاد رہے کہ چرچل کو نوبل پرائز ادبی خدمات ہی پر ملا تھا۔ وہ ایک رنگا رنگ شخصیت تھے۔ ان کی صلاحیتوں کی مختلف جہتیں ہیں اور ہر

UUNOVELS.COM

جہت میں کامیاب رہے ہیں۔

ان کے اقوال یاد رکھنے کے قابل ہیں اور یہ بھی یاد رکھیں کہ وہ ایک پست قد انسان تھے لیکن کون قد آور ان کے سامنے آسکتا ہے۔

وہ ایک اعلیٰ درجے کے مدبر لیکن انتہائی قدامت پسند انسان تھے۔ وہ برطانوی نسل کی ذہنی برتری کے قائل تھے۔

ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ پوری دنیا نے ان کے جملے۔ ان کے انداز اور ان کی عادتیں اپنالی تھیں اور آج بھی وہ سب کچھ اسی طرح رائج ہے۔

جیسے انہوں نے روس اور اس کی پالیسیوں کے لیے ایک اصطلاح دی۔ ''آہنی پردے'' یہ آج بھی سیاسی تقریروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ وی V یعنی وکٹری کا نشان بھی چرچل کا دیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سگار پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

انیس سو ایک میں پہلی بار پارلیمنٹ کے رکن بنے اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

ان کی شخصیت کا ایک منفی پہلو ان کا تعصب ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی تھے جن کے نزدیک برطانوی قوم ہی دنیا کی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ ہندوستان میں ایک بار قحط پڑا جس کے لیے چرچل نے جو بیان دیا اس بیان سے ان کی نسلی منافرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''مجھے ہندوستانیوں سے نفرت ہے۔ یہ جنگلی لوگ ہیں اور ان کا مذہب بھی جنگلی ہے۔ قحط ان کی اپنی غلطی ہے کیونکہ وہ خرگوشوں کی طرح آبادی بڑھاتے ہیں۔''

یہ تھا ان کا نقطہ نظر........ وہ ایک ایسے آدمی تھے جن کی شخصیت کا سحر پوری دنیا پر تھا۔

ان کی پیدائش ایک ارسٹوکریٹک گھرانے میں ہوئی۔ ان کا خاندان ڈیوک کا خاندان تھا۔ ان کے والد لارڈ رانڈوف چرچل تھے۔

پیدائش تیس نومبر اٹھارہ سو چوہتر کی ہے۔ دو سال سے لے کر چھ سال تک چرچل ڈبلن میں رہے جہاں ان کے دادا وائسرائے ہوا کرتے تھے۔ ان کے دادا نے اپنے بیٹے کو اپنا پرسنل سیکریٹری رکھ لیا تھا۔

ان کے دادا چونکہ وائسرائے تھے اس لیے کوٹھی کے احاطے میں فوجیوں کی پریڈ ہوا کرتی تھی۔ ننھے چرچل کو یہ نظارہ اتنا اچھا لگتا تھا کہ وہ بہت دیر تک یہ پریڈ دیکھتے رہتے تھے۔

ابتدائی تعلیم برلن ہی میں ہوئی۔ تعلیم کے لیے ایک گورنس رکھی گئی تھی۔

اس کے بعد ہارو اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ تاریخ اور ریاضی میں غیر معمولی صلاحیت کے حامل تھے۔

ان کے والد کا انتقال اٹھارہ سو پچانوے میں ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا اپنی صلاحیتوں سے دنیا بھر میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرلے۔

چرچل کے ہونٹوں میں ایک پرابلم تھی جس کی وجہ سے اسے بولنے میں دشواری ہوا کرتی لیکن علاج سے وہ پرابلم ٹھیک ہوگئی۔ اس کے بعد اندازہ لگالیں کہ چرچل کی تقریروں نے عالمی شہرت اختیار کی۔

انہوں نے اسکول سے فارغ ہو کر تین بار ''رائل ملٹری کالج میں داخلے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ چوتھی بار کسی طرح کامیاب ہو کر سروس جوائن کرلی۔ انہوں نے بہت سا وقت ہندوستان کے شہر بنگلور میں گزارا، جہاں انہیں آرمی آفیسر کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔

وہ دو بار برطانیہ کے وزیراعظم بھی رہے تھے۔ بعد میں وہ اپنے آخری دنوں میں الزیمر کے مریض بھی ہوگئے تھے۔ وہ اتنے بیمار تھے کہ جب امریکا نے انہیں اعزازی شہریت دینے کی تقریب میں مدعو کیا تو وہ اپنی علالت کے باعث اس تقریب میں شریک نہیں ہوسکے۔

ان کا انتقال نوے برس کی عمر میں انیس سو پینسٹھ میں ہوگیا۔

پوری دنیا میں ان کی موت کی خبر نشر ہوئی۔ وہ ایک بڑے آدمی تھے اور اس بڑے آدمی کا قد صرف پانچ فٹ چھ انچ تھا۔

نپولین بونا پارٹ

فرانس کا مرد آہن۔ شہنشاہ۔ صرف پانچ فٹ چھ انچ کا تھا لیکن زمانہ اس کو یاد کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کیا تھا، اس کی پالیسی کیا تھی مگر وہ ایک بڑا آدمی تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں تاریخ جن کو مختلف حوالوں سے یاد رکھتی ہے۔ نپولین ان میں سے ایک تھا۔

اس کی زیر قیادت فرانس کی فوجوں نے بہت سے یورپی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے حصے میں بے شمار مہمات آئیں تھیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

1795 میں تشدد اور افراتفری پر قابو پانا۔

1796 سے 97 میں اس نے اٹلی میں آسٹریا کی فوجوں کو شکست دی۔ 1799 میں اسے پہلا کونسل بنادیا گیا۔

1804 میں فرانس کا شہنشاہ بنادیا گیا۔ 1805 میں فرانس کی فوج آسٹریا ''کو الم'' کے مقام پر شکست دیتی ہے۔ نپولین ویانا میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد آسٹریا اور روس کی مشترکہ فوج کو شکست دیتا ہے۔ نپولین اپنے بہن اور بھائیوں کو یورپ کے مختلف ملکوں کے اختیارات دے دیتا ہے۔

1807 میں روس کو شکست دیتا ہے۔

اس طرح اس نے کامیابیاں حاصل کیں۔ وہ کہتا تھا کہ ناکامی کا لفظ اس کی ڈکشنری میں نہیں ہے۔ 1812 سے اس کی تنزلی کا آغاز ہوتا ہے۔ کامیابیاں ناکامیوں میں بدلنے لگتی ہیں۔ آخر اسے مکمل شکست ہوتی ہے۔ وہ قید کرلیا جاتا ہے اور سینٹ ہیلینا کے جزیرے میں قید ہو جاتا ہے اور وہیں اس کی موت ہو جاتی ہے جو ہر انسان کا مقدر ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

نپولین فرانس کے جزیرے کارسیکا میں پندرہ اگست 1769 کو پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھا۔ اس کا باپ نوبیل کارلو ایک اٹارنی تھا۔ نپولین کے بچپن پر اس کی ماں کے اثرات بہت گہرے تھے۔ وہ ایک پُر جوش اور باہمت عورت تھی۔

ابتدائی تعلیم برینی میں حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ پیرس آگیا۔ یہاں اس نے ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ وہ پہلا کارسیکن تھا جس نے اس اکیڈمی سے گریجویشن کی تھی۔ 1785 میں اس نے سیکنڈ لیفٹیننٹ کا عہدہ حاصل کرلیا۔

اس کے بعد ہی اس کی ان کامیابیوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

نپولین نے 1796 میں جوزیفائین سے شادی کی تھی جو عمر میں اس سے بڑی تھی اور بیوہ تھی۔

جوزیفائین ایک رنگین مزاج عورت تھی۔ اس کے کئی عاشق تھے جن سے وہ رابطے میں رہتی تھی۔ نپولین اس کے عشق میں اس طرح گرفتار ہوا تھا کہ وہ ہفتے میں کئی بار اسے محبت بھرے خطوط روانہ کیا کرتا۔ ایک طرف اس کی مہمات تھیں اور دوسری طرف جوزیفائین کی محبت تھی۔ ''اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی۔ ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی۔''

اس کا یہ عشق بہت مشہور ہوا۔ کئی کہانیاں اس بنیاد پر لکھی گئیں۔

اس محبت کی کہانی بھی بہت عجیب ہے۔ جوزیفائین سے گرچہ کئی اولادیں ہوئیں لیکن وہ کوئی وارث یعنی بیٹا نہیں پیدا کرسکی جبکہ شہنشاہیت برقرار رکھنے کے لیے شہنشاہ کا بیٹا ہونا ضروری تھا۔

نپولین کو جوزیفائین کو طلاق دینی پڑی۔ اس کے باوجود اس کی محبت قائم رہی تھی۔ جوزیفائین کو قید کرلیا گیا تھا اور اسی قید میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ نپولین کو جب اس کی موت کی اطلاع ملی تو اس نے خود کو ایک کمرے میں بند کرلیا اور دو دنوں تک اس کمرے سے باہر نہیں آیا۔

مارچ 1810 میں اس نے میری نام کی ایک لڑکی سے شادی کرلی، جو کم عمر تھی۔ اس کا تعلق آسٹریا کے ایک بڑے خاندان سے تھا۔ اس سے ایک بیٹا ہوا تھا۔ یہ شادی نپولین کی موت تک برقرار رہی تھی۔

برطانیہ سے شکست کے بعد نپولین کو سینٹ ہیلینا کے جزیرے میں قید کردیا گیا۔ اس کو جہاں قید کیا تھا وہ ایک

رات کا وقت تھا۔ مجاز کسی میخانے سے نکل کر یونیورسٹی روڈ پر ترنگ میں جھومتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ اسی اثناء میں ادھر سے ایک تانگا گزرا۔ مجاز نے اسے آواز دی۔ تانگہ رک گیا۔ مجاز اس کے قریب آئے اور لہرا کر بولے۔ ''اماں نخاس جاؤ گے؟''

تانگے والے نے جواب دیا۔ ''ہاں، جاؤں گا۔''

اچھا تو جاؤ۔'' یہ کہہ کر مجاز لڑھکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

مجاز اور فراق کے درمیان کافی سنجیدگی سے گفتگو ہورہی تھی۔ ایک دم فراق کا لہجہ بدلا اور انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''مجاز! تم نے کباب بیچنے کیوں بند کردیے؟''

''آپ کے ہاں سے گوشت آنا جو بند ہوگیا۔'' مجاز نے اسی سنجیدگی سے فوراً جواب دیا۔

مرسلہ: تحسین علی خان۔ ڈسکہ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

خراب جگہ تھی۔ صفائی کا انتظام نہیں تھا۔ آب و ہوا میں گھٹن ہوا کرتی تھی۔

نپولین وہاں سخت بے چینی محسوس کرتا تھا۔ اس نے کئی بار گورنر سے اس بات کی شکایت بھی کی تھی۔

اس کے ساتھ سلوک بھی برا ہوا کرتا۔ اس کے فزیشن نے حکومت کو آگاہ بھی کر دیا تھا کہ نامناسب سلوک کی وجہ سے اس کی صحت جواب دیتی جا رہی ہے۔

بالآخر 5 مئی 1821 کو اسی جزیرے میں اس کی موت ہو گئی۔ ایک بڑی شخصیت اپنے انجام کو پہنچ گئی لیکن اس نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کا قد چاہے کچھ بھی ہو وہ اگر ہمت سے کام لے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔

یوری گگارین

بہت چھوٹے قد کا انسان۔ پانچ اعشاریہ دو انچ

لیکن انسانی تاریخ میں اس نے اپنا ایک نام بنا لیا۔ انسانی تاریخ کا وہ پہلا انسان ہے جس نے خلا میں قدم رکھا۔ اس کا تعلق روس سے تھا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ حوصلہ قد بلند کر دیتا ہے۔

آج بھی جب خلائی سفر کی بات ہوتی ہے تو اس کا ذکر ضرور ہوتا ہے کیوں کہ اس نے انسان کے لیے خلا میں جانے کی راہ کھول دی تھی۔ پیشے کے لحاظ سے وہ سوویت روس میں پائلٹ تھا۔

اس کے خلا میں جانے کے بعد ہی روس اور امریکا میں خلائی دوڑ شروع ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش نو مارچ انیس سو چونتیس کو کلوشینو نام کے ایک چھوٹے سے روسی قصبے میں ہوئی تھی۔ اس کی موت کے بعد اس قصبے کا نام اس کے نام پر گگارین رکھ دیا گیا ہے۔

اس کے والدین بہت غریب تھے۔ اس کا باپ ایک کارپینٹر تھا جبکہ اس کی ماں دودھ سپلائی کا کام کیا کرتی۔ زندگی کسی طرح گزر رہی تھی کہ جنگ چھڑ گئی۔ ہٹلر کی فوجوں نے اس قصبے پر قبضہ کر لیا۔ گگارین کے والدین کا مکان ایک جرمن آفیسر نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

گگارین کے والدین کو اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ اس مکان کے عقب میں کھیتوں کے درمیان اپنا کوئی مٹی کا جھونپڑا بنا لیں۔

اس فیملی کو دو سال تک اسی مکان میں رہنا پڑا تھا پھر جب جنگ کا خاتمہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی وہ مکان ان کو واپس مل گیا لیکن ایک پریشانی یہ تھی کہ گگارین کے دو چھوٹے بھائیوں کو جرمن مشقت کے لیے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ان کی واپسی دو سال بعد ہوئی تھی۔ بہر حال یہ خاندان اس علاقے سے ہجرت کر کے ایک شہر میں آ گیا۔ یہاں سے گگارین نے اپنی تعلیمی سرگرمی دوبارہ شروع کی۔

انیس سو پچاس میں جب وہ سولہ برس کا تھا تو اس نے فونڈری میں کام سیکھنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔

1951 میں گریجویشن کرنے کے بعد اس نے ایک کلب سے ہوابازی کی ٹریننگ لی اور طیارے اڑانے لگا۔

1955 میں اس نے سوویت ائرفورس جوائن کر لی۔ وہ باصلاحیت اور باہمت تھا۔ ان ہی خوبیوں نے اسے ترقی دینی شروع کی۔

روس نے اپنی خلابازی کا پروگرام شروع کیا اور خلا میں جانے والے ہوابازوں کا انتخاب ہونے لگا۔ گگارین کو بھی منتخب کر لیا گیا تھا۔

اس کے بعد اس کی ٹریننگ شروع ہوئی۔ وہ ٹریننگ جو انتہائی سخت ہوتی ہے۔ جس میں جسمانی مضبوطی کے ساتھ اعصاب کا آہنی ہونا بھی دیکھا جاتا ہے۔ گگارین ہر امتحان میں کامیاب ہوتا رہا۔

1957 میں یوری کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جو ایک ائر ٹیکنیشن تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے اور دو بچوں کے باپ بنے۔

جس وقت یوری کا انتخاب خلا میں جانے کے لیے ہوا اس وقت وہ دو بچوں کا باپ تھا۔

انتخاب کے بعد جو ٹریننگ ہوتی رہی وہ ایک خفیہ ٹریننگ تھی جس کے بارے میں یوری کو بھی کچھ بتانے کی اجازت نہیں تھی۔

یوری نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔ اس کے بعد اسے 12 اپریل 1961 کو خلا میں روانہ کر دیا گیا۔

انسانی تاریخ کا وہ پہلا شخص تھا جو خلا میں گیا تھا۔ اس کے بعد تو درجنوں جا چکے ہیں لیکن اوّلیت یوری کو حاصل ہوئی۔ خلا میں اس کے قیام کی مدت ایک گھنٹا اڑتالیس منٹ تھی۔ اس وقت اس کی عمر 27 سال تھی۔

جب وہ اپنے کامیاب سفر کے بعد واپس آیا تو پوری دنیا نے اس کا نام جان لیا۔ اسے اتنے اعزازات دیے گئے کہ ایک ریکارڈ ہے۔ وہ جس ملک میں بھی گیا اس کی پذیرائی ہوتی رہی۔

UUNOVELS.COM

لیکن وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکا۔ ایک فضائی حادثے ہی میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس وقت وہ صرف چونتیس سال کا تھا۔

اس کی موت 1968 میں ہوئی تھی۔

وہ ایک چھوٹے سے قد کا انسان تھا لیکن کیا اس قسم کی رکاوٹیں باہمت لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک سکتی ہیں؟

چارلی چپلن

جی ہاں مختصر قد کا بہت بڑا انسان۔ کون ہے جو اس کو نہیں جانتا۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ کے چند مشہور ترین لوگوں میں سے ایک چارلی چپلن بھی ہے۔

اس کو ملنے والے اعزازات بھی بے شمار ہیں۔ اس قد آور شخصیت کا جسمانی قد صرف 5 اعشاریہ 5 انچ تھا۔

اس کو پورے اعزاز کے ساتھ چارلی چپلن آرڈر آف دی برٹش ایمپائر کہا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش 1899 میں برطانیہ میں ہوئی پھر وہ امریکا چلا گیا جہاں سے ہالی ووڈ فلم انڈسٹری سے اس نے لازوال شہرت پائی۔

امریکی سینما کے کلاسیکل دور سے لے کر درمیانی دور تک بطور اداکار، فلم ساز، ہدایت کار، مصنف اور موسیقار اس نے شہرت حاصل کی۔ اس نے اپنی ابتدا خاموش فلموں سے کی۔ وہ فرانس کی خاموش فلموں کے اداکار میکس لینڈر سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اپنی ایک فلم بھی میکس لینڈر کے نام سے کی تھی۔

چپلن کا تخلیقی کام 75 برسوں تک محیط ہے۔ جو اس کے بچپن کے دور میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں برطانوی اسٹیج سے شروع ہوا اور 88 برس کی عمر میں اس کی موت تک جاری رہا۔

اس نے ایک دو اداکاروں کے ساتھ مل کر یونائیٹڈ آرٹسٹس نامی فلم اسٹوڈیو بھی قائم کیا تھا۔

1999 میں امریکن فلم انسٹی ٹیوٹ نے چپلن کو تمام ادوار کا دسواں بہترین اداکار قرار دیا ہے۔

2008 میں ''چارلی اے لائف'' نامی کتاب میں تبصرہ کرتے ہوئے مارٹن سیف نے تحریر کیا کہ چارلی صرف بڑا ہی نہیں تھا بلکہ وہ دیوہیکل تھا۔

جارج برنارڈ شا جیسا آدمی چارلی کو فلمی صنعت کا واحد جینیس کہا کرتا تھا۔

اس کے والدین برطانیہ کے موسیقی کی روایت سے تعلق رکھنے والے فنکار تھے۔ اس کا باپ ایک صداکار و اداکار تھا جبکہ اس کی ماں ایک گلوکارہ تھی۔ ان دونوں میں اس وقت علیحدگی ہو گئی جب چپلن صرف تین سال کا تھا۔ اس نے یہ صلاحیتیں شاید وراثت میں حاصل کی تھیں۔ اس کی ماں اور نانی کا تعلق اسمتھ فیملی سے تھا جس پر اس کو فخر بھی رہا لیکن اپنی خودنوشت میں اس نے اس تعلق کو ''اپنے خاندان کی الماری میں پڑے ہوئے ڈھانچے'' سے تشبیہ دی ہے۔

اپنے باپ سے اس کا تعلق بہت کم رہا ہے۔ کچھ دنوں تک وہ اس کے ساتھ تھا جب اس کی ماں ذہنی مریضہ ہو کر ایک پاگل خانے میں تھی۔ وہ پاگل خانہ اس کے باپ کے گھر کے پاس تھا۔ چارلی اس کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اس کا سوتیلا بھائی بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

چارلی کی زندگی کا ایک واقعہ یادگار ہے۔ اس کی ماں کو ایک اسٹیج پر پرفارم کرنا تھا۔ وہ اسٹیج پر آئی۔ اس نے گانا شروع کر دیا لیکن اس کے گلے میں سخت تکلیف تھی جس کی وجہ سے وہ گا نہیں سکی۔ اس پر ہال میں بیٹھے لوگوں نے اس پر ہوٹنگ شروع کر دی اور چیزیں پھینک پھینک کر مارنے لگے جس سے وہ زخمی بھی ہوئی اور اسٹیج کے پیچھے جا کر رونے لگی۔

لوگوں کا شور کم نہیں ہو رہا تھا۔ اس وقت چارلی صرف پانچ سال کا تھا۔ وہ اسٹیج پر چلا گیا اور اس وقت کا مقبول گیت ''جیک جونز'' گانے لگا۔ اس نے اتنی خوبی سے گایا کہ لوگ خاموش ہو کر اسے داد دینے لگے۔

چارلی نے ابتدائی زندگی بہت ہی مفلسی میں گزاری۔ بے سہاروں کے لیے بنے اداروں میں پرورش پائی۔ یہی حال اس کے سوتیلے بھائی کا تھا اسی لیے دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ امریکا بھی دونوں ساتھ ہی آئے تھے۔ قسمت آزمانے کے لیے۔

چارلی نے امریکا کا پہلا دورہ 1910ء سے 1912 تک کیا۔ وہ ایک برطانوی ٹروپ کے ساتھ بحیثیت اداکار امریکا آیا تھا۔ اس کے بعد اسے ایک اور موقع ملا۔ اس نے وہاں اپنی پرفارمنس سے فلمسازوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ چارلی کو شہرت ایک لافانی کردار ''دی آوارہ گرد'' سے ملی۔ اس کی مہمات میں اس کا بھائی بھی شریک رہا۔ پھر وہ دونوں اپنی ماں کو بھی امریکا لے آئے جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

آوارہ گرد چارلی کی شناخت بن گیا۔ اس نے اپنی کردار نگاری سے ایک دھوم مچا دی۔ اس کے بعد اس نے مڑ

کر نہیں دیکھا اور ترقی کرتا چلا گیا۔ آج پوری دنیا چارلی چپلن سے واقف ہے۔ اس کا انتقال 1977 میں ہوا تھا۔ اس کی قبر سوئٹزرلینڈ میں ہے۔

اس نے اپنی زندگی حادثات میں گزاری تھی۔ موت کے بعد بھی ایک حادثہ اس کی لاش کے ساتھ ہوگیا۔

14 مارچ 1978 کو اس کے خاندان سے ناجائز طور پر رقم ہتھیانے کے لیے ایک گروہ نے قبر کھود کر اس کی لاش نکال لی۔ تاہم یہ سازش ناکام ہوگئی۔ چوروں کو گرفتار کرلیا گیا اور جسدِ خاکی گیارہ ہفتوں کے بعد برآمد کرلیا گیا اور دوبارہ تدفین کی گئی۔ قبر پر چھ فٹ موٹی کنکریٹ کی تہ ڈال دی گئی تاکہ کوئی دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے۔

مختصر یہ کہ چارلی چھوٹے قد کا ایک بہت بڑا آدمی تھا۔

پابلو پکاسو

چھوٹے قد کے بڑے انسانوں میں پابلو پکاسو کا نام بھی شامل ہے۔ شہرۂ آفاق مصور۔ اس کا قد بھی پانچ چار کا تھا۔

ٹائم میگزین نے 1998 میں موجودہ صدی کی سو بڑی شخصیات کا انتخاب کیا تو پابلو کو پہلے نمبر پر قرار دیتے ہوئے لکھا۔ ''اس سے قبل کوئی آرٹسٹ اس قدر مشہور و مقبول نہ ہو سکا جتنا پکاسو ہوا ہے۔''

دور جدید کا سب سے بڑا مصور۔ تجریدی آرٹ کا بانی۔ اسپین کے شہر ملاگا میں 25 اکتوبر 1881 کو پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ اس کا باپ خود ایک آرٹسٹ تھا اور ایک درس گاہ میں پینٹنگ سکھایا کرتا۔

اس کے والدین کارونا نامی شہر میں منتقل ہوگئے۔ پکاسو کو ابتدا ہی سے روایتی تعلیم سے کوفت ہوتی تھی۔ وہ اپنے لیے نئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔ اس کے باپ نے جب اس کی ڈرائنگ دیکھی تو اپنے برش اور رنگ وغیرہ اس کے حوالے کردیے اور خود کبھی پینٹنگ نہیں کی۔

پہلی بار 1900 میں پکاسو نے اپنی پہلی نمائش کی۔ پکاسو ایک ماسٹر تھا۔ ایک دیومالائی مصور۔ ہر تحریک نے اس کا اثر قبول کیا۔

1904 میں آرٹ کے مرکز پیرس میں رہائش اختیار کرلی۔ اس کے اسٹوڈیو کا نام bateaulaboir تھا۔

اس کی مصوری کے کئی ادوار ہیں۔ پیرس میں اس نے نیلے دور کی مصوری کی۔ اس دور کو نیلا اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی تصویروں میں نیلا رنگ نمایاں تھا۔ اداسی اور تنہائی کا رنگ۔

اداس اور بیمار کردار۔ سرکس میں ناچنے والے جو خود روتے رہتے ہیں لیکن دوسروں کے ہونٹوں پر تبسم لے آتے ہیں۔

نیلے دور کے بعد اس کا گلابی یا کلاسیکی دور آتا ہے پھر اس نے ہر قسم کی روایتی مصوری سے ناطہ توڑ لیا۔ دو سال تک افریقی حبشیوں کی مصوری اور سنگ تراشی کا گہرا مطالعہ کیا پھر دو سال عظیم مصوری زمانے کی تصویروں کا گہرا مطالعہ کرتا رہا۔

1909 میں اس نے cubism کی تحریک شروع کی جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

1920 میں اس کے فن میں ایک اور تبدیلی آئی۔ وہ کلاسیکی اسلوب میں حقیقت نگاری کے ساتھ تصویریں بنانے لگا پھر اسے تجریدی مصوری سے دلچسپی ہوگئی۔ وہ اس فن کا بھی امام قرار پایا۔ اس کے بعد اس نے کوزہ گری شروع کی اور اس میں بھی کمال دکھا دیا۔

وہ ایک ماسٹر تھا اور جس شعبے میں ہاتھ ڈالا اس شعبے میں ماسٹر ہی رہا۔ اس کی بنائی ہوئی امن کی فاختہ عرصے تک امن پسندی کی علامت رہی۔

پکاسو نے ایک بھرپور عمر پائی۔ بھرپور کام کیا۔ بھرپور شہرت حاصل کی اور دنیا پر اپنے ہنر کی چھاپ لگا کر 8 اپریل 1973 کو مر گیا۔

کہنے کو وہ ایک چھوٹے قد کا انسان تھا لیکن اس کا کام ایسا ہے کہ گردن اٹھا کر دیکھنے سے گردن ٹوٹ جاتی ہے۔

یہ تو چند لوگ تھے جن کے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ چھوٹے قد کے بے شمار قدآور اور بھی تھے۔

جیسے ہندوستان کے مہاتما گاندھی، ہالی ووڈ کا مشہور اداکار ٹام کروز وغیرہ۔

کہنا صرف یہ ہے کہ انسان چاہے جسمانی طور پر کیسا ہی کیوں نہ ہو اگر ذہنی طور پر بلند ہے تو پھر اس کے راستے میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں آسکتی۔ وہ ہر جگہ بلند ہی رہے گا۔

ضرورت صرف حوصلے اور مہارت کی ہے۔

یہ یوں ہی نہیں کہا گیا ہے کہ ''کسب کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی۔''

▼▼▼

سفر پہلا پہلا

ندیم اقبال

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ”نانگا پربت کا عقاب“ اور ”شمشال سے ٹورنٹو“ کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

UUNOVELS.COM

ایک نوجوان کے احساسات و جذبات میں گندھی سفر کہانی کا گیارہواں حصہ

ڈرائیور سے شوگران کا طے ہوا تھا۔ وہ ہمیں لے کر چوٹی پر پہنچا، اوپر بادل اترے ہوئے تھے۔ ہر طرف دبیز دھند چھائی ہوئی تھی۔ ایسی دھند تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اسی دھن میں کنول ہے۔ اگر دھند نہ ہوتی تو وہ مجھے نظر آجاتی میں کسی اندھے کی طرح ہو گیا تھا کہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ تبھی اپنی گلی کا مولا داد یاد آگیا جس کی بینائی بچپن میں چھن گئی تھی۔ وہ ریڑھی پر سبزیاں بیچتا تھا۔ لوگ ایمانداری سے سبزی لیتے اور رقم اس کے ہاتھ پر رکھ

دیتے صبح میں اس کی ریڑھی گھر کے باہر کھڑی رہتی۔ پرائمری کے بچے اسے ستانے کے لیے اس کی ریڑھی کو بھگا لے جاتے تب وہ اپنی لاٹھی ٹکاتا ان کے پیچھے آواز پر دوڑتا اس کی بے بسی میں بھول نہیں سکتا۔ اس کے گرد بھی تو ایسی ہی دھند ہوتی..... وہ اندازے سے لڑکوں کو ڈھونڈتا مگر ایک اندھا کس طرح سے ان کا سراغ پا سکتا تھا۔ لڑکے تو اسے دیکھ سکتے تھے مگر وہ اپنی دھند کے پار ان کو کیسے دیکھتا؟ جب تھک جاتا تو لاٹھی کے سہارے گلی میں بیٹھ کر رونے لگتا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر روتا تھا۔ اس کی زندگی کی واحد ساتھی اس کی وہ ریڑھی تھی۔ وہی اس کی زندگی تھی۔ وہی اس کی محبوب تھی اور وہی اس کی موت تک کی ساتھی بھی تھی۔ وہ اپنے محبوب کو دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس کے چاروں طرف اندھی دھند چھائی تھی۔ اسی کی طرح میری محبت بھی دھند میں لپٹی تھی اور میں اپنی بے بسی کی لاٹھی پکڑے چاک دل لیے بیٹھا تھا۔ میرا اور مولا داد کا دکھ ایک ہی تھا۔ وہ اپنی محبت پر دکھی رہتا تھا اور میں اپنی محبت کا درد لیے پھرتا تھا۔ مشترکہ جذبہ ہم دونوں کا اپنی اپنی شدت میں تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی شدت میں ناکام بیٹھے تھے۔ رویا وہ بھی تھا اور رو میں بھی رہا تھا۔ درد اسے بھی بہت تھا اور درد سے گھرا میں بھی تھا۔ ہم دونوں اندھوں کے گرد ہماری اپنی اپنی دھند چھائی تھی۔ مولا داد کی طرح مجھے بھی ایک دھند نے مہیب اداسی میں پھینک دیا۔ لطیف سوال کر کے خاموش بیٹھا تھا۔ خاموش میں بھی تھا کیونکہ کوئی ڈھنگ کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ میری حالت دیکھ کر لطیف خاموش ہو گیا۔ چاہتا تھا میں نہ کسی سے بات کروں اور نہ مجھ سے کوئی بولے۔ دھند سے لوگوں کے سنائی دیتے قہقہے مجھے کسی بھاری پتھر کی طرح لگ رہے تھے۔ سب رنگ اڑ چکے تھے اور زمین و آسمان پر دھند کا سیاہ رنگ چھایا تھا۔ میرے اندر جہاں خوشی کا چشمہ ابلتا تھا وہاں غم کی ندی چل پڑی تھی۔ کسی کو کھو دینے کا احساس میرے اندر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نہ مجھے کوئی دلاسہ چاہیے تھا اور نہ کوئی تسلی۔ میں اپنے دکھ میں اکیلا بیٹھنا چاہتا تھا۔ بخار کی تپش کی طرح دکھ کی کسک کا بھی ایک مزہ ہوتا ہے۔ ایک سے جسم جلتا ہے اور دوسرے سے دل سلگتا ہے۔

ان دنوں میری حالت بھی عجیب سی تھی۔ یہ حالت نہ تو میری سمجھ میں آ رہی تھی اور نہ میں اسے سمجھنا چاہتا تھا۔

غزالہ کی جدائی کا درد میرے رگ و پے میں پھیلا تھا۔ ہزار طرح کے جتن کرتا کہ اس کا خیال میرے دل میں نہ آئے۔ وہ بیاہ کر کسی اور کی ہو چکی ہے۔ میرے اس غم کا مداوا کہیں نہ تھا۔ میرا دل یہ حقیقت قبول کرنے کو تیار نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے غیر بن چکی ہے۔ اس کی جدائی کے دکھ کو کنول نے کم کر دیا تھا مگر جب کنول بھی کھو گئی تو کنول کے ساتھ غزالہ کے بچھڑنے کا احساس بھی شدت سے جاگ اٹھا۔

غزالہ مجھے قصوروار کبھی نہیں لگی۔ ہمیشہ خود کو قصوروار سمجھا یا تو میں نصیب کا برا تھا، یا پھر اس کا پیار میری اوقات سے بڑھ کر تھا۔ میری محبت میں کوئی کمی تھی جو اسے مجھ سے دور لے گئی۔ یہ محبت کے آبگینے میرے جھوٹ کی ٹھیس سے سلامت نہ رہ سکے تھے۔ مجھ سے ایسی لغزش ہوئی جس کا مجھے ادراک بھی نہ تھا۔ میں سمجھ بیٹھا تھا کہ اس کی محبت کے شادیانے تمام عمر یونہی گونجتے رہیں گے۔

ہمارا ناران کی جانب کا سفر شروع ہوا اور میں جیپ کی کھڑکی پر سر رکھے پڑا رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ شوگران کے علاوہ تمام راستہ اور ناران بھی دھند میں لپٹا ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا اور کوئی بھی نہیں جو میرا ہاتھ تھام کر مجھے میری راہ دکھا سکے۔ کھڑکی کے پار بھی مناظر پر نظر پڑتی تو لگتا یہ پہاڑ، آسمان اور برف، یہ سب رنج والم میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ویران نظر آتا کاغان راستے میں آیا۔ ہماری جیپ کے ٹائر اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ناران کے راستے میں ایک گلیشیئر نے راستہ روک رکھا تھا۔ کیچڑ اور دلدل سی بنی تھی۔ دوست گلیشیئر کے ساتھ کھڑے تصویریں بنوا رہے تھے۔ زبان سے گلیشیئر کی برف چاٹ رہے تھے۔ میں جیپ کے اندر بجھا بجھا سا بیٹھا تھا۔ ایک وسیع اور پھیلی ہوئی وادی تھی جس کے پہاڑ دور کھڑے نظر آ رہے تھے۔ مجھے لطیف نے گویا سوتے ہوئے جگایا کہ ناران آ گیا ہے۔

چھوٹا سا بازار تھا جس میں چند دکانیں تھیں۔ مختصر تعداد میں لوگ چہل قدمی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہماری جیپ بازار سے آہستگی سے گزرتی ہوئی وہ ہوٹل تلاش کر رہی تھی جس کا خط ایبٹ آباد میں کسی اجنبی دوست نے دیا تھا۔ پھر وہ ہوٹل ہم نے تلاش کر لیا جو بازار کے انتہائی آخر میں بائیں جانب واقع تھا۔ سامان اٹھایا اور مین دروازہ کھول کر سیدھا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ وہ مکمل لکڑی سے بنا چھوٹا سا ایک خوب صورت ہوٹل تھا۔ ڈائننگ روم کے

اختتام پر کاؤنٹر کے پیچھے ہمارا مطلوبہ آدمی کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے کچن تھا جس کے دروازے پر اندر آنا منع ہے لکھا تھا۔ دائیں جانب ایک راہداری چند گز بعد بائیں جانب مڑ رہی تھی۔ اس راہداری کے دائیں جانب کل ملا کر بارہ کمرے تھے۔ ہوٹل کے پیچھے بہتے دریائے کنہار کے پانی کی مسلسل گونج سنائی دے رہی تھی۔ ہوٹل کا مالک اور منیجر اکرام تھا جس کے نام خط تھا۔ اس نے رعایتی نرخوں پر ہمیں دو بڑے کمرے دیئے۔ سامان اٹھا کر میں ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامان لکڑی کے فرش پر پھینکا اور ایک پلنگ پر رضائی لپیٹ کر لیٹ گیا۔

☆......☆

اجنبی مقام کی اجنبی فضا میں ایسی نیند آئی کہ اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ خنک موسم ہو یا بارش برس رہی ہو، ایسے میں رضائی ڈالے سونا کسی نعمت سے کم نہیں۔ نوجوانی کے علاوہ فراغت اور بے فکری ہو تو ایسے موسم میں سونے کا ایک اپنا لطف ہے۔ میں اس موسم سے لطف اندوز ہوتا بے ہوش سا پڑا تھا۔ اتنے میں سائیں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

"لخ دی لعنت سب پر۔ بازار میں موجیں لگی ہیں اور یہ بھنگیوں کی طرح سو رہے ہیں۔"

معلوم نہیں سائیں کو نیند کیوں نہیں آتی۔ بقول فرید۔ "یہ سوتا کب ہے؟ ہم نے تو اسے ہمیشہ جاگتے یا خراٹے لیتے دیکھا ہے۔"

کوئی بولا۔ "سائیں سونے دے۔ نظارے کل دیکھ لیں گے۔"

سائیں غضب ناک ہو کر بولا۔ "اٹھتے ہو کہ نہیں۔ لتاں لتاں نال کرا دھا دوں گا۔ اس میں کون سا سریا بجری لگی ہے۔ ساری لکڑی ٹھوکی ہے۔ سستا کام۔"

پھر کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ سائیں نے میری رضائی ذرا سی کھینچی تو میں اندر سے بولا۔ "استاد جی! ناران کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ کیوں نیند خراب کر رہے ہو؟"

رضائی کھینچ کر میرے چہرے سے ہٹائی۔ "سارے کرتوت دیکھ رہا ہوں۔ ٹرپ کو تم نے فلم بنا رکھا ہے۔"

"کون سی فلم استاد جی؟"

"بتاؤ جیپ میں مجنوں بن کر کیوں بیٹھے تھے؟"

"وہی ایم پی اے ڈیپارٹمنٹ والی لڑکی یاد آ رہی تھی۔ مرشد سے بات کر کے لین سیدھی کرا دیں ناں۔ دل اداس اداس ہے۔"

سائیں بگڑ کر بولا۔ "تیرا علاج مرشد کیوں میں خود کرتا ہوں۔ یہ بتا ایم پی اے والی یا وہ یاد آ رہی تھی جو ایوبیہ میں ملی تھی اور پھر شملہ پہاڑی پر پیچھے بیٹھی پکوڑے کھلا رہی تھی۔"

میں ہکا بکا فوراً اٹھ بیٹھا۔ نیند میری اڑ گئی، ہولے سے بولا۔ "استاد جی اللہ کا خوف کرو کیوں ناحق الزام لگا رہے ہو۔ کسی نے سن لیا تو سب پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"زیادہ چخ چخ نہ کر، وہ بھی استاد کے سامنے۔" پھر ترچھی نظروں سے دیکھنے لگا۔ "سچ بتا میرے علاوہ بھی کوئی مرشد رکھا ہوا ہے۔"

"یہ خیال استاد جی کو کیسے آیا؟"

"حیران ہوں وہ ہر جگہ تمہیں مل کیسے جاتی ہے۔ نہ ایک دوسرے کو سگنل کس طرح سے مل جاتے ہیں۔"

میں بے پروائی سے بولا۔ "معلوم نہیں کس کی بات کر رہے ہو۔"

یہ کہہ کر رضائی اپنے اوپر کھینچنی چاہی تو سائیں نے پکڑ لی۔ نظریں اٹھا کر سوچنے لگا۔

"ڈیرہ کی نہیں ہے۔ ڈیرہ کی ہوتی تو کوٹ نہ پہنتی۔ وہاں کی بچیاں لاکھ فیشن کر لیں لیکن کوٹ نہیں پہنتیں۔ یہ بچی ملتان کی ہے یا لاہور کی۔"

میں نے آہستگی سے اسے کہا۔ "آہستہ بولیں۔ ستار کو پتا چل گیا تو چوگلے پر (ڈیرہ کا مرکزی چوک) بڑے بڑے اشتہار لگا دے گا۔ جانتے تو ہیں کہ باکھری بازار والے اسے ڈھول کہتے ہیں۔"

تب سائیں نے نیچی آواز میں پوچھا۔ "بچی ناران آ رہی ہے؟"

"کچھ معلوم نہیں کہ آ رہی ہے یا نہیں آ رہی۔" پھر ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ "کوئی وظیفہ یا دم درود بتائیں کہ یہاں کھنچی چلی آئے۔ نہیں دل لگتا استاد جی اس کے بغیر۔"

"تم لوگ تو تیار ہو کر باہر نکلو۔" یہ کہہ کر اٹھتے ہوئے رازداری سے بولا۔ "میں باہر دریا کنارے بیٹھ کر دس منٹ والی تسبیح پڑھتا ہوں۔ شملہ پہاڑی پر کہتے تو اور بات تھی۔ تم نے تو دیر کر دی ہے۔"

نکلتے نکلتے سائیں کہتا گیا کہ باہر سردی ہے اور ٹوپا مفلر کے بغیر نہیں نکلنا۔

گہری نیند اور سائیں کی باتوں نے میرے اندر کا غبار دھو ڈالا مگر کنول کے ذکر نے میرے اندر ایک بے چینی سی بھر دی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ ایبٹ آباد کے بعد یہاں ضرور

UUNOVELS.COM

آئے ہوں گے۔ اسے میں نے ناران میں تلاش کرنا تھا۔ یہاں وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتی تھی۔

غزالہ کی یاد کا کبوتر ایک لمبی پرواز کے بعد دل کے خانے میں بیٹھا غٹرغوں کر رہا تھا۔ جب پھڑ پھڑانے لگتا تو کنول اپنے نازک ہاتھوں میں اسے تھام لیتی۔ اس کے لمس میں وہ جادو تھا کہ وہیں اپنی آنکھیں موند لیتا۔

میں اٹھا اور باتھ روم میں ہاتھ منہ دھونے چلا گیا۔ صاف ستھرا باتھ روم جس کے نل سے نیم گرم پانی آ رہا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر بال بنائے اور آئینے میں خود کو دیکھنے لگا۔

یہ جانا پہچانا چہرہ سالوں سے ذرا سا نہیں بدلا تھا۔ جب سے اسے دیکھا یہ وہی کا وہی رہا۔ وہی آنکھیں، وہی نقوش اور وہی تاثرات۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ میں کلاس بدل بدل کر آگے نکل آیا اور یہ نہ بدلا۔ کبھی خوش ملا، کبھی اداس، کبھی لالچی اور کبھی دریا دل، کبھی سہما اور کبھی نڈر لگا۔ اس کو ہر زاویے سے دیکھا مگر اس کا کوئی زاویہ نہ بدلا۔ یہ اپنے کو تلاش کرتی آنکھیں پتھرا گئیں مگر اپنا کوئی کھوج نہ ملا۔ اس چہرے کو دیکھ کر کبھی ہنس پڑتا، کبھی حیرت سے دیکھتا، کبھی ندامت سے اور کبھی نظریں چرا کر دیکھتا۔ یہ میرا ہمیشہ سے یارِ غار رہا۔ میں خوش ہوا تو یہ کھل اٹھتا۔ دل بجھا تو یہ چہرہ بجھ گیا۔ اپنا علیحدہ ہی مزاج رکھتا رہا۔ کبھی اپنا لگا اور کبھی غیر سا۔ کبھی کسی کے دل میں اترا اور کبھی کسی کے دل سے اترا۔ کبھی اپنوں کے لیے غیر بنا اور کبھی پرایوں کو اپنا بنا لیا۔ کبھی محبت کی نظروں میں شاداب ہوا اور کبھی تیکھی نظروں سے زیرِ عتاب ہوا۔ کبھی آزردہ اور کبھی مضطرب ہوا۔ کبھی کسی کے آگے سوالی بنا اور کبھی کسی کے لیے سوال بن گیا۔ کبھی غم کے جھکڑوں نے اکھاڑ پھینکا اور کبھی معطر ہواؤں کے سنگ اڑا۔ مہینوں سالوں نے اپنے تھپیڑوں پر رکھا مگر میرے لیے نہ بدلا۔ خدوخال اس کے بدلے مگر خیالات نہ بدلے۔ یہ جانا پہچانا چہرہ سالوں سے ذرا بھی نہ بدلا۔ یہ کسی اور کا نہیں یہ میرا چہرہ تھا۔

☆......☆

میں کپڑے بدل کر باہر نکلا اور کھڑکی کے شیشوں کے پار دیکھنے لگا۔ دیکھ کر حیران ہوا کہ ایسی تو جگہ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ نہ تصویروں میں اور نہ خوابوں خیالوں میں۔ باہر کا منظر کھڑکی پر جیسے چسپاں تھا۔ سرمئی پہاڑوں پر ڈھلتے سورج کی سنہری کرنیں اتر رہی تھیں۔ برف کے سفید دھارے اوپر چوٹیوں سے نیچے دامن تک پٹیوں کی صورت بچھے تھے۔ ذرا دور دریائے کنہار بہتا چلا آ رہا تھا اور اس کے پانی کی گونج متواتر کانوں میں پڑ رہی تھی...... نیلگوں آسمان خاموش تھا۔ دریا کنارے سے لے کر بابوسر جاتے کچے راستے تک متعدد درخت سائے میں تھے۔ درختوں تلے سبز گھاس کے دبیز قالین بچھے تھے۔ اس گھاس کے قالینوں پر دور تک خودرو کاسنی، پیلے اور سرخ پھول پڑ رہے تھے۔ کھڑکی سے متصل ہوٹل کا باغیچہ تھا جس کی نرم گھاس پر لوہے کی سفید کرسیاں پڑی تھیں۔ باغیچے کے گرد باڑھی گلاب کھلا تھا۔ اس منظر نے مجھے ہپناٹائز کر رکھا تھا۔

اتنے میں باتھ روم سے تیار ہو کر ستار نکلا۔ مجھے محو دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں یکسوئی رکھے اپنی لے میں بولا۔ ''پہاڑوں سے پریوں کو اترتے دیکھ رہا ہوں۔''

''بکواس کر رہا ہے، دکھا مجھے کہاں پریاں ہیں؟'' وہ یہ کہہ کر مجھے ہٹانے کے بعد میری جگہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ جب نظر کچھ نہ آیا تو بغور دیکھنے لگا۔ ''طارق ٹھیک کہتا ہے تو نشہ کرنے لگا ہے۔''

میں ترخ کر بولا۔ ''چل اوئے نشہ کرنے لگا ہے......''

اس نے تو شور مچا دیا۔ ''طارق...... طارق...... اِدھر آ...... اس کا منہ سونگھ۔ بدبو سارے کمرے میں پھیلی ہے۔''

ہمارے کمروں کے درمیان الگ ہی باتھ روم تھا۔ آنے جانے کے لیے اسی راستے کو استعمال کر رہے تھے۔ طارق باتھ روم کے راستے سے ہمارے کمرے میں آ دھمکا۔ ستار اس سے کہنے لگا۔ ''کھڑکی میں کھڑا کہہ رہا تھا پریاں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے منہ سونگھنے کا کہا تو انکار کر دیا۔ لگتا ہے اس نے نشہ کیا ہے۔''

طارق بولا۔ ''منہ کھول۔''

میں ستار کو گھورتا رہا۔ طارق سے کہا۔ ''تو کشمیرن کے چکر میں اسے بھول گیا ہے۔ اب دیکھ یہ من مانیاں کرتا پھر رہا ہے۔''

''وہ تو تیری بات ٹھیک ہے مگر ابھی تو سو کر اٹھا ہے۔ نشہ کہاں سے کر لیا؟''

''اس کا سامان دیکھ۔ بوتل پڑی ہوگی۔''

طارق میری جانب دیکھنے لگا۔ میں اسے آنکھ مار کر بولا۔ ''کشمیرن آج کل میں آنے والی ہے۔ کیا خوب محفل جمے گی۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔ ''تم کو کیسے معلوم

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ہوا آج کل میں آنے والی ہے۔"

"پرسوں ٹھنڈیانی پر کہا تھا ناں کہ ایک دو دن میں ہم بھی ناران جا رہے ہیں۔"

طارق سن کر ستار سے بولا۔ "اسے تو پرسوں کی بات بھی یاد ہے اور تو کہتا ہے نشہ کیا ہوا ہے۔ مجھے تو آج کی بات بھی یاد نہیں رہتی۔"

"مگر یہ جو پریوں کا کہہ رہا تھا میں نے دیکھی ہیں۔"

"وہ تو شروع سے ایسا ہے۔ پاگل ہے۔ ہر وقت پریاں، پھول، بادل اور اسی قسم کی باتیں کرتا رہتا ہے۔"

طارق یہ کہہ کر دوبارہ باتھ روم کے راستے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ستار مجھ سے بولا۔ "طارق آج بگڑا نہیں۔ مزہ نہیں آیا۔"

☆......☆

ڈنر میں کچھ وقت پڑا تھا مگر ہم سب کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ لہٰذا ہم سب ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے چائے کے ساتھ آلو کے گرم اور فرائی کٹے ہوئے قتلے کھا رہے تھے۔ سائیں باہر کا چکر لگا کر واپس آچکا تھا۔ ہوٹل کا مالک اکرام اپنا کاؤنٹر چھوڑ کر ہمارے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ بے تکلفی کے انداز میں بیٹھنے سے وہ اجنبیت کی دیوار پھلانگ کر دوستی کے رشتے میں جڑ گیا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی اگر کہیں تو ایک اور کمرا بھی کھلوا دیتا ہوں۔ ابھی دو کمرے خالی پڑے ہیں۔"

سائیں مسکرایا۔ "خش کر دیتا ای جواناں۔ کوئی تکلیف نہیں جنڈڑی۔ امن ہی امن ہے۔"

"پھر بھی کچھ......؟"

دائیں ہاتھ کی ایک انگلی مونچھ پر پھیرتے ہوئے عیاش مسکرایا۔ "سب پر باش بجراوا۔ چنتا نہ کر۔"

امتیاز نے کہا۔ "ہمیں تو لگ رہا ہے کہ ٹرپ سے تھکے ہارے اپنے گھر میں واپس آگئے ہیں۔"

یہ سن کر اکرام خوش ہو گیا۔ "آپ لوگ میرے بھائی اور مہمان ہیں۔ ساتھ انعام کے دوست بھی ہیں۔ آپ کا خیال رکھنا تو میرا فرض ہے۔ بس آپ کوئی تکلف نہ کرنا۔"

"تکلف کیا جنڈڑی! چند دن یہاں آرام کریں گے۔ مرضی ہوئی تو گھوم لیں گے۔ مرضی نہ ہوئی تو پڑے ہیں۔ ہم تو ٹانگیں سیدھی کرنے آئے ہیں۔"

اکرم نے پوچھا۔ "ناشتا اور کھانا یہیں کریں گے یا باہر سے کھائیں گے۔"

"جنڈڑی! یہ تو غیروں والی بات کر لی۔ دل ہی ہمارا توڑ دیا۔ رہیں یہاں اور چائے پانی باہر سے؟" ہاتھ اٹھا کر سائیں نے میز پر مارا۔ "یہ خیال تیرے ذہن میں آیا کیوں؟"

اکرام شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ کوئی خاص فرمائش ہو تو بتا دیں۔ میرا خانساماں ہر ڈش بنا لیتا ہے۔"

"بس ایک خاص فرمائش ہے جنڈڑی۔" سائیں نے دائیں ہاتھ سے بائیں مونچھ کو بڑے پیار سے سہلایا۔

"جی جی فرمائیں۔"

مونچھ سہلانے کے بعد رازدارانہ لہجے میں ذرا آگے بڑھ کر بولا۔ "روٹی کڑک اتارنی ہے۔ مہک دریا تک نہ گئی تو سائیں کو مزا نہیں آئے گا۔"

فرید نے مشورہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "دریا ذرا دور ہے۔ فاصلہ کچھ قریب کر لیں؟"

"ناران میں چج نہیں اور اس ہوٹل میں تو بالکل نہیں۔" وہ پھر بھڑک اٹھا۔ "زیادہ بات کی تو گردن مروڑ کر ساتھ والے باغیچے میں قبر بنا دوں گا۔"

اکرام ہنس پڑا۔

میں نے پوچھا۔ "استاد جی! جوان کا کچھ اتا پتا؟ ایسا نہ ہو ابھی تک ٹھنڈیانی میں بیٹھا انتظار کر رہا ہو۔ نہ آیا تو سائیں اپنا نام ڈوب جائے گا۔"

ہاہا اس نے اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا۔ "تو بھی کملا ہے۔ میں یہاں ہوں اور وہ ادھر کیا پانڑ بیچ رہا ہے۔"

میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "آ گیا ہے؟"

"بس کے ساتھ بھاگا بھاگا آ رہا تھا۔ کیوائی میں جب آبشار میں نہا رہے تھے تو وہ سڑک پار بڑے پتھر کے پیچھے بیٹھا تھا۔ جب شوگران سے نیچے اترے تو مجھے اشارہ کر کے جیپ سے پہلے ناران پہنچ گیا۔"

"اور بندے؟"

"وہ اڑ کر پہنچے۔"

اکرام ہمارے چہرے دیکھ رہا تھا۔ حیران تھا کہ ہم کس کی بات کر رہے ہیں۔ "کون اڑ کر آیا ہے۔ آج تو کوئی ہیلی کاپٹر نہیں اترا۔"

اس بار سائیں نے تین بار ہاہاہا کر کے قہقہہ بلند کیا۔ میں نے اکرام کو حیرت کے سمندر میں سے نکال کر دوبارہ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

اس میں پھینک دیا۔ "سائیں کے چند مہمان دریا پر اترے ہیں۔"

"کمرے خالی پڑے ہیں۔ انہیں ادھر کیوں نہیں بلوا لیتے۔ دریا پار جنگل کا علاقہ ہے۔"

"اکرام بھائی! وہ آبادی سے دور رہتے ہیں اور یہی بہتر ہے کہ وہ دور دور رہیں۔" پھر اسے ڈرانے کے انداز میں اپنا سر ہلانے لگا۔ "اگر وہ غلطی سے بھی دریا پار کر کے ادھر آ گئے تو اکرام بھائی قسم سائیں کے مرشد کی۔ ناران میں سائیں کے علاوہ نہ آدم ہوگا اور نہ آدم زاد۔"

اکرام حیران بیٹھا میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

میں نے سائیں سے درخواست کی۔ "اکرام کو بتا دیتے ہیں۔ آج نہیں تو کل یہ راز ویسے بھی کھل جائے گا؟"

"جنڈڑی پھر بتا دے۔ اب اس سے کیا چھپانا۔ یہ بھی تو اپنا بندہ ہے۔"

میں نے فرید سے کہا۔ "یار اب آگے تو بتا میں چائے ختم کر لوں۔"

اس کے بعد فرید شروع ہو گیا۔ "سائیں سندھ کے ایک بہت بڑے پیر کے بہت بڑے خلیفہ ہیں۔ یہ خود بڑی بڑی کرامات رکھتے ہیں۔ ان کے مرشد پر تو اوپر والے کا خاص کرم ہے۔ انہوں نے سائیں کے علاوہ ہم سب کی حفاظت اور مشکل حالات میں مدد کے لیے ایک چیتا اور دو عدد جن بھیجے ہیں۔ سائیں نے انہیں دریا کے ادھر آنے سے منع کر رکھا ہے۔"

اکرام بے تاثرات لیے سائیں کی جانب دیکھنے لگا۔ سائیں نے آہستگی سے سر ہلا کر فرید کی تصدیق کی اور اکرام کو کہا۔ "اس راز کو راز رکھنا تمہارا فرض ہے۔ اگر ناران میں کسی کو اس بات کا معلوم ہو گیا تو ایسی افراتفری پھیلے گی کہ کرفیو لگا کر بھی نہیں رکے گی۔"

اکرام کچھ دیر تو سوچتا رہا پھر سائیں سے بولا۔ "یہاں سے واپس تو چلے جائیں گے؟"

"ہاں جنڈڑی! مجھے ویگن پر بٹھانے کے بعد اڑ جائیں گے۔ صرف چاچا محمد شفیع ساتھ رہے گا۔" اکرام مزید گھبرا گیا۔

فرید نے سائیں سے پوچھا۔ "چاچا ہے کہاں؟"

سائیں اشارہ کر کے بولا۔ "سامنے کونے میں بیٹھا ہے۔"

اکرام کونے میں دیکھ کر بولا۔ "یہاں کون بیٹھا ہوا ہے؟"

فرید بتانے لگا۔ "سائیں کے ساتھ چوبیس گھنٹے ایک بزرگ بھی رہتے ہیں۔ ایسا سمجھیں چاچا شفیع سائیں کا سایہ ہے۔" اکرام پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا۔

ان کی یہ گفتگو جاری تھی اور میں دروازے کے شیشوں کے پار پکی سڑک کو دیکھ رہا تھا جو ویران پڑی تھی۔ وہاں شام کا سایہ سرکتا ہوا چھا رہا تھا۔ میرے اندر کسی کی لگن تھی، کچھ اداسی اور کچھ سرشاری تھی۔ کسی کی آنے کی اُمید کے ساتھ نہ آنے کا ڈر بھی تھا۔

میں ڈائننگ ہال کو دیکھ رہا تھا۔ آٹھ دس میزیں رکھی تھیں۔ دیوار پر سیف الملوک اور لالوسر لیک کے علاوہ بابو سر ٹاپ کی تصویروں کے فریم آویزاں تھے۔ ناران مری اور نتھیا گلی سے بہت زیادہ مختلف تھا۔ اس میں جو کشش تھی وہ کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔

☆......☆

ہم اکرام کو حیران و پریشان چھوڑ کر باہر نکلے تو وہیں پہلی بار ناران کو اس کی کھلی فضا میں آ کر طریقے سے دیکھا اور محسوس کیا جو محسوس میں نے اس دن کیا تھا۔ اس کا یقین بعد میں ہوا کہ ناران دنیا کے خوب صورت علاقوں میں سے ایک ہے۔

اس وادی نے شام کے ملگجے اندھیرے میں میرے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں سحر میں گرفتار کھڑا ہر جانب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ناران نہیں بلکہ میرے خوابوں کی سرزمین تھی۔ میں اس کی فضا میں گہرے سانس لے کر اس کے نظاروں کو تکتا اور وہاں کا ماحول دیکھ رہا تھا۔ برف سے ڈھکی بلند پہاڑوں کی چوٹیاں خاموش کھڑی تھیں۔ شام کے جادوئی ماحول میں پہاڑوں کی برف چمک رہی تھیں۔ گہرے نیلے آسمان پر چاند اٹھ رہا تھا۔ چاند کے ارد گرد کچھ سفید اور اجلے بادل ٹھہرے تھے۔ ذرا آگے دریائے کنہار ایک چوڑے پاٹ میں گہری گونج کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ بازار میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پھیر رہے تھے۔ اطراف میں چند دکانیں اور کچھ ہوٹل تھے۔ سیاح خراماں خراماں بازار میں چل رہے تھے۔ کچھ جیپیں ہمارے ساتھ پارک تھیں اور دور کوئی دل جلا بانسری پر مدھر دھن بجا رہا تھا۔

یہاں ہر منظر جم چکا تھا اور وقت کا دریا تھم گیا تھا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

زندگی کا جھولا جو تیز رفتاری سے گھوم رہا تھا، اچانک آہستہ ہو گیا۔ دماغ کی سوچیں دھیمی پڑ گئیں اور سکون کے بیکراں سمندر نے اپنی موجوں پر مجھے لے لیا۔ لوگ دھیرے دھیرے آرام اور دھیان سے گھوم رہے تھے۔ سارا نظام قدرت سلو موشن میں آ گیا۔ میں دیکھ زیادہ رہا تھا اور سوچتا کم تھا۔ ہر ساعت کو، ہر منظر کو اپنے ذہن کے پردے پر منقش کر رہا تھا۔ دماغ پکے رنگوں سے دائمی تصویر بنا رہا تھا۔ میرا ماضی جو بلند پہاڑوں کے پیچھے کہیں رہ گیا تھا وہ بھولنے لگا۔ یاد رہی تو وہی رہی جو میرے ساتھ ساتھ تھی۔ میں کسی تند و تیز ندی میں بہتا بہتا ایک پُرسکون جھیل میں آ اترا تھا۔

یہ مقام میرے دل میں مکان بنا بیٹھا۔ یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں کوئی ذرا دیر کے لیے آئے اور اگلے روز لوٹ جائے۔ یہ تو ایسی جگہ تھی جہاں آپ آئیں اور پھر دنیا سے چھپ کر یہاں پناہ لے لیں۔ جو چاہے جتنا ڈھونڈے مگر ڈھونڈ نہ سکے۔ یہاں کی ہواؤں میں تادیر سانسیں لیں اور خوشی بھری ہواؤں میں دن گزاریں۔ دماغ کے دروازے بند کر کے دل کی کھڑکیاں کھول دیں جس مقام نے مجھے پہلی نظر میں بے حد متاثر کیا، ناران ان میں سرفہرست ہے۔

یہ ایک وسیع وادی ہے جو کالام کی طرح تنگ نہیں اور مری، نتھیا گلی کی طرح بے آب نہیں۔

وہیں پہلی بار میں نے شمالی منظر پر چھائے بابوسر ٹاپ کے برفانی پہاڑوں کا سلسلہ دیکھا اور میرا دماغ اس منظر کی خوب صورتی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں یقین اور گمان کے درمیان بھٹکنے لگا تھا۔ ازلوں سے پھیلی تنہائیوں میں کھڑے پہاڑ کسی طلسم کدے کا حصہ لگتے تھے۔ وہ شام کے وقت چمکتی برفانی بلندیاں اپنی ہیبت سمیت میرے اندر آ سمائیں۔ دوستوں کے میرے گرد گونجتے قہقہے دب گئے۔ میں اس برفانی منظر کو بے یقینی میں کھڑا دیکھتا جا رہا تھا۔ میرا پہلا پہلا سفر کئی حیرتوں میں گھرا سفر تھا۔ ہر دن میرے ساتھ کوئی نیا تجربہ ہو رہا تھا۔ ہر روز میرے لیے کوئی ایسا منظر یا کوئی ایسا واقعہ لاتا جس سے میں محویت میں گھرا کھڑا رہ جاتا۔

ہم اپنا علم اور شعور اسکول کی کتابوں سے حاصل کرنا شروع کرتے ہیں۔ اسکول کے جغرافیہ میں پاکستان کے بلند پہاڑوں کے بارے میں مختصر سا پڑھا تھا مگر کسی کی تصویر ہم نے نہیں دیکھی تھی۔ صرف کے ٹو پہاڑ کی تصویر کے ٹو سگریٹ کی ڈبیا پر تھی اور سگریٹ کی ڈبیا کو بھی غور سے دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا پاکستان کی برف پوش بلند پہاڑی چوٹیوں کا جب کوئی تذکرہ ہوتا تو ذہن ایکدم جست لگا کر کسی خیالی دنیا میں پہنچ جاتا۔ میرے ذہن میں صرف یہ رہا کہ برف سے ڈھکے پہاڑ صرف تصورات کی حسین اور رنگین دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اگر حقیقت ہوتے تو ان کی تصاویر بھی دستیاب ہوتیں۔ لہٰذا میں جب بھی اپنی کسی خیالی دنیا کا خاکہ بناتا تو اس میں جھیلیں، جزیرے، پرندے، جنگل اور برفانی پہاڑ ہوتے۔ مگر جب آج برف سے لدے پہاڑ اپنی آنکھوں سے دیکھے تو دماغ تصوراتی دنیا میں پہنچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں کسی خیالوں خوابوں کی دنیا میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا ہوں۔ ناران جیسے ہماری زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ کسی اور جہاں کا حصہ ہے۔ ناران کا علاقہ میری ایک فینٹیسی رہی۔ میں نے دوسرے پہاڑی مقامات کو زمین پر قدم رکھ کے دیکھا مگر ناران کے مناظر کو کسی بہشت میں کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ میں ناران کے پہلے ٹرپ کو بھول ہی نہیں سکتا کیونکہ اسے میں نے جیسے عالم خواب میں دیکھا تھا۔

ناران کی ہواؤں میں کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے میرا دل وہیں کھو گیا ہے۔ کسی نے اسے چرا لیا ہے۔ کوئی ہے جو مجھ سے دل لینے دل دینے کا کھیل کھیل رہا ہے۔

دل کر رہا تھا مجھے پر لگ جائیں اور میں ان بلندیوں کے بیچ پرواز کرتا پھروں۔ کاش مجھے ایسی زبان ملے کہ یہ ساری خاموشیاں مجھ سے ہم کلام ہوں۔ کوئی ایسا زخم ملے جس کا مرہم اس فضا میں ہو۔ وہ آنکھ ملے جو ان چوٹیوں پر معجزات اترتے دیکھے۔ مجھے وہ احساس ملے کہ یہاں کی دنیا ہمیشہ محسوس کرتا رہوں۔

میں خود سے بیگانہ کھڑا اس عالم حیرت کو دیکھ رہا تھا۔

لطیف میرا کندھا ہلا کر بولا۔ ”سب آگے نکل گئے ہیں اور تم کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟“

”یار! سوچ یہ رہا ہوں کہ دنیا میں اس سے خوب صورت مقام بھی کوئی ہوگا۔“ اتنے میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کہیں سے آیا اور میں نے کندھے پر رکھی جیکٹ پہن لی۔

لطیف کہنے لگا۔ ”کیا خوب صورت اور پُرسکون جگہ ہے۔ ہر چیز انوکھی اور دوسری جگہوں سے مختلف ہے۔ لوگ بھی اور طرح کے نظر آتے ہیں۔ نہ کسی چہرے پر غصہ ہے نہ رنج نہ دکھ اور نہ کوئی افسوس ہے۔ ہر ایک مطمئن اور خوش خوش ہے۔ دیکھو ہر کوئی کتنے مزے سے رک رک کر چل رہا ہے۔ نہ رش ہے، نہ سائیکل کی گھنٹی اور نہ موٹر سائیکل کی پھٹ

UUNOVELS.COM

پھٹ۔"

میں بولا۔ "زمین بھی یہاں کی مہربان اور آسمان بھی مہربان ہے۔"

ہم سڑک کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئے۔

وہ سگریٹ کا دھواں منہ سے فضا میں چھوڑنے کے بعد بولا۔ "کیا معلوم کنول بھی یہاں آئی ہوئی ہو۔"

"خوب صورت جگہ دیکھ کر دل کرتا ہے کہ وہ بھی یہاں ہو۔ وہ یہاں ہوئی تو ناران کے ساتھ اس کی اپنی خوب صورتی بھی بڑھ جائے گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر سجتے ہیں۔"

اتنے میں سائیں ہوٹل کی جانب تیزی سے جاتا ہوا ہمارے آگے سے گزرا۔ اتنی جلدی میں تھا کہ ہم پر نظر نہیں پڑی۔ میں اسے روک رہا تھا کہ لطیف بولا۔ "جانے دو، معلوم نہیں کس جلدی میں ہے۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ کتنا مخلص اور بے ضرر انسان ہے کہ کسی سے نہ کوئی طمع ہے اور نہ لالچ۔ اپنی باتوں سے ہر ایک کا دل بہلائے رکھتا ہے۔"

لطیف سوچتے سوچتے کہنے لگا۔ "یہاں بھکر والا تیل لے آتا۔ دیکھتے کہ ہر جانب کیسی مہک ہوتی۔"

"بھکر والی کیا بہت یاد آرہی ہے؟"

"اس جگہ کو دیکھا تو یاد آنے لگی ہے۔ وہ ساتھ ہوتی تو میں دریا کنارے اس کے ساتھ اکیلا بیٹھا ہوتا۔ ٹھنڈی ہوا میں اس وقت دریا کے کنارے بیٹھنے کا ایک اپنا مزہ ہوتا۔ یار ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے ہیں۔ پکی پل بننے والی ہے۔ میں تو ہر جمعے اس سے ملنے جاؤں گا۔"

اسے چھیڑتے ہوئے میں نے کہا۔ "جو قبرستان کے ساتھ رہتی ہے اسے یہاں لے آتا؟"

سگریٹ زمین پر پھینکتے ہوئے بولا۔

"تیری تو سوئی ادھر پھنسی ہے۔ بات کسی کی بھی ہو رہی ہو تو ہمیشہ اسے درمیان میں لے آتا ہے۔ کیسے کیسے خوب صورت خواب دیکھ رہا تھا اور تم نے سب کا ستیاناس کر دیا۔ بات بھکر والی کی کر رہا ہوں اور تو وہی...... کہ قبرستان والی کو ناران لے آتا؟ کتنی بار تم کو بتاؤں گا کہ اس کی منگنی ہو گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تو قبرستان والی کے ذکر پر اتنا چڑتا کیوں ہے؟"

وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں چڑتا نہیں تو اس کا ذکر علیحدہ سے کر لیا کر مگر بھکر والی سے کیوں ملاتا ہے، میں نے کبھی غزالہ کی کہانی میں کنول کا ذکر کیا؟ چار دن متواتر چپ کر کے اس کی کہانی سنتا رہا مگر ایک بار بھی تمہارا ذہن دوسری جانب نہیں بدلا۔"

"کئی بار تو نے غزالہ کی کہانی میں کنول کا ذکر کیا ہے۔ اب مکرتا کیوں ہے؟"

وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ "اگر ذکر کیا تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے تو نے تو اچھا بہانہ کیا ہوا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا عکس ہیں اور وہ اس کی محبت کی تجدید کرنے آتی ہے۔ ایک کا ذکر ہو تو دوسری کو کہانی میں ڈال دیتا ہے اور دوسری کا کروں تو پہلی کو ڈال دیتے ہو، جو بھی ہو جائے تمہاری کہانی چل رہی ہے۔ کبھی کشتی میں ایک کو بٹھا دیتے ہو اور کبھی دوسرے کو۔ بانسری رکی کبھی نہیں بلکہ مسلسل بج رہی ہے۔"

پھر ہم دونوں کے فلک شگاف قہقہے بیک وقت بلند ہوئے اور چلتے لوگ ہمیں رک کر دیکھنے لگے۔

نظر پڑی تو تیزی سے واپس جاتا سائیں بھی ہمارے قہقہوں پر رک گیا تھا۔ لپک کر ہماری جانب آیا پُرجوش لہجے میں بولا۔ "کہاں کہاں جنتڑی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ ہوٹل گیا وہاں بھی نہیں تھے۔ اب واپس ڈھونڈنے جا رہا تھا۔"

لطیف نے پوچھا۔ "کیا چیتا بازار میں تو نہیں گھس آیا؟"

"دل تو کرتا ہے کہ واقعی یہاں فنا کر دوں تم کو۔ کام کی بات میں بھی چخ چخ۔ یہ بتانے آیا تھا کہ دس منٹ والی تسبیح کام کر گئی۔"

"کیا مطلب کام کر گئی؟"

"دریا کے کنارے عصر پڑھی اور پھر دس منٹ والی تسبیح پھیری۔ اب دیکھ دو گھنٹے میں ایوبیہ والی بچی کو ناران میں حاضر کر دیا۔"

میں پتھر سے جست لگا کر کھڑا ہو گیا۔

سائیں نے بات جاری رکھی۔ "بتا اپنے استاد کی کرامات سب کو۔" میرے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "چلو سب کو نہیں ٹلنے کو تو بتا۔"

بے چینی سے میں نے پوچھا۔ "وہ ہے کہاں؟"

"بازار میں گھر والوں کے ساتھ ادھر ہی آرہی تھی۔"

پھر مجھ سے پوچھا۔ "یہاں سے نہیں گزری؟"

"استاد جی یہاں سے گزرتی تو میں یہاں بیٹھا ہوتا؟"

میں تیزی سے بازار کی جانب جانے لگا تو سائیں نے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

بازو سے پکڑ کر مجھے روک لیا۔ ''جنڈری! خیال اور عزت سے۔ ماں باپ ہمراہ ہیں۔ لطیفے کے علاوہ کسی کو پتا نہ چلے۔ شاباش جا اور آکر رپورٹ دے۔''

مجھے یہ خدشہ تھا کہ وہ اپنے ہوٹل میں نہ چلے گئے ہوں۔ معلوم نہیں وہ کس ہوٹل میں ٹھہرے تھے اگر اندر چلے گئے ہیں تو میں کہاں کہاں اسے تلاش کروں گا۔ ہر ہوٹل میں جاکر کیا ان کے رجسٹر چیک کروں گا؟ میں شدید پریشانی کے عالم میں لطیف کے ساتھ تقریباً بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔

میں اس کی ناران میں موجودگی پر حیران ہونے سے زیادہ اس کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ یہ ٹرپ جتنا مجھے حیران کرسکتا تھا وہ کرچکا تھا۔

☆......☆

میرے قدم زمین میں گڑ گئے جب میں نے اسے ڈرائی فروٹ کی دکان پر گھر والوں کے ہمراہ کھڑے دیکھا میں بت بنا اسے تک رہا تھا۔ وہ اس انداز سے کھڑی تھی کہ اس کا آدھا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ کوٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے خاموش کھڑی تھی۔

اسے دیکھتے ہوئے اچانک میرے اندر ایک طوفان سا اٹھنے لگا پھر لگا یہ کنول نہیں غزالہ ہے۔ وہی کھڑے ہونے کا انداز جیسے بے پروا مگر جم کر کھڑی ہے۔ اسی کی طرح بے غرض مگر لگتا ہے کسی دھیان میں ہے۔ ویسی ہی لمبی گردن جس پر اس کا چہرہ چمک رہا ہے۔ وہی گہری سیاہ آنکھیں جو تکنے لگتیں تو جھپکتی نہیں۔ وہی ناک ہونٹ اور وہی چہرے کی تراش۔ وہ پیشانی اور وہی سراپا۔ اسی کی طرح گھنے بال اور وہی سنبھال کر باندھنے کا انداز۔ مسکرائے تو حیران کردے۔ محبت سے دیکھے تو مالا مال کردے۔ جس سے پیار کرے اسے اپنے زمین و آسمان بخش دے اور بازوؤں میں آئے تو تشنگی بڑھا دے۔

آج مجھے موقع ملا تھا کہ اسے چوری چھپکے جی بھر کر دیکھوں اور دیکھتا چلا جاؤں۔ اس پر چھائی کھوئی کھوئی کیفیت نے اس کے حسن کو بے مثال کردیا تھا۔

''تو ادھر ٹھہر میں کچھ لے کر آتا ہوں؟'' لطیف یہ کہہ کر ڈرائی فروٹ کی دکان کی جانب بڑھ گیا۔

وہاں والدین کے ساتھ کول کھڑی دکان کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کی چاہت میری نس نس میں دوڑنے لگی۔ ناران اس کی موجودگی میں کہیں زیادہ خوب صورت دکھنے لگا تھا۔ ہوائیں، فضائیں، آسمان و زمین سب کچھ اچانک ہی بدل گئے تھے۔ جیسے چاروں طرف راگنیاں بجنے لگی تھیں۔ ایک چاند آسمان پر اور دوسرا زمین پر چمک رہا تھا۔

اسے ناران میں دیکھ کر مجھے قطعی کوئی حیرت نہ ہوئی۔ حیرت تو تب ہوتی جب وہ یہاں نہ ہوتی۔ یہ یقین تو شملہ پہاڑی پر میرے اندر جڑ پکڑ بیٹھا تھا کہ وہ اب ناران میں بھی مجھے ملے گی۔ ہر جگہ ساتھ ساتھ چلی آرہی تھی تو یہاں کیوں کھو جاتی؟ مجھے اس کے ردِعمل کا انتظار تھا جو مجھے دیکھ کر اس نے دینا تھا۔

لطیف اس کے سامنے کھڑے ہوکر دکاندار سے باتیں کرنے لگا۔ وہ پہلے تو اسے بے یقینی کے عالم میں کھڑی دیکھتی رہی۔ کئی لمحے گزر گئے اور وہ نہ چلی پھر اچانک چاروں جانب کسی کو ڈھونڈنے لگی۔ میں اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب مجھ پر نظر پڑی تو آنکھیں وہیں ٹھہر گئیں۔ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے گم ہوئی کوئی قیمتی چیز اس نے پالی ہو۔ خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ اس پر چھائی مسرتیں دیکھ کر مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ میرے اندر ساری خوشیاں مجھے مبارک بادیں دینے لگیں۔ پیار کا اظہار کرنے کے لیے وہ مجھے سینکڑوں خط لکھتی۔ گھنٹوں اپنی محبت کا یقین دلاتی، کئی نظمیں اور غزلیں لکھ ڈالتی پھر بھی وہ اس طرح اظہار نہ کرسکتی جو اس کا چہرہ کر رہا تھا۔ جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو

''تو بدن ہے میں ہوں چھایا
تو نہ ہو تو میں کہاں ہوں
مجھے پیار کرنے والے
تو جہاں ہے میں وہاں ہوں
ہمیں ملنا ہی تھا ہمدم
کسی راہ بھی نکلتے
یہ کہاں آگئے ہم یونہی ساتھ ساتھ چلتے''

میری طرح ایک ناقابل یقین افسانہ اس کی زندگی پر بھی اتر رہا تھا۔ وہ بھی سوچ رہی ہوگی یہ کیسے راستے ہیں جو گھومتے پھرتے پھر سے ایک راستہ بن جاتے ہیں۔ ہمارا ہر دن اور ہر لمحہ ایک دوسرے سے مل گیا ہے۔ ہماری حیرتیں اور کیفیتیں یکساں ہوگئیں۔

ہم اپنی کیفیت دوسرے کے چہرے پر پڑھ رہے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں جیسے پڑھا اور سمجھا کر ملا ایسا تھا کہ ہم آشنا تھے، اجنبی نہ تھے۔ میں بھی سوچتا یا

UUNOVELS.COM

اللہ یہ کیا اسرار ہے۔ یہ کیا ناطے ہیں جو بنے بھی نہیں مگر ہمیں جوڑ گئے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کیا ہر مسافر کو اپنے پہلے سفر میں ایسے ہی واقعات پیش آتے ہیں یا میرے ساتھ یہ سب ہو رہا ہے۔

میں نے کسی عقیدے کی طرح یہ خیال پکا کر لیا تھا کہ کنول اور غزال کسی ایک وجود کے دو نام ہیں۔ اگر میں آگے بڑھ کر اسے گلے بھی لگا لوں تو اسے ہرگز حیرت نہ ہوگی کیونکہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔

میں اسے دیکھ کر مسکرایا تو کوئی آسمانی چھب اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ ایک ساتھ مسکرائے تو زمین و آسمان مسکرا پڑے۔ شام کی نیم تاریکی میں اس کا چہرہ چاند کی مانند چمکنے لگا تھا۔

میں نے سوچا کہ ان کے والدین کو سلام کر لوں۔ نتھیا گلی کے قریب گاڑی میں انہوں نے لفٹ دی تو ایک طرح سے واقفیت بن گئی تھی۔ میں ان کی جانب بڑھا تو اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ شاید سمجھی کہ اس سے بات کرنے آ رہا ہوں۔ پھر جیسے ڈٹ گئی۔ نہ جھجکی اور نہ چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ اپنی جگہ اعتماد سے کھڑی مجھے للکارتی رہی کہ ہمت ہے تو آ کر بات کرو۔ اس کا یہ عزم مجھے اچھا لگا۔ اس کے قریب سے گزرا اور وہ اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں مسکرا کر اس کے والدین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''السلام علیکم!'' اس کے والد نے حیرت سے مجھے دیکھا اور سلام کا جواب دے کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''ہاں میاں ناران کب آئے؟''

انہیں بتایا کہ آج ہی پھر پوچھا۔ ''آپ کیا پورا ملک دیکھنے نکلے ہیں۔ لگتا ہے اس کے بعد بابو سر کو کراس کرنے کا پروگرام ہے؟''

وہ ہنس کر بولے۔ ''اس کے بعد آگے کیوں نہیں جانا۔ ٹرپ لمبا ہو گیا ہے اور میں بھی تھک چکا ہوں۔ یہاں کچھ دن رہ کر آرام کریں گے اور پھر گھر کو واپسی ہے۔''

''سر! آپ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں؟''

اپنی بیوی کی جانب دیکھ کر وہ مسکرائے۔ ''ہاں میاں ہنی مون پر یہاں آئے تھے۔ ان دنوں تو ایک دو ہوٹل اور چند دکانیں تھیں۔ اب تو بڑی رونق ہو گئی ہے۔'' پھر مجھ سے پوچھا۔ ''تم لوگوں کا ٹرپ ابھی ختم نہیں ہوا؟''

''وہ تو بارہ گلی کے بعد ہو گیا تھا۔ ہمیں چھٹیاں بھی ہیں اور امتحانوں سے ابھی فارغ ہوئے تو پڑھائی کا بوجھ بھی نہیں تھا۔ یونیورسٹی سے کچھ زیادہ پیسے مل گئے تھے۔ سوچا کہ موقع ہے ناران دیکھ لیں پھر معلوم نہیں کب چانس ملتا ہے۔''

پھر کنول کی ماں سے اس کا حال احوال پوچھا۔

میری تسلی یہ سن کر ہو گئی تھی کہ وہ کچھ دن ناران میں ہیں۔ وہ کسی بھی ہوٹل میں ٹھہرے ہوں تو گویا نظروں کے سامنے تھے۔ میں خوش و خرم کھڑا اس کے والدین سے باتیں کر رہا تھا۔ کنول اپنی بہن کومل کے ساتھ کھڑی ہمیں سن رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''انکل! مجھے لگتا ہے میں دوستوں کے ہمراہ نہیں آپ لوگوں کے ساتھ ٹرپ پر آیا ہوں۔ ہر جگہ آپ لوگوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔''

وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ اس کے والد نے کہا۔ ''ہمیں بھی یہی لگ رہا ہے۔''

ان لوگوں سے میں نے خود کو علیحدہ کر لیا۔ میں ان کی فیملی میں زیادہ مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

والدین چلے تو کنول بھی چل دی۔ میرے بالکل پاس سے گزر کر گئی تھی۔ اس سے آتی خوشبو میری سانسوں میں جذب ہو گئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے چل رہی تھی۔ چلتی چلتی رک جاتی اور رک کر تیز چلنے لگتی۔ لگتا تھا مجھ سے تو فاصلہ گھٹانا چاہتی ہے مگر والدین سے بڑھانا بھی نہیں چاہتی۔

ہم بھی ٹہلنے کے انداز میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ آہستہ ہوئی اور مجھ کو پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دیکھ کر اپنی مسکراہٹوں سے مجھے نوازا اور پھر سے چل دی۔ کیا دلآویزی اس کی مسکراہٹوں میں تھی کہ میں ہواؤں میں اڑنے لگا۔ میرے ہر جانب شہنائیاں بج رہی تھیں۔ پیار کی کشش نے مجھے اس سے باندھ رکھا تھا۔

ناران میرے لیے ایک دم جنت کا ٹکڑا بن گیا۔ سوچتا یہاں آتے اور یہاں سے نکلتے راستے معدوم ہو جائیں۔ نہ کوئی یہاں داخل ہو سکے اور نہ کوئی باہر جا سکے۔ ساری زندگی میری اس کے ہمراہ یہیں بسر ہو جائے۔ مجھے کنول کے ساتھ ساتھ ناران سے بھی پیار ہو گیا۔

ہم نے ان کا پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا اور بازار میں رک گئے۔ ہمیں معلوم تھا وہ مڑ کر واپس یہیں سے ہی گزریں گے۔ بازار میں ہوٹل، ریسٹورنٹ، چائے خانے، لانڈری، میوزک، گرم ملبوسات، بیکری وغیرہ کی دکانیں تھیں۔

UUNOVELS.COM

خواتین کا رش کشیدہ کاری کے ملبوسات پر تھا۔ نوجوان چائے خانوں پر بیٹھے تھے۔ مرد بچوں کو سنبھالتے پھر رہے تھے۔ ایک میلہ سجا تھا جس میں لوگ شور نہیں کر رہے تھے۔

شام پر رات اچانک آ جھپٹی تو بلند پہاڑ چاندنی میں چمکنے لگے۔ زمین، آسمان اور ساری فضا منور ہو گئی۔ تارے جھلمل کرنے لگے تو ناران کے آسمان پر چراغاں ہو گیا۔ مجھے لگا میں ہی نہیں ہر ایک مدہوش ہو کر چل رہا ہے۔ چاندنی کے رتھ متواتر آسمان سے زمین پر اتر رہے تھے۔ چہار جانب جادو چھایا تھا اور اس نے ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اتنے میں وہ سامنے سے آتی نظر آئی۔ اس کو دیکھا اور سوئے نغمے گونج اٹھے۔ اس کے چہرے پر سیاہ بالوں کی لٹ جھول رہی تھی۔ ایسا لگا چاند کالی بدلی کی اوٹ میں آ گیا ہے۔ چاند چھپا مگر چاندنی مدھم نہ پڑی۔ روشنی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی غزالہ میرے آگے اپنی ہتھیلیاں لہرا کر پوچھے گی کہ یہ مہندی پھیکی تو نہیں پڑ رہی۔ ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر دوسرے ہاتھ کی چوڑیاں کھنکھناتی کہے گی، لاؤ میرے خط کا جواب۔ بولوں گا جواب تو نہیں ہے تو آنکھیں نکال کر غصے میں کہے گی کہ تم ہو اپنے بھائی کی طرح ظالم۔ مجھے معلوم تھا یہی کرو گے مگر میں ہوں ہی پاگل جو ایک بے وفا پر مرمٹی ہوں۔ کنول بھی غزالہ کی طرح ایک پل خفا ہو کر دوسرے پل گلے لگ جائے گی۔ غصے میں گھور کر دیکھے گی اور اگلے لمحے راہ میں پلکیں بچھا دے گی۔ اس کی محبت ہر پل نئے رنگ میں نظر آئے گی۔

اتنے میں کنول میرے قریب سے گزری۔ نظریں اٹھا کر پیام محبت دیا اور نظریں جھکا کر قریب سے ہوا کی طرح گزر گئی۔

میں اور لطیف وہاں کھڑے تھے جہاں سے بازار شروع ہو رہا تھا۔ میری نظریں اس خیمے پر ٹکی تھیں جو دراصل چائے خانہ تھا۔ باہر کوئلوں پر چائے بن رہی تھی اور ساتھ رکھا ٹیپ ریکارڈر بج رہا تھا۔ اندر جھانک کر دیکھا تو زمین پر نمدے بچھے تھے۔ لالٹین کی مغموم زرد روشنی میں سگریٹ اور چائے کا دھواں خیمے کی چھت سے تیر رہا تھا۔ ایک جانب کوئی فیملی بیٹھی تھی اور دوسری جانب چند لڑکے تکیوں سے ٹیک لگائے چھت کو گھورتے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ خیمہ ریسٹورنٹ راہ سے ہٹ کر تھا۔۔۔ وہاں ہوا بے دریغ اور بہت زیادہ چلتی تھی۔ وہ مقام اور وہ ماحول میرے دل میں اتر گیا۔ وہاں بیٹھنے کا پروگرام ملتوی کر کے ہم ڈنر کرنے اپنے ہوٹل کی جانب چلے آئے۔

☆......☆

ہوٹل کے باہر سائیں نجانے کن سوچوں میں کھویا کھڑا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھا اور پھر ارد گرد دیکھ کر گرد و نواح کا جائزہ لیا پھر چپکے سے اشارہ کر کے قریب بلایا۔

”جنڈڑی! اویر لگا دی میں پریشان کھڑا تھا۔“

”ذرا بازار میں گھوم پھر رہے تھے۔“

تیکھے لہجے میں بولا۔ ”پوچھ رہا ہوں کہ بچی کو دیکھا کہ نہیں؟“

میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ”کس بچی کی بات کر رہے ہو؟“

وہ بپھر گیا۔ ”ایک ہاتھ سے گردن پکڑ کر دریا میں غڑتیاں (غوطے) لگاؤں تو سب یاد آ جائے گا۔“ اپنا لہجہ نرم کر کے رازداری سے کہا۔ ”شملہ پہاڑی والی بچی کی بات کر رہا ہوں۔“

”وہ استاد جی آپ کو مان گیا۔ میں آپ کا معتقد ہو گیا ہوں۔“

”مانتا ہے ناں اپنے استاد کی کرامات کو۔“

”وہ تو بارہ گلی سے مانتا ہوں۔“ پھر لطیف کی جانب دیکھ کر کہنے لگا۔ ”مگر یہ نہیں مانتا۔ میں نے تو اسے کہا ہے کہ سائیں تیری بھکر والی کو بھی کھڑے کھڑے ناران بلا لے۔“

”جنڈڑی! بھکر والی کو تو یہاں نہیں بلا سکتا مگر اسے ابھی ابھی بھکر پہنچا سکتا ہوں۔“ مجھے ڈانٹ پلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے پوچھے بغیر کسی سے بھی کام کرانے کا وعدہ نہیں کرنا، سمجھے۔“

”جی استاد جی۔“

”یہ بتاؤ اب دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ دل کو چین مل گیا اسے دیکھ کر۔“

”استاد جی! یہ تو معلوم کرا دیں کس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ مزہ آ جاتا اگر اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوتے۔“

وہ مونچھ کو پیار کرتے ہوئے بولا۔ ”پہلے بتا دیا کر۔ اب دوسری جگہ سے سامان اٹھا کر یہاں کیسے آئیں گے؟ پھر بھی سوچتا ہوں مگر وعدہ نہیں کرتا۔“ یہ کہہ کر آسمان پر نگاہیں رکھے سوچنے لگا۔

”استاد رہنے دیں۔ ناران میں تو ہیں، میرے لیے یہ

UUNOVELS.COM

بھی بہت ہے۔''

چہرے پر ناراضی طاری کر کے بولا۔ ''کئی بار کہا ہے جب سوچ رہا ہوں تو ٹر ٹر نہیں کرنی۔ شاگردی میری کر لی مگر آداب نہیں سیکھے۔ دل کرتا ہے چاچے شفیع سے کہوں کہ کچھ دیر کے لیے تمہیں سیف الملوک گھما آئے۔'' یہ کہہ کر پھر سوچنے لگا۔ میں اور لطیف کھڑے مسکرا رہے تھے۔

ہم کمرے میں چلے آئے۔ وہاں کھڑکی کی تصویر بدل چکی تھی۔ ہر سو پھیلی چاندنی نے زمین سے آسمان تک کے مناظر کو واضح کر رکھا تھا۔ روشنی اتنی زیادہ تھی کہ زمین پر پھیلے پھول بھی اٹکھیلیاں کرتے نظر آ رہے تھے۔

میں نے خود کو بستر پر گرا دیا۔ آنکھیں موندھ کر دماغ کو آزاد چھوڑ دیا مگر سوچیں آہستہ آہستہ کنول کی جانب گھوم گئیں۔ وہ ناران میں موجود تھی مگر نظروں سے دور تھی۔ جتنی قریب تھی اتنی مجھ سے دور تھی۔ یہاں نظر کیا آتی کہ مجھے اور بے چین کر گئی۔ یہ کیسی قربت تھی کہ اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ نہ اس کا ٹھکانا جانتا تھا اور نہ ہی کوئی خبر تھی۔ سوچتا کہ صبح ہی سے بازار میں کہیں بیٹھ جاؤں گا۔ اس کے والدین سے کسی بہانے مل کر یہ تو معلوم کر لوں گا کہ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

پھر ایک خیال ذہن و دل کو شکنجے میں کسنے لگتا کہ آخر یہ ہے کون حقیقت ہے یا ذہن کی کارسازی؟ غزالہ سے اتنی زیادہ مماثلت کیوں ہے؟ بار بار میری راہ میں کیوں آ رہی ہے مگر میرے پاس اس کا جواب نہ تھا۔

☆......☆

ہم تمام دوست ڈنر کرنے ڈائننگ ہال میں آ بیٹھے تھے۔ آئندہ پروگرام کے بارے میں بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ کل کا دن دریا کنارے بیٹھ کر گزارتے ہیں۔ اسی طرح سے آرام کر کے پچھلی تھکاوٹ اتار لیں گے۔ پھر سائیں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ اکرام کو جب سے سائیں اور چاچے محمد شفیع کے بارے میں غلط سلط بتایا تھا وہ اب سائیں سے ذرا دب کر رہتا تھا۔ ایک فاصلہ رکھ کر بات کر رہا تھا۔ فرید نے شرارتاً بات چھیڑ دی۔

''سائیں، چاچے شفیع سے کہو کہ آدم زادوں سے دور دور رہا کرے۔ ہم بھی ڈرے ڈرے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی قوم میں کیوں نہیں رہتا۔''

سائیں نے سمجھانے کے انداز میں بتایا۔ ''وہ اکیلا نہیں ہے۔ ویسے اس کی اولاد اور پوتے پوتیاں ملائیں تو ہزاروں بنتے ہیں مگر وہ اپنے ساتھ ایک بیوی اور ننانوے کنیزیں لایا ہے۔''

ستار نے حیرت سے پوچھا۔ ''تو وہ سب سوتے کہاں ہیں اور کنیزیں کہاں سوتی ہیں۔''

سائیں نے خبر دی کہ۔ چاچا شفیع کمرے میں خالی پلنگ پر سوتا ہے۔ باقی سارے باہر درختوں پر رہتے ہیں۔ یہ باہر ان سے ملنے جاتا ہے مگر پھر آ کر تھکا ہارا سو جاتا ہے۔''

''مگر کنیزیں ساتھ کیوں لایا ہے۔''

''تم لوگ سمجھتے نہیں۔ جنات کی بھی لاکھ ضرورتیں ہوتی ہیں۔ آگ سے بنے ہوتے ہیں تو تپے تپے گرم رہتے ہیں۔ چاچا شفیع تو شریف آدمی ہے صرف ننانوے لے آیا۔ کوئی اور ہوتا تو ہزار سے گھٹ نہ لاتا۔''

شہزاد سائیں کی منت کرتے ہوئے بولا۔ ''چاچے شفیع سے کہو اپنا احساس تو دلائے؟''

سائیں نے خبردار کیا۔ ''وہ کونے میں بیٹھا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ میں نے روکا نہ ہوتا تو ابھی سب کو سیدھا کر رکھ دیتا۔ پہلے بھی مجھ سے گلہ کر رہا تھا کہ تمہارے دوست ٹر ٹر بہت کرتے ہیں۔''

سن کر ہم سب کے قہقہے گلے میں گھٹ گئے۔

ہم ہنس ہی رہے تھے کہ اتنے میں کنول اور اس کے گھر والے برآمدے سے نکل کر ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ میں ان کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بھی ہمیں چونک کر دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ اسے ناران میں پانے کا تو مجھے یقین تھا مگر ہم ایک ہی ہوٹل میں رہ رہے ہیں یہ میرے لیے ایک انہونی بات تھی۔ سائیں اور لطیف بھی حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ایک ویٹر انہیں میز کے گرد کرسیوں پر بٹھا رہا تھا اور میں سکتے میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ سائیں متواتر مجھے پاؤں سے ٹھوکے لگا رہا تھا مگر میری توجہ میں کنول تھی۔ وہ بیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ ساتھ کول تھی۔ میں سکتے سے نکلا تو اٹھ کر اس کے والد کو سلام کیا۔

''میاں ٹھیک کہا تھا تم نے کہ ہم اکٹھے گھوم رہے ہیں۔''

''سر! کیا عجیب اتفاق ہے کہ آخری اسٹیشن پر ہم ایک ہوٹل میں آ رکے۔''

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

وہ بولے۔ ''تو کھانا بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھالو۔''

کنول نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ سراغ لگاتیں ان نظروں میں تیزی سے جھانک کر اس کے والد سے بولا۔

''بہت شکریہ سر۔ آپ اپنی فیملی کے ساتھ انجوائے کریں۔''

زندہ دلی سے ہنس کر بولے۔ ''ان کے ساتھ تو ماشاءاللہ پچھلے بارہ دنوں سے ہوں۔''

''پھر بھی سر۔ یوں بیٹھ جانا مناسب نہیں۔''

بڑے ادب سے اس کے والد اور والدہ کو سلام کیا اور واپس اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ سب دوست انہیں میری سے دیکھتے چلے آرہے تھے لہٰذا وہ خیال کرتے ہوئے آہستگی سے باتیں کرنے لگے۔

☆......☆

جو خیالوں میں تھی وہ آج فاصلے مٹا کر مجھ سے چند فٹ دور بیٹھی تھی۔ وہ مجھے پرائی سے زیادہ اپنی اپنی لگنے لگی۔ میری ساری توجہ اسی کی جانب تھی۔ وہ ہولے ہولے کول سے باتیں کر رہی تھی نجانے وہ اپنی بہن سے کیا باتیں کررہی تھی، میں اس گومگو میں بیٹھا تھا کہ وہ باتیں کر رہی ہے کہ گنگنا رہی ہے۔ یہ جو فضا میں چھائی ہے وہ کیا اس کی سانسوں کی خوشبو ہے ہوائے دل چلی ہے۔ یہ دبی دبی ہنسی جو ہنسی ہے وہ کچھ اور ہے یا میرے کانوں میں کچھ کہا ہے۔ یہ سرسراہٹ کیا تھی؟ شاید بے چین ہو کر پہلو بدلا ہے۔ میں گھائل کیوں ہوا شاید مڑ کر مجھے دیکھا ہے؟ یہ دل کیوں دھڑکا شاید میرا نام لیا ہے؟ یہ خاموشی کیوں چھاگئی، لگتا ہے کچھ سوچ رہی ہے۔

میں بہت سی حیرتوں اور بہت سے پیار میں کچھ خوشی اور کچھ رنج میں کچھ امید اور کچھ خوف میں، کچھ نشے اور کچھ ہوش میں ڈوبا تھا۔

وہ کھانا کھا کر اٹھے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو ڈائننگ روم کی فضا سونی سونی سی ہوگئی۔ اس کے دم سے سجی محفل اس کے جانے سے اجڑ گئی۔ میں اندر سے خالی ہوگیا۔ دل چاہا کہ میز پر سر رکھے رو پڑوں۔ جیسے تیسے کر کے کھانا کھایا اور کمرے میں آکر بستر پر سیدھا لیٹ گیا۔ بجھے دل سے کمرے کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ساتھ کے کسی دوسرے کمرے میں تھی مگر مجھے اس کی کمی بے چین کیے ہوئے تھی۔ ایک دو فقروں کے علاوہ میری اس سے زیادہ کبھی بات نہیں ہوئی تھی مگر لگتا ایسا تھا کہ سب ایک دوسرے سے کہہ چکے ہیں جس کو ابھی صرف دہرانا ہے۔

میں لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ اس سے دل کی باتیں کیسے دہراؤں۔ خط لکھوں تو کس طرح سے اسے دوں۔ اس سے بات کروں تو کیا کروں۔ آتے جاتے مل گئی تو روک کر کچھ کہہ دوں گا مگر کیا کہوں گا۔ یہ کہنا تو عجیب ہے مجھے تم سے پیار ہوگیا ہے۔ وہ بات کروں جو وہ نہیں جانتی۔ ایسی بات کروں جس پر وہ حیران رہ جائے۔ کوئی ایسی بات جس کو سن کر کہے میں نہیں سمجھی، ذرا پھر سے کہنا۔ میں بار بار کہوں اور وہ ہر بار بولے۔ پھر سے سمجھاؤ۔ نہ وہ سنتے سنتے تھکے اور نہ میں بولتے بولتے اکتاؤں۔ میں اس سے کہوں ہم سالوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بولے وہ بتاؤ جو میں نہیں جانتی۔ اس سے کہوں تمہارا بہت انتظار کیا اور وہ بولے میں بھی تو کب سے تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔ میں پوچھوں ہمیشہ میرا ساتھ دوگی اور وہ پوچھے تم یہ ساتھ چھوڑ دو گے تو نہیں؟ میں کہوں اس چاند کی چاندنی کی قسم تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ وہ کہے اس چاندنی کے چاند کی قسم مجھ سے بڑھ کر۔۔ نہیں چاہتے۔ اسے بتاؤں میرے پیار میں وہ تندی ہے جو اس دریا کی لہروں میں ہے۔ وہ کہے میری بانہوں میں وہ سکون ہے جو اس جھیل کے پانیوں میں ہے۔ اسے بتاؤں یہ آسمان پر چمکتے تارے نہیں بلکہ تم سے کیے گئے میرے لفظ ہیں۔ وہ بتائے یہ چاند نہیں میری محبت کا عنوان ہے۔ اسے سمجھاؤں یہ پھولوں پر کئی طرح کے رنگ نہیں سارے میری محبت کے رنگ ہیں۔ وہ جواب دے یہ پرندے چہک نہیں رہے میرے سندیسے سنا رہے ہیں۔ اترا کر بولوں یہ پہاڑ نہیں میری محبت کی اٹھان ہے۔ وہ پلکیں جھکا کر کہے وہ بادل نہیں میری کھلی بانہیں ہیں۔

کبھی ذہن نے سرزنش کی کہ پہلے یہ تو جان' پتا تو کر لے کہ یہ کوئی خواب تو نہیں ہے؟

☆......☆

میں کنول سے بات کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا کہ لطیف کمرے میں داخل ہوا۔ ''وہ گئی اور تم نے خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ ہم ناران گھومنے آئے ہیں کہ تمہارے یہ ڈرامے دیکھنے آئے ہیں؟''

''کل چلیں گے یار آج تھکاوٹ ہورہی ہے۔''

''اور مجھے بالکل نہیں ہورہی۔ بولو میں کیا کروں؟''

میں نے رضائی اوپر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بیٹھ ناں۔ چلتے ہیں۔''

اتنے میں سائیں کمرے میں داخل ہوا۔ ''دیکھ لیا اپنے

UUNOVELS.COM

استاد کا کمال۔ رہائش بھی اس کی یہیں کرا دی۔ اب آگے بول کیا کرنا ہے؟"

"اس سے بات کرنی ہے مگر حوصلہ نہیں ہو رہا۔"

"پورا دن چخ چخ کرتا رہتا ہے مگر اس سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا؟ اب اس کی بھی تسبیح پڑھوں؟"

"استاد جی یہ بات نہیں ہے۔ الجھن یہ ہے کہ بات کیا کہہ کر شروع کروں اسے چاند کہوں کہ چاندنی۔ دریا کہوں کہ موج کہوں پھول کہوں کہ خوشبو کہوں؟"

سائیں بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ "تیرا دماغ تو نہیں چر گیا جنڈری۔ بچی بھی سوچے گی کیا کریک بندہ پیچھے پڑ گیا ہے۔ قسم سے وہ تو باپ کو بتا دے گی۔"

لطیف نے پوچھا۔ "جنڈری کیسے؟"

سائیں سوچتے ہوئے بولا۔ "ابھی نہ کہے۔ ملتے ساتھ ہی جنڈری نہیں کہنا چاہیے۔ سیدھی طرح اس کا نام لے کر اسے بتائے کہ جب سے تجھے دیکھا جگر چھلنی چھلنی ہو گیا ہے۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ پڑھنے بیٹھتا ہوں تو بھیجا کام نہیں کرتا۔ ایک بار پیار کا جواب پیار سے دے دے تو قسم سوہنے رب کی، ساری زندگی کوئی فرمائش نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا۔ "استاد جی! یہ بالی نہیں جس کو تو کہے کہ ادھر آ ذرا یہ گنا چھیل دے۔"

"جنڈری! لڑکی بالی ہو یا کوئی اور ہو۔ ان کی ذات ایک ہی ہوتی ہے۔ ڈھنگ علیحدہ ہوں گے مگر سوچ ایک جیسی ہوگی۔ بالی گھر سے استرا لا کر یار کی شیو بنانے لگے گی اور دوسری یہ کہے گی جنگلی لگ رہے ہو، ذرا شیو تو بنا لو۔ پیار وہی ہوتا ہے اور صرف انداز بدل جاتے ہیں۔"

☆......☆

میں اور لطیف ہوٹل سے باہر نکلے تو دیکھا کہ چاندنی نے ہر چیز کو منور کر رکھا تھا۔ سرِ شام چلی ہوا ابھی تک آوارہ گھوم رہی تھی۔ بابوسر کو جاتے راستے پر چاندنی بچھی تھی لیکن دور سے جنگلی جانوروں کی آوازیں کبھی کبھی ہوا کے دوش پر تیرتیں ہم تک پہنچ جاتیں۔ بازار میں ایک دو ریسٹورنٹ اور چائے خانے کھلے تھے۔ سیاحوں کو سلا کر ناران کسی مدہوشی میں گھرا نظر آ رہا تھا۔

میں نے کنول کو یہیں دیکھا تھا مگر اب وہ جگہ ویران تھی۔ کیا عجیب سوچ تھی میری کہ سامنے ہوتی تو بہت پاس لگتی۔ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو لگتا کہیں بہت دور چلی گئی ہے۔ میری حالت سے تو وہ خوب آگاہ ہے مگر پھر بھی اتنی انجان ہے؟ اس کو یہ خیال کیوں نہیں آ رہا کہ میں اسے اتنی شدت سے یاد کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ بھی مجھ سے پیار کرتی ہے مگر باہر آ کر ایک بار جھانکتی کیوں نہیں؟ ایک بار تو آ کر دیکھ لے میں ہوا کی طرح آوارہ اس کے لیے پھر رہا ہوں۔ میں راستے پر پڑے اس کے قدموں کے نشان تلاش کر رہا ہوں۔

ہم چلتے چلتے خیمہ ہوٹل میں قہوہ پینے آ بیٹھے۔ اندر کی حدت نے باہر کی ٹھنڈ کا اثر زائل کر دیا تھا۔ ہم ٹانگیں پھیلائے اور تکیے سے ٹیک لگائے قہوہ پی رہے تھے۔ یہاں دریا کی گونج سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پہلے تو مجھے معلوم نہ ہوا کہ کس چیز کی کمی ہے۔ زمین نے گھومنا چھوڑ دیا ہے کہ چاند کا سفر رک گیا ہے۔ پھر لطیف نے بتایا کہ دریا کا شور یہاں مدھم ہے۔ باہر کا شور مدھم ہونے سے میرے اندر کا شور بڑھ گیا تھا۔ میرے اندر کی اچھالیں میرے وجود سے ٹکرانے لگیں۔ میری ذات کو منہدم کیے جا رہی تھیں۔ میں مسمار ہو رہا تھا۔

اس کے والد نے کہا تھا کہ ہم یہاں سے سیدھا اپنے گھر جائیں گے۔ وہ ہر مقام پر بچھڑ کر اگلے مقام پر دوبارہ مل جاتی تھی۔ مجھے بتاؤ کنول جب ہم یہاں سے بچھڑیں گے تو پھر تم کس مقام پر ہوگی، کوئی ایسا پڑاؤ اپنا بتاؤ جہاں سے میرا بھی گزر ہو۔ سیاحت سے گھر کو واپسی عموماً مکمل واپسی ہوتی ہے۔ یہ واپسی ہمیشہ تیز رفتاری سے ہوتی ہے۔ ناران سے جب اپنے گھر کا تصور کرو گی تو سیاحت وہیں ختم ہو جائے گی۔ آخری اسٹیشن سے گھر کا فاصلہ طویل نہیں ہوتا ہے۔ کنول اگر یہاں سے کچھ کہے بغیر واپس چلی گئیں تو پھر میری جانب واپسی ناممکن ہو جائے گی۔ مجھ سے کچھ کہہ کر جانا یا میرا کہا مجھ سے سن کر ضرور جانا۔

جب یہ خدشہ یقین میں بدل جائے کہ اب کے بچھڑنا دائمی ہوگا تو دل مٹھی میں آ جاتا ہے۔ روح پر دکھ کے سائے لہرانے لگتے ہیں۔ رونے کو جی کرتا ہے محبت اور بڑھنے لگتی ہے۔

مجھے اس سے بات کرنی ہوگی، اس سے پہلے کہ وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے اس سے کہنا ہوگا کہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر میرے دل کی باتیں یہاں کے موسم اور ہواؤں سے پوچھو۔ سامنے دریا کی بہتی موجوں سے میرا احوال پوچھو اگر کسی کا یقین نہیں تو اپنے دل سے پوچھ لو۔ ہر

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

جانب سے تم کو ایک ہی آواز آئے گی کہ مجھے تم سے پیار ہے، مجھے تم سے پیار ہے۔

باہر ٹیپ ریکارڈر پر یہ نغمہ گونج رہا تھا۔

"میں تیرے اجنبی شہر میں
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تجھے"

ہم چائے پی کر باہر آئے تو دیکھا بازار بند تھا۔ راستے خاموش تھے۔ چاند کچھ سفر طے کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ تارے مزید روشن ہو گئے تھے۔ ناران کی وادی جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ دنیا کسی موج پر سوار سکون سے بہتی چلی جا رہی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی اور نہ کوئی سرسراہٹ۔ دریا بہنے کا شور تھا۔ پیار کے دریا کی طرح یہ دریا نہ رکتا ہے، نہ تھمتا ہے، بہتا ہی رہتا ہے۔

اکرام نے بتایا تھا کہ لائٹ رات گیارہ بجے چلی جاتی ہے اور صبح سات بجے آتی ہے۔ لہٰذا اس نے ہر کمرے میں لو نیچی کر کے ایک ایک لالٹین رکھوا دی تھی۔ لو نیچی ہو مگر بجھنے نہ پائے، نہ دیئے کی اور نہ دل کی۔

کھڑکی کی پینٹنگ بدل گئی تھی۔ رات اور ناران کا سنگم نظر آرہا تھا۔ سیاہ آسمان پر تاروں کے جھنڈ تھے اور بیچ میں چمکتا چاند نظر آرہا تھا پھر کہیں سے آوارہ بادل بھٹکتا آیا، چاند کو ڈھانپنے لگا مگر اس نے بادل کو بھی منور کر دیا۔ میں نے کھڑکی کے سرد شیشے پر اپنے لب رکھ دیئے۔ شیشے کا سرد لمس میری حدت کے آگے پگھل گیا... مگر وہی بات کہ دل کا راگ اپنا تھا دماغ کا سوال اپنا کہ آخر یہ ہے کون؟

☆......☆

تھکاوٹ کے باعث رات گہری نیند آئی۔ رات بھر سپنوں کی وادی میں اپنی مرضی سے گھومتا پھرتا رہا تھا۔ بستر سے نکل کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو وادی جاگتے جاگتے تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ اسے تازہ دم کرنے صبح کا نور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمع ہو رہا تھا۔ سورج کی آمد کی خبر یہی سپیدگی دے رہی تھی۔ پرندوں نے باہر درختوں پر شور مچا رکھا تھا۔

میں نے جیکٹ پہنی، جاگرز پہنے اور کیپ اٹھائے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

کہیں سے سنا تھا کہ کائنات کو فطری شکل میں دیکھنا ہے تو اسے صبح سویرے دیکھو۔ اس وقت جب زمین اوس سے بھیگی ہوتی ہے، جب ڈالیوں پر پرندے چہچہاتے ہیں، جب خنک ہوا کے جھونکے پھیرے لگاتے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں اور جب کائنات مسکراتی ہے تو وہ ناران میں اتری صبح ہوتی ہے۔

دریا کی گونج کم تھی اور لہریں پرچھائیوں میں بہہ رہی تھیں۔ فضا سرد تھی اور بازار بند تھا۔ ایک دو جیپوں کو ان کے ڈرائیور صاف کر رہے تھے۔ نیلے پیلے اور سفید پھول گھاس پر جھوم رہے تھے۔ ناران کی وادی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔

میں پھولوں کو روندنے سے بچاتے ہوئے دریا کنارے ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ دریا کی موجیں دیکھنے لگا جن میں کوئی تلاطم نہ تھا۔ یہیں مجھے معلوم ہوا کہ پہاڑی ندی نالوں کا بہاؤ صبح کے وقت کم ہوتا ہے۔ دن کی گرمی سے جب برف پگھلتی ہے تو شام سے پہلے ان میں طغیانی آجاتی ہے۔

پانی سے ٹکرا کر آتی ہوا مجھ میں تازگی بھرے جا رہی تھی۔ میں سرمستی میں بیٹھا ان مناظر کو دیکھے جا رہا تھا۔ میں عشق حقیقی اور عشق مجازی، دونوں کی قربت میں تھا پھر آفتاب کی کرنوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں سے جھانکا اور جیسے پگھلا سونا کائنات پر بہنے لگا۔ فضائیں اور مناظر سنہری ہوتے چلے گئے۔ دنیا کی پرتیں ایک ایک کر کے کھلنے لگیں۔ سنہری کرنیں گلابی ہوئیں تو دریا بھی گلابی ہو گیا۔ پورا جہاں سنہری سے گلابی ہو گیا۔ کرنیں آہستہ آہستہ پہاڑوں سے اتر کر آئیں اور وادی میں پھیلتی جا رہی تھیں۔

کاش کنول بھی میرے ہمراہ یہاں ہوتی اور دن کو وجود میں آتے میری طرح دیکھتی۔ وہ بھی لہروں کو بہتے سنتی اور ہواؤں کو چلتے محسوس کرتی۔ وہ حیرت بھرے چہرے سے یہ جہاں دیکھتی اور میں اس کو دیکھتا۔ خوب صورت جگہوں کے خوب صورت لمحوں میں حسین لوگ اور زیادہ حسین لگتے ہیں۔ ناران تو عام بندے کو بھی خوب صورت بنا دے مگر وہ تو پہلے سے ہی خوش رو، خوش ادا اور خوش مزاج تھی۔

میں نے جھک کر زمین سے ایک کاسنی پھول توڑا اور ڈنڈل سے پکڑ کر ہوٹل کی جانب چلا آیا۔

☆......☆

مین ڈور کھول کر میں اندر داخل ہوا تو دیکھا وہ کاؤنٹر پر کھڑی شاید اکرام کا انتظار کر رہی تھی۔ چہرہ دوسری جانب کیے بنی بجی ہوئی تھی۔ وہی رات والا سیاہ کوٹ پہنے اور گردن کے گرد نیلا مفلر لپیٹا تھا۔ میں توقع نہیں کر رہا تھا کہ دروازہ کھولتے ہی وہ سامنے کھڑی ہو گی۔ میں دم بخود کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک کسی کی موجودگی کو محسوس کر کے اس نے

UUNOVELS.COM

گھوم کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے دونوں ہی بوکھلا گئے۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو جھٹ سے سلام کر ڈالا۔ اس کی پلکیں جھپکیں، ہونٹ ہلے تو لگا سلام کا جواب آیا ہے۔ میں نے چند قدم لیے اور کاؤنٹر کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ سوچا آج اس سے اپنے دل کی بات کر ہی ڈالوں۔ کئی ساعتیں گزر گئیں مگر میں کچھ کہہ نہ سکا۔ میں کبھی اسے دیکھتا اور کبھی زمین کی جانب نظریں پھیر دیتا۔ میری اس کیفیت نے اسے نروس کر دیا۔ اپنے ہاتھ مسلتی ہوئی بولی۔ ''کیا ہے......؟'' ہے کو اس نے خاصہ لمبا کر دیا تھا۔ ''کچھ کہنا ہے تو کہیں؟''

میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ ''کہیں جا رہی ہیں؟''

''جی ہم سب جا رہے ہیں۔''

میں لرز گیا۔ سمجھا وہ سب واپس جا رہے ہیں۔ شکستہ لہجے میں پوچھا۔ ''مگر انکل نے تو رات کہا تھا ہم ناران کچھ دن رکیں گے۔''

میری پریشانی دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔ ''ہم واپس نہیں جا رہے۔ لیک لالوسر دیکھنے جا رہے ہیں۔''

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور چین کی سانس خارج کی۔

''اگر میں واپس چلی جاؤں تو آپ پریشان ہو جائیں گے؟'' وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''بہت زیادہ۔''

''مگر کیوں؟'' اس نے بڑی دلآویزی سے پوچھا۔

''ابھی تو آپ سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ کچھ کہے اور سنے بغیر چلی گئیں تو وہ ساری باتیں کس سے کہوں گا؟''

''کون سی باتیں مجھ سے کرنی ہیں؟''

''آپ واپس آ جائیں تو بتاؤں گا۔''

''جو کہنا ہے کہہ دیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں دیر ہو جائے۔'' وہ گردن کو بائیں کندھے پر جھکائے مسکرا رہی تھی۔

''میں نے ایک نہیں بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

بھنویں اچکا کر بولی۔ ''آپ ایک بات تو کریں۔ باقی میں خود جان جاؤں گی۔''

میں دل میں کہہ رہا تھا وہی ایک بات ہی تو ہے جو کہہ نہیں پا رہا۔

''کیوں ناں میں باقی کی باتیں بتا دوں اور ایک بات آپ خود سمجھ جائیں۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''چلیں یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔''

میں اپنی پوری ہمت جمع کر کے بولا۔ ''آپ کی آواز آپ کی ہنسی...... دونوں بہت خوب صورت ہیں۔''

وہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ ''بہت بہت شکریہ۔ بہت سی باتوں میں سے ایک تو کہہ دی۔ اب دوسری بات بھی بول دیں۔''

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپ تک پہنچتا ہوں، آپ نظر آتی ہیں، مجھے دیکھتی ہیں مگر پھر کہیں چلی جاتی ہیں۔ آخر کس جلدی میں ہوتی ہیں کہ بات کرنے کی مہلت تک نہیں دیتیں۔''

''مجھے کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے آپ دیر کر دیتے ہوں۔''

''ہاں ہو سکتا ہے چلیں ایک اور بات کرتا ہوں۔'' میں اس کے چہرے کے خدوخال دیکھنے لگا۔ ''آپ کی صورت دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کہیں آپ کو دیکھا ہے۔ پہلی بار آپ سے نہیں ملا ہوں۔''

''وہ تو میں نے بھی آپ کو دیکھا ہوا ہے۔ مری، نتھیا گلی، ایوبیہ اور ایبٹ آباد میں دیکھا تھا۔ اب ناران میں ملے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں اس سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔''

''شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چھرا پانی میں جس گاڑی کے آگے آپ آ گئے تھے وہ ہماری گاڑی تھی۔ وہیں دیکھا ہو گا۔''

''وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ میں اس سے بھی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ''اس سے بھی پہلے؟''

''جی اس سے بھی پہلے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''مجھے یاد نہیں۔'' آنکھیں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ ''آپ کہاں کی بات کر رہے ہیں۔''

اتنے میں اکرام کچن کا ڈور کھول کر باہر آیا۔ آتے ہی بولا۔ ''جیپ آنے والی ہے۔ میں ناشتا تیار کروا رہا ہوں۔ آپ لوگ جلدی سے آ جائیں۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''ہم لوگ تو کہیں نہیں جا رہے؟''

وہ ہنس کر بولا۔ ''آپ نہیں یہ لوگ لالوسر جا رہے ہیں۔''

کچھ توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ ''صبح یہاں سے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

نکلیں تو واپسی کب تک ہو جاتی ہے؟"

"شام سے پہلے بہ آسانی واپس پہنچ جاتے ہیں۔"

"راستہ خطرناک تو نہیں؟"

"نہیں پلین ہے۔ آپ لوگوں نے بھی جانا ہے؟"

"نہیں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

کنول میری جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ یہ سب میں کس کے لیے پوچھ رہا ہوں۔

میں نے رکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہاں سے جانے لگا تو اکرام نے کہا۔ "اگر کہیں جانا ہو تو پہلے بتا دیں۔ جیپ والوں کو ایڈوانس بتانا پڑتا ہے۔"

وہ وہاں سے مڑا تو کنول کی آواز آئی۔ وہ اکرام سے کہہ رہی تھی۔ "میں ابو کو جا کر بتاتی ہوں کہ جیپ آنے والی ہے۔" یہ کہہ کر وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

راہداری سنسان پڑی تھی۔ میں اپنے کمرے کے دروازے پر آ کر ٹھہر گیا۔ وہ بھی چلی آئی اور پاس آ کر میرے سامنے رک گئی۔ مجھ سے پوچھا۔ "تو آپ نے مجھے پہلے کہاں دیکھا تھا۔"

میں خود سے بول رہا تھا کہ بات کو پچھلے حوالوں سے مت الجھاؤ۔ قول و اقرار کا یہ موقع غنیمت جانو۔ یہ وقت بھی ضائع کر دیا تو معلوم نہیں یہ دوبارہ کب ملے گا۔

میں اسے سمجھانے لگا۔ "آپ میرے خواب میں آتی رہتی تھیں۔ کئی بار کہا میں آپ کو چاہنے لگا ہوں۔ آپ کچھ کہنے لگتی تھیں کہ میرا خواب ٹوٹ جاتا تھا۔ آخری بار آپ کو تقریباً چار سال پہلے خواب میں دیکھا۔ میں اپنی بات کہنے والا ہوتا ہوں تو آپ مجھے روک دیتی ہیں۔ آپ کہتی ہیں کہ یہ خواب ٹوٹنے سے پہلے میں اقرار کرتی ہوں کہ......"

پھر میری بات کاٹ کر بولی۔ "میں بھی آپ کو چاہنے لگی ہوں۔"

یہ الفاظ اس کی زبان سے سن کر میں گم صم ہو گیا۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ نظریں اٹھائے اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے یہی کہا تھا ناں؟" میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جہاں مسکراتی آنکھوں میں پیار کے ڈورے پڑے تھے۔ میں سرتاسر اس کی آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

"ہاں آپ نے حرف بہ حرف یہی کہا تھا۔" اس سے پوچھنے لگا۔ "کیا خواب سچ بھی ہوتے ہیں۔"

وہ آہستگی سے بولی۔ "ہاں سچ بھی ہوتے ہیں۔"

"کیا میرا خواب سچا تھا؟"

"یہ اپنے دل سے پوچھیں۔"

"میں نے باقی کی بہت سی باتیں کر لی ہیں۔ آپ پہلی بات تو بتائیں۔"

اس کی آنکھوں میں محبت کے دیئے جل رہے تھے۔ وہ وارفتگی کے عالم میں کھڑی تھی۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہنس پڑی۔ شکایتی لہجہ میں بولی۔ "کتنی آسان بات تھی اور کتنا انتظار کرایا۔" یہ کہہ کر چل دی۔ راہداری مڑنے سے پہلے رکی، مڑ کر دیکھا، مسکرائی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔ میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا خالی راہداری کو دیکھ رہا تھا جو ابھی کہہ کر گئی تھی وہی فقرہ میرے اندر گونجتا پھر رہا کہ اتنی آسان سی بات کے لیے اتنا زیادہ انتظار کرایا۔ یہ فقرہ خود سے کہتا میں اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆......☆

اس نے ایک فقرہ بول کر اگلے پچھلے سارے سوالوں کے جوابات دے دیئے تھے۔ کتنے قرینے اور سلیقے سے اپنی چاہت کا اظہار کر دیا۔ کس خوب صورتی سے میرے ساتھ خود کو جوڑ گئی تھی۔ کس ادا سے اقرار کر گئی کہ میں کب سے تمہاری محبت میں ڈوب چکی ہوں۔

میرا جی کر رہا تھا کہ ابھی کے ابھی بلو کو یہ خوش خبری سناؤں۔ اسے بتاؤں کہ تمہاری بھابی پھر سے مجھے مل گئی ہے۔ نام غزالہ نہیں کنول سہی، پر ہیں تو دونوں ایک ہی۔ بلو میری محبت نہ کم ہوئی ہے اور نہ بدلی ہے۔ خوابیدہ تھی مگر جاگ اٹھی ہے۔ تو نے کتنی لڑکیوں کے بارے میں بتایا کہ غزالہ جیسی لگتی ہیں مگر میں نہیں مان رہا تھا۔ یہ کہتا تھا کہ اس جیسی کوئی اور نہیں ہے۔ واقعی اس جیسی کوئی اور نہیں... کیونکہ وہی لوٹ کر واپس آئی ہے۔ بلو بھی غزالہ ملے تو میرا شکریہ ادا کرنا کہ بھائی جان کو تم نے زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ ساڑھے تین سال کا انتظار تو انتظار نہیں ہوتا۔

میں کھڑکی سے نظر آتی تصویر دیکھتا رہا جہاں سورج کی کرنیں پوری وادی کو منور کر رہی تھیں۔ دریا کی گونج کے علاوہ پرندوں کے چہکنے کی آوازیں تھیں۔ میں جیکٹ اتارے بغیر رضائی اوڑھ کر سو گیا۔

☆......☆

اس ٹرپ پر عموماً ساتھیوں کا شور مجھے نیند سے بیدار کرتا چلا آ رہا تھا۔ آج سائیں کی جگہ طارق اور ستار نے میرے

UUNOVELS.COM

پلنگ کے گرد شور مچا رکھا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو سنا کہ ستار اس سے کہہ رہا ہے۔

"اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔ ہم سوئے ہوئے تھے۔ دروازہ آہستگی سے کھلا تو دیکھا یہ چوروں کی طرح اندر داخل ہو رہا ہے۔"

طارق بولا۔ "تم نے پوچھا نہیں کہاں گئے تھے۔"

"میں خود ڈرا ہوا تھا تو کیا پوچھتا۔ مجھے کیا پتا یہ وہی ہے یا اس میں سائیں پھر رہا ہے۔"

"پھر......!"

"چپکے چپکے سر رضائی سے نکال کر دوبارہ دیکھا تو یہ کھڑا اکیلے اکیلے مسکرا رہا تھا۔ پھر یکا یک ٹہلنے لگا۔ کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ پھر لپکتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ باہر دیکھتے دیکھتے کچھ بول بھی رہا تھا مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔"

طارق کی پریشان زدہ آواز آئی۔ "سائیں والا جن اسے چمٹ گیا ہے۔"

ستار بولا۔ "قسم سے یہی بات ہوگی۔ چنگا بھلا فارسی کر رہا تھا۔ جب سے ٹرپ پر آیا ہے معلوم نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔"

طارق نے کہا۔ "نشہ نہ کرتا ہو؟"

ستار نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے مجھے تو لگتا ہے چرس پیتا ہے۔" پھر مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ "سائیں کو اٹھا کر پوچھتے ہیں رات اس کا جن کہاں تھا۔"

طارق نے کہا۔ "تو اٹھا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ رضائی میں سائیں کی جگہ اس کا جن نہ سویا ہو۔"

ستار نے سائیں کی رضائی ہلکی سی کھینچی تو اندر سے آواز آئی۔

"کیوں ٹرٹر لگا رکھی ہے۔ وہ بھی ناران میں اور صبح کے وقت۔"

طارق نے پوچھا۔ "سائیں سچ سچ بتا۔ رات تیرا جن کہاں تھا۔ ہمیں شک ہے ندیم کو چمٹ گیا ہے۔"

اتنے میں رضائی ہٹا کر میں اٹھ بیٹھا۔ مجھے جاگتے میں دیکھ کر ستار نے شور مچا دیا۔ "دیکھا بولا نہیں تھا کہ جیکٹ پہن کر رات کو اندر آیا تھا۔" طارق مجھے گھورے جا رہا تھا پھر سائیں کھسکتا ہوا میرے بیڈ پر آ گیا۔ "آنکھیں کھول کر دکھا۔"

"استاد جی کھلی ہوئی ہیں۔ میں نے کون سی بند کر رکھی ہیں۔"

"چخ چخ نہ کر۔ منہ کھول......"

"آپ بھی ان کی باتوں میں آ گئے؟"

"جنڈری ایسی بات نہیں۔ اپنی تسلی کر رہا ہوں۔" منہ میں جھانکنے کے بعد پوچھا۔ "محمد شفیع سے بات ہوئی تھی؟"

"استاد جی رات سویا تھا کہ کھٹکا ہوا اور آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ لالٹین ہوا میں لہراتا باتھ روم جا رہا ہے۔ مجھے شک پڑ گیا کہ چاچا شفیع ہے۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ دروازہ بند ہوا تو یہاں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے آواز لگائی چاچا شفیع وضو کر کے لالٹین واپس کمرے میں رکھ دینا۔ اندر سے ایک بار ہوں ہوں کی آواز آئی اور پھر مجھے نیند آ گئی۔"

اتنے میں مانیک اور لطیف بھی اٹھ بیٹھے۔

سائیں نے پوچھا۔ "رات جیکٹ پہن کر سوئے تھے؟"

"نہیں۔" پھر اداکاری کرنے لگا۔ "یہ معلوم نہیں کہاں سے آ گئی۔ میں تو رات اتار کر سویا تھا۔"

سائیں نے طارق کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا اور پھر چہرے پر اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"لگتا ہے چاچا شفیع نے صبح کی نماز اسے بھی پڑھوا دی۔ پھر وہ باہر بچوں سے ملنے گیا تو اسے بھی ساتھ لے گیا۔ یہ اس نے اچھا کیا کہ باہر جانے سے پہلے اسے جیکٹ پہنا دی ورنہ ناران کی سردی میں نمونیہ بھی ہو سکتا تھا۔"

سائیں نے مجھ سے پوچھا۔ "اور کچھ یاد ہے۔"

"ہاں ہاں کچھ یاد آ رہا ہے۔" میں نے بھرپور اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "بہت سارے درخت تھے کئی عورتیں تھیں۔ چولہے پر چائے کی دیگ چڑھی تھی۔ بوری میں کیک رس بھرے تھے۔ ایک سفید ریش بزرگ مجھے چائے دے رہے تھے۔"

سائیں نے میری بات اچک لی۔ "وہی تو چاچا شفیع ہے۔ کہا نہیں تھا اس کی بیوی اور کنیزیں باہر درختوں پر رہ رہی ہیں۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ایک عورت جس کا قد بہت لمبا تھا کہ درخت سے بھی نکل رہا تھا۔ وہ میرے پاس آئی۔ مجھ سے بولی۔ "پتر پراٹھا تل دیواں۔ بکھ لگی ہوسی آ"
(بیٹا پراٹھا تل دوں۔ بھوک لگی ہوگی)

سائیں داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "چاچے شفیع کے ایک دو رشتے ڈیرہ والوں میں بھی ہوئے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ہیں۔ وہی ہوگی۔"

لطیف نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر اتنا یاد ہے کہ چاچا شفیع سے میں نے کہا کہ ذرا دعا کرا دیں کہ کشمیرن ناران آ جائے۔"

طارق غصے سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر سائیں سے مخاطب ہوا۔ "یہ بکواس کر رہا ہے۔ چاچے شفیع کو کشمیرن کا کیا پتا؟"

لطیف نے طارق کو بتایا۔ "کیوں نہیں اسے پتا۔ اس رات ٹھنڈ یانی پر ملنے آ نہیں گیا تھا؟ وہیں کشمیرن کو بھی دیکھا ہوگا۔"

طارق سخت طیش میں تھا۔ مجھ پر گرجا۔ "تو کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑا ہے۔ ایبٹ آباد سے ناران تک اسے بدنام کر کے رکھ دیا ہے اور تو اور اب جنات میں بھی اس کی خبریں پہنچا دیں۔" پھر ستار سے اس نے پوچھا۔ "سائیں کے پاس واقعی جن ہے؟"

ستار نے جواب دیا۔ "لگتا تو ہے کئی بار مجھے سائیں دو دو نظر آئے۔ چونغے والے مولوی صاحب سے پوچھا تو اس نے بتایا دوسرا اس کا عامل ہوگا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔"

☆......☆

سب دوستوں میں متفقہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ آج ناران میں آرام کر کے پچھلی ساری تھکاوٹ اتارتے ہیں۔ سائیں تو بازار میں مالشیا بھی تلاش کرتا رہا مگر ناکام لوٹا۔ اکرام نے مشورہ دیا کہ مچھلی کا شکار دریا کنارے بیٹھ کر کرلو۔ آرام بھی ہو جائے گا اور اگر مچھلی ہاتھ لگ گئی تو دہرا فائدہ۔

میں اور امتیاز فشری کے دفتر سے مچھلی پکڑنے کے چار لائسنس لے آئے۔ سیف الملوک والے راستے پر ایک کمرے میں اس کا دفتر تھا۔ وہیں ایک ندی برف کا تازہ پگھلا ہوا پانی لیے بہتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی لہریں ہنستی کھیلتی یوں بہتی چلی آ رہی تھیں جس طرح سہیلیاں محلے کے اسکول جاتی آپس میں چھیڑ خانی کرتی جاتی ہیں۔ میں اور امتیاز اس ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہم دور دور اپنی دنیا بسائے بیٹھے تھے۔ دور کے پہاڑوں پر کہیں کہیں برف چھپی تھی۔ مجھے اپنی پسندیدہ مصنفہ سلمٰی اعوان کا اپنی کتاب "میرا بلتستان" میں لکھا ایک فقرہ یاد آ رہا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ پہاڑ ایسے نظر آ رہے تھے جیسے کالی عورت کے چہرے پر برص کے دھبے ہوں' میں خیالوں میں پہاڑوں کے داغدار دامنوں پر گھوم رہا تھا۔

ابھی شام دور تھی مگر میں نے کنول کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ مجھے یہاں کے سارے مناظر سے پیار ہو چلا تھا جس راستے سے اس نے آنا تھا اس پر پیار بھری نظریں نکائے بیٹھا تھا۔ تصور میں اسے ہمراہ لیے پہاڑوں کی بلندیاں اور نیلے آسمان کی وسعتیں پھلانگ چکا تھا۔ بہتے پانیوں کی نغمگی اور خنک ہواؤں کے ملائم بوسے میری مسرتیں اور محبتیں بڑھا رہے تھے۔ میں پرندوں کی طرح ہواؤں میں زقندیں بھرنے لگا۔ آسمان سے زمین کو حیرت بھری نظروں سے یوں دیکھتا جیسے کوئی جادونگری ہو۔ میں خوشی سے دیوانا ہو گیا کیونکہ مجھے محبت ہو گئی تھی۔

☆......☆

واپس آ کر اکرام کو ہم نے لائسنس دیئے۔ باقی دوست دریا کنارے جا چکے تھے۔ ہم دونوں بھی کنارے کنارے دور تک چلتے گئے۔ راستے میں دریا کے ساتھ کسی نے ریزارٹ بنا رکھا تھا۔ لکڑی کے کیبن تھے جن پر درختوں

ڈاکٹر راشد لطیف خاں

عالمی شہرت یافتہ پاکستانی پروفیسر اور پاکستان میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے خالق۔ وہ ملتان میں رائے لطیف حسن خاں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ مئی 1961ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کیا۔ 1965ء میں رائل کالج آف گائنا کالوجسٹ لندن سے امراض نسواں میں ڈپلوما لیا اور 1967ء میں لندن سے ایم آر سی او جی کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایڈنبرا کی معروف طبی درسگاہ رائل کالج آف سرجنز سے ایف آر سی ایس کی ڈگری لی۔ 1974ء میں جون ہاپکنز میڈیکل اسکول بالٹی مور (میری لینڈ) امریکا نے انہیں اے ٹی ایم ایف کی اعزازی ڈگری دی اس طرح حکومت بھارت نے بھی سب سے بڑی طبی ڈگری بطور اعزاز پیش کی۔ علاوہ ازیں کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز نے بھی ان کی طبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایف آر سی پی کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ وہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان میں پہلی ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنے والی ٹیم کے سربراہ ہیں یہ بے بی 2 جولائی 1989ء میں پیدا ہوئی۔

مرسلہ: سلمٰی ممتاز، حیات آباد

UUNOVELS.COM

کا سایہ تھا۔ گھاس پر رنگا رنگ کے پھول کھلے تھے۔ تاران کی خاموش دنیا کے اندر خوشی کا کوئی گوشہ تھا جو آبادی سے دور مگر میرے دل کے بہت قریب تھا۔ شدید آرزو میرے اندر جاگی کہ زندگی میں کوئی ایسی رات بھی آئے جو اس کیبن میں بسر ہو۔

ریزارٹ سے کچھ ہی دور ہمارے ساتھی درخت تلے دری بچھائے بیٹھے تھے۔ شہزاد نے گٹار تھاما تھا۔ مائیک اپنے ورک مین کے سیل تبدیل کر رہا تھا۔ سائیں دریا کے پانیوں کو متواتر دیکھے جا رہا تھا اور باقی تاش کھیل رہے تھے۔

اتنے میں اکرام کا ملازم چار بنسیاں اور کیچوے لے آیا۔ بنسی کے ساتھ گھنگرو باندھے گئے۔ ملازم نے بتایا کہ جب گھنگرو بجے تو سمجھو مچھلی پھنس گئی ہے۔ میں نے کہا کہ گھنگروں کی جھنکار پر بڑے بڑے امراء دام فریب میں آچکے ہیں اور یہاں تو صرف مچھلی ہے۔ بنسیاں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر دریا میں لگا دی گئیں۔ پہلے تو ہم یوں بیٹھے رہے جیسے دشمن کی تاک میں ہوں۔ جب کوئی گھنگرو نہ بجا تو ہم آہستہ آہستہ ریلیکس ہوتے چلے گئے۔

میں ایک درخت سے ٹیک لگائے سامنے بہتے دریا کے پانیوں کو دیکھ رہا تھا۔ صبح کنول سے کہی اور سنی ہر بات کو بار بار Rewind کر کے ذہن میں چلا رہا تھا۔ اس کو سوچنے سے نہ دل بھرتا اور نہ دماغ تھکتا تھا۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

خود فراموشی میں ڈوبے کیا خوب صورت لمحے تھے جب میں بیٹھا حسین سپنے بن رہا تھا۔ وہ ہر پل پیار تھا، ہر پل اس کی یاد تھی اور ہر پل وہ خود تھی۔ ہم دو تھے اور تیسرا کوئی نہ تھا۔ کیا حسین اس کا اظہار محبت تھا۔ اس نے اقرار کیا کہ دل و دماغ میں چھن چھنا چھن کرنے لگی تھی۔ جب کوئی بات نہ تھی تو اتنی بے چینی بھی نہ تھی۔ جب قول و اقرار ہو گئے تو چین چھن گیا۔

میں درخت تلے بیٹھا سپنوں کے محل تعمیر کر رہا تھا۔ کبھی یاد کے پھول چنتا، کبھی محبت کی کتاب پڑھتا اور کبھی ڈالیوں پر پرندے تلاش کرتا۔ اتنے میں لطیف میرے ہمراہ آ بیٹھا۔

وہ پوچھ رہا تھا۔ ''ایک بار تو کاؤنٹر پر کھڑی مل گئی مگر بار بار نہیں ملے گی۔ وہ ہر وقت اپنے والدین کے ہمراہ ہوتی ہے تو اب اس سے بات کیسے کرو گے؟''

میں نے اس سے کہا۔ ''وہ بغیر پلان کے ملتی رہی اور بغیر پلان کے اس سے بات بھی ہو گئی۔ یار میں نے تو سوچ لیا ہے کہ اب زندگی میں بڑے بڑے پلان نہیں بنانے۔ چھوٹی سی زندگی کو کیوں اسے وقت کی گرفت میں دے دیں۔ کیوں اسے سالوں اور مہینوں میں بانٹ دیں۔ جس طرح سورج نئی اُمید کی نوید لے کر طلوع ہوتا ہے اسی طرح میرا ہر دن سورج کی نئی اُمید کے ساتھ نکلے گا۔''

''ہاں یار ٹھیک کہتے ہو۔ میں تو کہتا ہوں زندگی اس درخت کی طرح ہو جس پر طرح طرح کے پرندے آ بیٹھیں۔ لحظہ بھر ستائیں، ذرا دیر چہکیں اور پھر اڑ جائیں۔ بس دعا کرو ہماری زندگی کے شجر پر ہمیشہ بہار رہے اور پرندے یونہی اپنے نغمے سنانے آ جایا کریں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہوں گا کہ کوئی خوب صورت پرندہ آ کر میرے شجر پر گھونسلا بنائے۔ اُمید تو ہو گی کہ شام ہوتے ہی واپس لوٹ آئے گا۔''

اتنے میں گھنگرو بج اٹھا۔ سب دریا کی جانب بھاگے۔ سائیں نے ڈور کھینچی تو دیکھا کہ تقریباً ایک فٹ لمبی ٹراؤٹ آنکھیں کھولے ہمیں بے بسی سے دیکھ رہی ہے۔ مجھے ترس آ گیا۔

''استاد جی رحم کرو۔ کتنی معصوم ہے۔ اسے پانی میں دوبارہ پھینک دو۔''

''جنڈری! شکل سے تو معصوم بھی لگتا ہے۔ کیا خیال ہے تمہیں اس کی جگہ نہ پھینک دوں۔''

''استاد جی۔'' میں نے پھر گڑگڑا کر کہا۔

''تاں کبھی کڑاہی گوشت کھاتے ہوئے اس معصوم بکرے پر رحم آیا ہے کہ اس کی گردن پر چھری پھری ہو گی لیکن جب تو بڑے مزے سے کھا رہا ہوتا ہے۔''

سائیں نے مچھلی اس بالٹی میں ڈال دی جو ملازم لے آیا تھا۔ بالٹی اٹھائی اور دری پر آ بیٹھا۔ بالٹی اپنے ساتھ رکھی تھی۔

☆......☆

چار گھنٹوں میں چھ مچھلیاں ہم نے شکار کر لی تھیں۔ نو آموز شکاریوں کے لیے یہ تعداد بڑی حوصلہ افزا تھی۔ سائیں بتا رہا تھا کہ ڈور کو دریا کنارے جہاں سایہ بھی ہو، پھینکتے ہیں تو مچھلیاں زیادہ ڈور میں پھنستی ہیں پھر وہ ٹراؤٹ مچھلی کے ناقابل تحریر فوائد بتانے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''استاد جی آپ آخر ہیں کیا؟ پیر ہیں کہ مرید۔ عامل ہیں کہ طالب علم۔ بزنس مین ہیں کہ شکاری

UUNOVELS.COM

یا جوتشی ہیں کہ حکیم۔''

وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ انگلیاں اس کی مونچھوں سے کھیل رہی تھیں۔ ''یہ تعریفیں بند کر۔ میرے ساتھ ہمیشہ سیدھی اور صرف مطلب کی بات کیا کر۔''

''مطلب کی بات پر تو آپ کو غصہ آجاتا ہے۔'' بڑی آہستگی اور نرمی سے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

''وہی کہ ایم بی اے والی لڑکی سے لین کرا دیں۔ طارق کو کشمیرن کیا اچھی لگے گی جو وہ مجھے لگتی ہے۔''

پھر سائیں نے اپنے سامنے پڑی بالٹی سائیڈ پر رکھی۔ دری پر ایک لکیر کھینچی اور مجھ سے کڑک کر بولا۔ ''تو اب اس لائن کے اوپر کھڑا ہے۔''

میں ذرا سا آگے ہوا اور دری پر جھک کر پوچھا۔ ''پھر سے بتائیں کہاں کھڑا ہوں۔''

''یہاں اس جگہ۔'' دری پر کسی جگہ انگلی رکھتے بولا۔

''اچھا پھر؟''

''ذرا سی بھی اور چخ چخ کی تو یہ لائن پار کرلے گا۔''

''پھر کہاں ہوں گا؟''

دوسری جگہ انگلی رکھ کر بولا۔ ''پھر یہاں ہو گے۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

''جنڈڑی پھر یہ ہوگا کہ اسی درخت تلے چیر کر فنا کردوں گا۔ ہر وقت ٹر ٹر اور ابھی ناران میں دوپہر کو اور دریا کے کنارے؟''

اتنے میں فرید مجھے ہٹا کر میری جگہ بیٹھ گیا۔

''سائیں! مجھے اندازہ ہو گیا ہے آپ حکمت میں بھی یکتا ہیں۔ اپنے اس فارغ ٹائم کا فائدہ اٹھا کر میرا مسئلہ حل کردیں۔''

سائیں بالٹی کو دوبارہ سامنے رکھتے ہوئے فرید سے بولا۔ ''اب کہہ بھی دے۔ بولنے میں شام کرے گا؟''

''چاہتا ہوں میرا وزن آپ کی طرح بڑھ جائے۔ دو نہیں بلکہ چھ چھ روٹیاں کھاؤں اور ڈکار تک نہ لوں۔ چلوں تو جلدی تھک جاؤں۔ دوڑنے سے پہلے بیٹھ جاؤں۔ دم کریں، پڑھائی کریں یا تعویذ دیں، کوئی حل بتائیں۔''

نرم لہجے میں ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اپنا حال دے رہا ہے کہ میرا حال جہاں کو بتا رہا ہے؟''

فرید بولا۔ ''سائیں میں بہت سیریس ہوں۔ یہ علاج بتائیں تو بعد میں آپ سے ایک دو نسخے علیحدگی میں بھی پوچھنے ہیں۔''

یہ سن کر سائیں نے فرید کی نبض تھام لی۔ کچھ دیر معلوم نہیں کس دھیان میں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد فرید سے بولا کہ زبان دکھا۔ یہ کہہ کر اس کا منہ ایسے کھلا جیسے ہم بقرعید پر بکرے کا کھولتے ہیں۔

''استاد جی چیکنگ بہت ہوگئی۔ اب کوئی علاج بھی بتائیں؟''

فرید سے پوچھا۔ ''بھوک لگتی ہے؟''

''نہیں لگتی۔''

''آنکھوں میں تیرے حرص ہے اور کہتا ہے بھوک نہیں لگتی؟'' یہ کہہ کر اپنی بات بڑھائی۔ ''تجھے معدے کی شدید گرمی ہے۔ گھی سے پرہیز کرنا ہے اور یہ علاج صرف آج کا ہے۔ کل کا علاج کل بتاؤں گا۔''

گلو نے اپنے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے میرے اور طارق دونوں کے بال گر رہے ہیں۔ میری تو خیر ہے مگر کشمیرن نے کسی سے کہا ہے کہ کسی سے بھی شادی کرسکتی ہوں سوائے اس کے جس کے بال جھڑ رہے ہوں۔''

''علاج تو میرے پاس سو فیصد سچا ہے۔ جو گر گئے ان کی واپسی کی بھی گارنٹی دیتا ہوں مگر یہ گارنٹی نہیں دیتا کہ کشمیرن طارق کو ملے گی۔''

''طارق میں کس چیز کی کمی ہے؟''

''صرف عقل کی۔ محبتیں تب پروان چڑھتی ہیں جب دل کے ساتھ عقل بھی کام کرے۔''

''پیار میں عقل کا کیا کام سائیں۔''

''دل کسی کو پسند کرتا ہے اور عقل اس کو حاصل کرنے کا منصوبہ بناتی ہے۔ عقل ہی بتاتی ہے کہ بات کس طرح سے کرنی ہے۔ اب کرنی ہے اور کب کرنی ہے؟ یہ تو منہ میں چنے ڈال کر بیٹھا ہے۔''

''سائیں علاج تو بتا؟''

''اللہ الشافی۔ ایک چمچ معجون سکندانہ اور اسگندھ ناگوری۔ دونوں کو ملا کر آٹے میں گوندھیں۔ گول ٹکیاں بنا کر رکھ لیں۔ ایک ایک ٹکی ہر روز کسی اصل اور اعلیٰ نسل مرغ کو صبح و شام کھلائیں۔ سات دن بعد مرغ پھڑکا دیں۔ خبردار اس کا زہریلا گوشت کوئی نہ کھائے بلکہ سیدھا میرے پاس لے آئیں۔ آسانی کے لیے میں نے دوائی تیار کرنی ہے۔ اب مرغ کے پنجوں کی یخنی نکالیں۔ اب اس یخنی کو اتنا ابالیں کہ پانی اڑ جائے اور نیچے صرف کالک رہ جائے۔ مڈی

UUNOVELS.COM

پہلوان سے صبح سویرے تازہ مکھن لے آئیں مکھن میں اس کالک کو ملا دیں۔ سر پر استرا پھروا کر صبح تہجد کے وقت یہ دونوں اس مکھن کا لیپ ٹنڈ پر کریں۔ اسی دوران پانی ابال کر اس میں گلاب کا عرق اور کنور ملائیں۔ پانی ٹھنڈا کر کے اس سے یہ دونوں نکلتے سورج کے سامنے بیٹھ کر اکٹھے سر دھوئیں۔ یہ علاج پورا مہینا چلے گا۔''

امتیاز نے پوچھا۔ ''پھر دونوں کو دفنانا کب ہے؟''

غصے بھرے لہجے میں بولا۔ ''اگلے روز۔''

گلو نے شکایت کی کہ یہ مرنے کا طریقہ بتایا ہے کہ بال بڑھانے کا؟''

تو جواب دیا۔ ''سوال نامعقول تو جواب بھی نامعقول۔''

امتیاز بولا۔ ''کنور سے تو مردے نہلائے جاتے ہیں۔ میں سمجھا مرنے کے بعد اس پانی سے انہیں غسل دینا ہے۔''

''جنڈری! اچھے بھلے سمجھ دار بندے ہو۔ کنور کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ سر کی گرمی دور ہو گی تو بال اگیں گے۔''

(نوٹ: یہ سائیں کے نسخے ہیں اور ہر کوئی اپنے رسک پر استعمال کر سکتا ہے۔ نہ ذمے دار ہے سائیں اور نہ رائٹر)۔

فرید نے اپنا ایک اور مسئلہ پیش کیا۔ ''کسی لڑکی کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں تو ہاتھ پاؤں لرزنے لگتے ہیں۔ دماغ سن ہو جاتا ہے۔''

''جنڈری اعمال قبیح سے دور رہو۔''

''مگر کیوں؟''

سائیں اسے خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''برے اعمال سے دور رہنے کا کہو تو انہیں موت پڑتی ہے۔''

شہزاد بولا۔ ''مجھے کبھی کبھی برے خیالات آتے ہیں۔''

''جنڈری! وہ تو سب کو آتے ہیں۔''

''سائیں میں چاہتا ہوں ہر روز آیا کریں۔''

''فکر نہ کرو۔ شروع میں کبھی کبھار آتے ہیں۔ جب دماغ شیطان کا گھر بن جائے گا تو روز آنے لگیں گے۔''

''مگر آتے کیوں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جگر کی گرمی ہے۔''

لطیف نے پوچھا۔ ''مجھے ہر لڑکی خوب صورت کیوں لگتی ہے۔''

''یہ دل کی گرمی ہے۔''

''ستار بولتا بہت ہے۔''

''یہ زبان کی گرمی ہے۔''

''مجھے ایک کی دو لڑکیاں نظر آتی ہیں۔''

''آنکھ کی گرمی ہے۔''

''کوئی ایسا نسخہ لائیں جس سے یہ ساری گرمیاں بڑھ جائیں؟''

''نسخہ ہے جنڈری! نسخہ ہے۔ آج خود پر آزماتا ہوں۔ کام کر گیا تو صبح انشاء اللہ سب کو بتاؤں گا۔ یاد سے مجھے یاد کرا دینا۔''

''سائیں ہمیں بھی نسخہ بتاؤ۔''

''نسخہ نہیں بتاتا۔ طریقہ بتا دیتا ہوں۔ نسخہ پڑی میں بنا کر لایا ہوں۔'' سائیں بالٹی قریب کر کے اس میں جھانکنے لگا۔ ''مچھ ٹراؤٹ بھی بہت ہیں۔ اکرام بنوں کا مسالا لگا کر کڑاہی میں اسے تلے گا۔ توے کی روٹی سے اکیلا کھاؤں گا۔ نسخہ کام کر گیا تو صبح حال لینا۔''

فرید بولا۔ ''سائیں تمہاری جان بہت قیمتی ہے۔ یہ نسخہ مجھ پر آزماؤ۔ بھلے دو مچھلیاں کم کر دو۔''

سائیں نے کہا۔ ''اسے استعمال کرنے سے پہلے دو جمعرات قبر میں بیٹھ کر وظیفہ کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کے فضل سے وہ کر کے آیا ہوں۔''

اتنے میں گھنگرو ایک بار پھر بجا اور سب دریا کی جانب دوڑے۔ ایک اور مچھلی ہاتھ لگی تھی۔ اتنے میں دو لڑکے بازار سے تندور کی روٹیاں اور چپلی کباب خرید کر لے آئے۔ اکرام کا وہی ملازم تھرماس میں ہمارے لیے چائے بھر کر لے آیا۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی۔

کسی نے پوچھا۔ ''میں جا رہا ہوتا ہوں اتنے میں ایک لومڑی بھاگ کر آتی ہے اور سامنے جھاڑی میں گھس جاتی ہے۔ مجھے تب سے برے خیالات آ رہے ہیں۔''

''اس کی تعبیر یہ ہے کہ تجھے ساس چین نہیں لینے دے گی۔''

''سائیں یہ خواب نہیں۔ سچا واقعہ ہے۔''

''جنڈری پھر تو ساس کے ساتھ ساتھ بیوی بھی تیری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دے گی۔''

سائیں فرید نے پوچھا۔ ''یہ جو انگوٹھی پہنی ہوئی ہے اس کا بھاری پتھر کوئی خاص ہے یا کہیں مفت میں ہاتھ لگا ہے۔''

فرید کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم احمقوں کو کیا معلوم کہ برج کیا ہوتے ہیں۔ ستارے کی برج میں کیا پوزیشن ہو تو کون سا پتھر مناسب رہتا ہے۔ یہ تیری کوئی منگنی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کی انگوٹھی نہیں کہ تیرا دل چاہا تو پہن لی اور دل بھرا تو اتار کر واپس کر دی۔"

گلو پیٹ پر خارش کرتے ہوئے بولا۔ "پیرا مجھے کون سا پتھر راس آئے گا؟"

"تیرے لیے پتھر نہیں ایک اینٹ ہی کافی ہے۔ دل کرتا ہے چکا کر (بچا کر) تیرے سر پر ماروں۔ تو سوشلسٹ بندہ، تجھے ان پتھروں اور برج ستاروں سے کیا لینا دینا؟ ہاں تو یہ پوچھ کہ خارش کے لیے کون سی ملم (مرہم) پیٹ پر لگاؤں۔"

"سائیں! مائیگ کا کوئی علاج؟"

اس کی جانب بغور دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "کوئی علاج نہیں جنڈڑی! سارے حربے آزما چکا ہوں۔ اب تو مرشد بھی کہتا ہے کہ سائیں اس کا گلا گھونٹ اور میرے پاؤں میں دفنا دے۔ جب وقت ملا تو اس کا علاج بھی ڈھونڈ لوں گا۔"

ہم دوستوں کی محفل گرم تھی۔ دریائے کنہار کے آس پاس ہمارے قہقہے گونج رہے تھے۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو پہاڑوں کی چوٹیاں دھوپ سے سنہری ہو رہی تھیں۔ دریا کے پانی یوں نظر آتے جیسے پگھلا سونا بہتا جا رہا ہو۔ جہاں میدانوں اور پہاڑوں پر سبزہ تھا، وہاں مخمل اور کمخواب کے رنگ بچھے تھے۔ درختوں کے سائے لمبے ہو کر دور کھسک رہے تھے۔ شاخیں پرندوں سے خالی ہونے لگیں۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تو ہم ہوٹل کی جانب چل پڑے۔ سائیں نے جو بالٹی اٹھائی تھی اس میں نو ٹراؤٹ مچھلیاں پڑی تھیں۔ اکرام حیرت سے بالٹی کے اندر جھانک رہا تھا کہ میں سمجھا تھا کہ شاید ایک مچھلی بھی ہاتھ نہیں آئے گی۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔

☆......☆

سب دوست کمروں میں سوئے تھے اور میں نے غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے اور ڈائننگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مجھے کوئی خبر نہ تھی کہ کنول واپس ناران پہنچ گئی ہے کہ وہ لوگ راستے میں ہیں۔ مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ اکرام سے پوچھتا کہ وہ لوگ کیا واپس آ گئے ہیں۔ بے چینی اور انتظار میں بیٹھا تھا۔ اکرام قریب سے گزرا تو اسے روک لیا۔

"اکرام بھائی! بابوسر روڈ پر خدانخواستہ حادثے تو نہیں ہوتے؟"

مسکرا کر بتایا۔ "اللہ کا کرم ہے نہیں ہوتے مگر خیریت ہے؟"

"نہیں ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔"

اپنی مسکراہٹ گہری کر کے بولا۔ "ایسے ہی پوچھ رہے ہیں؟"

میں اس کی مسکراہٹ کو کوئی معنی پہنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہنے لگا۔ "وہ لوگ ابھی واپس نہیں آئے مگر فکر نہ کریں سب خیریت سے ہیں۔"

وہ تو کہہ کر چلا گیا مگر میں کنول کی محبت میں ڈوبتا چلا گیا۔ ایک انجان بندے نے بھی ہمارے درمیان پیار کی ڈور دیکھ لی تھی۔ اکرام نے مجھے اس کے ساتھ جوڑا تو میں سرشاری میں کرسی پر ٹیک لگائے مسکرانے لگا۔

☆......☆

فرید اور شہزاد چائے پینے آئے۔ چائے کے بعد ہم تینوں باہر بازار میں آ نکلے۔ ادھر سورج ڈھل رہا تھا اور ادھر میرا انتظار بڑھنے لگا۔ میں نے تو یہیں بیٹھ کر ان کے آنے کی راہ دیکھی تھی مگر ان دو کے اصرار پر بازار کا چکر لگانے چل پڑے۔

وہاں رونق لگی تھی۔ سیاحوں کا رش کل کی نسبت زیادہ تھا۔ کھلی فضا اور ٹھنڈے موسم کی وجہ سے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ ریسٹورنٹس اور چائے خانے بھرے تھے۔ دکانوں پر بھی ہجوم نظر آتا تھا۔

میری نظر ایک ہوٹل کے سامنے پڑی تو وہاں کشمیرن کی تینوں سہیلیاں زمین پر بیگ رکھے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے شہزاد سے کہا۔ "گو لے دیکھ لگتا ہے ابھی پہنچی ہیں۔"

"یہ سڑک پر کھڑی کیا کر رہی ہیں؟"

فرید بھی انہیں نظروں سے جانچ رہا تھا۔ "سامان بھی ساتھ ہے۔ ہوٹل تلاش کر رہی ہوں گی۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "یار! ہم کتنے دنوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ سب بے زار اور تھکے بھی لگ رہے ہیں۔ کیوں ناں ان کو اپنے ہوٹل میں ٹھہراتے ہیں۔ ان کی مدد بھی ہو جائے گی اور ہماری آپس میں گپ شپ بھی رہے گی۔"

"تو ان کا کرایہ ہم دیں گے؟" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

"پاگل ہیں جو کرایہ دیں گے بلکہ ان سے کمائیں گے۔"

شہزاد بولا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے مگر ان کا بھائی بھی ساتھ ہو گا۔''

فرید نے کہا۔ ''اس کے لیے تو سائیں بھی بہت ہوگا۔'' شہزاد نے کہا۔ ''مگر ہماری آزادی ختم ہو جائے گی۔''

''کون سی آزادی۔ ہم کون سی عیاشیاں کررہے ہیں یا ہم نے کرنی ہیں؟''

''ویسے مجھے وہ لڑکی جس نے ہماری جیکٹ پہنی ہے اچھی بھی لگتی ہے۔'' شہزاد نے دل کی بات کی۔

''تو چل ٹلر دکھا اپنا چکسار......'' فرید نے کہا۔

☆......☆

''السلام علیکم!'' شہزاد نے اتنے زور سے کہا کہ آس پاس کے لوگ بھی چونک پڑے۔ انہوں نے پہلے ہمیں بغور دیکھا اور جب اچھی طرح سے پہچان گئیں تو مسکرانے لگیں۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی گئی۔ وہ لوگ کچھ دیر پہلے پہنچے تھے۔ کشمیرن اور اس کا بھائی سامنے ہوٹل کے کمرے دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ یہ باہر کھڑی انتظار کررہی تھیں۔

باتیں کرتے کرتے شہزاد نے خالدہ سے کہا۔ ''اچھا کیا آپ بھی ان کے ساتھ آ گئیں۔ ورنہ ناران بجھا بجھا لگ رہا تھا۔''

وہ غصے سے اپنے ہونٹ کاٹتی شہزاد کو گھورنے لگی۔

فرید نے شہزاد سے پوچھا۔ ''ان کے آنے سے ناران تبدیل ہوگیا ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''تبدیل تو نہیں ہوا جب تک مسکرائیں گی نہیں۔''

''کیوں مسکرائے تمہارے لیے۔ تم کون سے اس کے سگے ہو۔''

''سگا نہیں مگر انسانیت کا رشتہ تو ہے۔ ہمارا مذہب بھی کہتا ہے مسکرا کر دیکھنا بھی صدقہ ہے۔ تو کچھ نہیں صدقہ ہی دے دے۔''

خالدہ کا رنگ سرخ ہونے لگا تو شہزاد باقی دو لڑکیوں سے مخاطب ہوا۔

''یہاں کون سا ڈاکو راج ہے جو بھائی کو حفاظت کے لیے ساتھ لے آئیں؟''

ان کے جواب دینے سے پہلے فرید شہزاد سے بولا۔ ''اچھا کیا لے آئیں۔ دیکھنا یہ تینوں اس بے چارے کو بھائی کہہ کہہ کر پاگل کردیں گی۔ ہماری جان چھوٹی رہے گی۔''

''اس اینگل سے تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔'' شہزاد فرید کو شاباش دینے لگا۔ ''تو جینئس ہے دوست۔''

وہ سب محو حیرت کھڑیں ہمارے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ کیونکہ جو باتیں لڑکے پیٹھ پیچھے کرتے ہیں وہ ہم لڑکیوں کے سامنے کررہے تھے۔

فرید نے اب ثروت کی جانب رخ کیا۔ ''یہ ٹوپی تو اتار دیں۔ اتنی سردی نہیں جتنی آپ کو لگ رہی ہے۔''

پھر شہزاد دوبارہ خالدہ کی جانب مڑا۔ ''آپ بھی یہ ہماری جیکٹ مجھے پکڑا دیں۔ پہنے پہنے تھک گئی ہوں گی۔''

ثروت نے کہا۔ ''ہم سمجھے تھے یہاں بہت زیادہ سردی ہوگی۔''

فرید ان سے بولا۔ ''کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے کہ قطب شمالی صاحب ان دنوں ناران آئے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اکرام بتا تو رہا تھا کہ چند ماہ پہلے تک وہ ناران میں تھے۔ ان دنوں بابوسر ٹاپ گئے ہوئے ہیں۔''

اتنے میں ہم نے دیکھا کہ کشمیرن سامنے ہوٹل سے نکل کر ہماری جانب چلی آرہی ہے۔ چہرے پر بیزاری، تھکاوٹ اور پریشانی چھائی تھی مگر ہماری توجہ کا مرکز کشمیرن نہیں اس کا بھائی تھا۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ اس کا بھائی کوئی لمبا تڑنگا اور مونچھوں والا کشمیری بٹ ہوگا مگر وہ تو بے چارہ سا، دبلا پتلا اور شرمایا ہوا سا لڑکا تھا جو بہن کے پیچھے سر کو جھکائے چلا آرہا تھا۔ عمر میں ہم سے چھوٹا تو تھا ہی مگر چہرے پر وہ معصومیت تھی کہ فرید بولا۔ ''لگتا ہے بہن اپنے بھائی کو ناران گھمانے لائی ہے۔''

شہزاد نے لڑکیوں سے کہا۔ ''اگر حفاظت کے لیے یہ بھائی لے آئی ہیں تو ابھی فون کر کے اس جیسے تین چار بھائی اور منگوا لیں۔''

میں نے طاہرہ سے کہا۔ ''آپ ایسا کریں کہ سائیں کو اپنا بھائی بنالیں۔''

فرید بولا۔ ''رہنے دو۔ ورنہ وہ ہم سب کو واقعی چیر کر رکھ دے گا۔''

وہ تینوں منہ کھولے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

اتنے میں کشمیرن ہمارے قریب پہنچ گئی۔ ہمیں اس نے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پرمسرت لہجے میں بولی۔ ''آپ لوگ ادھر کیا کررہے ہیں؟''

فرید نے کہا۔ ''ہم اس دور کے فرہاد ہیں، یہاں نہر

کھودنے کا ٹھیکا لیا ہے۔"

وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ "مذاق بھلے بعد میں کرلیں۔ پہلے ہمیں کوئی ہوٹل ڈھونڈ دیں۔ اس کے کمرے بہت چھوٹے تھے۔"

شہزاد نے توقیر کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "یہ بچہ آپ کا بھائی ہے؟"

"شہزاد بھائی! یہ بچہ نہیں ایف ایس سی کا امتحان دے چکا ہے۔"

وہ لڑکا مسکرا رہا تھا بعد میں معلوم ہوا اس کا نام توقیر ہے۔

میں نے توقیر سے پوچھا۔ "آپ ایبٹ آباد میں پڑھتے ہیں۔"

"نہیں کراچی میں پڑھتا ہوں۔ بہن نے فون کر کے بلالیا کہ ہمارے ساتھ ناران چلو۔"

فرید نے کہا۔ "جب کراچی سے آرہے تھے تو ان باقی بہنوں کے ساتھ آجاتے۔"

وہ بولا۔ "مجھے تو معلوم نہیں تھا۔ میں تو رات فلائٹ سے اسلام آباد پہنچا ہوں۔"

ہم تینوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "جہاز سے آئے ہو؟"

وہ خاموش کھڑا ہمارا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ہم طارق کی قسمت پر ناز کر رہے تھے کہ کتنی امیر لڑکی سے محبت کرنے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ اسے پھنسانے کے جتن کر رہا ہے۔

کشمیرن بولی۔ "شہزاد بھائی! اب ہوٹل دکھانے لے چلنا ہے کہ نہیں؟"

ہم نے ان کا سامان اٹھایا اور اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑے۔

راستے میں شہزاد نے خالدہ سے پوچھا۔ "لگتا ہے آپ تھک گئی ہیں؟"

وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "تھک گئی ہوں تو پھر؟"

"تو تانگہ کر لیتے ہیں۔"

"ناران میں کیا تانگے چلتے ہیں۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"وہ تو نہیں چلتے۔"

"پھر کیا کہوں؟"

"اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہیں تانگہ نہیں تو رکشا کر لیتے ہیں۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ "یہاں رکشے چلتے دیکھے ہیں؟"

"وہ تو نہیں دیکھے۔"

چلا کر بولی۔ "پھر کیوں کہا کہ رکشا کر لیتے ہیں۔"

"آپ ہر بات پر خفا کیوں ہو جاتی ہیں۔ کچھ نہیں کرتے بس پیدل چلتے ہیں۔ اب خوش؟" وہ لاچارگی سے کشمیرن کو دیکھنے لگی۔

"شہزاد بھائی میری دوست کو تنگ نہ کریں۔ انہیں آپ لوگوں کی عادتوں کا پتا نہیں ہے۔" اتنے میں ہم ہوٹل پہنچ گئے۔

شہزاد اور اکرام ان کو کمرا دکھانے لے گئے۔ میں ڈائننگ روم میں رک گیا۔ مجھے کنول کا انتظار تھا۔ معلوم نہیں وہ لوگ ناران پہنچ چکے تھے یا پھر ابھی راستے میں تھے۔

اتنے میں شہزاد اور اکرام انہیں کمرا دکھا کر واپس آئے۔ لڑکیاں کمرا دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ بتا رہی تھیں کہ کمرا بڑا ہے اور پانچ بیڈ لگے ہیں۔ کشمیرن کو اپنے بھائی کی فکر تھی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ ایک کمرے میں نہیں سونا چاہتا تھا۔ وہ بھائی سے کہہ رہی تھی۔ "کیا تمہیں اکیلے کمرے میں سونے دوں؟"

وہ بولا۔ "تو کیا ہوا۔ اکیلا سفر کر سکتا ہوں تو اکیلا سو نہیں سکتا؟"

میں نے تجویز دی۔ "ہمارے ہر کمرے میں ایک ایک بیڈ خالی پڑا ہے۔ یہ ہم لوگوں کے ساتھ سو جائے گا اور اسی طرح بور بھی نہیں ہوگا۔"

کشمیرن کے چہرے پر چمک آگئی۔ وہ تو شاید اسی انتظار میں کھڑی تھی کہ ہم یہ آفر کریں مگر رسماً بولی۔ "ندیم بھائی! اچھا نہیں لگتا۔ آپ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔"

"رسمی باتیں چھوڑیں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ خالی پلنگ پڑے ہیں تو یہ بھی سو جائے گا۔"

☆......☆

لڑکیوں کا سامان ان کے کمرے کے باہر رکھا اور توقیر کو لے کر اپنے نہیں بلکہ طارق کے کمرے میں آیا۔ اسے خالی پلنگ پر بٹھایا۔ طارق، امتیاز اور گلو رضائیاں اوڑھے سو رہے تھے۔ وہ چشمے کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں جھپکاتا مجھے دیکھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا طارق کو یہ سرپرائز کس طرح سے دوں؟ مجھے معلوم نہ تھا کہ کچھ دیر بعد ایسا کچھ ہو جائے گا۔

(جاری ہے)

لمبی چھلانگ

طارق عزیز خان

چاند پر انسان کے قدم پہنچے اس خبر کو سب نے سنا یقین کیا پھر بھی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تاویل دیتے ہیں کہ اپالو جب چاند پر پہنچا۔ اور نیل آرمسٹرانگ نے امریکی جھنڈا چاند کی زمین پر نصب کیا تو وہ ہوا سے لہرا رہا تھا جبکہ چاند پر ہوا کا نام و نشان نہیں پھر بھی ایک بڑا طبقہ یہ کہتا ہے کہ اپالو نے چاند پر اترکر چہل قدمی کی ہے، صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے سے قبل اس معلوماتی تحریر کو ملاحظہ کرلیں۔

معلومات حاصل کرنے کے شائقین کے لیے تحفہ

چند دن پہلے ٹی وی پر امریکی خلائی ادارے ناسا کی ایک رپورٹ دکھائی گئی جس کے مطابق سال 2020ء میں دنیا بھر میں دو سورج گرہن اور چار چاند گرہن ہوں گے۔ سال کا پہلا چاند گرہن 10 جنوری جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب رات 10 بج کر 5 منٹ پر ہوا۔ یہ چاند گرہن پاکستان سمیت جنوبی ایشیا کے بیشتر حصوں میں دیکھا گیا۔ سال کا دوسرا چاند گرہن 5 جون کی رات، تیسرا چاند گرہن 5 جولائی جبکہ چوتھا چاند گرہن 30 نومبر کی رات ہوگا۔ سن 2020ء کا

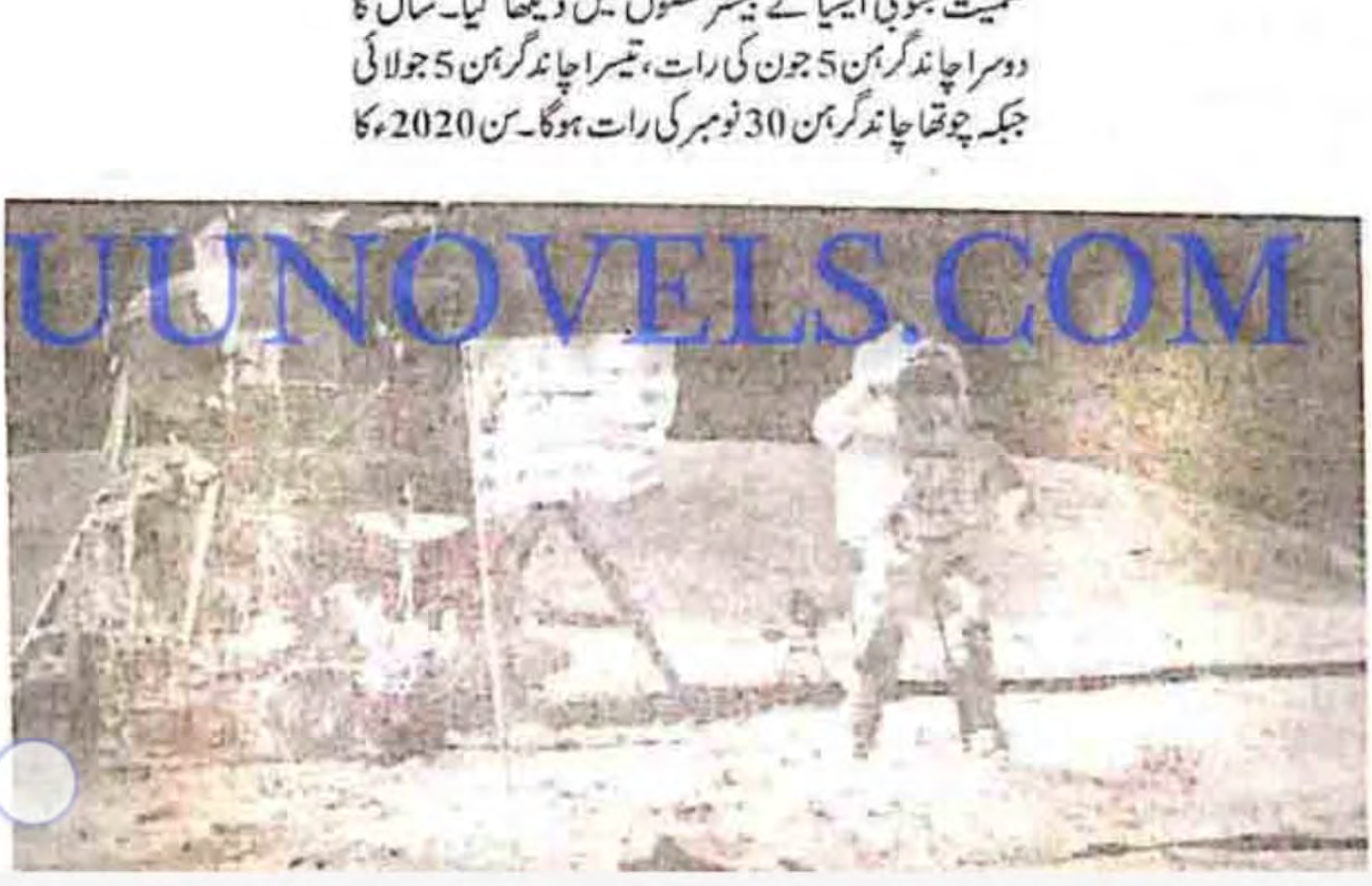

UUNOVELS.COM

پہلا سورج گرہن 21 جون کو صبح 8 بج کر 44 منٹ پر شروع ہوگا۔ یہ بھی پاکستان میں صاف دکھائی دے گا جب کہ دوسرا سورج گرہن 13 دسمبر کو ہوگا جو کہ مغربی نصف کرے میں دیکھا جاسکے گا۔

ٹی وی پر یہ رپورٹ دیکھ کر میرے دماغ میں چاند سورج اور زمین کے بارے میں صدیوں پہلے کے انسانی نظریات پر جیسے فلم چلنے لگی۔ ہمارے آباؤ اجداد کے نزدیک زمین چپٹی اور کائنات کا مرکز تھی جبکہ چاند سورج اور ستارے اس کے گرد گھومتے تھے۔ ان کے نزدیک چاند اور سورج دیوتاؤں کی حیثیت رکھتے تھے جن کی باقاعدہ عبادت کی جاتی تھی۔ تمام تاریخ انسانی میں اس بات پر یقین قائم رہا کہ چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ البتہ قدیم لوگ چاند کو سورج کی طرح کا آتشی گولا خیال کرتے تھے جس کی اپنی روشنی تھی۔ یونانی ماہر فلکیات اناکساغورث وہ پہلا شخص تھا جس نے 450 قبل مسیح میں یہ تصور پیش کیا کہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں وہ منعکس روشنی سے چمکتا ہے۔ یونانی ہی وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے کرۂ ارض کے گول ہونے کا خیال پیش کیا۔ قریب 240 قبل مسیح میں ارسطو نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''افلاک پر'' زمین کے گول ہونے کے بارے میں دلائل دیے۔ تاہم وہ چاند اور سورج کی گردش کے بارے میں کوئی واضح مؤقف پیش نہ کرسکا۔ آنے والی صدیوں کے دوران بنی نو انسان کی ساری توجہ کرۂ ارض کے دور دراز علاقوں کی دریافت تک مرکوز رہی۔ 1492ء میں کولمبس کے ہاتھوں امریکا کی دریافت اور 1521ء میں ہسپانوی مہم جو فرڈی نینڈ میگلین کے کرۂ ارض کے گرد کامیاب چکر کے بعد زمین کے زیادہ بہتر اور مستند نقشے تیار کیے گئے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک کرۂ ارض کا... کوئی خطہ ایسا نہ تھا جہاں انسانی قدم نہ پہنچے ہوں۔ سیارہ زمین کی مکمل دریافت کے بعد بنی نو انسان نے چاند تک رسائی کی کوششوں کا آغاز کیا جو کائنات میں ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ ہے۔ ان کوششوں کا آغاز اور نقطۂ عروج ہی ہمارا آج کا موضوع ہے۔

چاند، کرۂ ارض کا ایک سیارچہ ہے جس کا قطر 3480 کلومیٹر (2163 میل) اور وزن زمین کے وزن کا 1.2 فیصد ہے۔ یہ زمین سے 3 لاکھ 84 ہزار 3 سو 99 کلومیٹر (238854 میل) کے فاصلے پر ہے۔ یہ زمین کے مدار میں 27 دن 7 گھنٹے 43 منٹ میں ایک چکر پورا کرتا ہے جبکہ ایک قمری مہینا 29 دن 12 گھنٹے 44 منٹ اور 2.9 سیکنڈ کا ہوتا ہے۔ دن کے وقت وہاں سخت گرمی اور رات کے وقت سخت سردی ہوتی ہے اور موسم کا یہ اختلاف صرف ایک گھنٹے کے اندر واقع ہوجاتا ہے۔ اگرچہ چاند اور کرۂ ارض بہت قریبی طور پر وابستہ ہیں لیکن ان میں کچھ واضح فرق پائے جاتے ہیں۔ چاند پانی، ہوا اور زندگی سے عاری ہے۔ اس کی سطح تصادمی گڑھوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ گڑھے اربوں سال قبل ہونے والی شہاب ثاقب کی بارش کا نتیجہ ہیں چونکہ چاند کی فضا، ہوا اور بارش سے پاک ہے اس لیے وہاں قدموں کے نشان لاکھوں سال تک اپنی جگہ جمے رہیں گے۔ چاند کے کچھ نقوش کھلی آنکھ سے بھی دیکھے جاسکتے ہیں مگر چھوٹی ٹیلی اسکوپ کافی کچھ تفصیل سے دیکھنا ممکن بنا دیتی ہے۔ زمین سے ہمیں ہمیشہ چاند کا ایک ہی رخ نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کی محوری گردش اور زمین کے مدار میں گردش کا دورانیہ ایک ہی ہے۔ زمین سے چاند کی سطح کے 59 فیصد حصے کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، تاہم ایک وقت میں چاند کی سطح کے 41 فیصد حصے سے زیادہ دیکھنا ممکن نہیں۔ اگر زمین چاند اور سورج کے درمیان آجائے تو چاند گرہن لگتا ہے جبکہ سورج اور زمین کے درمیان چاند آجانے سے سورج گرہن ہوتا ہے۔ چاند سے زمین کو دیکھیں تو یہ ہمیشہ اوپر آسمان کی طرف نظر آتی ہے۔ چاند کی کشش کرۂ ارض کے سمندروں میں مدوجزر کا باعث بنتی ہے۔ چاند کی ہیئت کے متعلق مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ ایک سیارہ تھا جو چلتے چلتے زمین کے قریب بھٹک آیا اور زمین کی کشش ثقل نے اسے اپنے مدار میں ڈال لیا۔ ماضی میں یہ نظریہ بہت مقبول رہا ہے لیکن اس میں سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایسا ممکن ہونے کے لیے چاند کو ایک خاص رفتار اور خاص راستے پر چل کر زمین کے قریب آنا ہوگا جس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالیہ خلائی تحقیق کے مطابق 4.6 بلین سال پہلے ایک دم دار ستارہ دھماکے سے زمین کے ساتھ ٹکرایا جس سے دم دار ستارے اور زمین کی سطح کا بہت سا مادہ تبخیر ہوکر زمین سے نکل گیا۔ آہستہ آہستہ یہ مادہ زمین کے مدار میں گھومنے لگا اور مسلسل گھومنے کی وجہ سے چاند کی گول شکل اختیار کرگیا۔ پانی اور ایسے عناصر جو آسانی سے اڑ سکتے تھے باہر نکل گئے جبکہ باقی چاند کا حصہ بن گئے۔

چاند کے بارے میں ابتدائی تحقیقات گلیلیو

(1564-1642) نے 1609ء میں کیں۔ اس نے بتایا کہ چاند ہماری زمین کی طرح ایک کرہ ہے جہاں پہاڑ اور آتش فشاں کے دہانے موجود ہیں۔ اگلی چار صدیوں تک آسمان پر چمکتے چاند کی ہیئت، زمین سے فاصلے اور وہاں کی آب و ہوا سے متعلق نت نئے اندازے قائم کیے جاتے رہے۔

دوسری جنگ عظیم (1939-1945) کے بعد دنیا کی بساط پر امریکا اور سوویت یونین دو بڑی فوجی طاقتوں کے طور پر ابھرے۔ دونوں ممالک کے درمیان شروع ہونے والی سرد جنگ خلائی دوڑ خاص کر چاند تک رسائی کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ امریکا اور سوویت روس کے سائنس دانوں نے ایک دوسرے سے پہلے خلا کو مسخر کرنے کے لیے مہمات ترتیب دیں۔ سوویت یونین وہ پہلا ملک تھا جس نے 4 اکتوبر 1957ء کو دنیا کا پہلا مصنوعی سیارہ Sputnik 1 کامیابی سے زمین کے مدار میں بھیجا۔ اس دوران سوویت یونین نے چاند تک رسائی کا پروگرام (Luna Space Program) شروع کیا۔ اس پروگرام ہی کی وجہ سے چاند کو لونار (Lunar) کے خلائی نام سے منسوب کیا گیا۔

سوویت یونین نے 2 جنوری 1959ء کو Luna-1 لانچ کیا۔ 13 ستمبر 1959ء کے دن Luna-2 چاند کی سطح سے ٹکرایا۔ لونا ٹو کے توسط سے چاند کی خلاء سے کھینچی گئی اولین تصویر زمین پر موصول ہوئی۔ 4 اکتوبر 1959ء کو لونا تھری کے توسط سے چاند کی دوسری طرف کی تصاویر اتاری گئیں۔

سوویت روس کے مقابلے میں امریکا باقاعدہ طور پر 31 جنوری 1958ء کو خلائی دوڑ میں شامل ہوا جب اس نے اپنا پہلا مصنوعی سیارہ Explorer-1 اور 7 اگست 1959ء کو دوسرا سیارہ زمین کے مدار میں بھیجا۔ خلائی دوڑ کے حوالے سے سوویت یونین کو پہلی نمایاں کامیابی 12 اپریل 1961ء کو حاصل ہوئی جب دنیا کے پہلے انسان بردار خلائی جہاز ووسٹک ون (Vostok-1) نے زمین کے مدار میں 108 منٹ کی کامیاب پرواز کی۔ اس جہاز کا پائلٹ یوری گیگ رین خلا تک رسائی حاصل کرنے والا پہلا انسان تھا۔ 5 مئی 1961ء کو امریکی خلائی تحقیق کے ادارے ناسا (نیشنل ایرو ناٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن) نے امریکا کا پہلا انسان بردار مصنوعی سیارہ Freedom-7 زمین میں مدار میں روانہ کیا۔ اس سیارے کا پائلٹ ایلن شیپرڈ (1923-1998) تھا۔ فریڈم سیون نے 15 منٹ کی پرواز کے دوران خلاء میں 185 کلومیٹر کی بلندی تک رسائی حاصل کی لیکن وہ زمین کے مدار میں چکر لگانے میں ناکام رہا۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں امریکا کے 35ویں صدر جون ایف کینیڈی (20 جنوری 1961ء سے 22 نومبر 1963ء) نے 25 مئی 1961ء کو چاند تک رسائی کا Apollo پروگرام شروع کرنے کا اعلان کیا۔ ان کی ذاتی دلچسپی اور تحریک پر امریکی کانگریس نے اپالو منصوبے کے لیے 24 ارب ڈالر کی خطیر رقم منظور کی۔ بعض حلقوں نے اس قدر خطیر رقم سے چاند کی ٹکٹ کے حصول کو قوم کی دولت لٹانے کے مترادف قرار دیا، تاہم کینیڈی خم ٹھونک کر ناسا کی پشت پر کھڑے رہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہم اس دہائی میں چاند پر اتر کر کامیابی سے واپس آئیں گے۔ 22 نومبر 1963ء کو کینیڈی کی ناگہانی موت سے پوری امریکی قوم سکتے میں تھی کہ نئے امریکی صدر لنڈن بی جانسن (1963-65 اور 1965-69) نے قوم کا حوصلہ بڑھایا۔ انہوں نے فلوریڈا میں واقع اسپیس سینٹر کو کینیڈی کے نام سے منسوب کیا اور کینیڈی کے ادھورے مشن کو مکمل کرنے کا اعلان کیا۔ ادھر 3 فروری 1966ء کو سوویت مصنوعی سیارے Luna-9 نے چاند کی سطح پر اترنے کا پہلا کامیاب مظاہرہ کیا جبکہ 3 اپریل 1966ء کو Luna-10 کی طرف سے چاند میں مدار میں لگائے گئے پہلے کامیاب چکر سے سوویت یونین خلائی دوڑ میں امریکا سے کہیں آگے نکل گیا۔

اگلے چند ماہ کے دوران سوویت مصنوعی سیاروں Luna-16,20,24 نے چاند کی سطح سے مٹی کے نمونے جمع کیے۔ 27 جنوری 1967ء کو اپالو پروگرام کے سلسلے میں ناسا کے مصنوعی سیارے Apollo-1 نے زمین کے مدار میں کامیاب پرواز کی۔ 27 دسمبر 1968ء کا دن ناسا کی تاریخ کا یادگار دن تھا جب دنیا کے پہلے انسان بردار خلائی جہاز Apollo-8 نے چاند کے مدار میں کامیاب چکر لگایا۔ چاند کے مدار میں انسان کی رسائی امریکا کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس نے خلائی دوڑ کے حوالے سے سوویت یونین پر اپنی دھاک قائم کر دی۔ تاہم روسی سائنس دانوں نے یہ کہہ کر اپنی حکومت کو تسلی دی کہ ابھی امریکا کے پاس وہ ٹیکنالوجی نہیں ہے جسے استعمال کر کے وہ چاند پر انسان کو اتار سکے۔ ان کے خیال میں چاند پر انسان کو اتارنے سے زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ چاند کی سطح سے خلائی شٹل کو چاند کے مدار میں واپس کیسے لایا جائے؟ روسی سائنس دان امریکا سے پہلے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں جتے ہوئے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھے کہ 21 اپریل 1969ء کے دن دنیا کے کروڑوں لوگوں نے اپنی ٹیلی ویژن اسکرین پر انسانی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ نشر ہوتے دیکھا۔ سفید لباس پہنے امریکی خلا باز نیل آرمسٹرانگ نہایت سکون کے ساتھ چاند کی سطح پر اترا اور اس نے وہاں امریکا کا پرچم نصب کیا۔

نیل ایلڈن آرمسٹرانگ 5 اگست 1930ء امریکی ریاست اوہائیو کے شہر واپاکونیٹا میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام کوئنگ آرمسٹرانگ اور ماں کا ویولا لوئس اینگل تھا۔ وہ اپنے والدین کی تین اولادوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس نے 16 سال کی عمر میں ایک مقامی فلائنگ کلب سے ہوا بازی کی تربیت حاصل کی۔ وہ 26 جنوری 1949ء کو امریکی بحریہ میں بھرتی ہوا۔ اس نے جنگی جہاز USS Wright اور USS Cabot پر ذمے داریاں انجام دیں۔ 12 اگست 1950ء کو اس کی نیول ایوی ایٹر کے عہدے پر ترقی ہوگئی جس کے بعد اسے بحرالکاہل کی امریکی بندرگاہ سان ڈیاگو میں تعینات کردیا گیا۔ سان ڈیاگو میں نیل آرمسٹرانگ نے ابتدائی طور پر F9F-25 Panther لڑاکا طیارہ اڑنے کی مشق کی۔ اس نے 29 اگست 1951ء سے 23 اگست 1952ء کے دوران جنگ کوریا میں اپنی ہوابازی کی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ کوریا کی جنگ میں خدمات کے اعتراف میں اسے کورین سروس میڈل، گولڈ اسٹار اور ایئر میڈل دیئے گئے۔ واپس آنے کے بعد نیل آرمسٹرانگ نے بحریہ کے وظیفے پر ریاست انڈیانا کے شہر ویسٹ لیفائیٹ میں قائم پرڈیو یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں سے اس نے 1955ء میں ایروناٹیکل انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے فوراً بعد وہ کلیولینڈ میں واقع نیشنل ایڈوائزری کمیٹی فار ایروناٹکس (NACA) کے لیوس ریسرچ سینٹر سے وابستہ ہوگیا۔

اسی سال اس کا تبادلہ ایڈورڈ ایئرفورس بیس کیلی فورنیا NACA کے فلائٹ ریسرچ سینٹر میں کردیا گیا۔ ریسرچ سینٹر میں نیل آرمسٹرانگ کے خداداد جوہر کھل کر سامنے آئے اور اس نے بطور ٹیسٹ پائلٹ 900 بار پرواز کی۔ اس نے F-100 Super Sabre، F-101 Voodoo اور F-104 A Starfighter لڑاکا طیاروں کو ان کی انتہائی رفتار پر اڑانے کا مظاہرہ کیا۔ مارچ 1962ء میں ہوا بازی میں نیل آرمسٹرانگ کی مہارت کو دیکھتے ہوئے اسے خلائی تحقیق کے ادارے ناسا کے تحت مستقبل کی خلائی پروازوں کی تربیت کے پروگرام میں شامل کرایا گیا۔ چند ماہ کی تربیت کے دوران اس کا نام 6 بہترین پائلٹس میں شامل کیا گیا جو خلائی پروازوں کے لیے موزوں تھے۔ 13 ستمبر 1962ء کا دن نیل آرمسٹرانگ کی زندگی کے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جب وہ ناسا کے چاند تک رسائی کے Apollo پروگرام سے وابستہ ہوا۔

ناسا سے تربیت مکمل کرنے کے بعد آرمسٹرانگ کا نام خلائی جہاز Gemini-5 کے متبادل عملے میں شامل کردیا گیا۔ بعد میں اسے Gemini-8 کی کمان دی گئی۔ اس کے ساتھ اس خلائی جہاز میں ڈیوڈ آر اسکاٹ بھی شامل تھا۔ یہ مشن 16 جولائی 1966ء کو خلا میں روانہ ہوا۔ اس مشن کا مقصد زمین کے مدار میں پہلے سے موجود مصنوعی سیارے کے ساتھ تکنیکی رابطہ قائم کرنا تھا۔ بطور خلا باز یہ آرمسٹرانگ کی صلاحیتوں کا پہلا کڑا امتحان تھا۔ اس نے زمین سے 298 کلومیٹر کی بلندی پر 6 گھنٹے 34 منٹ کی کڑی محنت کے بعد Agena booster کے ذریعے دونوں مصنوعی سیاروں کا تکنیکی رابطہ ممکن بنایا۔ آرمسٹرانگ کے کام مکمل کرنے کے 30 منٹ بعد غیر متوقع طور پر دونوں مصنوعی سیاروں کا زمین سے رابطہ ختم ہوگیا اور انہوں نے بغیر کسی کمان کے ازخود کام کرنا شروع کردیا۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ آرمسٹرانگ اور زمین پر موجود کنٹرول روم دونوں ہی سیاروں کو کنٹرول کرنے کی سبیل کرنے لگے۔ اس دوران Gemini-8 کا 75 فیصد فیول ضائع ہوگیا، تاہم خیریت رہی اور جلد ہی خرابی کو دور کرکے خلابازوں کو زمین پر اتار لیا گیا۔ 27 جنوری 1967ء کو Apollo-1 کی لانچنگ کے وقت نیل آرمسٹرانگ واشنگٹن میں تھا۔ آرمسٹرانگ نے اگلی اہم ذمے داری Gemini-11 اور Apollo-8 مصنوعی سیاروں کے متبادل عملے کے طور پر سرانجام دی۔ اپالو آٹھ پہلا انسان بردار خلائی سیارہ تھا جس نے 27 دسمبر 1968ء کو چاند کے مدار میں کامیاب چکر لگایا۔ اس مشن کی کامیابی کے بعد ناسا نے Apollo-11 مشن کو چاند پر اتارنے کا فیصلہ کیا۔

اپالو گیارہ کا کپتان نیل ایلڈن آرمسٹرانگ تھا جب کہ اس کے ساتھ اس مشن پر ایڈون بز ایلڈرین اور مائیکل ایلین کولنز معاونین کے طور پر تھے۔ اس مشن کا مقصد انسان کو چاند پر لے جانا اور بحفاظت زمین پر واپس لانا تھا۔ ناسا اور اپالو گیارہ کا عملہ دونوں ہی کو اس مشن کی اہمیت کا احساس تھا۔ وہ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

جانتے تھے کہ غیر کمیونسٹ دنیا کے لیے اس مشن کی کامیابی کیا اہمیت رکھتی تھی؟ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت تک ان کا حریف سوویت یونین خلائی دوڑ میں ان سے کہیں آگے تھا۔ سوویت روس کی طرف سے آئے دن ایٹمی میزائلوں کے تجربے اور خلا میں ایک سے بڑھ کر ایک راکٹ روانہ کرنے سے امریکی عوام کے حوصلے پست تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ ان کے شہر روسی میزائلوں کی زد میں ہیں۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر ان کے ملک نے جلد ہی سوویت روس کو منہ توڑ جواب نہیں دیا تو کرخت چہرے والے روسی فوجی ان کی سڑکوں اور گلیوں میں دندناتے پھریں گے۔ ناسا کی تاریخ میں یہ واحد مشن تھا جس میں ٹیکنالوجی سے زیادہ اس سے وابستہ انسانوں کی اہمیت تھی۔ ناسا کو اندازہ تھا کہ اس وقت تک مصنوعی سیارے کو خلا میں پہنچانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، ہاں اگر اہمیت تھی تو اس پر سوار انسان کی جسے چاند پر اتار کر بحفاظت زمین پر واپس لانا تھا۔ چاند جو زمین سے لگ بھگ پونے چار لاکھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا وہاں اب تک کوئی ذی روح نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی وہ انسان دوست سیارہ تھا۔ وہاں کی فضاؤں، ماحول، آسمان اور زمین سے اجنبیت جھلکتی تھی۔ غرض یہ کہ اپالو گیارہ ایک ایسا مشن تھا جس میں غلطی کی ایک فیصد بھی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں غلطی کا مطلب تین انسانوں کی موت اور امریکی قوم کے آہنی ارادوں کی شکست تھا۔

اپالو گیارہ مشن کے تحت خلائی شٹل کولمبیا 16 جولائی 1969ء کی دوپہر 1 بج کر 35 منٹ پر کینیڈی اسپیس سینٹر فلوریڈا سے روانہ ہوئی۔ اس نے پہلے پہل زمین کے مدار میں چکر لگائے۔ وہ 20 جولائی کے دن چاند کے مدار میں داخل ہوئی۔ اس نے چاند کے مدار میں 14 چکر لگائے جس کے بعد کولمبیا سے ایگل (Eagle) نامی مصنوعی سیارہ الگ ہوکر چاند کی سطح کی طرف روانہ ہوا۔ اس سیارے میں نیل آرمسٹرانگ اور بز ایلڈرین سوار تھے جبکہ ان کا ساتھی مائیکل کولنز چاند کے مدار میں چکر لگا رہی کولمبیا کو کنٹرول کر رہا تھا۔ ایگل تین گھنٹے سفر کے بعد رات 8 بج کر 17 منٹ 40 سیکنڈ (UTC اسٹینڈرڈ ٹائم) پر چاند کی سطح پر واقع مقررہ مقام Sea of Tranquility کے علاقے میں اتر گیا۔ نیل آرمسٹرانگ اور ایڈون ایلڈرین نے کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے ایگل کو تیار حالت میں رکھا۔ رات 10 بج کر 56 منٹ (Eastern Daylight Time) پر اپالو مشن کے کمانڈر نیل آرمسٹرانگ نے بطور پہلے انسان چاند

اپالو گیارہ مشن کی اہم خصوصیات

مشن کا نام pollo-11

خلائی شٹل کا نام CSM: Columbia:

چاند پر اترنے والا خلائی جہاز کا نام :L.M Eagle in-flight

مشن سے متعلق فلائنگ مشین کا کل وزن 43895 کلوگرام

عملے کی تعداد: 3 (نیل آرمسٹرانگ، ایڈون ایلڈرین، ایلین کولنز)

بوسٹر کی قسم Saturn V SA-506

لانچ پیڈ کینیڈی اسپیس سینٹر فلوریڈا، امریکا

لانچ کی تاریخ 16 جولائی 1969ء، وقت دوپہر 1 بج کر 32 منٹ

چاند پر لینڈنگ 20 جولائی 1969ء، وقت رات 8 بج کر 17 منٹ 40 سیکنڈ (UTC اسٹینڈرڈ ٹائم)

چاند پر لینڈنگ کا مقام Sea of Tranquility

چاند پر مشن کا دورانیہ 2 گھنٹے 36 منٹ 40 سیکنڈ

چاند کی سطح پر صرف کیا گیا وقت 2 گھنٹے 31 منٹ 20 سیکنڈ

چاند پر جمع کیے نمونے کا وزن 21.55 کلوگرام

چاند کے مدار میں چکر 30

چاند کے مدار میں صرف کیا گیا وقت 59 گھنٹے 30 منٹ 25.79 سیکنڈ

زمین پر لینڈنگ 24 جولائی 1969ء، وقت شام 4 بج کر 50 منٹ 35 سیکنڈ (UTC اسٹینڈرڈ ٹائم)

مشن کا مجموعی دورانیہ 8 دن 14 گھنٹے 12 منٹ 31 سیکنڈ

کی سطح پر اپنا بایاں قدم رکھا اور کہا "انسان کا یہ چھوٹا سا قدم دراصل انسانیت کی ایک لمبی چھلانگ ہے۔"

ایلڈرین 15 منٹ بعد چاند پر اترا۔ دونوں خلابازوں نے چاند پر 2 گھنٹے 30 منٹ گزارے۔ انہوں نے وہاں سے 22 کلوگرام چٹانی پتھر اور Core tube کے نمونے جمع کیے۔ شمسی ہوا کی جانچ پڑتال کی۔ ایک

UUNOVELS.COM

چوتھا حصہ

روسیاہ

عاطر شاہین

UUNOVELS.COM

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آہنپوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام علی حسن تھا۔ وہ ہوم ٹیوشنز پڑھاتا تھا۔ وہ باکسر تھا اور اسے ہیرو بننے کا شوق تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جس سے وہ بطور "ہیرو" پہچانا جائے۔ ایک روز وہ گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اسے ایک کار کے نیچے ایک پرس پڑا دکھائی دیا۔ آئی ڈی کارڈ عذرا اسماعیل نامی لڑکی کا تھا۔ اس نے وہ پرس لڑکی تک پہنچا دیا۔ عذرا اسماعیل کا والد اسماعیل شاہد سرکس چلاتا تھا۔ اس نے علی حسن کو اپنی سرکس میں بطور کیشیئر کی جاب دے دی۔ ایک رات علی اپنے دوست سے مل کر گھر آ رہا تھا کہ اسے ایک گلی میں دو لڑکے مل گئے۔ وہ ایک لڑکی کو تلاش کر رہے تھے۔ ایم این اے چودھری باسط کے بیٹے شانی کے پوچھنے پر علی نے انکار کر دیا تھا۔ پھر شانی کے دوست کو لڑکی دکھائی دی اور دونوں اس کی طرف بڑھ گئے۔ علی کو محسوس ہوا کہ لڑکی کی عزت خطرے میں ہے تو اس نے اس لڑکی کو ان دونوں لڑکوں کے چنگل سے بچایا اور اس لڑکی کو بحفاظت اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ شانی نے اسے کافی دھمکیاں دی تھیں۔ چند روز کے بعد علی کی بہن روزینہ اغوا ہو گئی۔ علی کو شک تھا کہ اس کی بہن کے اغوا میں شانی ملوث ہو سکتا ہے اس لئے وہ اس کی کوٹھی کے باہر پہنچ گیا اور خوب ہلہ گلا کیا لیکن شانی نے اعتراف نہ کیا۔ علی اپنی بہن کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا پھر ایک روز اسے روزینہ شانی کے ساتھ پجارو میں بیٹھی دکھائی دی۔ شانی نے بھی علی کو دیکھ لیا تھا۔ علی نے پجارو کا تعاقب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر علی نے شانی کی نگرانی شروع کر دی اور ایک روز وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایک اور کوٹھی میں پہنچ گیا جہاں علی نے شانی پر بے پناہ تشدد کر کے اپنی بہن کے بارے میں پوچھا۔ علی نے اعتراف کر لیا کہ اس نے اس کی بہن کو اغوا کر کے چودھری ساجد نامی شخص کو فروخت کر دیا ہے۔ علی، شانی کو تھانے لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ تیار نہ تھا، پھر شانی نے چالاکی سے علی کو اپنے کمرے میں بند کر دیا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کافی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ وہاں چودھری باسط اور پولیس پہنچ گئی۔ پولیس علی کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ علی نے ایک ہفتہ تھانے میں گزارا۔ پولیس نے اس پر بہت تشدد کیا اور اسے اس شرط پر رہا کیا کہ وہ آئندہ چودھری باسط اور اس کے بیٹے شانی کے اردگرد دکھائی نہیں دے گا۔ ایک روز علی کو چودھری ساجد کے کارندے کی کال موصول ہوئی۔ اس نے اس کی بہن کے بارے میں بتایا تو علی بغیر سوچے مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ گیا۔ وہاں اسے پکڑ کر کرسی سے باندھ کر اس پر تشدد کیا گیا اور اسے زخمی حالت میں سڑک پر پھینک دیا گیا۔ وہاں سے گزرتی شانزے اور اس کی سہیلی اسے اٹھا کر اسپتال لے آئیں۔ علی نے ہوش میں آنے کے بعد شانزے کا شکریہ ادا کیا۔ ان دونوں کی دوستی ہو گئی۔ علی، چودھری ساجد تک پہنچنے کے لئے دوبارہ اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا مگر وہاں چودھری باسط کو ایک عورت کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس پر چودھری ساجد نے نہیں بلکہ چودھری باسط نے تشدد کرایا ہے۔ چودھری باسط کا چودھری ساجد سے کوئی تعلق ہے، چنانچہ علی نے چودھری باسط اور بیلی نامی عورت کی تصاویر اور ویڈیو بنالی۔ اس نے پرنٹ نکلوا کر چودھری باسط کو بھجوا دیئے۔ چودھری باسط نے اسے فون کیا تو علی نے اس سے ملنے کی فرمائش کی۔ جب وہ ہوٹل میں پہنچا وہاں چودھری باسط کی بجائے اس کا ہمشکل کارندہ موجود تھا۔ علی نے چودھری باسط کو فون کر کے دھمکی دی کہ وہ اس کی ویڈیو چینل پر چلوا دے گا۔ ہوٹل سے نکلتے وقت علی کو شانزے اور اس کی سہیلی مل گئی۔ اس نے ان کے ساتھ ڈنر کیا اور پھر وہ اسے اس کے گھر ڈراپ کر گئیں۔ اگلے روز علی ایک پارک میں موجود تھا کہ پارک کے گیٹ سے ایک نوجوان لڑکی کو اغوا کر لیا گیا اور وہ اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

اب آگے پڑھیں

UUNOVELS.COM

وہ آواز فاروق کی تھی۔ شاید وہ بے حد سہما ہوا تھا اس لیے اس کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور میرے دل و دماغ میں عجیب سے خیالات کسمسانے لگے۔

"فاروق! کیا ہو گیا ہے تمہیں...... تم خیریت سے تو ہو۔" میں نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد مدھم آواز میں پوچھا تا کہ میری آواز کوئی نہ سن لے۔

"بھائی...... یہ...... یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔" فاروق کی خوف بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "مجھے بچالو...... مجھے بچالو بھائی۔"

"کون لوگ ہیں یہ...... بتاؤ مجھے۔ کہاں ہو تم۔" میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ میرا دھیان یکلخت چودھری باسط کے غنڈوں کی طرف چلا گیا لیکن تصدیق ضروری تھی۔ چند ثانیے گزر گئے فاروق نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے اسے آواز دی۔ "فاروق۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

عین اسی لمحے ایک اجنبی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "سنو...... اگر تم اپنے دوست کی زندگی چاہتے ہو تو فوراً میرے پاس آجاؤ۔"

اجنبی آواز سن کر میں ٹھٹکا۔ یہ آواز چودھری باسط کی نہیں تھی۔ میں نے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"کیا سب کچھ فون پر ہی بتا دوں؟"

''اپنا تعارف تو کراؤ۔'' میں نے کہا۔

''تعارف بھی ہو جائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''تم آ رہے ہو یا نہیں؟''

''کیا تم چودھری باسط کے آدمی ہو؟'' میں نے تصدیق چاہی تو دوسری طرف سے جواب میں قہقہہ سنائی دیا۔

''جب ملو گے تو پتا چل جائے گا۔'' اجنبی آواز گونجی۔ ''ویسے تمہاری تسلی کے لیے بتا دیتا ہوں کہ میں چودھری باسط نہیں ہوں۔''

''تو پھر کون ہو؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''کہا نا کہ ملو گے تو بتا دوں گا۔'' اجنبی نے کہا تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اگر یہ چودھری باسط کے غنڈے ہیں تو کیا وہ میرے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میرے دل و دماغ میں غصے کی لہریں دوڑنے لگیں اور اگر یہ کوئی اور ہے تو کون ہے۔ مجھ سے کیسی پرخاش ہے۔ اس نے فاروق پر ہاتھ کیوں ڈالا؟ میرے اردگرد، میرا کوئی اپنا، کوئی مددگار تو تھا نہیں۔ یہ فاروق بھی صرف شناسا سا تھا مگر اس وقت میرا ساتھ دے رہا تھا۔ شاید اسی لیے اسے اغوا کیا گیا ہے۔

''بتاؤ...... آ رہے ہو یا نہیں......'' اسی لمحے میری سماعت سے ایک بار پھر مکروہ آواز ٹکرائی۔ تو میں خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا۔

''کہاں آنا ہے؟'' میں نے ہونٹ بھینچے ہوئے پوچھا۔

''ایڈریس میں تمہارے نمبر پر سینڈ کر رہا ہوں۔'' اجنبی نے جواب دیا۔ ''اگر تم ایک گھنٹے کے اندر اندر میرے پاس نہ آئے تو تمہارے دوست کی لاش اس کے گھر پہنچ جائے گی۔''

''میں آ رہا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن میرے دوست کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''اوکے۔'' اجنبی کی پُرسوچ آواز سنائی دی۔ ''میں تمہیں دو گھنٹے دے دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں...... اور ہاں، پولیس کو فون نہ کرنا ورنہ......''

''میں پولیس کو فون نہیں کرتا، اپنی جنگ خود لڑنے کا عادی ہوں۔'' میں نے اسے یقین دہانی کرائی۔

''گڈ۔ سمجھ دار بھی ہو۔'' اجنبی نے کہا۔ ''میرا آدمی تم سے جیسا کہے اس پر عمل کرنا ہے۔''

''ہمم۔''

رابطہ منقطع ہوا تو میں نے سیل فون کان سے ہٹایا اور طویل سانس لی۔ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ نجانے وہ کون تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ چودھری باسط کا کارندہ ہو۔ چودھری نے جان بوجھ کر اس سے مجھے کال کرائی ہو۔ وہ ایک کائیاں، مکار اور شاطر آدمی ہے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ وہ مجھ سے ویڈیو کی کاپی ایسے طریقے سے حاصل کرے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اسی لیے مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا ورنہ چودھری کا کارندہ فاروق کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں میری جان کو خطرہ درپیش ہو گا۔ دشمن میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے مگر میں تو ہتھیلی پر جان لیے پھر رہا تھا اس لیے کہ ایک بہن اغوا ہو چکی ہے اور دوسری کو اغوا کرنے کی دھمکی مل رہی تھی۔ ان حالات میں کون بھائی اپنی جان کی پروا کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اندھی چال چلنے پر راضی ہو گیا تھا۔

دو منٹ کے بعد میرے سیل فون کی میسج ٹون بجی تو میں نے دیکھا۔ فاروق کے نمبر سے ایڈریس بھیجا گیا تھا۔ وہ ایڈریس زکریا ٹاؤن کا تھا۔ ایڈریس کے آخر میں پیغام بھی لکھا ہوا تھا کہ کالونی کی گلی نمبر چار میں کالے رنگ کی ایک کار کھڑی ہو گی۔ اسی کار میں سوار ہونا ہے۔

میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سیل فون آف کر کے گھڑی میں وقت دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔ ایک مصیبت جاتی ہی نہیں کہ دوسری کی آمد ہو جاتی ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنے نامساعد حالات سے نبرد آزما ہوں گا۔ ہماری ہنستی بستی زندگی کو کسی کی نظر لگ جائے گی۔ مگر کیا کیا جائے کہ جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ شاید میری تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا۔ میں کمرے میں پہنچا تو مرینہ آ گئی۔ ''بھائی! کس کا فون تھا؟''

''ایک دوست کا فون تھا۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے اس سے ملنے کے لیے جانا ہو گا۔''

''اس وقت......؟'' مرینہ حیران ہوئی۔

''ہاں......'' میں نے کہا۔ ''میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا لیکن اگر مجھے دیر ہو جائے تو تم پریشان نہ ہونا۔''

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

''ٹھیک ہے بھائی۔'' مرینہ بولی۔ ''لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''امی بار بار وہی سوال دُہرا رہی ہیں کہ یہ گھر کس کا ہے۔''

''کچھ بھی کہہ کر انہیں مطمئن کر دو۔'' میں نے کہا۔

''ہم... کوشش کرتی ہوں۔''

''اب تم جاؤ۔ جاتے وقت میں تمہیں بتا دوں گا، تم گیٹ کو اندر سے بند کر لینا۔'' میں نے کہا تو مرینہ وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے چودھری باسط کا نمبر ملایا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا۔ ''ہیلو۔''

''چودھری! جب تم سے کل ملنے کی میری ڈیل ہو چکی ہے تو تم نے میرے دوست کو کیوں اغوا کرایا، بتاؤ۔'' اس کے ''ہیلو'' کہتے ہی میں اس پر چڑھ دوڑا۔ میں نے جان بوجھ کر یہ بات کی تھی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ میں تمہارے دوست کو کیوں اغوا کراؤں گا۔'' چودھری باسط کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

''تو پھر وہ غنڈے کس کے بھیجے ہوئے ہیں؟''

''مجھے کیا معلوم۔'' وہ انجان بنا۔

''چودھری! تم واقعی بہت کائیاں اور مکار ہو لیکن یاد رکھو، تمہاری یہ چالاکی الٹا تمہارے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''میری بات کا یقین کرو۔'' چودھری نے کہا۔ ''میں نے تمہارے دوست کو اغوا نہیں کرایا۔ جب تم سے ڈیل ہو گئی ہے تو پھر میں کیوں ایسی حرکت کروں گا؟''

میرا دماغ الجھ گیا۔ چودھری انکار کر رہا تھا، پھر فاروق کو کس نے اغوا کیا ہے؟

''میں کیسے یقین کر لوں؟'' میں نے کہا۔ ''تم اعتبار کے قابل ہی نہیں ہو۔''

''تمہیں کس نے بتایا ہے کہ تمہارے دوست کو اغوا کر لیا گیا ہے۔'' چودھری باسط نے پوچھا۔

''فون آیا ہے۔''

''کس کا؟''

''اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''ہمم۔''

''لیکن مجھے تم پر ہی شک ہے۔'' میں اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ ''شاید تم میرے ساتھ ڈبل گیم کھیلنا چاہ رہے ہو۔''

''نہیں۔ میں نے نہ ہی تمہارے دوست کو اغوا کیا ہے اور نہ ہی تم سے ڈبل گیم کھیل رہا ہوں۔'' چودھری باسط جھنجلایا۔ ''میری بات کا یقین کرو۔''

''سوری، نہیں کر سکتا۔''

''پھر اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''دیکھو چودھری، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم میرے ساتھ چالبازی کر کے مجھے پھانس لو گے تو یہ تمہاری احمقانہ سوچ ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں اب تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ یاد رکھو، اگر مجھے ثبوت مل گیا کہ میرے دوست کے اغوا میں تم ملوث ہو تو پھر......''

چودھری باسط نے جھنجلاتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ ''میں نہیں ملوث۔ میں اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھاتا ہوں کہ جن غنڈوں نے تمہارے دوست کو اغوا کیا ہے میں ان کے بارے میں نہیں جانتا اور نہ ہی وہ میرے آدمی ہیں۔ نجانے وہ کس کے آدمی ہیں اور انہوں نے تمہارے دوست کو کیوں اغوا کیا ہے۔''

چودھری باسط نے اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھا لی تھی اس لیے اس پر شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ اگر اس نے جھوٹی قسم کھائی تھی تو وہ خود ہی اس کا خمیازہ بھگتتا رہے گا۔

''ہمم۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے اپنے باپ کی قسم کھا لی ہے اس لیے میں یقین کر لیتا ہوں۔''

''شکریہ۔''

''پھر وہ کون ہو سکتے ہیں۔''

''اوہ۔ کہیں وہ چودھری ساجد کے آدمی نہ ہوں۔''

چودھری باسط نے کہا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔

''چودھری ساجد۔'' میرے منہ سے بے اختیار یہ نام نکل گیا۔ اس نام کے تصور سے ہی میرے دل و دماغ میں نفرت کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔ گو کہ ابھی تک میرا اس سے سامنا نہیں ہوا تھا مگر اس کے بارے میں جو کچھ سن رہا تھا وہ اس سے نفرت کرنے کے لیے کافی تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ چودھری ساجد کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ لڑکیوں کی اسمگلنگ جیسا گھناؤنا بزنس کرتا ہے۔ اسی نے میری بہن روزینہ کو خریدا ہے۔ چودھری باسط کے قیاس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے تو برملا کہا تھا کہ وہ چودھری ساجد کو نہیں جانتا پھر اس نے کیسے یہ بات کہہ دی کہ وہ غنڈے چودھری ساجد کے ہو سکتے ہیں۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

''تم تو کہتے ہو کہ تم چودھری ساجد کے بارے میں نہیں جانتے۔ پھر تم نے کیسے یہ قیاس کر لیا ہے۔'' میں دل کی بات زبان پر لے آیا۔

''تم ہی تو مجھ سے چودھری ساجد کے بارے میں پوچھ رہے تھے اس لیے میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔'' چودھری باسط نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر بولا۔ ''کیا تم چودھری ساجد سے رابطہ کرو گے؟''

''ظاہر ہے۔ اس کی قید میں میرا دوست ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میری ویڈیو......'' اتنا کہہ کر چودھری باسط رک گیا تو میں طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''میرے پاس محفوظ ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا، میں نے رابطہ منقطع کر کے سیل فون پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ میں کوئی ارفع و اعلیٰ مخلوق تو نہیں تھا اور نہ فلمی ہیرو کہ اکیلا دشمنوں کے نرغے میں کود کر سب کو شکست دے دوں۔ جس طرح اس نے مجھے بلایا تھا اس کا سیدھا مطلب تھا کہ وہ میری جان کا خواہاں ہے۔ وہاں جانا جان کو خطرے میں ڈالنا تھا اور وہاں جانا بھی ضروری تھا ورنہ وہ بے چارہ مار دیا جاتا۔ کافی دیر غور کرنے کے بعد ایک راہ سجھائی دی اور میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے ایک بار پھر گھڑی میں وقت دیکھا۔ شاید مرینہ نے امی کو مطمئن کر دیا تھا اس لیے کہ ان کے کمرے میں خاموشی تھی۔ میں مرینہ کو گیٹ کو تالا لگانے کا کہہ کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گیٹ سے باہر نکل کر میں کھڑا ہو گیا پھر جب مرینہ گیٹ کو تالا لگا کر چلی گئی تو میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

گلی سے باہر نکلتے ہی مجھے کوئی سواری تو نہ ملی البتہ تھوڑی دیر پیدل چلنے کے بعد ایک آٹو رکشا مل گیا۔ رکشے والے نے منہ مانگے پیسے مانگے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ رات کے وقت واپسی پر سواری نہیں ملے گی اور اسے خالی واپس آنا پڑے گا۔ میں نے چوں چراں نہ کی اور منہ مانگے پیسے ادا کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس نے پینتالیس منٹ میں ہی مجھے زکریا ٹاؤن کی طرف جانے والی گلی کی نکڑ پر اتار دیا تھا۔

میں گلی میں داخل ہو کر آگے بڑھنے لگا۔ گلی ویران پڑی تھی۔ وہاں بڑی بڑی اور خوبصورت کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں جن کی آرائش و زیبائش جدید طرز تعمیر کا نمونہ تھیں۔ گلی کی چوڑائی تیس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ وہ انتہائی صاف ستھری تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کوڑے کے ڈرم لگے ہوئے تھے۔ مرکری بلبوں نے گلی کو جیسے روشن کیا ہوا تھا۔ گویا وہاں دن کا سماں تھا۔

تھوڑی دور جاتے ہی آگے خالی پلاٹوں کا سلسلہ شروع ہونے لگا۔ کہیں کہیں کھمبے پر مرکری بلب روشن تھے جن کی روشنی قرب و جوار کے اندھیرے کو مٹانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ایک پلاٹ سے پندرہ گز کے فاصلے پر مجھے بائیں سمت کالے رنگ کی ایک کار دکھائی دی۔ کار کے آس پاس کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی ٹیل لائٹ روشن تھی۔

میں سمجھ گیا کہ یہی وہ کار ہے جس کے بارے میں مجھے میسج میں بتایا گیا تھا۔ میں اس کار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کار کے قریب پہنچا ہی تھا کہ یکدم پچھلی نشست کا دروازہ کھلا اور ایک قد آور نوجوان باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی مونچھیں تھیں۔

''کار میں بیٹھو۔'' اس نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا تو میں خاموشی سے کار میں بیٹھ گیا۔ اس وقت بھی موبائل میرے ہاتھ میں تھا۔ اکثر نوجوان شوبازی کے لیے موبائل ہاتھ میں پکڑے رکھتے ہیں شاید اسی لیے اس نے موبائل کی جانب توجہ نہیں دی۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے مجھے پہچانا کیسے تھا۔ بقول چودھری باسط کے یہ اس کے بندے نہیں تھے۔

میرے بیٹھتے ہی گھنی داڑھی مونچھوں والا وہ نوجوان بھی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے سے ہی ایک نوجوان موجود تھا جس نے ایک بار بھی مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھے نوجوان کے ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک رومال تھا اور اس نے وہ رومال میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اپنی آنکھوں پر باندھ لو۔''

''کیا ضروری ہے؟''

''باس کا آرڈر ہے۔''

''ہم۔'' میں نے کہا۔ ''کیا میرے ہاتھ بھی باندھو گے؟''

''نہیں۔''

UUNOVELS.COM

"ٹھیک۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس سے رومال لے کر اپنی آنکھوں پر باندھ لیا۔ آنکھوں پر پٹی باندھتے ہی مجھے ایسے لگا جیسے میں روشنی سے یکدم اندھیرے میں آ گیا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد مجھے نوجوان کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈرائیور سے مخاطب تھا۔

"چلو منیر۔"

کار اسٹارٹ ہوئی اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگنے لگی پھر رفتار میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہونے لگا اور ساتھ ہی ساتھ مختلف موڑ بھی مڑنے لگی۔ کبھی وہ دائیں طرف مڑ جاتی تو کبھی بائیں طرف۔ یوں لگتا تھا جیسے ڈرائیور اسے بھول بھلیوں میں گھما رہا ہو۔ کار میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"تمہارے باس کا کیا نام ہے؟" تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا۔

"تم باس سے ہی پوچھ لینا۔" اس نے خشک لہجے میں جواب دیا تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کا جواب واضح تھا کہ وہ کچھ نہیں بتائے گا۔

"کیا تمہارا باس چودھری باسط ہے؟" میں نے پھر پوچھا اس بار اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اس سے مزید کوئی سوال نہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ظاہر ہے جب اس نے جواب ہی نہیں دینا تو سوال کرنا فضول تھا۔

میرے اندازے کے مطابق چالیس سے پچاس منٹ کی ڈرائیونگ ہوئی تھی اس کے بعد کار کی رفتار ہلکی ہو گئی پھر چند منٹوں کے بعد وہ رک گئی اور ڈرائیور نے تین بار ہارن دیا تو مجھے گیٹ کے کھلنے کی آواز سنائی دی..... ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ میں آنکھوں پر سے رومال اتارنے لگا تو مونچھوں والے کی آواز گونجی۔ "رکو......"

میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد کار رکی تو مونچھوں والے نے مجھ سے کہا۔ "اب اتار دو۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آنکھوں سے رومال اتار دیا تو روشنی میں میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد جب آنکھیں روشنی سے مانوس ہوئیں تو میں کار میں بیٹھے بیٹھے اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کوٹھی کم حویلی زیادہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کا وسیع احاطہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ شہر سے دور بنائی گئی تھی۔ وسیع احاطے کے ایک طرف کچا میدان تھا جبکہ اس کے مخالف سمت دو منزلہ عمارت دکھائی دے رہی تھی جو روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی گیٹ بند کر کے عمارت کی طرف آ رہا تھا۔

"چلو نیچے اترو۔" مونچھوں والے نے کہا تو میں خاموشی سے کار سے باہر آ گیا۔ وہ بھی دوسری سائیڈ سے اتر آیا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور میں اس کی رہنمائی میں اس کے پیچھے چلتا ہوا عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ چلتے ہوئے میں قرب و جوار کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ حویلی کے تین اطراف میں مجھے گھنے اور بڑے بڑے درخت دکھائی دیئے جو ہیولوں کی طرح کھڑے تھے۔

گیٹ سے عمارت تک کا فاصلہ پانچ منٹ کی مسافت پر تھا۔ پانچ منٹ کے بعد ہم عمارت میں داخل ہو گئے اور مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ مونچھوں والے نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ "آ جاؤ۔"

مونچھوں والے نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھل گیا، وہ مجھے لے کر اندر داخل ہوا۔ کمرا وسیع تھا اور فرش پر میرون کلر کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ وہاں چھ کرسیوں اور دو میزوں کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں تھی البتہ کمرے کے کونے میں چھوٹا سا ایک دروازہ دکھائی دیا جو یقیناً اٹیچ باتھ روم کا تھا۔

کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کا نقاب تھا جبکہ دوسرا اس کے عقب میں اٹینشن کھڑا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور اس نے کالے سوٹ کے اوپر کالے رنگ کی ہی جیکٹ پہنی ہوئی تھی اس کے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ نقاب والا بھی سلیٹی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔

کمرے کا منظر فلمی انداز کا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے سین میں نے کئی جاسوسی ناولوں میں بھی پڑھے تھے اور آج میں خود ایسے منظر میں موجود تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے جاسوسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ مونچھوں والے نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود عقب میں کھڑا ہو گیا۔ اب میں نقاب کے سامنے بیٹھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ قد کاٹھ اور وضع قطع سے وہ کسی طرح بھی چودھری باسط دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن میرے دماغ میں یہ سوال ضرور گونجا تھا کہ آخر یہ کون ہے اور اس نے فاروق کو کس مقصد کے لیے اغوا کیا ہے۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا مجھے صرف اپنی تنفس کی

UUNOVELS.COM

ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نقاب پوش بھی بہ غور مجھے دیکھ رہا تھا جیسے وہ میرا جائزہ لے رہا ہو۔

''تمہارا نام علی حسن ہے؟'' نقاب پوش نے مجھ سے پوچھا۔

''جی۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''ایک سرکس میں ملازمت کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کتنا پڑھے ہوئے ہو؟''

''بی ایڈ کیا ہے۔''

''ہمم۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اچھا خاصہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود تم نے سرکس کا انتخاب کیوں کیا؟''

''جاب نہیں مل رہی تھی اس لیے سرکس جوائن کرنا پڑی۔'' میں نے جواب دیا۔

''شکل سے تم شریف زادے اور تمیز دار دکھائی دیتے ہو۔ بہرحال تمہارا تعلق کس گینگ سے ہے؟''

''گینگ۔'' میں ٹھٹکا اور نفی میں گردن ہلاتے بولا۔ ''سوری، میرا کسی گینگ سے تعلق نہیں۔''

''میں کیسے مان لوں؟''

''آپ مانیں یا نہ مانیں مجھے کوئی پرواہ نہیں۔'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ بتائیں، آپ کون ہیں اور میرے دوست کو کیوں اغوا کیا ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟''

نقاب پوش کے انٹرویو لینے پر مجھے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

''بتاتا ہوں۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''پہلے میرے سوالوں کے جواب تو دے دو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے ہونٹ سکیڑے۔ ''کیسے سوال، کیسے جواب؟ مگر میں یہ بھی بتا دوں، تم نے مجھے یہاں بلا کر غلطی کی ہے، اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میرے یہاں آنے کی کسی کو خبر نہیں ہے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔''

''اچھا!'' اس نے ایسے جواب دیا جیسے مجھے ننھا بچہ سمجھ رہا ہو۔

''گھر سے نکل کر یہاں تک آنے اور تم سے باتیں کرنے کی ویڈیو بنتی رہی ہے۔ یہ موبائل دیکھ رہے ہو نا، میں لائیو ہوں۔ میرا ایک دوست معروف ٹی وی چینل پر بیٹھا ریکارڈ کر رہا ہے۔ مجھے کچھ بھی ہوا تو یہ ریکارڈنگ چینل پر چلا دے گا۔''

''اس سے موبائل چھین لو۔'' اس نے حکم دیا۔ میرے پیچھے کھڑے شخص نے میرے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

نقاب پوش نے موبائل لے کر معائنہ کیا پھر بولا۔ ''بچے، میں آئی ٹی ایکسپرٹ ہوں۔ فی الحال تو میرے سوالات کا جواب دو۔'' پھر سانس لے کر بولا۔ ''چودھری باسط سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

''چودھری باسط......'' میں حیران ہوا۔

''ہاں۔''

میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا جواب دوں اور وہ نقاب پوش کس مقصد کے تحت یہ پوچھ رہا ہے۔

''میرا خیال ہے تم نہیں بتانا چاہتے۔'' مجھے خاموش دیکھ کر نقاب پوش نے کہا۔ ''میں مطلب کی بات پر آتا ہوں۔ چودھری باسط کی ایک عورت کے ساتھ بنائی ویڈیو کہاں ہے؟''

نقاب پوش نے میرے سر پر گویا دھماکا کیا تھا اور میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے گویا اچھل پڑا تھا۔ میں حیرت بھری نظروں سے سامنے بیٹھے نقاب پوش کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو۔

''ویڈیو...... کیسی ویڈیو......؟'' میں نے کہا تو نقاب پوش کا قہقہہ گونجا۔

''احمقانہ سوال کیوں کر رہے ہو علی۔'' وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''میں سب جانتا ہوں کہ تم نے چودھری باسط کی بیلی کے ساتھ ویڈیو بنائی ہے۔ چودھری باسط نے ویڈیو برآمد کرنے کے لیے تمہیں ڈرامائی انداز میں اغوا بھی کیا تھا۔''

پھر وہ مجھے ایسے بتانے لگا جیسے یہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہو۔ میں دل ہی دل میں حیران اور چہرے پر خجل سے تاثرات سجائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں وہ بولا۔ ''بتاؤ...... تم نے ویڈیو کہاں چھپا رکھی ہے۔ مجھے وہ ویڈیو چاہیے۔''

شاید نقاب پوش چودھری باسط کا مخالف تھا۔ میں نے کھوجتے لہجے میں پوچھا۔ ''پہلے آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں اور وہ ویڈیو کیوں چاہتے ہیں؟''

''اس بات کو چھوڑو۔'' اس نے کہا۔ ''یہ تمہارا مسئلہ

UUNOVELS.COM

نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ چودھری باسط کے دشمن ہیں؟"

میری بات پر اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ وہ بولا۔ "میں نے تم سے پوچھا کہ تمہاری چودھری باسط سے کیا دشمنی ہے لیکن تم نے نہیں بتایا، بہرحال میرا جواب ہاں میں ہے۔ وہ ویڈیو حاصل کرنے کے لیے ہی میں نے تمہارے دوست کو اغوا کرایا ہے۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ ہی میرے گھر کی نگرانی کر رہے تھے۔"

نقاب پوش نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ہاں۔"

"ویڈیو میرے پاس نہیں ہے۔"

"تو کہاں ہے؟"

"چودھری باسط نے وہ ویڈیو ضائع کر دی ہے۔"

میری بات پر اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی اُمید نہیں تھی۔"

"یہ سچ ہے۔"

"نو۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "تمہارے چہرے کے تاثرات چغلی کھا رہے ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

یہ بات کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے عقب میں کھڑے مونچھوں والے آدمی کے گرد سے گھومتا ہوا پھر میرے سامنے آ گیا۔

"سچ یہ ہے کہ اس ویڈیو کی ایک اور کاپی تمہارے پاس موجود ہے۔ تم نے خود چودھری باسط کو بتایا ہے اور کل تمہاری اس سے ملاقات طے ہے اس کی کوٹھی پر۔ میں سچ کہہ رہا ہوں ناں؟"

وہ سچ کہہ رہا تھا، میں نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ دماغ میں مختلف خیالات کسمسانا شروع ہو گئے تھے۔ آخر یہ ہے کون اور یہ ساری باتیں کیسے جانتا ہے۔

نقاب پوش وضاحت طلب لہجے میں بولا۔ "اب تمہارے پاس انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ بتاؤ کہاں ہے ویڈیو؟ بے فکر ہو جاؤ چودھری باسط کو کچھ پتا نہیں چلے گا اور نہ ہی تم پر وہ شک کرے گا۔"

میری الجھن بڑھ گئی تھی۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میری چودھری باسط سے بات ہو چکی تھی۔ بالفرض محال اگر میں ویڈیو نقاب پوش کے حوالے کر دیتا اور چودھری باسط کو معلوم ہو جاتا تو اس نے یہی سمجھنا تھا کہ میں نے ہی اسے ویڈیو دی ہے۔ نقاب پوش نجانے ویڈیو کس مقصد کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"لیکن آپ ہیں کون اور یہ سب کیسے جانتے ہیں؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اچانک میرے دماغ کے پردے پر چودھری ساجد کا نام ابھرا۔ "اوہ۔ کیا آپ چودھری ساجد ہیں؟"

میں نے نقاب پوش کی آنکھوں میں جو نقاب سے جھانک رہی تھیں ان میں یکدم حیرت در آتے دیکھی۔ لمحہ بھر کی توقف کے بعد اس نے جواب دیا۔ "نہیں...... میں چودھری ساجد نہیں ہوں۔"

"تو پھر کون ہیں؟"

"تم نے چودھری ساجد کا نام کیوں لیا؟" اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم اسے جانتے ہو؟ اسے دیکھا ہے؟"

"میں نے چودھری ساجد کو کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔ "البتہ میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہو؟"

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔

"تم نے مجھے چودھری ساجد سمجھا ہے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔" نقاب پوش نے وضاحت دی۔ "بہرحال نہیں بتانا چاہتے تو ٹھیک ہے، البتہ یہ بتا دوں کہ میں چودھری ساجد نہیں ہوں۔"

"آپ ویڈیو کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

نقاب پوش طویل سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں دیکھیں۔ وہ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اپنی پیشانی پر بھی خارش کر رہا تھا۔

"لڑکے...... یہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتا۔" وہ پیشانی پر انگلیاں چلاتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟"

"تمہارا دوست خطرے میں ہے۔ کیا تم اس کی جان نہیں بچاؤ گے؟" اس نے موضوع بدلا۔

"بچانا چاہتا ہوں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"تو پھر بتا دو۔ کیوں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے

UUNOVELS.COM

ہو؟''

''وہ ویڈیو میرے لیے بہت قیمتی اور اہمیت رکھتی ہے۔'' میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''اس ویڈیو کے ذریعے میں چودھری ساجد تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ ویڈیو میں نے آپ کو دے دی تو میں کبھی بھی چودھری ساجد تک نہیں پہنچ سکوں گا۔'' میں نے بالآخر کہہ ہی دیا۔ نقاب پوش کی آنکھوں میں ایک بار پھر حیرت کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ وہ آگے کو جھکتے ہوئے بولا:

''میرا خیال ہے چودھری باسط نے تمہارے ساتھ کچھ برا کیا ہے جس کی وجہ سے تم نے اس کی ویڈیو بنائی ہے اور اب تم کہہ رہے ہو کہ تم اس کے ذریعے چودھری ساجد تک پہنچنا چاہتے ہو۔ میرا خیال ہے کوئی ایسی بات ضرور ہے جو تم مجھے نہیں بتانا چاہتے۔''

''لیکن میں آپ کو کیوں بتاؤں؟'' میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

''اپنا ہمدرد ہی سمجھ لو۔'' نقاب پوش نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔

''ہمدرد......؟''

''ہوسکتا ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد بھی کرسکوں۔''

''مدد......'' میں چونکا۔

''ہاں۔''

میرے ذہن میں ان گنت سوالات ابھرنے لگے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ نے میری مدد کے لیے اس نقاب پوش کو چن لیا ہو۔ میں اس کے ذریعے چودھری ساجد تک پہنچ جاؤں اور اپنی بہن کو نکال لاؤں۔

میں سوچوں کے حصار میں گھر گیا کہ کیا اس پر اعتبار کرلوں، کیا اسے سب کچھ سچ بتادوں؟ کیا وہ واقعی میرا ہمدرد ہے۔ نقاب پوش شاید میری آنکھوں کے ذریعے میرے دل کی بات جان گیا تھا۔ وہ بولا۔ ''تم مجھ پر اعتبار کرسکتے ہو۔''

''لیکن......''

میں کشمکش میں مبتلا تھا اس لیے کہ ابھی میں اس سے صحیح طور پر واقف بھی نہیں تھا۔ وہ کون ہے، طاقت کتنی ہے، کتنے بڑے گینگ کا سربراہ ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

''اگر تم مطمئن نہیں ہورہے تو نہ بتاؤ۔'' پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان دھوکے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

اپریل کے شمارے
کی دلچسپ و سنسنی خیز
کہانیوں کی ایک جھلک

اولین صفحات

چند نکات میں کیا سے کیا ہوجاتا ہے۔ جھلملاتی جگمگاتی سانس لیتی زندگی سے موت تک کا لمحاتی فاصلہ طے کرتی حیرت خیز داستان امجد رئیس کے قلم سے

انا گیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل نگار داستان امجد جاوید کے زور آور قلم کا امتحان

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل
زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جارہی تھی ...... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے ایک سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

محبتوں اور رفاقتوں کے دامن کو تار تار کرتی کہانی کے پیچ و خم

دوستی اور دشمنی کے فاصلے طے کرتی پر انتقام کہانی

چٹکی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے ... مشورے ... محبتیں ... شکایتیں ... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

UUNOVELS.COM

باز، جھوٹا اور کمینہ ہو۔ دراصل بات یہ ہے کہ اگر ہمارے ذہن میں کسی کے بارے میں جو ہے، جیسا ہے کی بنیاد پر بیٹھ جائے تو پھر ہمیں فیصلہ کرنے میں قدرے مشکل ہوتی ہے۔ میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔''

میں نے ایک بار پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نقاب پوش کی آنکھوں میں اطمینان کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں آپ پر اعتبار کرتے ہوئے بتا دیتا ہوں۔''

''میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔'' اس نے کہا۔ لیکن میں پھر بھی کشمکش میں مبتلا رہا۔ وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے اگر تمہارا دل مطمئن نہیں ہو رہا تو نہ بتاؤ۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دیتا ہوں کہ میں ویڈیو کیوں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

پھر اس نے کمرے میں موجود اپنے کارندوں کو اشارہ کیا تو وہ دونوں یکے بعد دیگرے وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی نقاب پوش نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا۔

وہ پکی عمر کا ایک خوش شکل آدمی تھا اور چہرے سے لگتا نہیں تھا کہ وہ جرائم پیشہ ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیالیس اور پینتالیس کے درمیان تھی۔ رنگت گوری تھی۔ آنکھیں بڑی اور ذہانت سے بھرپور دکھائی دیتی تھیں۔ اس کی دائیں ابرو پر کٹ کا چھوٹا سا ایک نشان تھا۔ زیرناک پتلی مونچھیں تھیں لیکن داڑھی نہیں تھی۔ اس نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

میرا نام حیدر الماس ہے اور میں کنسٹرکشن کا بزنس کرتا ہوں۔ بڑے بڑے پلازے نقشہ جات کے مطابق تعمیر کرنے کا ٹھیکا لیتا ہوں۔ میری کمپنی پورے ملک میں مشہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے شہروں کے لوگ بھی مجھ سے کنسٹرکشن کرواتے ہیں۔ کافی بارسوخ ہوں۔ بڑے بڑے افسروں کے ساتھ تعلقات ہیں۔ میرے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ ایک بہن تھی جو شادی کے بعد شوہر سمیت امریکا میں سیٹل ہوگئی ہے۔

چودھری باسط میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم دونوں نے اکٹھے ہی تعلیم حاصل کی اور ایک ساتھ ہی پلے بڑھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرا چودھری باسط کے گھر آنا جانا تھا۔ ببلی، میری بیوی تھی۔ ببلی کا اصل نام نازنین ہے لیکن پیار سے اسے ببلی کہا جاتا ہے۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ یہ شادی پسند کی تھی اور شادی کو چھ سال ہونے والے ہیں۔

ببلی کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ میرے آفس میں جاب کرتی تھی کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی اور جب میں نے اسے پرپوز کیا تو وہ فوراً مان گئی تھی۔

ہم نے انتہائی سادگی سے شادی کی تھی جس میں ببلی کے گھر والوں اور میرے قریبی دوستوں نے شرکت کی تھی۔ چودھری باسط نے بھی شرکت کی تھی۔ چودھری باسط انتہائی عیاش، عاشق مزاج اور بدفطرت انسان ہے۔ وہ جس خوب صورت عورت کو دیکھتا ہے وہ اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ وہ بچپن کی دوستی کو بھلا کر میرے ہی گھر میں سیندھ لگائے گا۔ اس نے میرے گھر آتے جاتے ببلی سے دوستی کرلی۔

کئی بار میں آفس سے جلدی گھر آتا تو چودھری باسط کو اپنے گھر میں موجود پاتا اور ببلی اس کی خاطر داری کر رہی ہوتی۔ ان دونوں کو انتہائی بے تکلفی سے بات چیت کرتے دیکھتا تھا تو دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔

ایک روز جب میں آفس سے گھر آیا تو دیکھا کہ ببلی اور چودھری باسط ایک ہی صوفے پر ایک دوسرے کے بے حد قریب بیٹھے تھے۔ ببلی نے بھڑکیلا لباس پہنا ہوا تھا اور چودھری باسط کا ہاتھ اس کے کندھے پر تھا۔ میں اپنے سیل فون سے ان کی ویڈیو بنانا چاہتا تھا لیکن عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اسے فوراً احساس ہوگیا اور وہ جلدی سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر چلی گئی اور میں ویڈیو بنانے سے قاصر رہا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری بیوی مجھے دھوکا دے گی۔ چودھری باسط سے بھی اُمید نہیں تھی کہ وہ آستین کا سانپ نکلے گا مگر باسط اڑا ہوا تھا کہ میں ببلی کو بھابی سمجھتا ہوں دیور بھابی کا رشتہ مذاق کا ہوتا ہے اس لیے میں کبھی کبھی مذاق کر لیتا ہوں۔ ببلی نے بھی قسمیں کھا کھا کر اپنی بے گناہی ثابت کرنی چاہی تھی مگر مجھے یقین نہیں تھا۔ میں ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا تاکہ انہیں تڑپا تڑپا کر ماروں۔

میں نے ان دونوں سے انتقام لینے کی ٹھان لی تھی لیکن مجھے کوئی ثبوت نہیں مل رہا ہے۔ میں نے ببلی کی خفیہ نگرانی شروع کرادی تھی لیکن وہ میری سوچ سے بھی زیادہ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

شاطر، مکار اور کائیاں نکلی ہے۔ شاید اسے محسوس ہو گیا ہے کہ اس کی خفیہ نگرانی کرائی جا رہی ہے اس لیے وہ بے حد محتاط ہو گئی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ببلی کا رویہ بھی مجھے بدلتا جا رہا ہے۔ وہ مجھے زیادہ توجہ نہیں دیتی اور مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ بات بے بات ہمارے درمیان لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ حیدر الماس نے اپنی پیشانی پر موجود کٹ کا نشان دکھاتے ہوئے بتایا کہ ایک روز لڑائی کے دوران ہی ببلی نے اسے سیل فون مارا تھا جس سے اس کی پیشانی پر زخم آ گیا تھا۔

جب بھی ہمارے درمیان جھگڑا ہوتا ہے تو ببلی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے مگر میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں اسے آزاد نہیں کروں گا اس لیے کہ آزاد ہوتے ہی وہ باسط سے شادی کر لے گی۔ وہ اب راتوں کو بھی گھر سے باہر رہنے لگی ہے۔ کہاں جاتی ہے، کس سے ملتی ہے، کبھی مجھے نہیں بتاتی۔ اگر میں اس پر دباؤ ڈالتا تو وہ بہانہ یہ کرتی ہے کہ اس کی کسی ''سہیلی'' کے گھر پارٹی ہے وہ وہیں جا رہی ہے اور رات وہیں رہے گی۔ مجھے پتا ہے کہ وہ سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے چودھری باسط سے ملنے جاتی ہے کیونکہ میں نے اس کی نگرانی پر بندے لگا رکھے ہیں مگر وہ بھی کم چالاک نہیں ہے۔ جنہیں میں نے نگرانی پر تعینات کیا ہے وہ ببلی اور چودھری باسط کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ببلی جاتی تو اپنی سہیلی کے گھر ہی ہے لیکن وہاں سے وہ نکل کر کیسے چودھری باسط کی خفیہ کوٹھی پر پہنچتی ہے اس بارے میں کوئی بھی معلوم نہیں کر سکا ہے۔

حیدر الماس جیسے ہی خاموش ہوا میں نے پوچھا۔

''یعنی آپ میری بنائی ہوئی کلپ کو بطور ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

''صحیح کہا، جو کام میرے آدمی نہیں کر سکے وہ تم نے کر دیا۔ اب میں اسے شہر میں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے معلوم ہے باسط کتنا طاقتور ہے، تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ وہ ہے کیا۔'' حیدر الماس نے کہا۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ چودھری باسط شراب اور شباب کا بھی رسیا ہے۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا ہے۔ اس کے کئی ''خفیہ'' اڈے ہیں۔ اس نے غنڈوں کی فوج پالی ہوئی ہے۔ سیاست میں ہونے کی وجہ سے وہ بااثر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بیوی گھریلو خاتون ہے۔ اس کا بیٹا شانی بھی باپ کے ہم قدم ہے البتہ اس کی بہن بے حد مختلف مزاج کی ہے۔

''آپ کو اس بات کا کیسے پتا چلا کہ میرے پاس کوئی کلپ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

حیدر الماس نے بتایا کہ گزشتہ رات وہ اپنی بیوی ببلی کے ساتھ ایک پارٹی میں موجود تھا۔ وہاں چودھری باسط بھی نظر آیا۔ وہ پریشان اور الجھا الجھا سا تھا۔ دونوں کی ٹیبل الگ تھی۔ درمیان میں فاصلہ بھی تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ باسط اس کی بیوی کو آنکھوں سے اشارہ کر رہا ہے۔ حیدر الماس نے ثبوت حاصل کرنے کے خیال سے انہیں موقع دینا چاہا۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور بیوی سے بولا کہ میں واش روم جا رہا ہوں۔ واش روم میں نہ جا کر کوریڈور کی طرف مڑ گیا پھر گھوم کر اس کھڑکی کے پاس آ گیا جس کے نزدیک باسط کی ٹیبل تھی۔ کھڑکی سے دیکھا تو اس نے ببلی اور چودھری باسط کو محو گفتگو پایا۔ اس نے چھپ کر ان دونوں کی باتیں سنیں، چودھری باسط، ببلی کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس نے ببلی کو بتایا ہے کہ ایک لڑکے نے ان دونوں کی ویڈیو بنا لی ہے۔ حیدر الماس نے اسی دن چودھری کے ایک آدمی کو خرید لیا جو میرے پرانے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس آدمی نے اسے میرے بارے میں مکمل معلومات دے دیں اور حیدر الماس نے میرے دوست فاروق کی نگرانی شروع کر دی اور پھر اسے اغوا کر کے مجھے اپنے ڈیرے پر بلا لیا۔

☆......☆

حیدر الماس، چودھری باسط اور ببلی کی ویڈیو لیک کرنا چاہتا تھا تاکہ چودھری باسط کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اس کے دل میں دونوں سے انتقام لینے کی آگ جل رہی تھی اور وہ آگ اتنی شدید تھی کہ ٹھنڈی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ''لیکن اس طرح تو چودھری باسط کا شک مجھ پر ہی جائے گا۔ وہ تو یہی سمجھے گا کہ میں نے اس کی ویڈیو لیک کی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' حیدر الماس نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ''میں کچھ سوچتا ہوں۔''

میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھا۔ شاید ایسی فول پروف پلاننگ سوچ رہا تھا کہ اس میں ذرا سا بھی جھول باقی نہ رہے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور

UUNOVELS.COM

کہا۔ ''تم ایک کام کرو۔''

''کیا؟''

''تم چودھری باسط سے کل نہ ملو۔'' حیدر الماس نے کہا۔

''لیکن میرا اس سے ملنا ضروری ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم چودھری ساجد کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہونا؟'' حیدر الماس نے پوچھا۔

''جی۔''

''لیکن وہ تمہیں کبھی بھی چودھری ساجد کے بارے میں نہیں بتائے گا۔'' حیدر الماس نے کہا۔ ''میں اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ بے حد ضدی اور چالاک ہے۔''

''اس کا تو باپ بھی بتائے گا۔'' میں نے یکدم غصیلے لہجے میں کہا۔

''تم کافی جوشیلے نوجوان ہو۔'' حیدر الماس نے مدلل لہجے میں کہا۔ ''لیکن بعض اوقات یہ جوشیلا پن نقصان کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو اور دل مطمئن ہو تو مجھے بتا سکتے ہو کہ تمہاری چودھری باسط سے کیا دشمنی ہے اور تم چودھری ساجد کو کیوں تلاش کر رہے ہو؟ ہوسکتا ہے میں تمہاری مدد کرسکوں۔''

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے جواب دیا۔ ''چودھری باسط کے بیٹے شانی نے میری بہن کو اغوا کر کے چودھری ساجد کو فروخت کردیا ہے۔''

''اوہ۔'' حیدر الماس کے منہ سے نکلا۔ ''مجھے پوری بات بتاؤ۔''

میں نے شانی سے ملنے، اپنی بہن روزینہ کے اغوا سے لے کر چودھری باسط تک پہنچنے تک کی تفصیل بتادی اور یہ بھی بتادیا کہ میں اس سے چودھری ساجد کے بارے میں کیوں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس نے بڑے تحمل اور غور سے میری بات سنی تھی۔ اس دوران میں اس کی آنکھوں کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتار چڑھاؤ کے تاثرات ابھرتے اور ختم ہوجاتے تھے۔

''چودھری باسط اس قدر گھٹیا اور کمینہ انسان نکلے گا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے ساتھ واقعی ٹریجڈی ہوئی ہے لیکن تم اکیلے چودھری باسط سے نہیں لڑ سکتے۔ تم اس کا بال تک بیکا نہیں کرسکتے۔ وہ تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر کمینہ اور کائیاں ہے۔''

''میں نہ صرف اس کا بال بیکا کروں گا بلکہ اسے کیفر کردار تک بھی پہنچاؤں گا۔'' میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''نوجوان! میں نے کہا نا کہ تم اکیلے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تمہیں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دے گا۔ البتہ اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں، میرے پاس بہت نہ سہی مگر وسائل ہیں، تھوڑی بہت مدد ضرور کرسکتا ہوں۔''

''آپ؟''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''باسط سے بدلہ لینے کے لیے میں بھی اکیلا جرم کی دنیا میں آیا تھا۔ ابتدا معمولی بات سے ہوئی تھی۔ میں صرف بیوی کے خلاف ثبوت حاصل کرنا چاہتا تھا مگر جب میدان میں آیا تو پتا چلا کہ وہ نہ صرف میرا دشمن ہے بلکہ ملک وقوم کا بھی دشمن ہے۔ اس لیے میں نے اپنی جنگ کا رخ موڑ دیا ہے۔ اب صرف اپنا ہی نہیں ملک وقوم کا بھی حساب اس سے لینا ہے۔ اس مقصد کے لیے میں نے کچھ اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا ہے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تم بھی میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔''

''میں کس طرح آپ کے ساتھ ہوسکتا ہوں؟''

''اس کی ابتدا یہ ہے کہ تم مجھے ویڈیو دے دو اس کے بدلے میں تمہاری مدد کروں گا اور بہت جلد تمہاری بہن تمہارے پاس ہوگی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ حیدر الماس مجھے بالکل مختلف انسان دکھائی دیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اس پر اعتبار کرنا چاہیے۔ چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔''

''گڈ۔''

''لیکن اگر چودھری باسط نے ویڈیو کی بابت پوچھا تو اسے کیا جواب دوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم میرا نام لے لینا۔''

''آپ کا......؟'' میں چونکا۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ حیدر الماس کے چہرے پر چمک ابھر آئی تھی۔ پھر وہ مجھے سمجھانے میں مصروف ہوگیا اور میں

UUNOVELS.COM

غور سے اس کی باتیں سننے لگا۔

☆......☆

میں جب گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ امی تو سو گئی تھیں لیکن مرینہ میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ وہ کافی پریشان اور سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے یہی بتایا کہ وہ میری وجہ سے پریشان تھی۔ اسے امی کے پاس بھیجنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اٹیچڈ باتھ روم میں جا کر میں نے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ فریش ہونے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا اور آنے والے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے حیدر الماس کی بات تو مان لی تھی لیکن نتائج سے بے خبر تھا۔ یہ ایک اندھی چال تھی۔ ایک بلائنڈ گیم تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرا یہ فیصلہ میرے حق میں بہتر ہوگا یا غلط پھر میں نے یہی سوچ کر دل کو تسلی دی کہ چودھری ساجد کے ذریعے اپنی بہن تک پہنچنا اور لڑکیوں کے اسمگلروں کو بے نقاب کرنے کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا تو دریغ نہیں کروں گا۔ لڑکیوں کے اسمگلروں کے بے نقاب ہونے سے کئی خاندانوں کا بھلا ہو جائے گا۔ قوم کی بیٹیاں ان درندوں کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچ جائیں گی۔ کسی ایک لڑکی کے برباد ہونے سے پورا خاندان برباد ہو جاتا ہے۔

حیدر الماس میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہ میرے ساتھ مخلص ہے یا نہیں یہ سب میں نے وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ البتہ مجھے اس کے لہجے میں خلوص کا عنصر ضرور محسوس ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے چودھری باسط اور اس کی ہونے والی بیوی کی ویڈیو دینے کی ہامی بھر لی تھی۔ حیدر الماس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ چودھری ساجد کو بھی جانتا ہے لیکن ابھی اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں بتائے گا کیونکہ وہ ایک بڑا مہرا ہے پھر وہ خود بھی اس کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتا۔ اب وہ اس پر نظر رکھے گا اور مکمل معلومات کے بعد مجھے بتائے گا۔ ابھی تو اسے وہ ویڈیو چاہیے۔

واپسی پر جب حیدر الماس کے کارندے مجھے اور فاروق کو چھوڑنے آئے تھے تو انہوں نے میری آنکھوں پر رومال نہیں باندھا تھا البتہ فاروق کی آنکھوں پر رومال ضرور باندھا تھا۔ فاروق کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد جب میں کارندوں کے ساتھ کار میں سوار کچہری چوک تک پہنچا تو میں وہیں اتر گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ حیدر الماس کے کارندے میرا گھر دیکھ لیں۔ میں ابھی محتاط رہنا چاہتا تھا۔

کارندے نے بھی میرے فیصلے پر اعتراض نہیں کیا تھا اور مجھے گھنٹا گھر چوک پر اتار کر چلے گئے تھے۔ میں ایک آٹو رکشے پر بیٹھ کر گھر پہنچا تھا۔ میں نے حیدر الماس کے ٹھکانے کا سارا راستہ دیکھ لیا تھا اس لیے مجھے وہاں پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں آ سکتی تھی۔ جانے سے پہلے میں نے حیدر الماس سے وعدہ کیا تھا کہ میں کل شام تک ویڈیو لے کر ان کے ٹھکانے پر پہنچ جاؤں گا۔

میں نے اب وہی کرنا تھا جو مجھے حیدر الماس نے سمجھایا تھا۔ کافی دیر تک بستر پر لیٹے رہنے کے باوجود مجھے نیند نہیں آئی تو میں نے سیل فون آن کر کے سوشل میڈیا اوپن کیا اور سرسری انداز میں دیکھنے لگا۔

جب نیند کا غلبہ ہوا تو فون سائلنٹ موڈ پر لگایا اور اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے بعد لائٹ آف کی اور بیڈ پر لیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

فجر کی اذان پر ہی میں بیدار ہوا تھا۔ اذان کی آواز قدرے دور سے آ رہی تھی۔ چونکہ میں نے ابھی گھوم پھر کر محلہ نہیں دیکھا تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ مسجد کس طرف ہے۔ میں نے مرینہ کو نماز کے لیے جگانے کے بعد وضو کر کے گھر میں ہی نماز پڑھ لی۔ میں نے اپنی بہن روزینہ کے علاوہ ان لڑکیوں کے لیے بھی دعا کی جو درندوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ مرینہ نے امی کو بھی نماز کے لیے جگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں جاگی تھیں۔ شاید دوائیوں کا اثر تھا۔ پھر مرینہ نماز کے بعد کچن میں ناشتا بنانے چلی گئی۔

ناشتا کرنے کے بعد میں لان میں آ گیا۔ چونکہ وہ گھر کافی عرصے سے بند پڑا تھا اس لیے لان میں پودے مرجھائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ میں غور سے ان پودوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری آنکھوں کے سامنے روزینہ کا چہرہ آ گیا۔ پھول پودے اسے شروع سے ہی اچھے لگتے تھے۔ میں مرجھائے پودوں کی طرف متوجہ تھا مگر ذہن میں روزینہ تھی کہ ایک پرانا منظر ذہن میں جاگا۔ میں چشم تصور میں اسے دیکھنے لگا۔ ہم ایک پارک میں آئے ہوئے تھے۔ میں اور روزینہ واک کر رہے تھے۔ مرینہ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

”بھائی جان۔ کاش...... ہمارا بڑا سا گھر ہوتا، اس گھر

میں ایک بڑا سا لان ہوتا، میں وہاں باغبانی کرتی۔ پودوں اور پھولوں کو پانی دیتی، تتلیوں سے دوستی کرتی، ان کے ساتھ کھیلتی۔'' روزینہ چہکتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

ابھی میں گزرے وقت کے گرداب میں چکر پھیریاں کھا رہا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے کھڑے ہو کر پتلون کی جیب سے سیل فون نکالا تو اسکرین پر باسط کا نمبر تھا۔ میرے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''ہیلو۔'' میں نے سیل فون کان سے لگانے کے بعد کہا۔

''ہیرو۔'' دوسری طرف سے چودھری باسط کی آواز سنائی دی۔ ''میری طرف کتنے بجے آ رہے ہو؟''

''سوری چودھری۔ میں نہیں آ رہا۔''

''کیوں...... کیا ہو گیا ہے؟'' چودھری باسط کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیسا مسئلہ؟''

میں تھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل...... میں نے سوچا ہے کہ تمہاری ویڈیو فروخت کر دوں۔''

میں نے چشم تصور میں چودھری باسط کو اچھلتے ہوئے دیکھا۔

''کیا بک رہے ہو۔''

''بک نہیں رہا، بتا رہا ہوں۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے اس ویڈیو کے منہ مانگے دام مل رہے ہیں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' چودھری باسط ہذیانی انداز میں چیخا۔

''میں ایسا کر رہا ہوں۔''

''کس کو فروخت کر رہے ہو؟''

''تم اسے جانتے ہو؟''

''کون...... کون ہے وہ۔ بتاؤ مجھے۔ تم کس کو ویڈیو فروخت کر رہے ہو؟''

''تمہارے دوست کو۔'' میں نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''کس دوست کو؟ میرے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تم کس دوست کی بات کر رہے ہو۔ اس کا نام بتاؤ۔'' چودھری کی آواز میں غیظ و غضب کا عنصر تھا۔

''ہاہاہا۔'' میں اس کے لہجے پر ہنسا۔

''ہنسو مت۔ بتاؤ مجھے۔''

''تم بے بس ہو اس لیے میرا ہنسنا تو بنتا ہے نا۔'' میں نے اسے مزید طیش دلایا۔ ''تم نے اور تمہارے بیٹے نے بھی تو میری بے بسی کا مذاق اڑایا تھا۔''

''جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔''

''لگتا ہے تم سے صبر نہیں ہو رہا۔ مگر میں ابھی اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

مجھے علم تھا کہ جرائم کی دنیا بڑی عجیب ہے۔ یہاں دشمن بھی دوست بن کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ حیدر الماس ابھی بھی میرے لیے اجنبی تھا۔ بلکہ پُراسرار بھی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی چودھری باسط کی طرح چودھری ساجد کا گرگا ہو اور مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''اوہ۔ کون ہے وہ۔ بتاؤ، اس کا نام بتاؤ۔'' چودھری باسط کی پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ اسے اسی طرح پریشان ہوتے دیکھ کر میری انا کو تسکین مل رہی تھی۔

''ہاہاہا۔'' میں نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ ''صبر کرو چودھری۔ تمہیں کیا جلدی ہے؟''

''تم میرے صبر کا امتحان لے رہے ہو۔'' وہ گرجا۔

''ہمم۔'' میں نے کہا۔ ''تو پھر دل تھام لو، میں تمہیں اس کا نام بتانے لگا ہوں۔''

''بتاؤ۔''

''تمہیں ہارٹ اٹیک تو نہیں ہو جائے گا نام سن کر؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''مجھے کیوں ہارٹ اٹیک ہوگا۔'' چودھری باسط نے کہا تو میں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ پھر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ویسے تم ایسے کمینے لوگوں کو ہارٹ اٹیک اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔''

''بکواس بند کرو اور اس کا نام بتاؤ۔''

''ایسی کیا جلدی ہے وقت آئے گا تو بتا دوں گا۔'' میں نے مزے لیتے ہوئے کہا تو دوسری طرف یکدم خاموشی چھا گئی۔ گہری خاموشی اور سناٹا۔ یوں لگتا تھا جیسے چودھری باسط کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے چشم تصور میں اسے پتھر کا بت بنا ہوا دیکھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں واقعی اسے ہارٹ اٹیک نہ ہو گیا ہو۔ میں نے پوچھا۔

''چودھری! کیا تم زندہ بھی ہو...... یا؟''

''تم...... تم اچھا نہیں کر رہے۔''

''کیسے؟''

UUNOVELS.COM

''دیکھو، وہ...... جو کوئی بھی ہے وہ مجھے برباد کر دے گا۔'' چودھری باسط ہذیانی لہجے میں بولا۔ ''تم ایسے ویڈیو فروخت نہیں کر سکتے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''پھر کیسے فروخت کروں؟'' میں نے کہا۔

''بہرحال، میں فون رکھ رہا ہوں، اب تم جانو اور خریدار جانے۔''

''فون بند نہ کرو، میری بات سنو۔'' چودھری باسط نے التجا کی۔ ''تم وہ ویڈیو اس طرح فروخت نہیں کرو گے۔''

''میں تمہارا حکم ماننے کا پابند نہیں ہوں۔'' میں نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور نہ ہی مجھے تم پر اعتبار ہے۔ تم مار آستین ہو۔ ایسا کرنے پر تم نے ہی مجھے مجبور کیا ہے۔ اگر تم اپنے بیٹے کے کرتوتوں پر اعتبار کر لیتے، مجھے چودھری ساجد کے بارے میں بتا دیتے تو...... تو آج یہ نوبت نہ آتی۔''

''سنو۔ تم مجھ سے جتنے پیسے مانگو گے میں تمہیں دوں گا لیکن تم یہ ویڈیو فروخت نہیں کرو گے۔ میں تمہیں چودھری ساجد کے بارے میں بتاؤں گا بلکہ تمہیں اس کے پاس بھی لے جاؤں گا۔ میرا وعدہ ہے۔'' چودھری باسط نے مجھے قائل کرنا چاہا۔

''سوری چودھری۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے کہا نا کہ مجھے تم پر اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے اگین سوری، خریدار سے ڈیل فائنل ہو چکی ہے۔ اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ میں زبان کا پکا ہوں، تمہاری طرح منافق نہیں۔''

''نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔ میں تمہاری منتیں کرتا ہوں۔ ایسا مت کرو۔'' چودھری باسط یکدم منتوں ترلوں پر اتر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے اپنی پوزیشن کا خوف ہے۔

''تمہارا حال تو خارش زدہ کتے کی طرح ہو رہا ہے اور اچھا ہے۔ کم سے کم تم جیسے لوگوں کا بھیانک چہرہ تو سامنے آنا چاہیے نا۔ مجھے دوبارہ فون مت کرنا۔ گڈ بائے۔'' میں نے یہ کہہ کر سیل فون کان سے ہٹایا تو مجھے چودھری کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی لیکن میں نے ان سنی کرتے ہوئے کال منقطع کر دی۔

''اب دیکھتا ہوں تم کیا کرتے ہو۔'' میں سیل فون میز پر رکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

ایک منٹ ہی بہ مشکل گزرا ہوگا کہ چودھری باسط کی کال آنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ اب اس کا سکون غارت ہو چکا ہوگا۔ اسے ایک لمحہ بھی چین و سکون نہیں آ رہا ہوگا۔ اس کی اعتدال پسندی ہوا ہو چکی ہوگی۔

فون کی گھنٹی چیخ چیخ کر بالآخر بند ہو گئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی مگر چند لمحوں کے بعد دوبارہ اس کی کال آ گئی۔ میں نے اس بار بھی اس کی کال اٹینڈ نہ کی۔ بالآخر اس نے فون کرنا بند کر دیا۔ میں چشم تصور میں ہی اسے پاگل ہوتے دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی بلکہ مجھے خوشی تھی اور دل میں تائید بھی کی تھی کہ عوام کے ''سیاہ چہروں'' والے نمائندوں کا چہرہ سامنے ضرور آنا چاہیے۔

مجھے اپنی بہن تک پہنچنا تھا، ان سیاہ چہروں کو بے نقاب کرنا تھا، مجھے ان اسمگلروں تک پہنچنا تھا جو لڑکیوں کو اغوا کر کے ان سے پورنوگرافی کراتے تھے پھر ان کی پورن ویڈیو ڈارک ویب سائٹ پر ڈال دیتے تھے۔ ایک بار پھر میں یہ سوچنے لگا کہ کیا ایسے لوگوں کو اللہ کا کوئی خوف نہیں ہوتا، کیا انہیں اللہ کے سامنے پیش نہیں ہونا، کیا وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر ان کی اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا ہو تو ان پر کیا گزرے گی۔

☆......☆

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز سوشل میڈیا دیکھنے میں مگن تھا کہ تین بجے

ٹریسا، مدر

1910-1997ء

عیسائی مبلغ جو سکوپجی (مقدونیا) میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصل نام ایگنس گونکشا بوجا کیسو (Agnes Gonxha Bejaxhiu) تھا۔ 18 سال کی عمر میں وہ راہبہ بن گئیں۔ بیس سال تک ملازمت کرنے کے بعد کلکتہ میں مفلوک الحال لوگوں کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف بھارت میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی حادثات میں لوگوں کی جانیں بچانے کا کام کیا۔ انہیں ان کی خدمات کے صلے میں 1971ء میں پوپ جان ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فلاح و بہبود کے کاموں کے سلسلے میں متعدد بار پاکستان کا دورہ کیا۔ پیرانہ سالی میں 1998ء میں انتقال کیا۔

مرسلہ: راحیلہ اشرف، کراچی

UUNOVELS.COM

حیدر الماس کی کال آ گئی۔ اس کا لہجہ تشویش سے بھرپور تھا۔ کہنے لگا۔

''سنو...... جلدی سے اپنی بہن اور ماں کو لے کر کسی محفوظ جگہ پر چلے جاؤ۔''

''کیوں، کیا ہوا......؟'' میں بے اختیار چونکا اور غیر ارادی طور پر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''چودھری باسط کو تمہارے ٹھکانے کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔'' حیدر الماس نے بتایا تو میں حیران رہ گیا۔

''کیا۔ چودھری باسط کو میرے گھر کے بارے میں کیسے پتا چل سکتا ہے...... میں تو......'' میں کہتے کہتے رک گیا۔

''اس کے غنڈے کسی بھی وقت تمہارے گھر پر دھاوا بول سکتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''تمہارے پاس وقت کم ہے، اس لیے جلدی سے اپنی ماں اور بہن کو لے کر نکل جاؤ۔''

یہ میرے لیے واقعی بے حد تشویش کی بات تھی۔ کئی سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔ سب سے اہم سوال یہی تھا کہ چودھری ساجد کو میرے نئے گھر کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ یہ گھر تو اسماعیل شاہد کے کسی دوست کا تھا جس کے بارے میں وہ یا ان کا دوست ہی جانتا تھا۔ میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

''میں کہاں جاؤں...... میرے پاس تو کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں ہے۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''ہم۔ تم اپنی فیملی کو لے کر گھر سے تو نکلو۔'' حیدر الماس نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر مجھے کال کرنا، میرا ڈرائیور آ کر تم سب کو لے جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''جلدی کرو جلدی نکل جاؤ وہاں سے۔'' حیدر الماس نے کہا۔ ''اور ہاں، خیال سے باہر نکلنا۔ میرے ذرائع کے مطابق چودھری باسط کے غنڈے شکاری کتوں کی طرح تم پر جھپٹنے ہی والے ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں...... وہ میری گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔'' میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

''اوکے رائٹ۔'' حیدر الماس نے کہا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

کال کے بند ہوتے ہی میں نے سیل فون پتلون کی جیب میں ڈالا اور تقریباً دوڑتا ہوا کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گیا جہاں امی اور مرینہ بڑی انہماک سے ٹی وی پر کوئی ڈراما دیکھ رہی تھیں۔ مجھے حواس باختہ دیکھ کر مرینہ چونکی اور اٹھ کر میری طرف بڑھی۔

''بھائی...... خیریت تو ہے ناں۔''

''مرینہ! جلدی سے اپنا ضروری سامان سمیٹ لو۔ ہمیں ابھی کے ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔'' میں نے اسے ہدایت دیتے ہوئے کہا تو حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''لیکن......'' وہ کہنا چاہتی تھی۔

''وقت بے حد کم ہے۔ جو کہا ہے وہ کرو۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو اس نے امی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور ٹی وی کی طرف متوجہ تھیں۔

''امی کو کیا کہوں گی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

''کچھ بھی کہہ دینا...... لیکن فی الحال یہاں سے نکل چلو۔ چودھری باسط کے غنڈے پہنچنے والے ہیں۔ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔

میں پلٹ کر اپنے کمرے میں آیا اور جلدی جلدی اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگا۔ چودھری باسط اور بیلی کی ویڈیو والی فلیش میں نے پہلے ہی نکال کر اپنی پتلون کی جیب میں منتقل کر دی تھی۔ پانچ منٹ کے بعد میں جب ڈرائنگ روم میں آیا تو مرینہ بھی تیار تھی۔ اس نے ضروری سامان دو بیگوں میں ڈالا ہوا تھا۔ امی بھی اس کے پاس ہی کھڑی تھیں اور حیران تھیں۔

''علی بیٹا! ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' امی نے پوچھا۔

''امی! آپ کو بتایا تو ہے کہ ہم علی بھائی کے دوست کے گھر دعوت پر جا رہے ہیں۔'' میرے بولنے سے پہلے ہی مرینہ امی سے مخاطب ہو گئی۔

''کس دوست کے گھر......؟ یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں۔'' امی شاید پوری تحقیق کرنا چاہتی تھیں۔ مرینہ نے میری طرف دیکھا۔

''امی! ہم یوسف کے گھر جا رہے ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ یوسف میرا دوست تھا اور وہ گول باغ کی طرف رہتا ہے۔

''یوسف......'' وہ سوچنے والے انداز میں بولیں۔

''ہم اس کے گھر کیوں جا رہے ہیں۔ کیا اس کی شادی ہے؟''

UUNOVELS.COM

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا اور سوچنے لگا کہ مزید کیا جواب دوں۔ لیکن انہیں مطمئن کرنا بھی ضروری تھا اس لیے کہنا پڑا۔ "اس کے گھر ہماری دعوت ہے۔"

امی حیران رہ گئیں اور بولیں۔ "لیکن یہ بیگ کیوں لے کر جا رہے ہیں؟...... ان میں کیا ہے؟"

امی تو بال کی کھال اتارنے پر اتر آئی تھیں۔ ذہنی دباؤ نے انہیں عجیب سا کر دیا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے سرکتا جا رہا تھا اور میری بے چینی مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے امی سے کہا۔ "امی...... ان باتوں کو چھوڑیں اور فی الحال چلیں۔"

"روزینہ کو تو آنے دو۔ کیا وہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گی؟ مجھے اس کی پریشانی ہو رہی ہے۔" امی نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"امی! روزینہ وہیں آ جائے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تم نے اسے بتا دیا کہ ہم یوسف کے گھر جا رہے ہیں؟" امی نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

"جی امی، چلیں اب۔"

امی مزید کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن پھر خاموش ہو گئیں البتہ انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

گھر سے باہر نکل کر میں نے گیٹ کو تالا لگایا اور پھر سامنے والی گلی سے جانے کی بجائے دائیں طرف والی پتلی گلی سے ہوتے ہوئے سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ امی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ان کی رفتار پر مجھے غصہ آ رہا تھا کیونکہ ہمارے اردگرد خطرہ ہی خطرہ تھا کسی بھی وقت باسط کے غنڈے مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہ تھی۔ مجھے خوف تھا تو صرف مرینہ کا۔ ایک بہن کو تو کھو ہی چکا ہوں۔ اب کہیں یہ بھی نہ کھو جائے۔

گلی میں اکا دکا افراد ہی موجود تھے۔ ان میں چند ہماری طرف متوجہ تھے جبکہ باقی اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ میں وقفے وقفے سے پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ چودھری باسط کے غنڈے اس گلی سے نہ آ جائیں۔ امی جس رفتار سے چل رہی تھیں اس سے یہی لگتا تھا کہ ہمیں سڑک تک پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔

"امی! ذرا تیز چلیں۔" میں نے بالآخر امی کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔

"کیوں...... کیا پولیس ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے؟" امی نے نروٹھے پن سے کہا۔ "ایک تو تم آندھی اور طوفان کی طرح گھر سے لے کر نکل پڑے ہو اور اب کہتے ہو کہ میں جلدی چلوں۔"

اتنا کہہ کر امی نے پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ مرینہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ امی نے مزید کہا۔ "میں آرام سے ہی چلوں گی، میرے پیروں میں درد ہے۔ اور اگر تم لوگوں کو جلدی ہے تو مجھے گھر چھوڑ کر تم دونوں چلے جاؤ۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور ہم آگے بڑھتے رہے۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد ہم سڑک پر پہنچ گئے۔ میں نے آٹو رکشے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک خالی آٹو رکشا مل گیا۔ امی اور مرینہ کے سوار ہونے کے بعد میں بھی سوار ہو گیا۔

"کہاں جانا ہے صاحب؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"گھنٹا گھر چلو۔" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا تو ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آٹو رکشا آگے بڑھا دیا۔

"ہم گھنٹا گھر کیوں جا رہے ہیں؟" امی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "گھنٹا گھر کی طرف ہمارا کوئی رشتے دار نہیں رہتا۔"

"امی! آپ کو بتایا تو تھا کہ ہم یوسف کے گھر جا رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں تو...... کیا یوسف گھنٹا گھر کی طرف رہتا ہے۔ کیا اس کے گھر والوں نے مکان بدل لیا ہے؟" پتا نہیں کیا بات تھی کہ امی کی یادداشت کبھی کھو جاتی اور کبھی لوٹ آتی۔ ڈاکٹر کی دواؤں نے اتنا تو اثر دکھایا ہی تھا کہ اب وہ بہکی بہکی باتیں کبھی کبھی ہی کرتی تھیں۔

"جی امی۔" میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"اچھا، اس نے کب گھر بدلا تھا؟"

"یہی کوئی ایک ماہ پہلے۔"

"ہمم۔ مجھے تو تم نے بتایا ہی نہیں تھا۔"

"آپ کو بتایا تھا لیکن شاید آپ کو یاد نہیں۔"

"ہمم۔" امی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

آٹو رکشا اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا اور میں عقابی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ چوک

UUNOVELS.COM

پہنچنے تک مجھے ایسی کوئی مشکوک کار دکھائی نہیں دی تھی جس میں میرے خیال کے مطابق چودھری باسط کے غنڈے سوار تھے یا مجھے ایسے لوگ دکھائی دیتے جن پر غنڈے ہونے کا شبہ ہوتا۔ البتہ جیسے ہی آٹو رکشا نے رائٹرز کالونی کی طرف جانے والی گلی عبور کی تو مجھے ایک ''مشکوک'' کار دکھائی دی جس میں چار غنڈہ ٹائپ لوگ سوار تھے۔ وہ چاروں نوجوان تھے اور چہرے مہروں سے کسی طرح بھی شریف دکھائی نہ دیتے تھے۔ ان کی کار ہمارے رکشے کے بالکل قریب سے گزری تھی لیکن ان میں سے کسی نے ہماری طرف نہیں دیکھا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ صرف میرا قیاس ہو اور وہ چودھری باسط کے غنڈے نہ ہوں۔

بہرحال میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ حیدر الماس نے مجھے بروقت آگاہ کر دیا تھا اور ہم گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے ورنہ میں بے خبری میں مارا جاتا اور کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہوتی۔

لیکن یہ سوال ہنوز میرے دماغ میں گھوم رہا تھا کہ چودھری باسط کو میرے ٹھکانے کا علم کیسے ہوا؟ شاید اس بارے میں حیدر الماس کو معلوم ہو۔ میں اس سے ہی معلوم کروں گا۔ یہ سوچ کر ذہن کا رخ تبدیل کر لیا۔

آٹو رکشے نے چوک کراس کیا تو میں نے حیدر الماس کو کال ملائی۔ دوسری بیل پر ہی اس نے کال اٹینڈ کر لی۔

''کیا تم اپنے گھر سے نکل آئے ہو؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم اس وقت گھنٹا گھر پہنچنے والے ہیں۔''

''ہونہہ......'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''تم گھنٹا گھر چوک پر سوپ یخنی والی شاپ میں بیٹھو، میں کار بھیج رہا ہوں۔''

''میں کار کیسے پہچانوں گا۔'' میں نے پوچھا۔

''کار کا رنگ سلیٹی ہے اور نمبر 555 ہے۔'' حیدر الماس نے بتایا۔ ''وہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائے گی۔ تم ڈرائیور کو اپنا نام بتا دینا وہ تمہیں بٹھا لے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور دوسری طرف سے حیدر الماس نے اوکے کہہ کر کال منقطع کر دی۔

گھنٹا گھر چوک پر پہنچ کر میں نے ڈرائیور کو آٹو رکشا روکنے کا کہا تو اس نے رکشا روک دیا۔ اسے کرایہ ادا کرنے کے بعد ہم چوک کے دائیں طرف موجود سوپ یخنی والی شاپ کی طرف بڑھ گئے۔ امی نے اس بارے میں بھی سوالات کیے اور ان کے جوابات مرینہ نے ہی دیے تھے۔

شاپ میں کم رش تھا۔ امی اور مرینہ کو لیڈیز پورشن میں بٹھانے کے بعد میں باہر آ کر بیٹھ گیا...کیونکہ لیڈیز پورشن میں چند خواتین موجود تھیں۔ میں نے تین سوپ کے پیالوں کا آرڈر دیا اور قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا لیکن کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سب کچھ وہی معمول کے مطابق تھا۔

لیڈیز پورشن میں سوپ کے پیالے پہنچانے کے بعد ایک پیالہ مجھے بھی دے دیا گیا۔ میں سوپ پینے کے ساتھ ساتھ باہر کا جائزہ بھی لے رہا تھا کہ اچانک میری نظر سامنے موجود ایک بک شاپ کی سیڑھیوں کی طرف اٹھ گئی۔ اس طرف کے منظر نے مجھے چونکا دیا۔ شانزے بڑے طمطراق سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس نے آنکھوں پر بلیک گاگل لگائے ہوئے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں بکس دکھائی دے رہی تھیں۔

میں شانزے کو دیکھے جا رہا تھا جو اب سیڑھیاں اتر کر ایک سائیڈ پر کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے سائیڈ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوگی اور ڈرائیور یہیں کہیں موجود تھا۔

اچانک میری نظر غیر ارادی طور پر بک شاپ کی سیڑھیوں کی طرف اٹھ گئی تو میں بے اختیار چونک پڑا بلکہ اچھل پڑا۔ مجھے شانی سیڑھیاں اترتا ہوا دکھائی دیا جس نے ٹراؤزر کے ساتھ لیدر کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں جوگنگ شوز تھے۔ اسے دیکھ کر میرے وجود میں خون کی گردش تیز ہوگئی اور میرے اندر آتش فشاں سا پھٹنے لگا۔ میں نے اس کی طرف بڑھنے کا سوچا لیکن پھر خود کو شانت رکھتے ہوئے ارادہ ترک کر دیا۔

شانی بھی بڑے طمطراق سے چلتا ہوا اسی کار کی طرف جا رہا تھا جس کار میں شانزے بیٹھی تھی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب شانی اسی کار کی ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ میں پلکیں جھپکے بغیر شانی اور شانزے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کئی خیالات اور وسوسے میرے دماغ میں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہے تھے۔

''شانزے کا شانی سے کیا تعلق ہے۔'' میں نے خود

UUNOVELS.COM

سے سوال کیا۔
کار آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی سڑک کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گاڑیوں کے اژدحام میں غائب ہوگئی لیکن میں بدستور اسی طرف ہی دیکھ رہا تھا جدھر کار گئی تھی۔ کئی سوالات میرے ذہن میں الجھے تھے۔ کہیں شانزے، شانی کی دوست تو نہیں تھی؟

میں اس وقت چونکا جب ایک لڑکے نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''صاحب جی! آپ سوپ نہیں پی رہے۔ کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟''

''آں...... نہیں بہت لذیذ ہے۔'' میں نے خیالوں کی دنیا سے باہر آتے ہوئے کہا تو لڑکے نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''صاحب جی! اگر سوپ ٹھنڈا ہوگیا ہے تو گرم کر دوں؟'' لڑکے نے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں۔ ابھی گرم ہی ہے۔''

''صاحب جی...... کہاں سے آرہے ہو آپ...... میرا مطلب ہے کس شہر سے آئے ہو؟'' لڑکا میز کی دوسری طرف پڑے بیگز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تو میرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''ملتان سے آرہا ہوں۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا تو لڑکا چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''معاف کیجئے گا صاحب۔ میں سمجھا تھا کہ آپ کسی دوسرے شہر سے آرہے ہیں۔'' لڑکے نے پشیمان ہوتے ہوئے کہا اور پھر وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے سوپ کا پیالہ ختم کیا اور لڑکے کو بلا کر بل ادا کیا پھر حیدر الماس کے کارندوں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے پچیس منٹ گزر چکے تھے۔ پھر مجھے پینتیس منٹ پر سلیٹی رنگ کی کار سوپ یخنی والی شاپ کے باہر رکتی دکھائی دی تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے کار کا نمبر بھی دیکھ لیا تھا۔ کار میں صرف ڈرائیور موجود تھا۔

میں جلدی سے اٹھ کر کار کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرلیا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔ ''میرا نام علی ہے اور تمہیں حیدر الماس صاحب نے بھیجا ہے۔''

ڈرائیور کی عمر اٹھائیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ اس نے آسمانی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ مقامی تھا، بولا۔

''جی۔ مجھے حیدر الماس صاحب نے بھیجا ہے۔''

''رکو...... میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور مڑ کر لیڈیز پورشن کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم ڈرائیور کے ساتھ کار میں بیٹھے اس کے ساتھ جارہے تھے۔ ڈرائیور ہمیں کہاں لے جارہا تھا میں نے اس سے نہیں پوچھا تھا البتہ میں راستے دیکھ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے کار اب پرانے شجاع آباد روڈ پر دوڑ رہی تھی، پھر ڈرائیور نے فاروق پورہ کی بھول بھلیوں سے ہوتے ہوئے ایک گلی میں کار داخل کرکے ایک پرانے سے مکان کی دیوار کے ساتھ روک دی۔ دروازہ قدرے پرانا لیکن مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ اس پر گرے کلر کیا گیا تھا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' ڈرائیور نے کہا تو ہم سب نیچے اتر آئے۔ میں نے امی کو دیکھا تو وہ حیرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں لیکن انہوں نے کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر مکان کے دروازے پر دستک دی تو کچھ دیر کے بعد ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ درمیانے قد کی تھی لیکن قدرے صحت مند دکھائی دے رہی تھی۔ ڈرائیور اس سے بولا۔

''یہ حیدر صاحب کے مہمان ہیں اور کچھ عرصہ یہیں رہیں گے۔''

ادھیڑ عمر عورت نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا اور ہمیں راستہ دینے کے لیے ایک سائیڈ پر ہوگئی۔ ڈرائیور چلا گیا تو ہم مکان میں داخل ہوگئے۔ مکان چھ، سات مرلے پر مشتمل تھا۔ تین کمرے، چھوٹا سا ڈرائنگ روم اور ایک کشادہ کچن تھا البتہ صحن زیادہ بڑا نہیں تھا۔

''علی! یہ کس کا گھر ہے؟'' ہم ایک کمرے میں پہنچے تو امی نے مجھ سے استفسار کیا۔

''امی! یہ یوسف کا گھر ہے۔'' میں نے بات بنائی۔

''یوسف کا......'' وہ ٹھٹھکیں۔ ''یوسف کا گھر تو اپنے محلے میں ہے۔''

''ہاں امی......'' میں نے کہا۔ ''یہ بھی اسی کا گھر ہے۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی خریدا ہے۔''

''ہونہہ......'' امی نے ہنکارا بھرا اور ان کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھر آئے۔ شکر ہے وہ مطمئن ہوگئی تھیں ورنہ جس طرح ان کی ذہنی رو خراب تھی ایسے میں وہ مختلف سوالات کرسکتی تھیں جن کے جواب دینا ہمارے بس سے باہر

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ہو جاتا۔ میں نے ایک کمرا مرینہ اور امی کے لیے جبکہ ساتھ والا کمرا اپنے لیے مختص کرلیا۔

گھر میں فرنیچر اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی اس لیے مجھے پریشانی نہیں تھی۔ ادھیڑ عمر عورت کا نام زلیخا تھا اور وہ انتہائی چاق و چوبند اور ہوشیار دکھائی دیتی تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد حیدر الماس بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے حال احوال پوچھنے کے بعد کہا۔

"تمہارے جانے کے بیس منٹ بعد ہی چودھری باسط کے کارندوں نے کوٹھی پر دھاوا بول دیا تھا۔ انہوں نے کوٹھی میں موجود سامان کی توڑ پھوڑ بھی کی ہے۔"

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ مرینہ اور امی اپنے کمرے میں تھیں۔

"آپ کا شکریہ کہ آپ نے بروقت مجھے آگاہ کردیا ورنہ میں بے موت مارا جاتا۔" میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہاری تقدیر نے تمہارا ساتھ دیا ہے اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ خیر...... ویڈیو مجھے دے دو۔" وہ بولے۔

"ہاں کیوں نہیں۔" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا اور پتلون کی جیب سے فلیش نکال کر حیدر الماس صاحب کو دے دی۔ وہ فلیش الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ میں نے غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر گہری چمک ابھر آئی تھی۔

"اب دیکھتا ہوں چودھری باسط کسی کو منہ دکھانے کے قابل کیسے رہتا ہے۔ اس نے میری عزت کا جنازہ نکالا ہے اب میں اس کی عزت کا جنازہ نکالوں گا۔" وہ فلیش کو گھورتے ہوئے انتہائی سفاکی سے بولے تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ان کی سفاکی آنے والے کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے جارہی تھی۔

"کیا آپ اسے چینل پر چلوائیں گے؟" میں نے استفسار کیا۔

"ہاں۔" حیدر الماس نے فلیش اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کب......؟"

"آج رات دس بجے والی نیوز میں۔" حیدر الماس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔ وہ ایسے خوش ہو رہے تھے جیسے انہیں ویڈیو نہیں بلکہ قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ وہ مزید بولے۔

"چودھری باسط نے مجھ سے میری بیوی چھینی ہے...... میں اس سے شہرت، عزت، وقار سب چھین لوں گا۔ اس کی نیک سیرتی کا لبادہ اتار دوں گا۔ میں اسے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔" وہ سخت غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔

جو کام میں کرنا چاہتا تھا وہ اب حیدر الماس کرنے جا رہے تھے۔ میں نے تو چودھری باسط کو محض دھمکی دی تھی لیکن حیدر الماس عملی جامہ پہنانے جارہے تھے۔ مجھے بھی اب چودھری باسط کی پرواہ نہیں تھی کیونکہ حیدر الماس مجھے اس سے زیادہ طاقتور لگ رہے تھے پھر وہ چودھری ساجد کے بارے میں بتانے والے تھے۔ اس کے بعد میں چودھری ساجد سے اپنی بہن روزینہ کے بارے میں معلوم کرلوں گا۔ اگر وہ ابھی یہاں ہوئی تو اسے بازیاب کرانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

حیدر الماس بولے۔ "جب تم نے چودھری باسط کو بتایا کہ تم ویڈیو کسی کے حوالے کررہے ہو تو وہ تلملا گیا تھا۔ اس نے اندازے سے مجھے فون کیا تھا۔ میری اس سے اچھی خاصی جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھا اور اس نے مجھ سے ویڈیو کی بابت پوچھا تھا لیکن میں نے اسے بتادیا کہ میں اسے بے نقاب کرکے رہوں گا۔ اس نے مجھے جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی ہیں۔"

"اوہ......" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "لیکن میں نے آپ کا نام تو بتایا نہیں ہے۔"

"وہ بہت چالاک ہے اس نے اندازہ لگالیا ہوگا لیکن میں اس کی دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"پھر بھی آپ کو احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں...... خیر......" وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "میں محتاط ہوں۔"

"اچھا حیدر صاحب! میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا ہے۔ اب...... آپ بھی اپنا وعدہ پورا کردیں۔" میں نے کہا تو انہوں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔ تھوڑا انتظار کرلو۔ پہلے اس ویڈیو کو آن ایئر جانے دو۔ میں لوگوں اور خاص طور پر حکومت کا ردعمل دیکھنا چاہتا ہوں۔ اعتماد رکھو میں جلد ہی تمہیں چودھری ساجد سے ملوادوں گا۔ بہن کی رہائی میں بھی تعاون کروں گا۔"

UUNOVELS.COM

”لیکن مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔“

”صبر کرو۔ صبر کرنا اچھی بات ہے۔“

اسی لمحے اماں زلیخا چائے لے آئی اور ہم باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ چائے بھی سپ کرنے لگے۔ اچانک مجھے کچھ یاد آیا تو میں نے کہا۔ ”ایک بات پوچھنی تھی۔“

”ہاں پوچھو۔“

”کیا آپ جانتے ہیں کہ چودھری باسط کو میرے ٹھکانے کا کیسے علم ہوا تھا؟“

”اس بارے میں تو میں بھی نہیں جانتا۔“ حیدر الماس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے میرے مخبر نے بتایا تھا۔ وہ چودھری ساجد کے پاس ملازمت کرتا ہے۔ اس نے چودھری ساجد کو کسی سے بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ اس نے اپنے کارندے سے کہا تھا کہ وہ فوراً غریب آباد والے مکان پر پہنچ جائے، علی حسن اپنی فیملی سمیت وہیں چھپا ہوا ہے۔“

میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ چودھری ساجد میرے ٹھکانے کے بارے میں کیسے جانتا تھا۔ میں اسی مخمصے کا شکار تھا کہ حیدر الماس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”زیادہ مت سوچو۔ خواہ مخواہ میں اپنا دماغ تھکاؤ گے۔“ پھر وہ کپ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا، میں اب چلتا ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک اماں زلیخا سے کہہ دینا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ میں اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا تو انہوں نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کھول کر دیکھ لو۔“

میں نے کاغذ کھولا تو حیران رہ گیا۔ یہ وہ کاغذ تھا جو میں نے تھانے دار کو لکھ کر دیا تھا کہ اگر میں چودھری باسط یا اس کے بیٹے شانی کے اردگرد منڈلاتا ہوا دکھائی دیا تو میرے خلاف دہشت گردی ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کر لیا جائے۔

”اس کی کاپی بھی تھانے میں موجود نہیں ہے۔“ حیدر الماس صاحب بولے۔ ”اب تم چودھری باسط اور اس کے بیٹے کے اردگرد دکھائی دے سکتے ہو۔“

ان کی بات پر میں نے قہقہہ لگایا تو وہ ہنس پڑے۔ پھر انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور وہاں سے رخصت ہو گئے تو میں نے وہ کاغذ پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور انہیں ڈسٹ بن میں پھینک کر امی اور مرینہ کے پاس چلا گیا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا امی، مرینہ سے الجھ رہی تھیں اور مرینہ انہیں سنبھالنے اور سمجھانے کی حتی المقدور کوشش کر رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے امی کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے مرینہ سے پوچھا۔

”اس سے کیا پوچھتے ہو، مجھ سے پوچھو۔“ امی نے تلخ لہجے میں کہا تو میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کا رویہ بدلا ہوا تھا اور وہ کافی بیخ پا دکھائی دے رہی تھیں۔

”امی! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کی طبیعت......“ میں نے کہتے ہوئے امی کی کلائی پکڑنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ یہ بات میرے لیے باعث تعجب تھی۔ امی نے کبھی یوں میرا ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ بولا، اس نے بھی جھوٹ بولا۔“ امی نے پہلے مجھ سے اور پھر مرینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ۔“ میں چونکا۔

”تم نے کہا تھا کہ ہم جہاں جا رہے ہیں روزینہ وہیں آ جائے گی لیکن...... لیکن کافی دیر ہو گئی ہے وہ نہیں آئی۔ کیوں نہیں آئی...... بتاؤ، کیوں نہیں آئی وہ؟“

اس سے پہلے کہ امی کا انداز ہذیانی ہوتا میں نے جلدی سے انہیں تھام کر خود سے لگا لیا۔ انہوں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن میں نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔

”امی! میری بات سنیں، آپ......“ میں نے کہنا چاہا لیکن امی نے میری بات قطع کر دی۔

”چھوڑو مجھے...... چھوڑو۔“

”پہلے میری بات تو سنیں۔“

”نہیں سننی تمہاری بات۔“

”امی!“ میں نے کہا لیکن وہ تو کسی صورت میری بات سننے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

ان کے جارحانہ انداز پر میں اور مرینہ دونوں ہی حیران تھے۔ آج سے پہلے انہوں نے کبھی ایسا ری ایکٹ نہیں کیا تھا۔ اسی تگ و دو میں وہ خود کو مجھ سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئیں اور پھر ایک جھٹکے سے انہوں نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

”بتاؤ علی...... میری بیٹی کہاں ہے...... کہاں ہے وہ۔ بتاؤ۔ خاموش کیوں ہو۔“ وہ ہذیانی انداز میں چلائیں تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور خود کو بے بس محسوس کرنے لگا۔

”امی! میرا گریبان تو چھوڑیں۔“ میں نے گریبان

UUNOVELS.COM

چھڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں چھوڑوں گی۔ پہلے بتاؤ..... بتاؤ میری بچی کہاں ہے..... تم لوگوں نے مجھے بیمار سمجھا ہوا ہے۔ ہر وقت ٹال دیتے ہو لیکن آج..... آج میں تم سے معلوم کر کے رہوں گی۔ بتاؤ، کہاں ہے روزینہ اور کیوں نہیں آئی ابھی تک؟" امی نے تو گویا آج روزینہ کے بارے میں معلوم کرنے کی قسم ہی کھالی تھی اور اس لمحے مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا جواب دوں۔ انہیں کیسے تسلی دوں۔

"امی! میرا گریبان تو چھوڑیں۔ بتاتا ہوں۔" میں ملتجی ہوا۔

"نہیں چھوڑوں گی..... پہلے بتاؤ۔" وہ بھی گویا اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھیں۔

میں نے استفہامیہ اور مشورہ طلب نظروں سے مرینہ کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی بے حد پریشان اور الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"اس کی طرف کیا دیکھ رہے ہو، میری طرف دیکھو اور بتاؤ۔" امی نے غصے سے کہا۔

"بھائی! میرا مشورہ ہے، آپ امی کو روزینہ کے بارے میں بتا دیں۔" بالآخر مرینہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "روز روز کے جھوٹ بولنے سے بہتر ہے کہ ایک بار ہی سچ بول دیا جائے۔"

"لیکن....." میں کشمکش میں پڑ گیا جبکہ امی کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"جھوٹ..... سچ..... یہ تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو۔" امی نے کہا۔ "کیسا جھوٹ..... کیسا سچ..... اوہ..... اوہ..... روزینہ کے ساتھ کچھ ہوا تو نہیں گیا۔ بتاؤ علی..... کیا ہوا ہے روزینہ کے ساتھ؟ کیا وہ ٹھیک تو ہے نا۔ بتاؤ علی۔ تم خاموش کیوں ہو؟"

کہتے کے ساتھ ہی انہوں نے میرے گریبان کو جھٹکا دیا تھا جس سے میری شرٹ کے دو بٹن بھی ٹوٹ کر بیڈ پر بکھر گئے تھے۔ میں نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی! کول ڈاؤن۔"

"روزینہ کہاں ہے..... کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟" امی نے میری بات نظر انداز کر دی۔ "بتاؤ علی..... ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ بتاؤ۔"

اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور چند لمحوں کے بعد اماں زلیخا دروازہ کھول کر اندر آئیں۔ ہم نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر پریشانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔

"بی بی جی کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں پریشان ہو گئی تھی اس لیے....." وہ کہتے کہتے رک گئیں۔

"امی ٹھیک ہیں۔ آپ جائیں۔" میں نے کہا تو وہ دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔

"تم مجھے بتاتے ہو یا نہیں؟" امی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

مرینہ کے مشورے کے مطابق بالآخر میں نے یہی بہتر سمجھا کہ امی کو سچ بتا دوں۔ ہوسکتا ہے سچ سننے کے بعد ان کی حالت بہتر ہو جائے اور وہ ہذیانی کیفیت سے باہر نکل آئیں۔ بعض اوقات صدمے بھی طبیعت کی بہتری کا باعث بنتے ہیں۔ اتنے ماہ ہو گئے تھے ہم نے امی سے مسلسل جھوٹ بولا تھا لیکن کب تک جھوٹ بولتے۔ سچ تو آخر ایک نہ ایک روز سامنے آنا ہی تھا تو میں نے یہی سوچا کہ آج ہی کیوں نہ بتا دوں۔ جو ہوگا اللہ بہتر کرے گا۔ حالانکہ امی کو معلوم تھا کہ روزینہ اغوا ہو چکی ہے لیکن اس وقت ان کی حالت نارمل تھی۔ اب ان کی حالت و کیفیت بدلی ہوئی تھی اس لئے انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو علی۔ بتاؤ مجھے۔" ان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں سوچوں کے حصار سے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "امی! روزینہ اغوا ہو چکی ہے۔ آپ کو پہلے بھی بتایا تھا۔"

"کیا.....؟" امی نے بے ساختہ کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ سکتے کی حالت میں چلی گئیں۔ ان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا، میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی اور سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ اس لمحے مجھے رونا آیا لیکن میں خود پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ میں نے مرینہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس لمحے میری کیا کیفیت تھی یہ بتانا مشکل ہے لیکن میں اتنا جانتا تھا کہ میرا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔

"رو..... رو..... روزینہ..... اغ..... اغوا....." امی نے بہ مشکل ہی یہ الفاظ ادا کیے تھے پھر وہ میری بانہوں میں جھول گئی تھیں۔ وہ صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش ہو گئی تھیں۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

UUNOVELS.COM

قہر

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ایک اور سچ بیانی ارسالِ خدمت ہے۔ یوں تو ہمارے اردگرد، معاشرے میں لاتعداد کہانیاں بکھری پڑی ہیں لیکن ایک اچھا قلم کار صرف انہی کہانیوں کو قلم بند کرتا ہے جن میں انفرادیت ہو، عابی کی کہانی تو بہت ہی منفرد، بہت زیادہ سبق آموز بلکہ دل دہلا دینے والی ہے۔ یقین کریں اس کہانی کو لکھ کر میں روئی ہوں، بہت زیادہ روئی ہوں، ایسی کہانیوں پر تو فلم بنتی، ڈرامے بنتے ہیں۔
کنیزہ زہرہ
(لاہور)

دروازے پہ زوردار دستک ہوئی تھی۔ برتن دھوتی عفی نے بھاگ کے دروازہ کھولا سامنے والے گھر سے آئے بچے نے نیاز کی بریانی کا شاپر اسے تھمایا اور یہ جا وہ جا ہوا۔ وہ ابھی ڈھیروں برتن دھو کے ہٹی تھی سو پلیٹ کا تکلف کیے بنا وہ شاپر لیے سیدھی اپنے اور بہنوں کے مشترکہ کمرے میں آگئی جہاں چھمی ابا کے کپڑے پریس کر رہی تھی جبکہ عابی منہ پہ دوپٹا ڈالے لیٹی جانے کن جہانوں کی سیر میں مگن تھی۔

''واہ یار! ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ کاش کہیں سے بریانی آ جائے۔ لو دیکھو آ بھی گئی، اللہ کتنا مہربان ہے۔'' ہاتھ سے ہی بریانی سے وہ انصاف کرتی ہوئی عجلت میں وہ عابی کی ساتھ والی چارپائی پہ کچھ اس انداز میں بیٹھی کہ چارپائی کی چرچراہٹ گونجی۔

''اللہ تو واقعی مہربان ہے سمندر مانگنے پہ سمندر بھی دیتا ہے... مگر تمہارے ندیدی ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ تمہاری سوچ کی پرواز بس بریانی تک محدود ہے۔'' منہ سے دوپٹا ہٹاتی عابی نے قدرے نخوت سے کہا تو چھمی جو ابا کے کپڑے ہینگ کر کے رکھتی... وہ بھی اب عفی کی پلیٹ سے نوالے لے رہی تھی اس کی بات پہ ٹھٹک گئی۔

''بہت اونچا اڑنے والے کبھی کبھار منہ کے بل بھی گر جایا کرتے ہیں اس لیے اوقات میں رہنا اچھی بات ہے۔'' دو ہی نوالوں کے بعد چھمی نے چاولوں سے سنی ہوئی انگلیاں چاٹیں اور گمبھیر لہجے میں کہتی ایک کونے میں پچھی اپنی چارپائی پہ جا بیٹھی۔

''اونچا اڑنے والوں کو کھلا آسمان بھی تو ملتا ہے۔ جس کی تم حسرت ہی کر سکتے ہو... کیونکہ کنویں کے مینڈک کی طرح تمہاری چھوٹی سی عقل، خواب بھی چھوٹے چھوٹے ہی بنتی ہے۔'' بدک کے اٹھتی ہنی نے تنک کے کہا تو چھمی نے سر جھٹک کے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

''ارے تم لوگ کیا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ محاذ کھول لیتی ہو، کبھی تو سکون سے بیٹھ جایا کرو کہ لڑنا جھگڑنا فرض ہے تم لوگوں پہ۔'' عفی نے گھور کے بہنوں کو دیکھا اور ناصحانہ انداز میں سمجھانا گویا فرض سمجھا۔

''میں کب اسے منہ لگاتی ہوں خود ہی ہر بات میں ٹانگ اڑا کے مجھ سے اپنی عزت افزائی کرواتی ہے۔'' چھمی کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے وہ عفی سے مخاطب تھی۔

''عفی! اس کو بڑا وہم ہے کہ اسے منہ لگانے کا مجھے کوئی خاص شوق ہے، ہنہ بڑی آئی کہیں کی شہزادی۔'' چھمی بھی اب کے مخاطب عفی سے تھی مگر گولا بارود کا رخ عابی کی طرف ہی تھا۔

''اف بس کر دو اللہ کی بندیو! کیوں ہاتھ منہ دھو کے ایک دوسرے کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ عابی تو نے تو چکھی ہی نہیں کھا کے دیکھ بڑے مزے کی بریانی ہے انگلیاں چاٹتی رہ جائے گی قسم سے۔'' ادھ کھائی پلیٹ سامنے چارپائی پہ رکھتی عفی نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کے انہیں لڑنے سے روکا تو بمشکل خاموش ہوئیں۔

UUNOVELS.COM

"نہیں تم ہی کھاؤ مجھے نہیں ضرورت اس گندے سے محلے کی شاپر میں آئی ہوئی بریانی کی۔ میں تو ایک دن فائیو اسٹار ہوٹل میں کھاؤں گی وہ بھی چھری اور کانٹے کے ساتھ۔" اسے جواب دے کر وہ پھر سے منہ پہ دوپٹا ڈال کے لیٹ گئی تھی۔ غنی نے افسوس سے سر ہلایا اور باقی ماندہ بریانی ختم کرنے لگی جب کہ جیمی نے نفرت سے اس کی طرف ہاتھ کھڑا کر کے گویا اس پہ لعنت بھیجی تھی۔ دفعتاً دروازے پہ بڑی زوردار دستک ہوئی تھی۔ وہ تینوں بری طرح ہڑبڑا اٹھی تھیں۔ جیمی جا کے دروازہ کھول آئی۔ دروازے پہ مختار صاحب تھے جو اس کے سلام کا جواب دیتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جیمی کو تعجب نے گھیر لیا۔ پہلے تو وہ جب بھی گھر آتے تھے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ان تینوں کے لیے چیز ہوتی تھی۔

"یار غنی! کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، آج ابا بہت خاموش ہیں۔ اماں بھی سارا دن سے سر درد کا کہہ کر کمرے سے نہیں نکلیں۔ ابھی بھی ابا آتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ پتا نہیں کیوں مگر مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ برا ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔" اندر آتے ہی جیمی نے اپنے خدشات کو زبان دی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، اماں بھی مجھے صبح بہت پریشان لگی تھیں۔ میں نے پوچھا نہیں کہ کہیں غصے میں مجھے جوتی اٹھا کے ہی نہ ماردیں۔" غنی نے بھی تائید میں سر ہلا کے بتایا تو جیمی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ جبکہ ٹھٹک تو عابی بھی گئی تھی مگر اس نے اپنی ازلی بے پروا فطرت کی وجہ سے جلد ہی پریشانیاں ذہن سے جھٹک دی تھیں لیکن وہی سب خدشات پھر سے سر اٹھانے لگے تھے۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"مجھے لگتا ہے امی ابا ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ کچھ ایسا جو بہت سنگین ہے جو بتا کے وہ ہمیں پریشان نہیں کرنا چاہتے۔" جیمی نے پُرسوچ انداز میں اپنا اخذ کیا ہوا نتیجہ بیان کیا۔

"بالکل مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے تم آؤ میرے ساتھ جو بھی بات ہے آج ہم جان کے رہیں گے۔" اس کا ہاتھ پکڑے غنی دبے قدموں کمرے سے نکلی تھی۔ عابی بھی سلیپر میں پاؤں اڑستی اٹھ کے ان کے پیچھے چل دی۔

دوسرے ہی لمحے وہ ساتھ والے ادھ کھلے دروازے سے کان لگائے ہمہ تن گوش تھیں۔ ان کا گھر دو کمروں پہ محیط تھا جن کی چھت ٹی آر گارڈر کی تھی۔ پلستر سے مبرا کائی زدہ دیواریں گویا ان کی مفلسی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ چھوٹے سے برآمدے کے ایک سرے پہ ٹیبل رکھ کے اس پہ چولہا نصب کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی پڑی الماری میں مصالحہ جات کے ڈبے اور کچھ برتن سجے تھے۔ چھوٹے سے صحن میں البتہ مٹی کی بہتات تھی۔ رہی سہی کسر باتھ روم کی بنا دروازے والی چوکھٹ پوری کر رہی تھی جہاں ڈالا ہوا ٹاٹ نہایت خستہ حال تھا۔ باتھ روم کی چار دیواری بھی پلستر سے محروم تھی۔ اس کی چھت بھی ندارد تھی۔ وہ سب واش روم استعمال کرنے کے لیے جوڑے کی شکل میں جاتی تھیں۔ ایک واش روم میں جاتی دوسری باہر پہرہ دیتی۔ ان کے دن رات بس ایک ہی خواہش میں گزرتے کہ کسی طرح ان کے پاس اتنے پیسے ہوں کہ یہ باتھ روم کا دروازہ اور چھت افورڈ کر سکیں۔ مستری مختار احمد بہت اعلیٰ پائے کا کاریگر نہیں تھا اس لیے اسے کبھی کام ملتا کبھی ہفتہ ہفتہ یونہی گزر جاتا۔ پھر بھی وہ دل جمعی سے محنت کرتا۔ کبھی کسی کے گھر پینٹ کرتا تو کبھی گاڑیوں کے شیشے صاف کرتا۔ وہ محنت سے جی نہیں چراتا تھا۔ وہ ہر کام کرنے پر راضی ہو جاتا تھا۔ اس تنگدستی کے عالم میں بھی اس نے اپنی بیٹیوں کو میٹرک تک تعلیم دلوائی تھی۔

"تو مختار احمد! تم نے اپنے دل کی بات پوری کر کے چھوڑی نا۔ تمہیں مجھ پہ، اپنی بچیوں پہ ایک پل کو بھی رحم نہیں آیا۔ ایک غیر کے لیے تم نے سب کچھ داؤ پہ لگا دیا۔" وہ تینوں کافی دیر سے کان دروازے پہ اور آنکھیں دروازے کے پار لگائے کھڑی تھیں۔ مگر اندر چھایا گہرا سکوت ان کی اکتاہٹ کا باعث تھا۔ مختار احمد اور ہاجرہ کتنی دیر سے ایک دوسرے کے مقابل بچھی چارپائی پہ ساکت بیٹھے تھے۔ کمرے میں اتنی خاموشی تھی کہ گویا سوئی بھی گرے گی تو شور مچ جائے گا۔ جب ان تینوں کی ٹانگیں کھڑے کھڑے شل ہونے لگیں تب ہاجرہ کی شکست خوردہ آواز کمرے کا سناٹا چیرتی ہوئی ان کی سماعتوں میں بے چینی گھول گئی۔

"تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے ہاجرہ! وہ میرے لیے غیر نہیں جگری یار ہے۔ کیا ہوا جو ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے تو۔ نہ کبھی اس نے اس بات کو وجہ بنا کے ساتھ چھوڑا نہ کبھی میں ایسا کر سکا۔ جسے تمام عمر خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے دیکھا ہو اسے آج غم میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔" مختار کے چہرے کا اتار چڑھاؤ ان کے دکھی ہونے کا غماز تھا۔ جہاں ہاجرہ کے چہرے پہ ناگواری سمٹی تھی وہیں باہر کھڑی تینوں لڑکیاں ناسمجھی کے عالم میں ایک دوسرے کو

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

دیکھ کے رہ گئیں۔

''یہ کہاں کی عقلمندی ہے مختار! کہ کسی کا غم بانٹنے کے چکر میں انسان اپنی جان اپنی اولاد کا مستقبل تک داؤ پہ لگا دے۔ تم خود سوچو اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے۔ کیوں اپنی بیٹیوں کے سر سے باپ کا شفقت بھرا سایہ چھیننا چاہتے ہو۔'' ہاجرہ کی آواز شدت غم سے اتنی دھیمی ہو چلی تھی کہ گویا کسی کنویں سے آ رہی ہو۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا نیک بخت! کہتے ہیں کہ اللہ سے اچھا گمان ہو تو وہ اچھا ہی کرتا ہے۔ کیوں اوہام کو دل میں پال کے میرا بھی راستہ کھوٹا کرتی ہو۔ دیکھنا سب بہتر ہی ہوگا۔'' تسلی آمیز انداز میں مختار نے ہاجرہ کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلے ہی لمحے وہ تینوں ایک ہی جست میں اپنے کمرے میں تھیں۔ ان کے ہاتھ ایسا معما لگا تھا جس کی گتھی سلجھاتے ان کی رات گزرنے والی تھی۔

☆......☆

وہ آج بہت خوش تھی بالآخر کئی دن کی ناراضگی کے بعد کل اس نے فیضی کو منا ہی لیا تھا۔ بھلا وہ اس سے خفا کیسے رہ سکتی تھی جس کے نام کے ساتھ بندھ کے وہ اس گھر میں آئی تھی پھر فیضی جیسے احساس کرنے والے عمدہ فطرت شریکِ سفر پہ تو وہ اپنی زندگی وار سکتی تھی یہ تو پھر اس کے خواب تھے۔ حلیمہ ٹھیک کہتی تھی کہ عورت کے لیے سب سے اہم اس کا گھر اور اس کے بچے ہونے چاہیے۔ وہ کتنی نادان تھی کہ اپنی عاقبت نااندیشی کی نظر اپنے اتنے پیارے رشتے کرنے والی تھی۔ اتنے دنوں کی اعصابی پکڑ دھکڑ کے بعد آج وہ پُرسکون تھی آج اس کا بی پی بھی معمول پہ تھا ورنہ پچھلے کافی عرصے سے ہائی تھا۔

ابھی بھی وہ صفائی کر کے فارغ ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے افنان اور سفیان کو نہلایا اور صاف کپڑے پہنا کے بیڈ پہ لٹا دیا پھر کچن میں چلی آئی۔ فیضی کو اس کے ہاتھ کا بنا انڈے کوفتے کا سالن بہت پسند تھا اس نے جلدی سے وہی بنایا۔ ساتھ میں دلیا بنا کے وہ دلیے کا باؤل لیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دونوں بچوں کو باری باری دلیا کھلاتی وہ ہمیشہ کی طرح ان سے باتوں میں مگن تھی۔

''آپ کے بابا بہت گندے بچے ہیں مجھ سے بہت فائٹ کرتے ہیں۔ میں نے بھی ایک ہفتہ انہیں خوب ستایا۔ بھلا میرا کب دل چاہتا ہے اپنے چھوٹو اور موٹو کو چھوڑ کے جانے کا۔'' ساتھ ہی پڑے ٹاول سے ان کے منہ صاف

سرسید احمد خان

سید احمد بن متقی خان (17 اکتوبر 1817ء - 27 مارچ 1898ء) المعروف سرسید انیسویں صدی کا ایک ہندوستانی مسلم نظریہ علیت کے حامل، مصلح اور فلسفی تھے۔ سرسید احمد خان ایک گھرانے میں پیدا ہوئے جس کے مغل دربار کے ساتھ مضبوط تعلقات تھے۔ سرسید نے قرآن اور سائنس کی تعلیم دربار میں ہی حاصل کی، جس کے بعد یونیورسٹی آف ایڈنبرا نے انہیں قانون میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

مجدد الف ثانی

شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی مکمل نام: شیخ احمد سرہندی ابن شیخ عبدالاحد فاروقی۔ پیدائش: 26 جون 1564ء، وفات: 10 دسمبر 1624ء دسویں صدی ہجری کے نہایت ہی مشہور عالم وصوفی تھے۔ جو مجدد الف ثانی اور قیوم اول سے مشہور ہوئے۔ آپ کے مشہور خلیفہ سید آدم بنوری ہیں۔

سردار عبدالرب نشتر

آپ 13 جون 1899ء کو پشاور میں پیدا ہوئے اور 14 فروری 1958ء کو کراچی میں فوت ہوئے۔ 2 اگست 1949ء تا 24 نومبر 1951ء پاکستان کے صوبہ پنجاب کے گورنر رہے اس دوران آپ نے ملکی خدمت کے نئے باب رقم کیے۔

سر آغا خان (سوم)

سر سلطان محمد شاہ ابن امام آغا علی شاہ آغا خان دوم، اسماعیلیہ فرقے کے اڑتالیسویں امام تھے۔ آپ نے تقریباً ستر سال امامت کی ہے جو اسماعیلی اماموں میں کسی بھی امام کی امامت سے طولانی امامت ہے۔ امام سلطان محمد شاہ کی ولادت 25 شوال 1294ھ بمطابق 2 نومبر 1877ء کو جمعہ کے دن کراچی شہر میں ہوئی۔ 11 جولائی 1957ء کو وفات پائی اور مصر کے اسوان کے مقام پر آسودہ خاک ہوئے۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کرتی وہ یوں ان سے بات کر رہی تھی جیسے وہ سن رہے ہیں۔ جبکہ وہ بے تاثر نگاہوں سے بس اسے دیکھے جا رہے تھے۔

"وہ کہتے ہیں تم آرام سے گھر بیٹھو میں اپنے سونو مونو کا علاج خود کرواؤں گا۔ دیکھا پاپا آپ دونوں سے کتنا پیار کرتے ہیں۔" دلیے کا خالی باؤل سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے وہ کمر سیدھی کرنے کی غرض سے ان دونوں کے ساتھ ہی لیٹ گئی تھی۔ ان سے لایعنی باتیں کرتی کب وہ نیند کی سرسبز وادیوں میں کھو گئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔

یکلخت اسے لگا وہ کسی تپتے ہوئے ریگستان میں ہے۔ جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ دور دور تک کسی ذی نفس کی موجودگی سے خالی۔ ویران ریگستان بہت ہی خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ دور دور تک کھڑے ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھتے ہوئے چلی جا رہی تھی۔ نیم اندھیرے کے باوجود اس کے قدموں تلے محسوس ہوتی ریت اس قدر تپ رہی تھی کہ اس کی جلن اس کو اپنی روح تک میں محسوس ہو رہی تھی۔ یکا یک ہوا کا تیز جھونکا اسے ریت میں نہلا گیا تھا دوسرے ہی پل اس پہ آشکار ہوا کہ اس کا آدھا دھڑ ریت میں دھنس چکا ہے۔ وہ چیخ چیخ کر فیضی کو پکار رہی تھی جس کی دور دور تک خبر نہ تھی۔

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے سے شرابور تھی۔ اس نے منہ پہ ہاتھ پھیر کے خواب کا اثر زائل کرنا چاہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ فیضی کے آنے میں فقط ایک گھنٹا باقی تھا۔ اس نے جلدی سے نہا کے فیضی کی پسند کا بلیو اور سیاہ کنٹراسٹ کا ڈیزائنر سوٹ پہنا اور گویا خود کو پرفیوم میں ڈبو لیا۔ سیاہ آویزے کانوں میں پہن کر اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا۔

آج وہ مصمم ارادہ کیے ہوئے تھی کہ کل جو شوبز چھوڑنے کا فیصلہ اس نے غصے میں سنایا تھا آج وہ اس فیصلے پہ تہہ دل سے آمادہ ہے۔ آج وہ فیضی سے معافی مانگ کے ان کے درمیان آئی رنجشیں مٹا دینا چاہتی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سات کے ہندسے کو بھی عبور کر رہی تھیں جبکہ فیضی چھ بجے تک گھر آ جاتا تھا۔

اس کا انتظار اب فکر مندی میں بدل چکا تھا۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی مانند صحن کے کئی چکر لگا چکی تھی جہاں چپ سادھے کھڑا دروازہ اس کے ضبط کا امتحان ثابت ہوتا تھا۔

وہ کوئی بیسواں پھیرا لگا کے بیڈروم میں داخل ہوئی تھی کہ فون کی بیل بج اٹھی۔ اس نے لپک کے فون اٹھایا اور نمبر دیکھے بنا ریسیور کو کان سے لگا لیا۔

"واہ جناب! بڑی جلدی آپ کو خیال آ گیا گھر فون کرنے کا۔ میں یہاں انتظار کر کر کے پاگل ہو گئی ہوں آپ ہیں کہ آنے کی بجائے فون کھڑکا رہے ہیں۔" فرط انبساط سے بولتی وہ اب سنگھار میز پہ بکھری اشیاء دراز میں رکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم جی، کیا یہ فیضان صاحب کا گھر ہے۔" قدرے عجلت بھرے لہجے میں استفسار کرتی آواز کسی انجبی شخص کی تھی۔

"جی یہ ان ہی کا گھر ہے میں ان کی مسز بول رہی ہوں۔ کہاں ہیں وہ اور ان کا فون آپ کے پاس کیوں ہے۔" اچانک اس کے دماغ میں خواب اپنی پوری ہولناکی سمیت ابھرا تھا۔ اس نے اپنے خدشات کو پس پشت رکھ کے لرزتے لہجے میں سوال کیا۔

"جی مسز فیضان! میں اسپتال سے بات کر رہا ہوں۔ مجھے بہت افسوس سے بتانا پڑ رہا ہے کہ آپ کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ موقعے پہ ہی دم توڑ گئے۔ آپ اسپتال آ کے لاش کلکٹ کر لیں۔" اس شخص کے انداز میں پیشہ وارانہ بے پروائی تھی۔ وہ تو اطلاع دے کے کب کا فون بند کر چکا تھا۔ جبکہ فون کو اپنی آنکھوں کے سامنے کیے تعجب سے دیکھتی آ نگینے فیضان کے جیسے حواس مختل ہو رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ پہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔ تب ہی بیڈ پہ لیٹے افنان نے کلکاری ماری تھی۔ وہ بے تاثر نگاہوں سے سامنے بیڈ پہ لیٹے اپنے سات سال کے نہایت کمزور اور لاغر جڑواں بیٹوں کو دیکھنے لگی۔ وہ نہ بیٹھ سکتے تھے نہ بول سکتے تھے نہ محسوس کر سکتے تھے۔ بس کبھی کبھار حلق سے لایعنی کلکاریاں برآمد ہو جاتیں جوان میاں بیوی کے مردہ دلوں میں امید کی نئی شمع روشن کر جاتیں۔

"تم تو کہتے تھے کہ چھوڑ دو شوبز میں ان کا علاج کرواؤں گا۔ اب خود یہ جہان چھوڑ گئے اب کون کروائے گا ان کا علاج۔ میں تو شوبز چھوڑ چکی۔ سب پروڈیوسر ڈائریکٹرز کو اگلے پروجیکٹ سے منع کر چکی۔ اب ان سے رول کی بھیک مانگوں گی تو شرم نہیں آئے گی۔" وہ گویا اپنے حواسوں میں نہیں تھی ہذیانی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے وہ اس شخص سے مخاطب تھی جو اب کسی اور جہان کا باسی تھا۔

"جانا مراد تجھ پہ خدا کا قہر ٹوٹے۔ تو گٹروں کا پانی

UUNOVELS.COM

پیے۔ کبھی بھی تیری زندگی میں سکون کا ایک پل نہ آئے۔"
یکلخت ایک مخموم آواز نے اس کے سائیں سائیں کرتے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا، وہ بلبلا کے چیخ اٹھی۔
"فیضی کیوں مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ گئے تمہیں نہیں معلوم میرے پیچھے کتنی بددعائیں لگی ہیں۔ اب تمہاری آبگینے جیسے بھی تو گئے۔" بری طرح چیختے ہوئے اس کی گردن ایک جانب کو ڈھلک گئی تھی۔ ہوش و خرد سے بیگانہ ہونے سے پہلے اس نے دروازے پہ ہونے والی تیز دستک سنی تھی۔

ہزار دستک کے باوجود جب دروازہ نہ کھلا تو حلیمہ اپنے گھر سے ایکسٹرا چابی لے آئی جو اسے آبگینے نے ہی دی تھی کہ اکثر اسے گھر اور بچوں کو حلیمہ کے سپرد کر کے جانا پڑتا تھا۔ حلیمہ کے چونکہ اپنے بچے نہیں تھے سو وہ یہ ذمے داری بڑی خندہ پیشانی سے نبھاتی تھی۔

ابھی بھی وہ چابی کے ساتھ ساتھ ان کی مشترکہ پڑوسن امینہ کو بھی بلا لائی تھی۔ ایک دوسری سے انہونی کے خدشات بیان کرتی جب وہ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئیں تو دہل گئیں۔

"امینہ! دیکھو آبگینے کو کیا ہوا۔" کمرے کے بیچوں بیچ آڑی ترچھی اوندھے منہ پڑی وہ آبگینے ہی تھی۔ حلیمہ نے بڑھ کے بے سدھ پڑی آبگینے کا سر اپنی گود میں رکھا۔ امینہ بھاگ کے پانی لے آئی۔

"حلیمہ آپا! یہ تو پانی کے چھینٹے سے بھی ہوش میں نہیں آ رہی۔ فیضان بھائی بھی ابھی تک واپس نہیں آئے اب کیا کریں۔" امینہ نے قدرے گھبرا کے کہا تو حلیمہ ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی۔

"تم فکر مت کرو میں اسے لے کے اسپتال جاتی ہوں تب تک تم بچوں کے پاس بیٹھو۔ ہو سکے تو انہیں کچھ کھلا دینا۔" وہ دھان پان سی آبگینے کو اٹھا کے بیڈ پہ ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ امینہ افتاں و خیزاں ٹیکسی لینے باہر کی طرف لپکی تھی۔

☆.....☆

ابا آپریشن کروا کے گھر آ گئے تھے جب ان تینوں کو یہ معلوم ہوا کہ ابا اپنے دوست شفاعت حسین کو اپنا ایک گردہ ڈونیٹ کر کے آئے ہیں تو وہ لوگ ششدر رہ گئیں۔ آج کے دور میں بھی ابا جیسے مخلص لوگ موجود ہیں۔ جو بے غرض ہو کے کسی کی یوں مدد کریں کہ اپنی جان بھی داؤ پہ لگا دیں۔

انہیں گھر آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا ان کی میڈیسن بھی ختم تھیں۔ چونکہ مہینا قریب الختم تھا سو گھر میں راشن بھی مٹھیوں کے حساب سے ہی باقی بچا تھا۔ ایسے میں ہاجرہ کا صبر کیسے جواب نہ دیتا۔

"مختار احمد! بڑا شوق تھا نا تمہیں دوستی نبھانے کا۔ نبھا لی دوستی، پڑ گئی دل میں ٹھنڈک۔ جس کے لیے تم نے اپنی جان داؤ پہ لگائی اس نے تو پلٹ کے پوچھا تک نہیں تمہیں۔" قدرے تروٹھے انداز میں کہتی وہ پیتل کی پلیٹ جو کھچڑی سے لبالب بھری تھی اس کے سامنے کرتے ہوئے شکوہ کناں تھی۔ ڈاکٹر نے مختار کو نرم مگر طاقت بخش غذا کھانے کا مشورہ دیا تھا..... گھر کا واحد کمانے والا چارپائی سے کیا لگا۔ مصائب منہ کھولے انہیں نگلنے کو تیار ہو گئے۔

"نیک بخت! مجھے بھی بہت دکھ ہوتا اگر یہ سب میں نے کسی صلے کے لالچ میں کیا ہوتا۔ یہ سب تو میں نے اللہ کی رضا اور اپنے جگری یار کی صحت یابی کے لیے کیا تھا۔ جواب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ فون کیا تھا میں نے کل انہیں۔" رسان سے انہیں سمجھاتے مختار کا لہجہ حسبِ سابق بہت نرم تھا۔

"اماں! آپ پریشان مت ہوں جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ آپ کے غصہ کرنے سے اب ابا کا گردہ واپس آنے سے تو رہا۔" پانی لاتی عنقی نے ہاجرہ کو سنجیدگی سے سمجھایا تو کمرے میں ہی موجود چھمی اور عابی بھنا گئیں۔

"تو چپ کرا ابا کی چمچی اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں! اتنی سخاوت بھی اچھی نہیں کہ انسان اپنی جان ہی داؤ پہ لگا دے۔ پھر آج کے دور میں امیر غریب کی بھی کوئی رشتے داری ہے بھلا دیکھنا شفاعت چچا کو کچھ دن بعد آپ کا احسان یاد بھی نہیں رہنا۔" عنقی کو بری طرح جھڑک کے چھمی اب ابا سے مخاطب تھی۔ جبکہ عابی بار بار بجتی میسج ٹون پہ جز بز ہو رہی تھی۔

"آپا! تم تو لڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا کرو۔" عنقی جو ماں باپ کی لڑائی ختم کروانے کی نیت سے گویا ہوئی تھی پیر پٹختی باہر نکل گئی، پیچھے ہی عابی بھی گئی۔

"بات کوئی ہو یہ چنڈالیں اپنا رولا بیچ میں ضرور ڈال لیں گی۔ باپ بیمار پڑا ہے، گھر میں کھانے کو زہر بھی نہیں اور تم لوگ کشتی کا میدان سجا کے بیٹھ جاتی ہو۔" لفظ دانتوں میں چبا چبا کے ادا کرتی ہاجرہ اب چھمی کو کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔ چھمی نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

مبادہ ادھر اُدھر کا سارا نزلہ اسی پہ نہ نکل جائے۔

''بس کر ہاجرہ! مت ڈانٹا کر ان نمانیوں کو۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ صبر سے کام لو۔ دیکھنا اللہ کوئی نہ کوئی سبب ضرور بنا دے گا۔'' کھچڑی کھاتے ہوئے وہ ناصحانہ انداز میں ہاجرہ کو سمجھانے لگے جس پہ ہاجرہ اور آگ بگولا ہو گئی۔

''وہ محاورہ تو سنا ہو گا آپ نے کہ جو آپ پھنسے اسے کون چھڑائے۔ تن تنہا جو فیصلہ تم نے کیا اس کے بعد آنے والے ان برے حالات کے بارے میں بھی ایک بار سوچ لیتے۔'' ہاجرہ ابھی بھی اپنے مؤقف پہ قائم تھیں۔ اس سے پہلے کہ مختار کوئی جواب دیتا گھر کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی۔ عابی چونکہ چھت پہ سوکھے کپڑے اتارنے گئی تھی سو ناچار عفی کو ہی دروازہ کھولنا پڑا۔ سامنے ہی چچا شناعت اپنے ڈرائیور ریان علی کے سہارے کھڑے تھے اس نے سلام کر کے جلدی سے راستہ دیا۔

''مجھے افسوس ہے مختار! کہ میں تمہارے اتنے بڑے احسان کے بدلے کچھ زیادہ نہیں کر پایا.. مگر جو مجھ سے بن پڑا وہ میں کر رہا ہوں۔ یہ کچھ رقم ہے یہ رکھ لو تمہاری بچیوں کے کام آئے گی۔'' اندر پہنچتے ہی رسمی دعا سلام کے بعد شناعت حسین نے ایک خاکی لفافہ مختار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو جہاں ہاجرہ کے چہرے پہ چھائی ناگواری خوشگوار حیرت میں بدلی تھی۔ وہیں مختار احمد کا اپنے دوست کی آمد پہ فرط انبساط سے کھلتا ہوا چہرہ سنجیدہ ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے یہ بات پہلے بھی ہو چکی ہے ہمارے درمیان۔ انسان ساری زندگی پیسے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا۔ کیا مضائقہ ہے اگر خدا کی رضا اور اپنے عزیز از جان رشتے کے لیے کچھ کرے تو۔ انسان ایک گردے سے بھی اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔ اگر میرا ایک گردہ میرے جگری یار کو شفائے کاملہ بخشتا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ پیسے میں نہیں لے سکتا میرے ایثار کی قیمت مجھے رب کی رضا کی صورت چاہیے۔ ان چند سکوں کی صورت نہیں۔'' دھیمی مسکان لبوں پہ سجائے وہ شناعت کو رسان سے سمجھا رہے تھے جبکہ عفی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ہاجرہ البتہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

''ہاں بھائی صاحب! بالکل صحیح کہہ رہا ہے مختار روپیا پیسا تو آنی جانی چیز ہے۔ ویسے بھی چند سکے کسی کی دائمی صحت کا بدل ہو بھی نہیں سکتے۔ آپ بیٹھیے میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔'' مختصر الفاظ میں گہری بات جتاتے ہوئے انداز میں کہتی ہاجرہ اگلے ہی پل کمرے سے نکل گئی جبکہ ان کی بات کے سیاق و سباق سے واقف مختار شرمساری کے گہرے احساس سے مغلوب ہو کر رہ گیا۔

''یہ تو تم لوگوں کی اعلیٰ ظرفی ہے مگر میں یہ پیسے واپس نہیں لے جاؤں گا۔ یہ تو طے ہے کہ یہ تمہیں رکھنے ہی ہوں گے۔'' وہ خاکی شاپر اب انہوں نے مختار کے تکیے کے نیچے گھسایا تھا پھر اس قدر اصرار کیا کہ انہیں مانتے ہی بنی۔

''اونہوں آئے ہوں گے ابا سے جھوٹی ہمدردی جتانے۔ انہیں کوئی اور نہیں ملا تھا قربانی کا بکرا بنانے کو۔ ابا نے بھی نادوستی کے نام پہ یوں اپنا گردہ پیش کر دیا گویا کوئی پرانا رومال ہو۔'' سوکھے کپڑے بائیں بازو پہ سمیٹتی عابی نے گلی میں کھڑی شناعت حسین کی گاڑی دیکھ کے نخوت سے سوچا۔ تب ہی ہاتھ میں پکڑا اس کا فون رنگ کرنے لگا۔ بابر کا فون تھا۔

اسے شروع سے ماڈلنگ کا بہت شوق تھا۔ ہیروئن بننے کے خواب اس کی بھی خواہشات میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ دو ماہ پہلے ہی وہ نیوز پیپر میں ایک پروڈکشن ہاؤس کا ایڈریس دیکھ کے آڈیشن دینے گئی تھی۔ گو وہاں وہ سیلیکٹ نہیں ہوئی تھی مگر وہیں اس کی بابر سے بات چیت ہوئی۔ جو اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا جلد ہی نمبرز کا تبادلہ ہوا۔ عابی کو لگا بابر شہرت کا آسمان چھونے کے لیے ایک مضبوط سیڑھی ثابت ہو سکتا ہے۔ جبکہ بابر جو کہ یتیم تھا۔ شروع سے ہی تنہا رہا تھا اسے بھی معصوم چہرے والی یہ سادہ سی لڑکی جو دنیا سے کافی حد تک نابلد تھی بہت اچھی لگی تھی۔

آج دو ماہ بعد وہ چند ہی ملاقاتوں میں ایک دوسرے کو جیون ساتھی کے روپ میں چن چکے تھے۔ عابی بھی اسٹوڈیوز کے چند چکروں میں ہی یہ سمجھ گئی تھی کہ کسی مضبوط سہارے کے بنا وہ انڈسٹری میں اپنا مقام نہیں بنا سکتی۔ وہ کئی ایکسٹرا ایکٹرز کو پیسے کے بل بوتے پہ کام حاصل کرتے دیکھ چکی تھی۔ وہ ہیروئن بننے کے خواب کو دو ہی ذرائع سے شرمندہ تعبیر کر سکتی تھی۔ یا اس کے پاس بہت سا پیسا ہوتا یا پھر انڈسٹری کے کسی بندے کی بھرپور سپورٹ۔ پیسے کے معاملے میں تو وہ خالی تھی ہی مگر بابر جیسا ترپ کا پتا وہ ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ مختار احمد اس کی شادی بابر سے کبھی بھی نہیں کریں گے... کیوں کہ وہ برادری کو بہت اہمیت دیتے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھے۔ بھلا وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ غیر برادری کے کسی شخص کے ہاتھ میں کیسے دے سکتے تھے اسی لیے اس نے مختار احمد کے علم میں لائے بنا بابر سے نکاح کا فیصلہ کیا تھا۔

"کیا کر رہی ہو اچھی لڑکی!" بہت خوشگوار انداز میں فون ریسیو ہوتے ہی بابر نے چہکتے ہوئے اس کا حال پوچھا تھا۔

"میں خیریت سے ہوں جناب! اور آپ کی خیریت مطلوب ہے۔" اس نے بھی شوخ لہجے میں جواب دیا کہ بہر حال اسے بابر کے مخلص ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

"میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں نے سب انتظامات کر لیے ہیں۔ اگلے جمعے کو ہم نکاح کر لیں گے۔ گو میرا گھر ابھی کرائے کا ہے مگر یقین جانو جلد ہمارا اپنا گھر ہوگا۔" بابر نے مستحکم لہجے میں کہتے ہوئے وعدے کی ایک ڈور اسے تھمائی تھی۔ اسے بابر کی یہی بات تو پسند تھی وہ اس سے کچھ چھپاتا نہیں تھا۔

"مجھے یقین ہے تم پہ بابر! خود سے بھی زیادہ۔ تم فکر مت کرو ہم مل کے اتنا کام کریں گے کہ زندگی کی محرومیاں کہیں دور بھاگ جائیں گی پھر دولت اور شہرت ہمارے گھر کی باندی ہوگی۔" وہ جذب کے عالم میں اپنے دیکھے گئے خوابوں کی عمدہ تعبیر بیان کر رہی تھی جس میں اس کے تئیں ردوبدل کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

"جی تو ناظرین" دنیا آپ کے سامنے" پروگرام میں آج ہم آئے ہیں جنرل اسپتال۔ اور یہ ہیں ملک کی ابھرتی ہوئی نوآموز اداکارہ آبگینے بابر فیضان جو بہت کم وقت میں شہرت کا آسمان چھونے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ یہ آج شہرت کی جس سیڑھی پہ ہیں اس اسٹیج تک پہنچنے کی لوگوں کے بال سفید ہو جاتے ہیں مگر بدقسمتی سے یہ اس سنگین بیماری اور کسمپرسی کے ہاتھوں مجبور ہو کے آج اسپتال کے کوریڈور میں علاج کے لیے سسک رہی ہیں۔ ہم وزیراعلیٰ صاحب سے اپیل کرتے ہیں کہ ان کی دادرسی کی جائے۔ آپ مخیر افراد سے بھی ان کی مدد کی بھرپور اپیل کرتے ہیں۔ آج ہم کسی کی آسانی کا باعث بنیں گے تو کل آسمان سے ہمارے لیے آسانیاں اتاری جائیں گی۔ اسی کے ساتھ اپنے دوست اپنے ہوسٹ دانش شہزاد کو اجازت دیجئے اللہ نگہبان۔" وہ جو آدھے گھنٹے سے آبگینے کی زندگی میں گزرے واقعے کے تمام محرکات پوری جذیات سے بیان کر چکا تھا اب اسی چرب زبانی سے بولتے ہوسٹ نے پروگرام کا اختتام کیا تھا۔ کیمرا مین نے اسپتال کے سرد فرش پہ بے بس پڑی آبگینے کے چہرے پہ ایک پل کے لیے کیمرا فوکس کیا تھا پھر پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔

باون انچ کی ایل ای ڈی پہ یہ افسوس ناک واقعہ دیکھتی ملک کی مایہ ناز مصنفہ کا دل ایک لمحے کو سوکھے پتے کی طرح کانپا تھا۔ ایک عورت جو شہرت کے آسمان سے یکلخت ذلت و پستی میں گری تھی۔ جس کا شوہر ایک ہفتے سے لاپتا تھا۔ جس کے دو جڑواں بیٹے دونوں ہی معذور اور بے بس تھے۔ وہ عورت آج کسمپرسی کے عالم میں اسپتال کے فرش پہ پڑی جانے کرب کے کن مرحلوں سے گزر رہی ہوگی۔ وہ شروع سے حساس تھی لوگوں کا درد خود پہ محسوس کرنے والی۔ جو آج اس نے دیکھا تھا وہ تو تھا بھی اعصاب شکن۔

یکلخت اس کے پرتعیش کمرے میں گویا کانٹے اگ آئے اس نے ریموٹ اٹھا کے ٹی وی بند کیا اور ٹیرس پہ نکل آئی۔ رات اپنے جوبن پہ تھی۔ ستاروں سے اٹا سیاہ آسمان جیسے آج انوکھی سج دھج لیے ہوئے تھا۔ ہلکی خنکی لیے اوائل نومبر کی خنک ہوا گویا کائنات کی طرف تیزی سے بڑھتے ٹھنڈ کے طوفان کی پیامبر تھی۔ سامنے تارکول کی سڑک پہ رواں دوڑتی بھاگتی زندگی بھی گویا اس کے خیالات کی یورش پہ بند نہیں باندھ پائی تھی۔ اس نے ٹیرس کی گرل پہ مضبوطی سے ہاتھ جما کے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ اندر کی گھٹن کچھ کم ہوئی تھی۔ تیزی سے کہانی بنتے دماغ سے ابھی بھی کچھ نکات پوشیدہ تھے۔ یوں جیسے کینوس میں جڑے ایک شاہکار کا سانچہ تو تیار تھا مگر اسے مکمل کرنے والے رنگ کہیں کھو گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اندر کی طرف قدم بڑھاتی مصنفہ اب اس اداکارہ سے بالمشافہ ملنے کو تیار تھی۔ اسے اس بیچ کے بارے میں جاننا تھا جس کو اداکارہ اس دگرگوں انداز میں کاٹ رہی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ نیوز رپورٹر اپنا لائیو شو کمپلیٹ کر کے گیا تھا۔ وہ جانی کو گھر سے لایا ہوا دلیا کھلا رہی تھی۔ جو اس کے معدے میں کم جا رہا تھا اور باچھوں کے ذریعے باہر زیادہ گر رہا تھا۔ اسے فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ جس نے اس کے جسم کا بایاں حصہ بری طرح متاثر کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان بھی گنگ ہو گئی تھی اور جانے وہ کون سی بات تھی جس نے اسے ہاتھ پیر ہلانے کی خواہش ختم کر دی تھی۔ اسے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسپتال آئے مگر اس کی حالت میں ایک فیصد بھی سدھار نہیں آیا تھا۔ اس کی پڑوسن حلیمہ اور

امینہ اس کڑے وقت میں اس کے ساتھ تھیں۔ امینہ اس کے بیٹوں کو اپنے گھر لے گئی تھی جبکہ حلیمہ کے دن رات اسپتال کے چکر لگ رہے تھے۔ نہ جانے نصیب کی کجی تھی یا کوئی سخت آزمائش کہ وارڈ میں موجود کوئی بھی بیڈ خالی نہیں تھا سو دو دن سے اسے کوریڈور کے ٹھنڈے فرش پہ ہی لٹا دیا گیا تھا۔

اور عالی کو تو جیسے فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔ وہ بے تاثر نظروں سے پاس سے گزرتے لوگوں کو دیکھتی رہتی۔ جن میں سے اکثر اس نامور اداکارہ کو پہچان بھی نہ پاتے۔ جو پہچان لیتے وہ سر جھٹک کے یہ سوچ کے آگے بڑھ جاتے کہ سرکاری اسپتال میں ایک اداکارہ کا کیا کام۔ ابھی بھی وہ بے دھیانی میں دلیا کھلاتی حلیمہ کو دیکھے جا رہی تھی۔ جب حلیمہ کے شوہر خلیل نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دلیے کا پیالہ وہیں رکھے خلیل کے پیچھے چل دی۔ وہ لوگ کچھ ہی دیر میں اسپتال کی کینٹین میں موجود تھے۔

"حلیمہ! ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ عالی کی حالت کسی شدید ذہنی صدمے کی وجہ سے ایسی ہوئی ہے۔ اور اب نامعلوم مدت تک ایسی ہی رہنے والی ہے۔ کیونکہ وہ خود اس صدمے سے نکلنا ہی نہیں چاہتی۔" خلیل نے جوس کے دو ڈبے خرید کر ایک بصد اصرار اس کی طرف بڑھایا اور جھجکتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

"ہاں مجھے پتا ہے۔ نہ جانے کون سا روگ ہے جو نمانی کو اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ میں تو ہر نماز میں یہ ہی دعا مانگتی ہوں کہ میرا مہربان رب اس کی آزمائش ختم کر دے۔" صدق دل سے کہتی حلیمہ نے بات کے اختتام پہ... جھولی پھیلائی اور گلوگیر لہجے میں زیر لب اپنی عزیز دوست اور ہمسائی کے لیے دعا گو ہوئی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"دیکھ بھلی! ساری محبت انسیت اپنی جگہ مگر زندگی جذبات کے سہارے نہیں گزرتی۔ ہم کب تک یوں اپنا گھر بار چھوڑ کے اسپتال میں پڑے رہیں گے۔ کل جب میں گھر گیا تو امینہ بہن بھی شکوہ کر رہی تھیں کہ کب تک وہ کسی کے بچوں کی چاکری کر سکتی ہے۔ اب تو اس کا شوہر بھی اسے ہزار صلواتیں سناتا ہے۔" گمبھیر لہجے میں مدعا بیان کرتا خلیل اس مفت کی ذمے داری پہ خوب اکتایا ہوا تھا۔

"تو تم کیا چاہتے ہو میں اسے اس حالت میں تنہا چھوڑ کے اپنے گھر اور اس کی ذمے داریوں میں مست ہو جاؤں اور یہ امینہ کتنے چھوٹے دل کی نکلی، یہ سب کہتے اس کی انسانیت کہاں مر گئی تھی۔ وہ دن بھول گئی جب ہمارے سگے رشتے دار بھی ہماری مالی مدد کرتے ہچکچاتے تھے مگر عالی ہنس کے ہمارے بڑے بڑے مسائل حل کر دیا کرتی تھی۔ آج اس کو مدد کی ضرورت ہے تو ہم منہ موڑ لیں۔" حلیمہ خلیل کی بات سن کے آگ بگولا ہو گئی اور تلخ لہجے میں بولتی چلی گئی۔ خلیل کے چہرے پہ ایک پل کو شرمندگی کے سائے لہرائے تھے دوسرے ہی پل اس پہ ازلی بے حسی قابض ہو گئی۔

"ہاں تو ایک ہفتے سے کون ہے جو اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ کون ہے جو اس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ اس کا شوہر تو نجانے کہاں منہ چھپا کے بیٹھا ہے اور اس کی ذمے داریاں ہم سنبھال رہے ہیں۔ دیکھ حلیمہ! تو اگر ٹھنڈے دل سے سوچے تو مان جائے گی کہ کوئی کسی غیر کی ذمے داری تمام عمر نہیں اٹھا سکتا۔ ہم تو چلو ہیں ہی کلم کلے (اکیلے) مگر الطاف کیسے اپنے بچوں کے حصے کی توجہ کسی غیر کے بچوں کی طرف ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ پھر معذور بچوں کی ذمے داری بھی عام بچوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ویسے بھی عالی کے احسان کا یہ بدلہ تو نہیں کہ امینہ بہن اپنے گھر کا سکون داؤ پہ لگا دے۔" اب کے خلیل نے تحمل سے پوری تفصیل حلیمہ کے گوش گزار کی۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر اس سارے مسئلے کا کوئی حل بھی تو ہو۔ ہم کیسے اپنی لاچار محسنہ کو اس حال میں تنہا چھوڑ سکتے ہیں۔" بہت دیر خاموش رہنے کے بعد وہ خلیل کی ہر بات پہ ایمان لے آئی تھی۔

"عالی کا کوئی تو آگے پیچھے ہوگا۔ مطلب کوئی رشتے دار کوئی عزیز وغیرہ۔ جس کو ہم اس کی حالت کی اطلاع دے کے خود کو اس ذمے داری سے آزاد کر سکیں۔" کچھ پل پُرسوچ انداز میں حلیمہ کی طرف دیکھتے خلیل نے گویا اس مسئلے کا حتمی حل اس کے سامنے پیش کیا تھا۔

"ہاں اس کی ایک بہن ہے جس سے وہ اکثر باتیں کیا کرتی تھی مگر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ دونوں میں کوئی بڑا جھگڑا تھا کیونکہ یہ تو معافیاں مانگتی رہتی تھی اور دوسری جانب سے شاید لعن طعن سننے کو ملتا کیونکہ فون بند ہونے کے بعد وہ دیر تک روتی رہتی تھی۔" وہ پُرسوچ انداز میں تفصیل سے بتاتی گویا ان لمحات کو یاد کر رہی تھی جب عالی کی سے معافیاں مانگتی تھی اور اس کے پوچھنے پہ وہ ٹال جاتی تھی۔

"بس تو تم مجھے اس کی بہن کا نمبر لا دو۔ میں جلد از جلد اس صورتِ حال کا قابل قبول حل نکالنا چاہتا ہوں۔"

UUNOVELS.COM

خلیل نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"اس کا موبائل تو اس دن سے میرے ہی پاس ہے مگر ان میں تو کوئی گہری ناراضگی ہے۔ پتا نہیں وہ آئے گی بھی کہ نہیں۔" پُرتشویش لہجے میں بات کرتی وہ ہاتھ میں پکڑے پرس میں سے عابی کا موبائل نکالنے لگی۔

"اللہ سے اچھی اُمید رکھو۔ سگے سگے ہی ہوتے ہیں چاہے بیچ میں جتنے مرضی اختلاف ہوں۔ کہتے ہیں نا کہ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔ ویسے بھی بات کرنے میں کیا حرج ہے۔" رسان سے سمجھاتے خلیل نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر کال لاگ چیک کیا۔

"ارے یہ کیا جس دن عابی کو فالج کا اٹیک ہوا تھا اسی دن اس نمبر سے اسے کال آئی تھی۔ کہیں یہ کال ہی اس کی اس حالت کی ذمہ دار تو نہیں، میرا خیال ہے مجھے اس نمبر پہ کال کرنی چاہیے۔" خلیل نے یکلخت چونک کر بتایا تو حلیمہ گنگ رہ گئی۔ شفاعت نے وہ نمبر اپنے موبائل سے ڈائل کیا۔

"جی اسلام علیکم آپ کے نمبر سے ایک ہفتہ پہلے ہمارے اس نمبر پہ کال آئی ہے۔ میں جان سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں۔" خلیل نے فوراً ہی مدعے کی بات کی...اور عابی کا نمبر دہرانے لگا۔ گو اسے ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا کہ سامنے والا ایک ہفتے پرانی بات یاد رکھے ہوئے ہوگا۔

"جی جی مجھے یاد آ گیا۔ میں نے انہیں یہ اطلاع دی تھی کہ ان کے شوہر کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے اور وہ فوراً آ کے لاش وصول کر لیں مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔" سامنے والا جو بھی تھا کمال کے حافظے کا مالک تھا۔ نمبر سنتے ہی طوطے کی طرح شروع ہو گیا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون کیا ہم اب ان کی لاش وصول کر سکتے ہیں۔ اصل میں یہ خبر سنتے ہی ان کی بیگم پہ فالج کا اٹیک ہو گیا تھا۔ وہ اب پیرالائزڈ ہیں اسی وجہ سے وہ بابر کی موت کی خبر کسی کو نہ دے سکیں۔" خلیل کے منہ سے تفصیل سن کے حلیمہ پہ گویا سکتہ طاری ہوا۔

"میں معذرت خواہ ہوں جناب اب یہ ممکن نہیں۔ لاش کی حالت چونکہ خراب تھی سو کسی کے رابطہ نہ کرنے پہ ہم نے انہیں لاوارث سمجھ کے دفنا دیا۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو ان کی قبر کا پتا بتا سکتے ہیں۔" سامنے والا اب معروف سے انداز میں بات کرتا اس کے جواب کا منتظر تھا۔ خلیل نے بوجھل دل سے کال ڈراپ کر دی۔ وہ اب قبر کے بارے میں جان کے کرتا بھی تو کیا۔ اس نے ایک اور نمبر نکالا جو باجی شمیم کے نام سے سیو تھا۔ خلیل نے نسوانی آواز میں ہیلو سنتے ہی ساری کہانی من وعن سنا کے شمیم سے اسپتال آنے کی درخواست کی تھی۔ جس کے بعد اس کی سماعتوں کو لمبی کرب آگیں خاموشی برداشت کرنا پڑی۔

"میں کسی آبگینے کو نہیں جانتی آئندہ یہاں فون کر کے تنگ کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔" کچھ ہی دیر میں شمیم کی تیز لہجے میں سرسراتی آواز گویا خلیل کی زبان گنگ کر گئی۔

"دیکھیں بہن! میں نہیں جانتا کہ آپ لوگوں کے درمیان کیا ناراضگی ہے۔ مگر اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ رنجشیں رشتوں سے اہم نہیں ہونی چاہیے۔ پھر یہ تو آپ کی سگی بہن ہے جو نہایت تکلیف میں ہے۔ آپ ایک بار آ کے اس سے مل لیں گی تو اس کا اثر اس کے ذہن پر اچھا پڑے گا۔" خلیل نے لہجے میں تیزی سے کہا۔ مبادہ وہ غصے میں بھری ہوئی خاتون کال ہی نہ ڈراپ کر دے۔

"کیوں اب کیسے تنہا ہو گئی وہ۔ اس کا وہ شوہر کہاں دفعان ہو گیا جو اسے بھی ہم سے بھی زیادہ اہم لگتا تھا۔ میرے ماں باپ کو منوں مٹی تلے پہنچا کے اب اگر وہ اپنی عبرت کو پہنچی بھی ہے تو اس میں کیا غلط ہے۔" تمسخرانہ انداز میں کہتی شمیم کا لہجہ اتنا تلخ تھا کہ خلیل متعجب رہ گیا۔

"ابھی خبر ملی ہے وہ بیچارا تو ایک ہفتے پہلے ہی یہ جہان فانی چھوڑ چکا۔ مرنے والوں سے کیسا گلہ۔ آپ کے ماں باپ کی روحیں بھی بے چین ہوں گی کہ بہرحال آبگینے ان کی اولاد تھی۔ آپ بھی دنیاوی جھگڑوں کو بنیاد بنا کے اپنی بہن کو مت چھوڑیں۔ ایسا نہ ہو کل آپ کو اپنی اس حرکت پہ پچھتانا ہو۔" خلیل کے منہ سے نکلنے والے فقرے یقیناً مقابل کو گہری سوچ میں ڈال گئے تھے۔ خلیل نے الجھ کے فون کان سے ہٹا کے دیکھا تھا جس پہ کال جاری تھی۔

"ٹھیک ہے آپ نام بتا دیں اسپتال کا میں کچھ دیر میں پہنچتی ہوں۔" مختصر مگر مثبت جواب پہ خلیل کی خوشی کی انتہا نہ رہی اشاروں کنایوں میں حلیمہ کو بتاتے خلیل نے شمیم کو اسپتال کا نام بتایا اور فون بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

☆......☆

شفاعت چچا کے جانے کے بعد ان کا دیا ہوا خاکی لفافہ کھولا گیا تو سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں تھیں۔ چونکہ ان کے گھر میں آج سے پہلے اتنی بڑی رقم کبھی نہیں آئی تھی سو

UUNOVELS.COM

سب باری باری دس لاکھ کے اس خزانے کو بصد احترام اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی زندگی کے چند لمحات لازوال بنانے میں مگن تھے۔ صرف مختار اور ہاجرہ تھے جن کے لب آج کئی دن بعد آسودہ مسکراہٹ میں رنگے تھے۔ سب کے ہاتھوں گردش کرتی وہ دو گڈیاں اب اندر آتی عالی کو تبرک کے طور پہ تھما دی گئی تھیں کہ لو تم بھی دیدار کر کے واپس کر دو۔ وہ تحیر سے ہاتھ میں پکڑے نوٹ دیکھ رہی تھی۔ اس نے زندگی میں گنتی کے چند بار ہی پانچ ہزار کا نوٹ دیکھا تھا جو جلد ہی اس سے یہ کہہ کے لے لیا جاتا تھا کہ اتنی بڑی رقم وہ کہیں کھو نہ دے۔ نوٹوں پہ جمی اس کی آنکھوں میں خیرہ کن چمک تھی۔ چھمی خوشی خوشی گڈی میں سے ایک نوٹ کھسکا کے حلیمہ سے مخاطب ہوئی۔

"اماں! میں اس سے گھر کا سودہ سلف منگوا رہی ہوں۔ ابا آپ یہ کھچڑی مت کھائیں، میں ابھی آپ کے لیے یخنی بنا کے لاتی ہوں۔" پہلے اماں اور پھر ابا سے پُرجوش انداز میں کہتی کمرے سے نکل گئی کہ گلی سے گزرتے کسی بچے کو روک کے سامان منگوا سکے۔ عفی اس سے پیسے لے کر حلیمہ کی گود میں رکھتی اس کا ہاتھ پکڑے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"میں نے کہا تھا نا شفاعت میرا سچا اور بے غرض دوست ہے وہ کبھی بھی کسی کے احسان کا بوجھ نہیں رکھتا۔ بھر یہ تو میں تھا اس کے بچپن کا وہ دوست جس کے ساتھ تعلق نبھاتے ہوئے وہ نہ طبقاتی فرق کو کبھی خاطر میں لاتا تھا نہ ہی دنیا کی باتوں کو۔" شفاعت کا ذکر کرتے ویسے بھی مختار کے لبوں سے شہد پھوٹتا تھا اب تو وہ اس کا محسن بھی تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم میں یونہی اس سے بدگمان ہو گئی تھی۔ اب پیسے آ گئے ہیں نا اب ہم بہت اچھے ڈاکٹر سے تمہارا علاج کروائیں گے۔ دیکھنا تم دنوں میں بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔" فرطِ مسرت سے کہتی حلیمہ بہت سرشار تھی۔

"کیا بات کرتی ہو نیک بخت! بیٹیوں کی شادی نہیں کرنی کیا۔ یہ پیسے ان کے جہیز کے لیے سنبھال کے رکھو کام آئیں گے۔ میں تو ٹھیک ہو ہی جاؤں گا کچھ دن میں۔" خوشی سے کھنکتے لہجے میں کہتے مختار کی زرد آنکھوں میں گویا زندگی نئے قرینے سے چمکی تھی۔

"ارے تم فکر کیوں کرتے ہو میں نے سب سوچ لیا ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ ہم خرچ کریں گے۔ باقی نو لاکھ ان تینوں کے لیے رکھیں گے تین تین لاکھ بیٹی کی شادی کے لیے کافی ہیں۔" غیر مرئی نقطے پہ نظر جمائے سوچ کے دھاگوں سے خواب بنتی ہاجرہ مدھم لہجے میں بولی تو مختار بھی مسکرا دیا۔

عفی اسے وہ پرانا میگزین دکھانے لائی تھی جو پرسوں اس نے ردی کے عوض ریڑھی والے سے پانچ روپے میں خریدا تھا۔ اب وہ اس پہ چھپی ماڈل کے میک اپ اور کپڑوں پہ سیر حاصل تبصرہ کر رہی تھی۔ اسے بھی زبردستی ساتھ گھسیٹ رہی تھی جو سرسری سی نگاہ سامنے ڈال کے ہوں ہاں میں جواب دے دیتی۔

"واہ جی واہ یہ مہارانیاں یہاں میگزین دیکھ رہی ہیں۔ اتنا احساس نہیں کہ بڑی بہن کچن میں اکیلی کھپ رہی ہے آ کے مدد ہی کروا دیں۔" لڑاکا عورتوں کی طرح دونوں ہاتھ کمر پہ جمائے دروازے پہ ایستادہ چھمی تنک کے بولی تھی۔

"ہاں تو، ہم کوئی مہارانیوں سے کم تھوڑا ہی ہیں۔ مہارانیوں کے سر پہ کون سا سینگ ہوتے ہیں جو ہمارے نہیں۔ لیکن اپنی زندگی میں تبدیلی لانے اور کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے جتن کرنے پڑتے ہیں جو میں کروں گی اور تم لوگوں کو ایک دن حقیقی مہارانی بن کے دکھاؤں گی۔" مستحکم لہجے میں کہتی حنابی کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا تفاخر تھا۔

"اچھا مہارانی جی! خیالی پلاؤ بعد میں پکانا پہلے کچن میں آ کے میری کچھ مدد کر دو۔ آج پہلی بار ایک کلو گوشت منگوایا ہے۔ پاؤ کی تو میں نے یخنی چڑھا دی ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ پاؤ کی شامی ٹکیاں بنا لوں آدھا کلو بریانی میں ڈال لوں۔" اپنا اگلا لائحہ عمل ترتیب دیتی وہ انہیں مطلع کر رہی تھی۔

UUNOVELS.COM

"واہ آپا! یعنی آج تم ہماری عیاشی کروانے والی ہو۔ کباب بریانی سلاد یہ سب امیروں والے کھانے آج ہم کتنی مدت کے بعد کھائیں گے۔" پُرجوش انداز میں کہتی عفی میگزین تکیے کے نیچے رکھتی چھمی سے مخاطب ہوئی جبکہ پاس ہی بیٹھی حنابی ہنس ہنس کے دُہری ہوئی جا رہی تھی۔

"چھمی آپا! ایک کلو میں اگر کچھ اور ڈشز بھی بنتی ہیں تو وہ بھی بنا لو نا اتنی کسر نفسی بھلا کس کام کی۔ پانچ ہزار کا نوٹ نکالا تھا کوئی دس کلو گوشت تو منگواتی مگر رہنا وہی کی وہی غریب، کبھی کبھی ملی چھوٹی سی خوشی میں خوش ہونے والی۔ چھوٹے لوگ چھوٹی سوچ چھوٹی مراد۔" نخوت سے کہتی

UUNOVELS.COM

عابی کے لبوں سے گویا الفاظ نہیں انگارے نکلے تھے جو لمحوں میں چھمی کا دل جلا کر خاکستر کر چکے تھے۔

''عفی! اس خود غرض لڑکی کو بتاؤ کہ گھر کا راشن بالکل ختم تھا وہ بھی منگوایا ہے میں نے۔ دس کلو گوشت منگوا کے کہاں رکھتی اس مہارانی کے اس محل میں فریج نام کی کوئی چیز نہیں۔ ویسے بھی وہ پانچ ہزار ہمارے باپ کی صحت کے عوض ملے ان کی قدر کرنا اور انہیں بے جا ضائع نہ کرنا ہمارا فرض ہے۔'' غصے سے سرخ پڑتے چہرے سمیت وہ پھٹ پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے عابی کے چہرے پہ ندامت کے رنگ چمکے تھے۔ دوسرے ہی پل وہ سر جھٹک کے خود پہ ازلی بے حسی طاری کرتی منہ پہ دوپٹا ڈال کے لیٹ گئی تھی۔

''چھوڑیں اسے آپا! چلیں میں آپ کی مدد کرواتی ہوں۔'' عفی پاؤں میں چپل اڑستی اٹھ کے اسے لیے کچن میں چلی گئی۔

''اونہوں جب میں ایک بڑی اداکارہ بن جاؤں گی تب انہیں بتاؤں گی کہ بہترین کھانا کوئی عیاشی نہیں بلکہ انسان کا بنیادی حق ہے جو ذرا سی محنت اور کوشش کے بعد انسان حاصل کر سکتا ہے۔'' وہ طمانیت کے گہرے احساس میں ڈوبی پھر سے دوپٹا منہ پہ رکھے خوابوں کی دنیا میں کھو گئی۔

☆......☆

انہیں اسپتال میں پندرہ دن ہو گئے تھے مگر کہیں سے بھی کوئی مدد نہیں آئی تھی مگر ایک بات اچھی ہوئی تھی کہ جنرل وارڈ میں ایک بیڈ خالی ہو گیا تھا جس پہ عابی کو منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کی حالت ویسی ہی تھی۔ خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہتی، حلیمہ کچھ کھلا دیتی تو کھا لیتی ورنہ ویسے ہی بے حس و حرکت پڑی رہتی۔ بس اس کی بے رنگ آنکھوں میں خوشی کے رنگ تب جھلکتے جب حلیمہ اسے اس کے بچوں کی خیریت کی اطلاع دیتی۔ ان ہی بے کیف دنوں میں چھمی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ اسپتال چلی آئی۔ اس کے بیڈ کے پاس رکھے چھوٹے سے بینچ پہ بیٹھ کے وہ دیر تک بے تاثر چہرے سے عابی کے مفلوج وجود کو دیکھتی رہی۔ ایسی نظریں جن میں ترس ہمدردی اور محبت جیسے لازوال جذبات مفقود تھے۔ تھی تو بے نیازی۔ اور عابی کا یہ حال تھا کہ بس محبت پاش نظروں سے اپنی ماں جائی کو دیکھے جاتی تھی احساس تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں کہ ہزار دھتکار کے باوجود وہ اپنی ماں جائی کو منا لی جبکہ درحقیقت چھمی کا دل پسیجا نہیں تھا بلکہ وہ حالات کا جائزہ لینے آئی تھی۔

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اس کے بارے میں۔'' انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتی وہ اب حلیمہ سے مخاطب تھی۔ حلیمہ نے اچنبھے سے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا جس کا ہر انداز اسے ورطہ حیرت میں ڈال رہا تھا۔

''ڈاکٹر اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہ ذرا سا حوصلہ کرے تو بہتر ہو سکتی ہے... مگر علاج بہت طویل اور حوصلہ طلب ہے۔'' مختصر مگر جامع جواب دے کے وہ سامنے بیٹھی عجیب سے رویے کی مالک عورت کے اگلے جملے کی منتظر تھی۔

''بچے کہاں ہیں اس کے۔'' اب کے پھر بہت ہی مختصر سوال آیا تھا۔ لہجے اور انداز میں ابھی بھی محسوس کی جانے والی اجنبیت تھی۔

''وہ اس کے گھر میں ہیں۔ ہماری ایک پڑوسن امینہ پہلے انہیں اپنے گھر لے گئی تھی، مگر کچھ گھریلو مسائل کی وجہ سے وہ اب اس کے گھر ہی ان کی خبر گیری کرتی رہتی ہے۔ اب آپ آ گئی ہیں نا تو سب کچھ خود سنبھال لیجئے گا آخر آپ سگی بہن ہیں عابی کی۔'' مختصر سوال کا تفصیلی جواب دیتی حلیمہ مجبوری کا نام شکریہ کی عملی تفسیر بنی ہوئی تھی مگر دوسری جانب دبیز خاموشی تھی۔

''کس گھر کی بات کر رہی ہیں۔'' طویل خاموشی کے بعد اپنی نوعیت کا بالکل عجیب سوال کرتی چھمی کا لہجہ اب کے پُراسرار تھا۔

''وہی گھر جو اس نے اور بابر بھائی نے اتنے سالوں کی محنت سے خریدا مگر شومئی قسمت انہیں رہنا نصیب نہیں ہوا۔'' ہمدردی سے بھرپور لہجے میں کہتی حلیمہ اب جوابی حوصلہ افزا جملے کی منتظر تھی۔

''میں اس کے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم بالکل فکر مت کرو اب میں آ گئی ہوں میں انہیں سنبھال لوں گی۔ بس تم ہمت کرو اور ٹھیک ہونے کی کوشش کرو۔'' پہلا جملہ حلیمہ سے کہتی اب وہ عابی سے مخاطب تھی۔ اس کے تسلی آمیز لہجے میں اپنائیت کی رمق تک نہ تھی۔ حلیمہ پھر بھی مطمئن تھی کہ اس پہ سے ذمّے داری کا بوجھ ہٹا جبکہ حنابی تو اتنے عرصے بعد اپنی بہن کو دیکھ کے ہی سرشار تھی۔

پھر دن جیسے پر لگا کے اڑے۔ شمیم بچوں کو دیکھنے گئی تھی۔ دوسرے ہی دن وہ اپنی فیملی کے ساتھ اسی گھر میں شفٹ ہو گئی۔ امینہ بھی ذمّے داری سے سبکدوش ہو کے بہت خوش تھی۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

شمیم نے ہی اپنے پندرہ سالہ بیٹے کی ڈیوٹی اسپتال میں لگادی تھی۔ دن میں وہ خود اسپتال چلی جاتی بچوں کو پیچھے اس کی تیرہ سالہ بیٹی سنبھالتی۔ راوی گویا چین ہی چین لکھ رہا تھا مگر یہ کون جانتا تھا کہ اس چین کے پیچھے کتنے طوفان چھپے تھے۔

اس دن بھی رات کا کھانا دینے کے بعد بیٹے کو اسپتال روانہ کر کے شمیم پھر سے کچن میں گھس گئی۔ کمال اس کا شوہر ڈیوٹی سے آنے ہی والا تھا۔ وہ ایک آفس میں چوکیدار تھا۔ آمدنی گو کم تھی مگر پھر بھی برکت تھی کہ خواہشات کو پر نہیں لگے تھے لیکن ان ہی دنوں موصول ہوئے چلہ کے فون نے اور پھر اس چھوٹے سے مگر شاندار گھر نے اس کے منصوبہ ساز دماغ کو ایک نئے پلان کی ترغیب دی۔ اب ہی تو وہ سنہری موقع آیا تھا جس کے ذریعے وہ ایک تیر سے دو شکار کر سکتی تھی۔ پھر اس نے قسمت سے ملے موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جھٹ اس گھر میں شفٹ ہو کے اپنا گھر کرائے پہ اٹھا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے گھر سے ملنے والے ایڈوانس کو بروئے کار لا کے اس گھر کا بھی اوپر والا پورشن معمولی تبدیلی کروا کے سپرٹ کر دیا...اور اس گھر کا اوپر والا پورشن بھی کرائے پہ اٹھا دیا۔ اب ان کے پاس معقول آمدنی کا سلسلہ بھی تھا اور اس گھر کے ایڈوانس کی مد میں ملنے والی تیس ہزار جیسی ان کے تئیں خطیر رقم بھی تھی۔ محلے والوں کو اس نے یہ کہہ مطمئن کر دیا کہ عابی کا بہتر علاج کروانے کے لیے...یہ سب کچھ کرنا پڑا۔

"شمیم او شمیم بھئی جلدی سے کھانا لا دو۔ قسم سے بھوک سے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ آج ٹریفک نے بہت کھپایا اوپر سے یہ گھر کام کی جگہ سے بہت دور ہے۔" منہ ہاتھ دھو کے تولیے سے پونچھتے کمال نے اپنی پاٹ دار آواز میں اسے پکارا تو اس نے چونک کے چولہا بند کیا اور کھانے کی ٹرے لیے کمرے میں آ گئی۔

"تم نا بہت ناشکرے ہو کمال! ایک تو میں تمہیں اس کچرے کے ڈھیر والے محلے سے اٹھا کے یہاں لے آئی ہوں تم ہو کہ ابھی بھی اسی پھٹیچر گھر کو یاد کر رہے ہو۔" ٹرے شیشے کی ٹیبل پہ رکھتے ہوئے خود صوفے پہ بیٹھتی شمیم نے یوں شکوہ کیا جیسے یہ اس کے جہیز کا گھر ہو۔

"اس میں تو واقعی کوئی شک نہیں یہ تمہاری زرخیز دماغ کی ہی کارستانی ہے جو آج ہم اس شاندار گھر میں مالکانہ حقوق کے ساتھ رہ رہے ہیں... ورنہ اگر تم پچھلی باتوں کو لے کر بیٹھی رہتی تب تو ہم وہیں سڑ رہے ہوتے مگر یہ سب عارضی ہے جانا تو پھر اسی کوڑے دان میں ہے۔" گو کمال ایک سادہ دل محنت کو رگ جاں ماننے والا شریف النفس انسان تھا مگر زندگی میں آئی مثبت تبدیلی کس کو بری لگتی ہے۔ وہ بھی اس صورتِ حال سے خوش تھا مگر یہ سب چھن جانے کے خیال سے ملول بھی تھا۔ مٹر گوشت کے سالن کے ساتھ روٹی کے بڑے بڑے نوالے لیتے کمال نے اپنے خدشات بیان کیے۔

"اب تک میں نے ہی سب کچھ سنبھالا ہے نا۔ آگے بھی میں ہی دیکھ لوں گی۔ یہ گھر تو اب تم بس اپنا ہی سمجھو۔ سمجھو ختم ہوئے ہمارے وہ غربت کے دن۔" آنکھوں میں شاطرانہ چمک لیے وہ اب اپنا اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں مگر مجھے لگ رہا ہے کہ اب تم کچھ بہت بڑا کرنے والی ہو۔ بس میری دعا ہے کہ تم کچھ برا نہ کرو۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے کمال کا دل عجیب وحشت زدہ ہوا تھا۔ جیسے کسی انہونی کے احساس سے کانپ گیا ہو۔

"میں جو بھی کروں گی وہ اتنا برا نہیں ہوگا جتنا جابی نے میرے اور میرے ماں باپ کے ساتھ کیا۔ اب تو کاٹنے کا وقت ہے اور اسے سود سمیت نہ کاٹنا پڑا تو مجھے شمیم مت کہنا۔" بات مکمل کرتے ہی وہ کھانے کے خالی برتن اٹھاتی کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆......☆

اس رات وہ گنتی کے چند جوڑے گٹھری میں رکھتے ہوئے ٹرنک میں موجود دس لاکھ کی رقم ساتھ رکھنا نہیں بھولی تھی۔ ٹرنک کی چابی اس نے کیسے حاصل کی یہ ایک الگ کہانی تھی۔ وہ صرف دس لاکھ ہی نہیں وہ خواب تھے اس کے ماں باپ اور بہنوں کی آنکھوں میں سجے تھے۔ آسودگی کی وہ آس تھے جو اس کے باپ کو اپنی صحت کی قیمت میں ملی تھی۔ یہ امید کے وہ جگنو تھے جس کے ہونے سے اس کے اپنوں کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے ہاتھ ایک پل کو کانپے تھے دوسرے ہی پل ازلی بے حسی اس پہ حاوی ہو چکی تھی۔

وہ دبے پاؤں گھر سے نکلتی سیدھی بابر کے فلیٹ پہ پہنچی تھی۔ جہاں گواہ اور قاضی پہلے ہی موجود تھے۔ آدھے گھنٹے کے اندر ان کا نکاح ہو گیا تھا۔ وہ خوش بھی تھی اور سرخرو بھی کہ بہر حال وہ بابر کو لے کے ان گنت خدشات کا شکار تھی۔ شادی کے دوسرے دن ہی اس نے وہ خاکی لفافہ بابر کے سامنے رکھ کے ہیروئن بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے میں تمہیں چانس دلوا دوں گا مجھے اپنا

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

وعدہ یاد ہے۔ ویسے بھی میں عورت کے کام کرنے کو برا نہیں سمجھتا پر یہ کیا ہے۔" ملتفت لہجے میں کہتا وہ سامنے رکھے خاکی لفافے کو اچنبھے سے دیکھ کے استفسار کر گیا۔

"یہ دس لاکھ ہیں جو میں بابا کے گھر سے لائی تھی۔ ہیروئن بننا میرا خواب ہے یہ پیسے میں اس لیے ساتھ لے آئی کہ یہ میرے شوبز کے سفر میں زادِ راہ ثابت ہوں گے۔" ساری تفصیل بابر کے گوش گزار کرتی عابی نے آخر میں کہا تو بابر تحیر سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ تم نے بہت غلط کیا۔ جب میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ تمہارے خوابوں کی تعبیر کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا تو تمہیں چوری کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ شادی تو اس طرح کرنا ہماری مجبوری تھی کہ تمہارے والدین راضی نہیں تھے مگر تم نے اپنی بہنوں کا حق مار کے اچھا نہیں کیا۔" بابر نے واضح انداز میں اس کے اس عمل کی پُرزور مزمت کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے عابی شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔

"سوری مجھے لگا تم رشوت کے بنا انڈسٹری میں میری جگہ نہیں بنا پاؤ گے اس لیے یہ ساتھ لے آئی۔ اچھا اب ختم کرو نا یہ ناراضگی ہو گئی غلطی اب وقت پلٹ کے تو نہیں آ سکتا نا۔" روٹھے انداز میں کہتی اب وہ اسے منانے میں مگن تھی۔

"معافی اللہ سے مانگو یقیناً اسے تمہارا یہ عمل ناگوار گزرا ہوگا۔" بابر کے لہجے میں تحکم تھا جسے محسوس کر کے وہ کچھ پل خاموش ہو گئی۔

"اللہ تو معاف کر دیتا ہے انسان معاف نہیں کرتے بس۔" بظاہر وہ اس سے ناراض ہو کے منظر سے ہٹ گئی تھی۔ مگر درحقیقت وہ اب اپنے عمل پہ پشیمان تھی اور اپنے رب سے سچے دل سے معافی کی خواستگار تھی۔

وہ پیسا بابر اگلے ہی دن بینک میں جمع کروا آیا تھا کہ مناسب موقع ملتے ہی وہ... حقداروں تک پہنچا دیں گے۔ عابی کو پیسے لانے پہ بابر کی کی گئی لعن طعن اچھی لگی تھی سو وہ مطمئن ہو گئی۔ اکثر وہ معافی مانگنے کے لیے گھر بھی فون کرتی مگر لعنت ملامت سن کے بند کر دیتی۔ وہ لوگ اسے بولنے کا موقع بھی نہیں دیتے تھے۔

اس کا یہ فیصلہ گو اس کے لیے بہت اچھا ثابت نہیں ہوا تھا کہ جسے وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر سمجھی تھی وہ اصل میں کوآرڈینیٹر تھا۔ جس کا کام اسکرپٹ کے مطابق لوکیشن ڈھونڈنا تھا پھر اس لوکیشن کے مالکان سے روپے پیسے کی ڈیلنگ کرنا بھی اس کی ذمے داری تھا۔ بابر کی ہوائی روزی تھی۔ کبھی کبھی ایک کے بعد ایک پروجیکٹ ملتا اور کبھی کبھی ہفتوں وہ گھر پڑا رہتا پھر جیسے ہی کسی نئے پروجیکٹ کی کال آتی وہ شدومد سے اس میں جت جاتا۔ بابر جیسے محنتی بندے پہ رزق کبھی تنگ نہیں پڑا تھا۔ مگر پیسے کی وہ ریل پیل نہیں تھی جو انڈسٹری کے لوگوں کے پاس بھی جاتی ہے مگر یہ بات بھی سچ تھی کہ بابر کے کانٹیکٹس بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ یہ ان کانٹیکٹس کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا کہ عابی کو بھی کام ملنے لگا تھا۔ شوبز کی دنیا میں متعارف کروانے کے لیے بابر نے عابدہ عرف عابی کو نیا نام آبگینے دیا۔ گو ٹیلنٹ عابی میں پہلے بھی تھا مگر انڈسٹری میں رشوت اور سفارش کی سنوائی ٹیلنٹ سے زیادہ ہوتی تھی۔

پھر سات سال ان دونوں نے مل کے محنت کی۔ اتنی محنت کہ آج وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنا گھر بنا سکیں۔ سو انہوں نے حال ہی میں ایک درمیانے درجے کی کالونی میں چھوٹا سا مگر شاندار گھر خریدا تھا ان ہی دنوں اللہ نے انہیں دو جڑواں بیٹوں سے نوازا مگر یہ خوشی شاید ان کو راس نہیں آئی تھی کہ ان کے دونوں بیٹے معذور تھے جو نہ بول سکتے تھے نہ سن سکتے تھے نہ ہی بیٹھ سکتے تھے۔

ان ہی دنوں اسے پھر پچھتاوے نے گھیرا اس نے بینک میں پڑے پیسے واپس کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے ابا کے نمبر پہ فون کرنا چاہا فون نہ ملا۔ ہمت کر کے گھر گئی وہاں تالا پڑا تھا وہ اپنی غلطی کا مداوہ کرتی بھی تو کیسے سب راستے ہی تو مسدود ہو گئے تھے۔ دوسری طرف بابر تھا کہ ٹھانے بیٹھا تھا کہ اس دس لاکھ میں سے ایک پائی خرچ کرنا بھی اس پہ حرام ہے۔

پھر بیتتے وقت نے اس کے زخموں پہ کھرنڈ جما دیے اب دھن تھی تو بس یہ کہ کسی طرح اپنے بیٹوں کا علاج کروا لے۔ یہ وہ خواہش تھی جس کی تکمیل کے لیے ان دنوں دونوں میاں بیوی محنت کر رہے تھے کہ ان ہی دنوں عابی کو فلم میں چھوٹا سا رول آفر ہوا۔ عابی تو بہت خوش تھی مگر بابر [illegible] وہ کسی صورت فلم کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ عابی اب شوبز چھوڑ دے۔ شوبز کی روٹین ایسی تھی کہ کبھی عابی کو صبح سویرے نکلنا پڑتا تو کبھی منہ اندھیرے واپسی ہوتی۔ بابر اس صورت حال سے اکتا گیا تھا۔ سو اب وہ یہ چاہتا تھا کہ عابی شوبز چھوڑ کے اب بچوں اور گھر پہ توجہ دے۔ اسی کشمکش میں گزرنے والے دن ان پہ بہت بھاری تھے کہ ایک دن عابی نے چیزوں کو ذہن میں

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ترتیب دینا شروع کیا اور دنگ رہ گئی۔ ہیروئن بننے کا وہ خواب جو لڑکپن سے اس کی آنکھوں میں سجا تھا وہ تو اس کی ترجیحات میں سب سے آخر میں پڑا اپنی ناقدری پہ ماتم کناں تھا۔ وہ تو بس افنان اور سفیان کی ماں تھی۔ وہ تو اس گھر کی مالکن تھی جس کی سب ذمّے داریاں آج تک وہ خود نبھاتی آئی تھی۔ وہ باہر چاہے شہزادی کا رول نبھا کے آتی اپنے گھر کے ٹائلوں جڑے واش روم صاف کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتی۔ یہ گھر، اس کی ذمّے داریاں اس کی تھیں اور اس کی ترجیحات میں سرفہرست تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شوبز چھوڑ دے گی مگر تب ہی اس کی قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ اس کی عقل تک دنگ رہ گئی۔ تھکے ماندے سکون کی خواہش میں بلبلاتے اعصاب گویا ڈھے گئے۔ اپنے خوابوں پہ اپنے گھر کو فوقیت بخشنے کے اظہار کو بے چین زبان جیسے گنگ ہو کے رہ گئی۔

☆......☆

جب سے عابدہ گھر سے دس لاکھ روپے لے کے بھاگی تھی تب سے ہی گھر میں صف ماتم بچھی تھی۔ ہاجرہ اٹھتے بیٹھتے اسے کوستی تھیں۔ انہیں راستے میں پڑے کسی پتھر سے بھی ٹھوکر لگتی تھی تب بھی منہ سے کوسنے عابی کے لیے ہی نکلتے تھے۔ پھر جو وہ شروع ہوتیں تو دن سے رات ہو جاتی مگر ان کے دل کی بھڑاس نہیں نکلتی تھی۔ مختار کی زبان جیسے گنگ ہو کے رہ گئی تھی۔ وہ بے تاثر آنکھوں سے بس ہاجرہ کو منہ بھر کے بددعائیں دیتے دیکھتا رہتا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی زندگی کی رمق سے خالی آنکھوں میں دم توڑتی امید گویا عفت کا دل چیر کے رکھ دیتی۔ کاش عابی ان کی بہن ہی نہ ہوتی۔ اس کے دل سے بے اختیار نکلتا تھا۔ شمیم کچن کے کام کے دوران برتن پٹختی جاتی اور بہ آواز بلند عابی کے غرق ہونے کی بددعائیں مانگتی جاتی۔ ان کے پاس وہ ہی تین ہزار تھے جو جھمی نے تب اس سودے کی رقم سے بچائے تھے۔ اسی طرح ایک ماہ گزر گیا۔ مختار پھر سے بھلا چنگا ہو کے کام پہ جانے لگا۔ وہ بھی ایک بہت ہی عام سا دن تھا مختار کام پہ گیا ہوا تھا۔ عفی کمرے میں فرش پہ ہی کپڑا بچھا کے اس پہ لحاف پھیلائے اماں کے ساتھ لحاف میں ڈورے ڈالنے میں مشغول تھی۔ جبکہ پاس ہی بیٹھی جھمی آٹا گوندھنے میں مگن تھی کہ یکلخت اس کے پرانے سے فون کی بیل کسی عفریت کی چنگھاڑ کی صورت گونجی۔

"اماں! ذرا فون اٹھانا میرے ہاتھ آٹے میں ہیں۔" اپنی سوچوں میں گم جھمی نے ہاجرہ سے فون ریسیو کرنے کا کہا جو چارپائی پہ رکھے فون کے قریب ترین تھیں۔

"ہیلو کون۔" ہاجرہ نے فون ریسیو کر کے کان سے لگایا اور اپنے مخصوص انداز میں استفسار کیا۔ مقابل جو بھی تھا لمحوں میں ان کی آواز پہچان گیا تھا۔ اسی وقت عفی نے بڑے سی سوئی میں اینگر کا دھاگا ڈال کے سوئی انہیں تھمائی۔ فون پہ لمبی تکلیف دہ خاموشی سنتی ہاجرہ کے ہاتھ میں سوئی تب کانپ کے رہ گئی جب فون سے ابھرتی شناسا سا آواز میں سسکی سن ان کا دل گویا انگاروں پہ لوٹ گیا۔

"اب کیوں فون کیا ہے بدبخت! تیرا دل نہیں کانپا بوڑھے ماں باپ کے سروں میں خاک ڈالتے۔ تجھ پہ خدا کا قہر نازل ہو عابی۔ تجھے ایک سانس سکون کا نصیب نہ ہو۔ گٹروں کا پانی پیے خدا کرے ذلیل و خوار ہو کے مرے گی تو دیکھنا۔" ہاجرہ جیسے مزید کوئی لفظ سنے بنا نان اسٹاپ بولی تھی اور عابی کے کچھ کہنے کے حوصلے گویا دل میں ہی دم توڑ گئے۔

"اماں! مجھے معاف کر دو۔ میری بات تو سنو۔" شرمندگی میں ڈوبے پست لہجے میں کچھ بولنے کی سعی کرتی عابی تب دنگ رہ گئی جب اس کی بات کاٹ کے ہاجرہ کے منہ سے مغلظات کا طوفان نکلا تھا۔

"مر گئی تیری اماں نانہجار! اور مر گئی تو ہمارے لیے۔ ماں باپ کا دل جلایا ہے نا تو دیکھ تیرے لیے دنیا جہنم کیسے بنتی ہے۔ نامراد ہی رہے گی تمام عمر تو۔ ہمیں زندہ لاشیں بنا کے اب فون کرتی ہے معافی مانگنے کے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہمیں تمہارے ان تماشوں میں۔ خبردار آئندہ یہاں فون کیا تو۔" بے تحاشہ چیختے ہوئے انہوں نے کال ڈراپ کر دی تھی۔ اتنا چیخنے پہ حلق میں پڑتی خراشوں کی وجہ سے انہیں کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔ عفی گھبرا کے اٹھی اور کچن سے پانی لے آئی جسے پی کے ہاجرہ پھر بددعا دینے میں مشغول ہو گئیں۔ جبکہ عفی خاموشی سے لحاف کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جبکہ ابھی گھر میں داخل ہوتا مختار بھی سن رہ گیا۔

"بس کر دے اماں! تیرے کوسنوں کا اب اس بے فیض پہ کوئی اثر نہیں ہونے والا الٹا تم اپنی طبیعت خراب کر لو گی۔" آٹا گوندھ چکا تھا جھمی آٹا اور پانی والا برتن اٹھائے اماں کو سمجھاتی کچن میں چل دی۔ عفی نے مختار کے استفسار پہ ساری بات اسے بتائی۔

"تم لوگوں نے اس کی کال اٹھائی ہی کیوں۔ اٹھائی بھی تو ہاجرہ کی بات کیوں کروائی۔ تمہیں نہیں پتا اس کی

UUNOVELS.COM

طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ جو وہ ہمارے ساتھ کر گئی وہ کافی نہیں اب کیا اپنی ماں کی جان لے کے ٹلے گی۔" ہاجرہ کے زرد پڑتے چہرے پہ نظر ڈال کر زہر خند لہجے میں دانت پیستے ہوئے مختار نے اب کے عفی کو ڈانٹا تھا۔

"ابا! اس نے پتا نہیں کس نمبر سے کال کی تھی ہمیں اندازہ ہوتا تو ہم کال ہی نہ اٹھاتے۔" قدرے خفیف سے انداز میں بتاتی عفی اپنے ناکردہ جرم پہ شرمندہ تھی۔

"اب تو پتا چل گیا نا نمبر کا اب اس کی کال کوئی نہیں اٹھائے گا۔ بلکہ کسی بھی نئے نمبر سے کال آئے تو اٹھانے کی ضرورت نہیں یہ میرا حکم ہے۔ سمجھو مرگئی وہ ہمارے لیے۔" ہنکارا بھرتے مختار نے غضب ناک لہجے میں کہتے ہوئے واش روم کا رخ کیا۔ تب ہی کال بیل بجی ان کے لرزتے دل کچھ اور سہم کے رہ گئے۔

"کل ہی ابا سے کہتی ہوں کہ اس بیل کو تو ہٹوا ہی دیں۔ کیسی مردوں کو بھی قبر میں اٹھا کے بٹھا دینے والی کرخت آواز ہے اس کی۔" کچن سے نکلتی چھمی تلملا کے بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھولنے چل دی۔ سامنے ہی شفاعت چچا اپنے ڈرائیور ریان علی کے ساتھ کھڑے تھے۔ انہیں اندر ابا کے کمرے میں بٹھاتی چھمی کچن میں آ کے چائے بنانے لگی۔ کچھ ہی دیر میں عفی بھی اس کے پیچھے آگئی۔

"دیکھا آ گئے کن سوئیاں لینے۔ کبھی سارا زمانہ آ کے ہم سے ہمدردی کے نام پہ ہم پہ تھوک گیا ہے۔ یہ کیوں پیچھے رہتے۔" کپوں میں چائے انڈیلتی چھمی نے ناگواری سے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

"آپا! تم ان کے دل کے راز بھی جانتی ہو مجھے نہیں پتا تھا۔ میں نے کتنی بار سمجھایا ہے کہ ہمیشہ مثبت سوچا کرو۔ پھر ایسا ضروری بھی تو نہیں کہ جیسا ہم سوچیں ویسا ہی ہو۔ پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" ناصحانہ انداز میں سمجھاتی عفی نے شاپر میں رکھی نمکو اور بسکٹس پلیٹوں میں ڈال کے چائے والی ٹرے میں رکھی جہاں پہلے ہی چھمی چائے کے کپ سیٹ کر چکی تھی اور ٹرے لیے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

"ہاں میں ہی مثبت سوچوں لوگ چاہے ہمارے بارے میں جو مرضی سوچیں۔" چھمی نے دائیاں ہاتھ نچاتے ہوئے تڑخ کر جواب دیا جس پہ تاسف سے سر ہلاتی عفی ٹرے لیے کمرے میں آ گئی۔ جہاں ابا روتے ہوئے تمام بات چچا شفاعت کے گوش گزار کر رہے تھے۔ وہ چائے کی ٹرے ٹیبل پہ رکھ کے پلٹی تو اس کے پیچھے ابھی اندر آئی چھمی نے یوں اشارہ کیا گویا کہہ رہی ہو۔ دیکھا میں نا کہتی تھی۔

"وہ بدبخت جاتے ہوئے وہ پیسے بھی لے گئی جو آپ نے دیئے تھے۔ میرے تو کسی جرم کی سزا ثابت ہوئی یہ لڑکی۔" مختار جھریوں زدہ چہرے میں مدغم ہوتے آنسوؤں کو دائیں آستین سے صاف کرتے گویا گڑگڑائے تھے۔

"بس صبر کر اللہ سب بہتر کر دے گا دیکھنا۔" مختار کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے شفاعت نے کہا۔

"کیسے صبر کروں بھائی شفاعت! عزت پہ صبر کروں یا اس پیسے پہ جسے میں نے اپنی بیٹیوں کا جہیز بنانے کا سوچا تھا۔ اب میں اپنی بیٹیوں کو کیسے رخصت کر پاؤں گا۔ کاش وہ ناہنجار میرے گھر پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی تو آج مجھے یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا۔" گلوگیر لہجے میں کف افسوس ملتے ہوئے مختار نے کہا۔

"مختار! تمہیں عفت کے مستقبل کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ آج سے میری امانت ہے۔ میں اپنے ریان کے لیے عفت کو مانگتا ہوں۔ تم تو جانتے ہو جب سے میرا اکلوتا بیٹا فیاض دبئی شفٹ ہوا ہے تب سے ریان کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا ہوں۔ میری بیٹیاں تو برملا اسے اپنا چھوٹا بھائی کہتی ہیں۔" شفاعت چچا نے تفصیل سے بتاتے ہوئے گویا ان کے دل کی بات کہہ دی۔ عفت کمرے سے نکل گئی تھی جبکہ باقی چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔

"بھائی شفاعت! میری بیٹی آپ کی بہو بنے اس سے بڑی تو کوئی خوشی نہیں ہو گی ہمارے لیے مگر چھمی بیٹی سے پہلے ہم عفت کو کیسے رخصت کر سکتے ہیں۔" کشمکش و پیچ میں مبتلا ہاجرہ اب کے خاموش نہیں رہ سکی تھیں۔ چھمی کو شدت سے اپنی بے وقعتی محسوس ہوئی اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کے کمرے سے نکل گئی۔

"بھائی جی! ریان بیٹے کے دبئی جانے کے چانسز بن رہے ہیں میں چاہتا ہوں نکاح اسی ماہ ہو جائے تاکہ جلد سے جلد عفت بیٹی کے بھی کاغذات بن جائیں اور وہ بھی اس کے ساتھ ہی جائے۔ باقی اللہ چھمی کے نصیب بھی کھولے گا آپ لوگ کوشش کرتے رہیں۔" شفاعت نے نہایت سبھاؤ سے ان کے خدشات دور کرتے ہوئے انہیں منا کے ہی دم لیا۔ پندرہ دن بعد عفی کے نکاح کی تاریخ ٹھہرا دی گئی تھی۔

جب سے عفی کے نکاح کی تاریخ ٹھہری تھی ہاجرہ کو بس ایک دھن لگ گئی تھی۔ چھمی کے رشتے کی دھن جانے اس کے دل میں کیا خوف بیٹھ گیا تھا کہ وہ عفی اور چھمی کی

UUNOVELS.COM

ایک ساتھ ہی رخصتی کرنا چاہتی تھی۔ پھر سر توڑ کوشش کے بعد بالآخر انہیں کمال پسند آ گیا تھا۔ چوکیدار کی معمولی نوکری کرنے والا معمولی شکل و صورت کا مالک شخص چھمی کے نصیب میں لکھا تھا اور چھمی نصیب کے اس تضاد پہ انگشت بدنداں رہ گئی۔ یعنی ایک دس لاکھ لے کے اپنی دنیا بسا بیٹھی اور ایک کے مقدر کا درخشاں ستارہ اسے دبئی کی شاہانہ طرز زندگی دے گیا۔ ایک گھاٹے میں رہی تو صرف وہ، یہ سوچ اسے انگاروں پہ گھسیٹتی تھی۔ اس دوران عابی کے فون آئے جو کبھی تو ریسیو ہی نہ کیے جاتے اور بھول کے کبھی جاتے تو مغلظات بک کے بند کر دیے جاتے۔

وقت پر لگا کے اڑا تھا۔ مختار اور ہاجرہ کو چھمی کے جلد بازی میں کی گئی زیادتی کا پورا احساس تھا سو تلافی کے لیے مرنے سے پہلے اپنا مکان چھمی کے حوالے کر گئے تھے۔ عفی نے اپنا حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا جس پہ شکر مناتی چھمی خوش تھی کہ اس کی کرائے کے مکان سے نجات ہوئی تھی۔ ورنہ کمال کی ناکافی آمدن آدھی کرائے اور بلوں کی مد میں کھپ جاتی تھی اور باقی چند روپوں کو وہ سینت سینت کے خرچ کرتی پھر بھی بس دال روٹی پوری ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اسے عابی کی پڑوسن کی کال آ گئی۔ گویا مردار پر شیرنی کو چیر پھاڑ کی دعوت دی گئی تھی۔

☆......☆

''کیا بتاؤں عابی! کیسی قیامت کی رات گزری ہے میری۔ میرے ان ہاتھوں میں میرے بھانجوں نے دم توڑا اور میں کچھ نہ کر سکی۔ خدا غارت کرے اس موذی بخار کو جس کی گرفت میں دونوں معصوم بچے آ گئے اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تبھی تو جڑواں ایک کو ناہنجار نے آلیا تو دوسرا بھلا کیسے بچ سکتا تھا۔ دونوں کو ہی لے گئی یہ موت کتنی سفاک نکلی۔'' زار و قطار روتے ہوئے چھمی اب اپنے ہاتھ ملتے ہوئے افسوس کر رہی تھی۔ کچھ دور کھڑی حلیمہ اس کی شعبدہ بازی پہ دنگ رہ گئی۔

''ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا عابی! اگر تم نے حوصلہ رکھنا ہے۔ کیا ہوا جو افنان اور سفیان نہیں رہے ان کی زندگی ہی یہاں تک تھی۔ بس تم ہمت رکھو میں بہت جلد تمہیں پرائیویٹ اسپتال میں لے جاؤں گی وہاں تمہارا بہترین علاج ہوگا اور تم دنوں میں بھلی چنگی ہو جاؤ گی پھر تم اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنا۔'' عابی کی زندگی کی رمق سے بے نیاز آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چھمی اسے وہ تسلی دے رہی تھی جو کسی سراب سے کم نہیں تھی۔ حلیمہ کا دل چاہا وہ اس مطلبی عورت کو کھری کھری سنا دے پھر خاموش رہ گئی کہ آخر کس رشتے سے بولتی وہ۔ مقابل بیٹھی عورت اسے ذلیل کر کے رکھ دیتی تو اس کی کیا عزت رہ جاتی۔ حلیمہ کے صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ شمیم کے جاتے ہی اس نے سب مصلحتیں ایک طرف رکھ کے عابی کو سب بتا دیا۔

''مجھے معاف کر دینا عابی! میں نے مدد کے لیے غلط انسان کو پکارا۔ مجھے افسوس ہے شمیم بہن تم سے مخلص نہیں۔ میں کچھ بھی کہہ کے دلوں میں رنجشیں ڈالنے کا باعث نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے خاموش رہی مگر اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ وہ تمہارے گھر پہ قبضہ کر چکی ہے۔ مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ تمہارے بچوں کی جان بھی اسی نے لی ہے... کیونکہ اس واقعے کے ایک دن پہلے میں بچوں کو دیکھنے گئی تھی انہیں ہلکا سا بخار بھی نہیں تھا۔'' یہ سب سننے کی دیر تھی کہ عابی کی حالت غیر ہو گئی۔

''یہ تم کیا باتیں کر رہی ہو۔ مریض کی حالت خراب ہو رہی ہے پیچھے ہٹو تم۔'' اس کو وارڈ سے باہر نکالتی نرس عابی کی طرف متوجہ تھی۔ عابی کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں پھر بھی اس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔ نرس نے فوراً بی پی چیک کیا جو بہت ہائی تھا۔ نرس نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا ڈرپ میں انجکشن منتقل کیا تھا جس کے کچھ ہی دیر بعد اس کی حالت قدرے بہتری کی طرف مائل ہوئی مگر خاموش آنسو ابھی بھی جاری تھے۔ سانس کی رفتار ابھی بھی نارمل نہیں تھی۔ تب ہی وارڈ میں ایک خوش پوش عورت داخل ہوئی جو نرس کی اجازت سے اس کے پاس رکھے بینچ پہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں ہی حلیمہ بھی اس کے پاس آ گئی۔

''میں ایک مصنفہ ہوں۔ میں نے پروگرام ''دنیا آپ کے سامنے'' میں آپ کے بارے میں ڈاکومینٹری دیکھی تھی۔ تب ہی میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نا میں آپ کے بارے میں لکھوں۔ آپ نے عروج کے دنوں میں زوال دیکھا یہ ایک بہت بڑا امتحان ہے۔'' شستہ اردو میں اپنا مدعا بیان کرتی مصنفہ کی آنکھوں میں گہری ہمدردی تھی۔ شروع میں بے دھیانی سے سنتی عابی کی آنکھیں یکایک متحرک ہوئی تھیں۔ وہ اب منہ موڑے مصنفہ کا دردمند پُرخلوص چہرہ دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اشارے سے قلم کاغذ مانگا جو مصنفہ نے نرس سے طلب کر کے اسے تھما دیا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دھونکنی کی مانند چلتی سانس وقفے

UUNOVELS.COM

وقفے سے اکھڑ رہی تھی بامشکل اس نے صفحہ پہ چند لائنیں گھسیٹیں اور صفحہ مصنفہ کی طرف بڑھا دیا۔

''میں اپنی کہانی لکھنے کی اجازت دیتی ہوں کیونکہ میں سمجھتی ہوں میری کہانی میں بہت سے اسباق چھپے ہیں۔ حلیمہ میرے سب حالات سے واقف ہے وہ آپ کو سب کچھ بتا دے گی۔ اور ہاں میری کہانی میں یہ بھی ضرور لکھیے گا کہ زندگی میں ضروری نہیں کہ سزا صرف اس گناہ کی ملے جو ہم سے سرزد ہوا ہو۔ بعض اوقات صرف ایک گناہ کا ارتکاب کرنے والا ہر اس سزا کا مستحق ٹھہرا دیا جاتا ہے جو دنیا اسے دینا چاہے۔'' بلند آواز میں تحریر پڑھتی مصنفہ اتنی گہری بات پہ دنگ رہ گئی۔

''میں حلیمہ ہوں جی میں آپ کو سب بتا دوں گی۔'' حلیمہ نے جیسے مصنفہ کو تسلی دی تھی۔ مگر عابی کے پھیکے پڑتے چہرے اور ٹوٹتی سانسوں کو دیکھ کے گھبرا اٹھی اور نرس کو بلانے بھاگی۔ وہ مصنفہ سے پھر اشارے سے قلم اور پین مانگ رہی تھی۔ مصنفہ نے فوراً دونوں چیزیں اسے دیں۔ وہ لکھنا چاہتی تھی کہ اس کے پاس اس کی بہنوں کی امانت وہ دس لاکھ کس اکاؤنٹ میں پڑے ہیں۔ وہ جاتے ہوئے دل پہ بوجھ رکھ کے نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا ادھر اس نے قلم کی نوک کاغذ پہ رکھی ادھر اس کی روح اس کے فانی وجود کو الوداع کہہ گئی۔ اس کا ہاتھ اس کے پہلو میں لڑھک گیا جبکہ مصنفہ کے ہاتھ میں تھما کاغذ لرز کر رہ گیا۔ تب ہی نرس نے آ کے عابی کی موت کی تصدیق کر دی۔ حلیمہ دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھی جبکہ مصنفہ حلیمہ کے ہاتھ میں چند ہزار کے نوٹ اور اپنا کارڈ تھما کر لڑکھڑاتے قدموں سے اسپتال سے نکل آئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جیتے جاگتے انسان نے دم توڑا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی غیر حرماں نصیبی پہ دل دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا۔

شمیم ابھی گھر ہی پہنچی تھی کہ اسے فون پہ عابی کے مرنے کی اطلاع ملی۔ اس کے کمینے دل نے گویا یک گونا اطمینان محسوس کیا۔ اسی پل اس گھر میں رکھا ہوا فالتو سامان جس میں کچھ پرانے بیگ جن میں بابر کے مرحوم والدین کی تصاویر اس کے بچپن کے کچھ کھلونے۔ ایک سبز رنگ کی فائل جس میں چیک بک بھی تھی سب کباڑیے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ رکھی تو صرف اس مکان کی رجسٹری اگر اسے ایک فیصد بھی علم ہوتا کہ وہ جس فائل کو فالتو سمجھ کے پھینک رہی ہے اس میں دس لاکھ کی رقم پوشیدہ ہے تو وہ کبھی یہ فائل ردی میں نہ دیتی۔

پھر چند دن کے دکھاوے کے سوگ کے بعد عابی کا شاندار گھر اس کا ہو گیا تھا۔ عابی نے اس کے خواب چرائے تھے وہ خواب جن کے یوں چھن جانے سے اس کے ماں باپ اوہام کا شکار ہو کے جلدی میں اسے کنویں میں دھکیل گئے۔ وہ تب سے ہی انگاروں پہ لوٹتی تھی آج اس کے دل میں لگی انتقام کی آگ عابی کی موت کی خوشخبری سن کے سرد پڑی تھی۔ عفی نے فون پہ سب سنا تو افسردہ رہ گئی۔ عابی پہ خدا کا قہر نازل ہوا تھا۔ بے شک اپنے خوابوں کی انگلی تھام کے گھر سے بھاگنے والیوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا مگر اتنا برا بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

درحقیقت عفی ان لوگوں میں سے تھی جو آزمائش اور قہر میں فرق نہیں کر پاتے اور اپنے ادھورے علم کے بل بوتے پہ لوگوں کو جانے بنا پوری سزا کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔ اصل سزا کی حقدار تو شمیم تھی جس نے اپنے انتقام کے جنون میں اپنے نام کو مظلومیت کی کیٹیگری سے نکال کے ظالمین کی فہرست میں جلی حروف میں لکھا تھا۔ جس پیسے کے غم میں شمیم نے اپنی آدھی زندگی اور پوری آخرت خراب کر لی وہ تو ان میں سے کسی کے بھی نصیب میں لکھا ہی نہیں تھا تو کسی کو ملتا کیسے۔ اور صرف اس پیسے کی کیا بات کرتا کوئی پیسے کے نام پہ دنیا میں موجود فتنہ کسی کی میراث نہیں۔ اس دنیا کی طرح فانی اور بے مصرف ہے۔ انسان کی اصل جائیداد اس کے اعمال ہوتے ہیں جن کا صلہ اسے دونوں جہانوں میں ملتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جو عابی جھیل چکی وہ آزمائش تھی یا خدا کا قہر کیونکہ عابی تو بہت پہلے توبہ کر چکی تھی۔ ہاں اب جو شمیم نے کیا تھا وہ ضرور خدا کے قہر کو دعوت دینے والا عمل تھا۔ بے شک خدا دلوں کے حال جاننے والا رحیم و کریم ہے مگر اس کی ایک صفت جابر و قہار بھی ہے۔ تبھی تو اگلے ہی ہفتے وہ کچھ ہو گیا جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اسے ٹائلز لگے باتھ روم کی عادت نہ تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی تھی کہ پھسل گئی۔ باتھ ٹب کا کونا ریڑھ کی ہڈی پر لگا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ شام میں شوہر آیا تو وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کا نچلا حصہ مفلوج ہو چکا ہے۔ تب سے علاج چل رہا ہے۔ علاج کی خاطر حنائی کا مکان بھی بک گیا مگر وہ ابھی بھی بستر پر ہے۔

++

UUNOVELS.COM

شیطان صفت

جناب مدیر
السلام علیکم!
ایک نئی سچ بیانی ارسال کررہا ہوں ، اس قسم کے واقعات اکثر سننے میں آتے ہیں۔ اخبارات میں بھی آتے رہتے ہیں۔ ایسے افراد کتنی معصوم طالبات کا مستقبل تباہ کردیتے ہیں۔ ان جیسے زبان کے زہریلے لوگوں پر قدغن لگانا ضروری ہے۔
کوثر اسلام
(صوابی)

UUNOVELS.COM

وجیہہ پڑھائی میں اتنی منہمک تھی کہ اسے ماں کے آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ اندر آتے میں ماں نے اس کے ہاتھوں سے کتاب کھینچی اس افتاد پر وہ اچھل پڑی۔

''جب دیکھو پڑھتی رہتی ہے نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ تمہارے ابا کب سے کھانے کی میز پر انتظار کر رہے ہیں۔''

''ماں! امتحان سر پر ہے پڑھوں گی نہیں تو آگے کیسے بڑھوں گی۔''

ماں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو آؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

وہ بادل نخواستہ اٹھی اور ماں کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے والد صغیر احمد خان اس کو دیکھ کر مسکرائے۔ جب وہ بیٹھ گئی تو وہ بولے۔ ''بیٹی پڑھائی کے لیے صحت سب سے زیادہ ضروری ہے اگر بیمار ہو گئی تو پڑھائی دھری رہ جائے گی اس لیے کھانا پینا وقت پر کرو اور صحت کا خیال رکھو۔''

''ٹھیک ہے بابا آئندہ خیال رکھوں گی۔'' اس نے سر جھکا کر کہا اور پلیٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

صغیر احمد کی نظریں بیٹی پر جم گئی تھیں گو کہ نگاہیں اس پر تھیں مگر ذہن کہیں اور تھا۔ وہ خیالوں میں بہت پیچھے، 21 سال پیچھے چلے گئے تھے۔

☆......☆

صغیر احمد اسپتال میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے ایک ایک منٹ ان کے لیے صدیوں جتنا طویل تھا۔ ان کی نظریں بند دروازے پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ دروازہ آپریشن تھیٹر کا تھا۔ سامنے سے گزرتے ہوئے پھر لوٹ کر آتے ہوئے اسے دیکھتے جا رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور آپریشن روم سے نرس برآمد ہوئی۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچے۔ نرس نے مسکرا کر کہا۔ ''مبارک ہو اللہ نے آپ کو رحمت سے نوازا ہے۔ زچہ اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔''

صغیر احمد نے اوپر دیکھا ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہنے لگے۔ ''مالک! تیرا بہت بہت شکریہ...... تو نے مجھ گنہگار کو اپنی رحمت سے نوازا...... مجھے توفیق دے کہ تیری رحمت کی مناسب پرورش کر سکوں۔''

بیٹی کا نام وجیہہ رکھا گیا۔ وجیہہ بہت پیاری بچی تھی۔ اس کے آنے سے گھر میں رونق آگئی تھی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتیں۔

صغیر احمد عدالت میں ملازم تھے وہ جب تھکے ہارے گھر آتے تو وجیہہ کو دیکھتے ہی ان کی تھکاوٹ ختم ہو جاتی۔

وقت کا پہیا آہستہ آہستہ گھومتا رہا۔ وجیہہ پانچ سال کی ہو گئی تو اسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ بہت ذہین تھی جلد ہی اس نے اپنے اساتذہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کے والدین کو اس کا مستقبل روشن نظر آ رہا تھا۔ مگر کسی کے نظر آنے یا نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تقدیر کبھی کبھی ایسا کھیل کھیلتی ہے کہ سب کچھ چوپٹ ہو جاتا ہے۔

وجیہہ تعلیمی سیڑھیاں کامیابی سے چڑھتی جا رہی تھی۔ تعلیمی میدان میں اس کی رفتار اس لیے تیز تھی کہ اس نے سوچ لیا تھا، وہ آگے بہت آگے جائے گی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے اپنی ماں سے بے انتہا پیار تھا۔ اس کا خواب تھا کہ وہ اس پیار کے بدلے جو اس کے ماں باپ نے اسے دیا ہے دنیا جہان کی خوشیاں لا کر ان کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اس نے اس کا بازو بننے کی سعی کی تھی۔ ہر کام میں ہاتھ بٹاتی، وہ کہتی۔

''بیٹی کے ہوتے ہوئے ماں کام کیوں کرے گی ایسی بیٹی کو زندہ رہنے کا کیا حق جس کے ہوتے ہوئے اس کی ماں کو کام کرنا پڑے۔''

اور ماں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔ ''ایسا نہ کہو بیٹی۔ تم میری زندگی ہو ہم تمہیں دیکھ کر ہی تو جیتے ہیں۔''

اور پھر وہ آبدیدہ ہو کر کہتی۔

''خدا تیرے نصیب اچھے کرے۔ تیری جیسی بیٹی خدا ہر کسی کو دے۔''

☆☆☆

وجیہہ میٹرک سے ہوتی ہوئی کالج اور پھر یونیورسٹی پہنچ گئی۔ یونیورسٹی میں بوائے فرینڈ کے نام پر لڑکیوں کی لڑکوں کے ساتھ دوستیاں تھیں مگر وہ ان فضول کاموں میں اپنا وقت برباد نہیں کرتی، اس کے سامنے دو خواب تھے جس کی تعبیر کے لیے وہ سخت محنت کر رہی تھی اور وہ خواب تھے پاکستان کے سول سروس میں ملازمت یا بیرون ملک تعلیم۔

یونیورسٹی میں اس کا آخری سال تھا اس کی سہیلی نے پوچھا۔ ''آئندہ کیا ارادے ہیں؟''

''ارادے تو بہت بڑے ہیں۔''

''بڑے لوگوں کے ارادے بھی تو بڑے ہوتے ہیں۔ خیر بتانے میں کیا حرج ہے کچھ ہمیں بھی پتا چلے۔''

''میں سی ایس ایس آفیسر بننا چاہتی ہوں۔''

''اور اس کے علاوہ......''

''اگر یہ نہ بن سکی تو بیرونِ ملک مزید تعلیم حاصل کروں گی۔''

''اور......''

''اس کے علاوہ میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔''

''ہم سے بھی چھپاتی ہو۔''

''میں کسی سے کچھ نہیں چھپاتی، جو کرتی ہوں ڈنکے کی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

چوٹ پر کرتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا اور امتحان ہال کی جانب بڑھ گئی۔

فائنل کے پیپر ہو گئے تو گویا اس کے سر سے بھاری بوجھ اتر گیا۔ اب وہ بے چینی سے رزلٹ کا انتظار کرنے لگی۔ اس لیے کہ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے یہ پہلی سیڑھی تھی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ یہ رزلٹ اس کے لیے ایک بھیانک خواب بن جائے گا۔

☆......☆

آخر کار جاں گسل انتظار کے بعد رزلٹ کا دن آ گیا۔ لیکن رزلٹ دیکھتے ہی اس پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ فیل کر دی گئی تھی... اور وجہ ایک پرچے میں اس کی غیر حاضری بتائی گئی تھی۔

اس نے روتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ "بابا میں نے پرچہ دیا تھا پوری کلاس اس کی گواہ ہے جوابی پرچے کا سیریل نمبر میرے پاس ہے۔ پرچے کے دن میں نے حاضری لگوائی تھی میرے دستخط اٹینڈنس شیٹ پر ہوں گے مجھے کس طرح غیر حاضر قرار دیا گیا۔"

"حوصلہ رکھو میری بیٹی...... کل یونیورسٹی جا کر معلوم کر لیں گے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

انہیں معلوم نہیں تھا کہ تقدیر ان کے لیے کیا جال بن رہی ہے کل ٹھیک ہونے کی بجائے سب کچھ بگڑ جائے گا۔

اگلے دن وجیہہ اپنے والد کے ہمراہ یونیورسٹی گئی اس کی ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ متعلقہ ڈپارٹمنٹ گئی۔ وہاں اس کی چند کلاس فیلوز بھی تھیں۔ اس کے والد نے کلرک سے کہا۔ "میری بیٹی نے پرچہ دیا تھا لیکن اسے غیر حاضر قرار دے کر فیل کر دیا گیا ہے آپ براہ کرم ذرا ریکارڈ چیک کریں۔"

کلرک نے ایک نظر وجیہہ پر ڈالی تو وجیہہ ٹھٹک گئی۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ شخص تو وہی ہے جس نے اس کی ایک سہیلی سے پیغام بھجوایا تھا کہ دوستی کر لو تو ہر پرچے میں نمبر بڑھوا دیا کروں گا۔ جواب میں وجیہہ نے سہیلی کو ڈانٹ دیا تھا۔ آج وہ ٹیبل پر بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے چشمہ ماتھے پر چڑھایا اور سر قدرے اوپر اٹھا کر وجیہہ کے باپ سے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کی بیٹی کیا کرتی رہی ہے کیا آپ کو پتا ہے کہ آپ کی بیٹی یونیورسٹی کے بہانے کہاں کہاں جاتی ہے کیا آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ پیپر کے بہانے آپ کی بیٹی کہاں گئی تھی...... جائیں پہلے وہ معلوم کریں پھر ریکارڈ چیک کرنے کے لیے آنا۔"

صغیر احمد یہ سن کر سناٹے میں آ گئے۔ وجیہہ کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے وہ ایک دم گھر والوں اور سہیلیوں کے سامنے چور بن گئی۔

اسے دنیا گھومتی ہوئی معلوم ہوئی اس کے باپ نے اسے سنبھالا۔ کسی نہ کسی طرح وہ گھر پہنچ گئے۔ اس میں اپنے گھر والوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کر دیا اور سارا دن وہ روتی رہی۔ کلرک کے ایک جملے نے اس کے اعتماد اس کے کردار اور اس کی پاکیزگی کو پارہ پارہ کر دیا۔

اگلے دن پڑوس کی ایک لڑکی اس کے پاس آئی اور کہا۔ "محلے میں لوگ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں وجیہہ۔"

"لوگوں کو باتوں کے سوا اور آتا بھی کیا ہے۔ جو منہ میں آیا بک دیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس سے کسی پر کیا اثر پڑے گا۔ یہ جانے بغیر کہ اس سے کسی کی زندگی بھی تباہ ہو سکتی ہے...... اور تم...... تمہیں مجھ سے ہمدردی نہیں بلکہ میرا تماشا کرنے آئی ہو۔" وجیہہ اپنے آپے میں نہیں تھی وہ اس پر برس پڑی۔

محلے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے اور تو اور اس کی ماں بھی اسے کبھی کبھی عجیب نظروں سے دیکھنے لگتی۔

زندگی اس کے لیے بوجھ بن گئی اور بالآخر اس نے زندگی کے بار گراں کو اپنے کندھوں سے اتارنے کا فیصلہ کر دیا۔

اس نے پنکھے سے رسی لٹکائی، میز پر کھڑی ہو گئی اور پھندا گلے میں ڈالنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ اور پیار ماں کی تصویر لہرانے لگی۔ یکایک اسے بینا یاد آ گئی۔

☆......☆

بینا اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ بہت خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ کلاس میں کاشف نامی ایک لڑکا تھا جو بہت ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت مہذب اور شریف تھا۔ ہر کسی کے کام آتا۔ اس کی باتیں بہت سحر انگیز تھیں۔

اس نے بینا کی بہت مدد کی۔ رفتہ رفتہ بینا اس کے قریب آتی گئی اور بالآخر اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔

ایک دن اس نے کاشف سے کہا۔ "کاشی! مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا میرے رشتے کے لیے اپنے والدین بھیجو۔"

"تم نے میرے دل کی بات کی۔ میں نے اپنی بہن

UUNOVELS.COM

سے بات کی ہے وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ بس آج تم اس سے مو پھر ایک دو دن میں میرے والدین رشتہ مانگنے آجائیں گے۔"

"سچ کاشی......"

"کیا میں نے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے۔"

"تم کتنے اچھے ہو کاشی...... شادی کے بعد بھی اسی طرح رہنا۔"

وہ دونوں ایک ساتھ مسکرائے۔

کاشف اسے ایک فلیٹ میں لے گیا۔ فلیٹ خالی تھا۔ اس کی بہن موجود نہیں تھی۔ کاشف نے کال ملائی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "وہ تھوڑی سے شاپنگ کرنے گئی ہے بس آدھے گھنٹے میں آجائے گی۔"

کاشف اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

بینا تھوڑی سی گھبرا گئی کیونکہ آج تک کاشف نے اسے کبھی چھوا نہیں تھا۔

کاشف کہنے لگا۔ "ہم بس چند دنوں میں میاں بیوی بننے والے ہیں پھر ایک دوسرے سے یہ اجنبیت کیسی۔"

"لیکن ابھی تو ہمارا نکاح نہیں ہوا ہے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا لیکن کیا میں تمہیں قبول نہیں ہوں۔"

"کیوں نہیں ہو۔"

"بس تو پھر دوری کیسی۔"

کاشف نے اسے اپنی میٹھی باتوں کے جال میں ایسا جکڑ لیا کہ وہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکی۔ اور وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کاشف کی محبت میں اندھی بینا اپنا سب کچھ کھو گئی۔

ٹیبل پر رکھے فون کی گھنٹی بجی کاشف نے بینا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بہن کی کال ہے شاید آرہی ہے۔"

کال سننے کے بعد اس نے کہا۔ "ہمارے ایک عزیز کو حادثہ پیش آیا ہے۔ بہن اسپتال چلی گئی ہے میں تمہیں کل ان سے ملوا دوں گا۔ چلو تمہیں ہاسٹل پہنچا دوں مجھے بھی اسپتال جانا ہے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ کچھ ہوا تو میں تمہیں کال کرلوں گا۔"

اگلے دن کاشف کالج نہیں آیا۔ بینا کو بہت فکر ہو رہی تھی۔ دوپہر کے بعد کاشف کی کال آئی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1200 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 600 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

UUNOVELS.COM

''سنو بینا! میرا ایک دوست تمہیں لینے آرہا ہے وہ جیسے کہے ویسا کرنا۔''

''لیکن تمہارے دوست کے ساتھ میرا کیا واسطہ...... اور آج میں تمہاری بہن......''

''میری کوئی بہن نہیں۔'' کاشف نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میں نے کہا نا میرا دوست جو کہے ویسا کرو۔ اور تیری جیسی آوارہ لڑکی سے کیا میں شادی کروں گا؟ تیری جیسی لڑکیاں دل بہلانے کے لیے ہوتی ہیں گھر بسانے کے لیے نہیں اور تیری خفیہ تصویر میں نے بنائی ہوئی ہے اگر تو تعاون نہیں کروگی تو وہ تمہارے گھر والوں کو بھیج دی جائے گی۔''

بینا لرز گئی۔ اسے اپنی سہیلی کی بات یاد آ گئی۔

''ہر شخص اس وقت تک شریف ہوتا ہے جب تک اسے موقع نہیں ملتا اور جب موقع مل جاتا ہے تو اچھے اچھوں کے چہروں سے شرافت کا نقاب اتر جاتا ہے۔''

کاشف کے چہرے سے بھی شرافت کا نقاب اتر گیا تھا۔ اب وہ اپنے احسانوں کی قیمت وصول کر رہا تھا۔

اس کی مثال اس جواری کی سی تھی جو اپنا سب کچھ ہار چکا ہو۔

اسی رات اس نے خودکشی کر لی۔ اس کی ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور اگلے دن اس کے ساتھ اس کی ماں کا جنازہ بھی نکلا۔

اس کے والد اور بھائی ہر کسی سے منہ چھپاتے پھر رہے تھے پھر وہ گھر چھوڑ کر کہیں دور چلے گئے والد کی بہت اچھی نوکری جب کہ بھائی کا کاروبار تھا وہ سب کچھ ایک جھٹکے میں ختم ہو گیا۔

بینا کے ساتھ وجیہہ کو پھر اپنی ماں یاد آ گئی۔ وہ لرز گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر والوں کو تکلیف پہنچے۔

وہ میز سے نیچے اتر گئی۔

اس کے کانوں میں اس کے باپ کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''بیٹی خود کو مضبوط بناؤ۔ لڑکی جب کمزور ہوتی ہے تو دنیا اسے کمزور سے کمزور تر بناتی ہے لیکن جب وہ مضبوط ہو جاتی ہے تو بڑے بڑے چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔''

اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں مضبوط بنوں گی میں حالات کا مقابلہ کروں گی میں ہمت نہیں ہاروں گی۔''

وہ اپنے باپ کے کمرے میں گئی۔ صغیر احمد کرسی سے سر لگائے سوچوں میں گم تھے۔ آہٹ سن کر وہ چونک پڑے بیٹی کو دیکھ کر...... مسکرائے اور اسے بیٹھنے کو کہا پھر خود ہی کہنے لگے۔ ''بیٹی! ہم تمہارے ساتھ ہیں کوئی فکر مت کرو ہمیں معلوم ہے ہماری بیٹی کیسی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یونیورسٹی و کالجز میں بھی کبھی شیطان صفت لوگ بھی نوکری حاصل کر لیتے ہیں۔''

''اب آپ نے کیا سوچا ہے پاپا۔''

''ہم عدالت میں جائیں گے اور اس وقت تک لڑیں گے جب تک ہمیں ہمارا حق نہیں مل جاتا۔''

''شکریہ پاپا۔''

صغیر احمد نے یونیورسٹی پر کیس کر دیا۔ وجیہہ کا کیس مضبوط تھا۔ یونیورسٹی اور کلرک پر عدالت کا دباؤ پڑا تو وہ فوراً وجیہہ کا پرچہ عدالت میں لے آئے اور یوں یونیورسٹی نے غلطی تسلیم کرتے ہوئے وجیہہ کو پاس قرار دیا۔

لیکن بات اب پاس اور فیل سے کہیں آگے بڑھ گئی تھی۔ اس اذیت کا حساب کون دیتا جو ان دنوں وجیہہ اور اس کے گھر والوں نے اٹھائی تھی۔ بدنامی کا وہ دھبا کون دھوتا جو کلرک نے اپنی کوتاہی چھپانے کے لیے لگایا تھا اور تو اور وجیہہ کی جو کردار کشی کی گئی تھی یونیورسٹی نے اس پر معذرت تک نہ کی۔

اس لیے صغیر احمد نے یونیورسٹی پر ہتک عزت کا کیس کر کے 25 لاکھ روپے ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔ یونیورسٹی نے اس کے خلاف اپیل کی مگر ہائی کورٹ سے لے کر سپریم کورٹ تک ہر جگہ ان کی اپیل مسترد ہوتی گئی۔ 17 سال تک یہ مقدمہ چلتا رہا بالآخر دیوانی عدالت نے وجیہہ کے حق میں فیصلہ کر دیا لیکن ہرجانے کی رقم 25 لاکھ سے کم کر کے 8 لاکھ کر دی۔

ڈگری مکمل ہوتے ہی وجیہہ کے والدین نے اس کی شادی کر دی تھی، اس کے شوہر نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

وجیہہ اب کینیڈا کے شہر کنگسٹن میں اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ مقیم ہیں۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہے مگر اس کے سامنے اب بھی پاکستان کے سول سروس میں شامل ہونے کے کبھی نہ پورے ہونے والے خواب ہیں۔

وجیہہ جی دار تھیں جس نے سترہ سال تک اس مقدمے کا بار اٹھایا ورنہ کتنی لڑکیاں ہیں جن کی زندگیاں کسی کے کہے ہوئے ایک جملے نے جہنم بنا دی ہیں۔

++

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

UUNOVELS.COM

پاکھنڈی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ایک اور سرگزشت روانہ کررہی ہوں، یہ سرگزشت اپنے وطن عزیز کی ہے۔ ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو یہ کہہ کر سینہ پھلا لیتے ہیں کہ مرد کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ کا حکم یہ بھی ہے کہ عدل سے کام لو
امید ہے قارئین کو پسند آئے گا۔

مونا شہزاد
البرتا (کینیڈا)

UUNOVELS.COM

کوئلوں کی راکھ کب کی سلگ سلگ کر ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ اس نے بے دھیانی میں راکھ کو کریدا تو کچھ دبی ہوئی چنگاریاں ایک لمحے کو دہک اٹھیں، ایک چنگاری اڑ کر اس کے ہاتھ کی پشت کو بھی جلا گئی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی سسکی نکل آئی اور آنکھیں یک لخت بھر آئیں، وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ یہ آنسو اس کے ہاتھ کی جلن سے اس کی آنکھوں میں بھر آئے تھے یا من کی جلن سے...... اس نے سر اٹھایا اور سوچا۔

"ہائے اماں! تو نے مجھے سب کچھ سکھایا مگر یہ نہ سکھایا کہ محبت میں بٹوارہ کیسے برداشت کیا جاتا ہے؟ جو مجازی خدا کل تک صرف میرے سر کا تاج تھا۔ آج وہ کسی اور کے سر کا تاج ہے اور میں جو کل تک ایک ملکہ تھی آج پیر کی جوتی بن گئی

ہوں۔"

اچانک باہر سے خدا بخش کے چلّانے کی آواز آئی۔ "کدھر مرگئی شاداں ست نکمی عورت! دیکھ پینو ابھی تک بھوکی بیٹھی ہے۔"

شاداں ایک دم سے جیسے ہوش میں آگئی۔ اس نے فافٹ ناشتا ٹرے میں رکھا اور پھرتی سے باورچی خانے سے باہر بھاگی۔ اندر کمرے کا منظر دیکھ کر اس کا دل ڈوب سا گیا۔ اس کی سوتن پھیل کر بستر پر دراز تھی اور شوہر نامدار جواب بد قسمتی سے سوتن کے سر کا تاج بھی تھا۔ اس کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ وہ خدا بخش جس نے کبھی خود سے ہل کر پانی نہیں پیا تھا، آج کسی کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر پروین عیاری سے مسکرائی۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ایک ادا سے ہائے ہائے کرتی اٹھی۔ شاداں کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ خدا بخش نے اسے جھڑک کر کہا۔ "ناہنجار عورت! رکھ دے ناشتا تپائی پر۔ مجھے سب پتا ہے تو پینو سے جلتی ہے۔ سوہنے سائیاں نے اتنے سالوں بعد مجھ پر رحم کیا ہے... مگر تجھ جنم جلی کو کوئی میرا خیال نہیں ہے۔ خود تو مجھے یہ خوشی نہیں دے سکی اب پینو کا ہی خیال کر لے۔"

شاداں ہراساں سی ہوگئی۔ اس نے گھگیاتے ہوئے کہا۔ "خدا بخش تجھے پتا ہے، گیس آج کل کم آتی ہے۔ سیلنڈر بھی کل سے ختم ہے۔ میں نے مجبوراً آج کوئلے کا چولہا جلا کر ناشتا بنایا ہے۔ کوئلے دہکانے میں وقت تو لگتا ہے۔"

خدا بخش بیزاری سے بولا۔ "جا جا زیادہ وضاحتیں مت پیش کر۔ گوشت کی یخنی چڑھا دے۔ پینو سے پوچھ وہ کھانے میں کیا پسند کرے گی؟"

شاداں کا دل کسی گہرے کنوئیں میں ڈوب سا گیا۔ اس نے گہری سانولی موٹے نقوش والی عمر رسیدہ پینو کی طرف دیکھا۔ پینو مسکرا کر ایک ادا سے بولی۔

"خدا بخش! اللہ قسم! تو تو جانتا ہے کہ میرا دل کتنا کچا ہوتا رہتا ہے... مگر ڈاکٹرنی صاحبہ نے ہدایت دی ہے کہ بچے کی صحت کے لیے میں اپنی خوراک اچھی ضرور رکھوں اسی لئے میں نے سوچا ہے کہ ڈاکٹرنی کی ہدایت پر عمل کروں۔ میرا خیال ہے کہ گوشت کا پلاؤ، آلو گوشت کا شوربا اور میٹھے میں فیرنی ٹھیک رہے گی۔ ہاں! تازہ سبزیوں کا سلاد ضرور ساتھ میں بنائے اور ساتھ دو چار پھلکے بھی۔"

شاداں کی روح سنگ اٹھی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "خدا بخش! اتنا کھانا کوئلے کے چولہے پر کیسے بن پائے گا؟"

خدا بخش کا رنگ غیض سے سیاہ پڑ گیا۔ شاداں کو احساس ہوا کہ جیسے وہ ایک بھیانک غلطی کر بیٹھی تھی۔ خدا بخش چیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ اسے لاتیں گھونسے مار مار کر کہہ رہا تھا۔ "بدحرام! کبھی تو کچھ کام کر لیا کر۔ جب سوئی گیس نہیں تھی تو کیا کھانا نہیں پکتا تھا؟ تیری جیسی کام چور عورتوں نے جینا حرام کر دیا ہے۔"

شاداں بری طرح پٹتے ہوئے اپنے مجازی خدا سے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر پینو پر پڑی۔ اس نے دیکھا، اس کی سوت بستر پر بیٹھی بہت تسلی سے ناشتا کر رہی ہے۔ اس کی آنکھیں اور لب اب اکٹھے مسکرا رہے ہیں۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ وہ اس وقت اس منظر سے بہت محظوظ ہو رہی ہے۔ شاداں کو احساس ہو گیا کہ جس لڑکی کو طلاق یافتہ، کم شکل اور بڑی عمر کی سمجھ کر اس نے بطور اپنی سوتن قبول کیا تھا۔ اس نے اسے بہت چالاکی سے اس کی راجدھانی سے دستبردار کر دیا تھا۔ سوت نے نفرت کا جالا کچھ اس چالاکی سے بنا تھا کہ وہ بے بس مکھی کی طرح اس میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ پینو کا پاؤں بھاری ہونا درحقیقت شاداں کے نصیب سو جانے کا سندیسہ تھا۔ خدا بخش اب اسے مار مار کر ہانپ چکا تھا اور شاداں کا پنڈا ان بھی نیل و نیل ہو چکا تھا، کئی جگہ سے خون بہہ رہا تھا، اس کے چہرے پر بھی زخم بن گئے تھے۔ حالات کو بھانپ کر پینو اٹھی اور ایک ادا سے خدا بخش کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "اتنا غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ پکا لے گی کھانا شاداں...... اب اسے سمجھ آ گئی ہے۔"

شاداں کو اس پاکھنڈی کی شکل دیکھ کر متلی سی آ گئی۔ وہ اپنے زخموں سے چور چور جسم کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے سے نکلتے نکلتے اس کے کانوں میں پڑا۔ "واہ خدا بخشا! تو نے تو میرا دل خوش کر دیا۔ میں نے رات ہی تجھے اسے مار کر انسان بنانے کی فرمائش کی تھی اور تو نے صبح صبح ایسی دھلائی کی ہے کہ آئندہ سوال کرنے کی ہمت نہیں کرے گی، بانجھ عورت کو تو نے ہی اتنے سال جھیلا ہے۔ یہ تیرا ہی حوصلہ تھا، ورنہ کوئی اور ہوتا تو کب کا اسے چلتا کر دیتا۔"

شاداں کا دماغ سن سا ہو گیا۔ وہ گرتی پڑتی باورچی خانے میں پہنچی۔ شیشے کی الماری میں اس کا زخم زخم عکس اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ عمر کی اٹھارویں سیڑھی وہ چڑھی تھی، ابھی ایف اے کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا کہ اماں نے اس

UUNOVELS.COM

کے ہاتھ پیلے کر دیئے تھے۔ تیس سالہ خدا بخش اس سے بہت بڑا تھا اور شکل و صورت میں بھی عام سا تھا مگر اماں کہتی تھی۔ ''دیبے! شادی مرد کی خوبصورتی نہیں اس کی کمائی دیکھ کے کی جاتی ہے۔ میری لاڈو تو بے فکر ہو جا تو عیش کرے گی۔''

اسے یاد تھا کہ جب شب عروسی پر خدا بخش نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تھا تو اس کے حسن نوخیز کو دیکھ کر مدہوش ہو گیا تھا۔ اس نے اسے دیکھتے ہی ''چندا'' کا لقب دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی شاید ماضی چیز ہی ایسی ہے۔ جب بھی اپنے در وا کرتا ہے تو بہت سے دبے ہوئے سسکتے ہوئے سوالات کو بھی دوبارہ سے زندہ کر دیتا ہے۔ اسے بھی وہ سہانے دن یاد آ گئے جب اس کا مجازی خدا اسے دیکھ دیکھ کر فدا ہوتا تھا۔ ہر دم اسے چندا چندا کہہ کر بلاتا تھا۔ ہر وقت اس کی کلائیاں چوڑیوں سے بھری رکھتا، اسے کانچ کے برتن کی طرح سینت سینت کر رکھتا تھا مگر جب سال پر سال گزرتے گئے، اس کی گود ہری نہ ہو سکی تو محبت کے تمام سوالات کا حاصل منفی میں آنے لگا۔ خدا بخش نے بہت علاج معالجہ کروایا مگر سب ڈاکٹروں، حکیموں کی ایک ہی رائے تھی کہ وہ دونوں بالکل صحت مند تھے، ماں باپ بننے کے قابل مگر بس شاید رب کی مہربانی پر نہیں تھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا رشتے دار، دوست، احباب سب کی زبانیں نشتر بنتی گئیں۔ ہر جگہ یہی سوال پوچھا جاتا کہ اب تک ان کا آنگن سونا کیوں ہے؟

دھیرے دھیرے یہ صور رنگ لانے لگا اور خدا بخش کا دل اس کی جانب سے کھنا سا ہو گیا۔ بہت سے مفاد پرست اب کھل کھلا کر خدا بخش کو دوسری شادی کا مشورہ دیتے۔ شاداں ہراساں تھی یہ سب کچھ سنتی رہتی، اس میں کوئی نقص نہیں تھا پھر بھی وہ بنجر کھیتی قرار پائی تھی۔ شاداں کو لگتا تھا کہ اس کے آنگن میں سیلابی باڑ آ گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس باڑ کے پانی پر بند بنانے میں ناکام رہی ہے۔ وہ خدا بخش کے آگے ہاتھ جوڑتی اس کے پیر پکڑتی مگر محبت کی خوش رنگ تتلی ان کے آنگن سے کب کی اڑ چکی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے خدا بخش پتھر کا بھگوان بن گیا ہے جو صرف مندر کو آباد تو کرتا ہے مگر کسی بھگت کی پراتھنا نہیں سنتا جس پر کوئی منت وسماجت اثر نہیں کرتی۔ اس کی داسی اس کے پیروں میں کیا ارپن کرتی ہے وہ اس سے بے نیاز رہتا ہے۔ سرد، بے جان اور خود غرض۔ دھیرے دھیرے ان کی محبت کے قفل کو بھی زنگ لگنے لگا تھا۔ شاداں نراش ہو کر سوچتی۔ ''میرے میاں کا بھی قصور نہیں ہے۔ شاید بچے ہی ہر شادی کے قفل کی چابی ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی ہی اس رشتے کو دوام بخشتی ہے۔''

آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب باقاعدگی سے اس کی سوت ڈھونڈنے کا ارادہ کر لیا گیا۔ خدا بخش نے اسے بلا کر اسے تیار ہونے کا حکم دیا، اسے معلوم تھا کہ آج بھی وہ رشتہ دیکھنے جا رہے تھے۔ اس کی ساس بھی گاؤں سے آئی ہوئی تھیں۔ وہ تیار ہوتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر چپکے سے خود سے بولی۔ ''اماں! تم تو کہتی تھی کہ اولاد مرد کے نصیب سے ہوتی ہے اور کمائی عورت کے نصیب سے ہوتی ہے مگر خدا بخش کا نصیب تو میرے نصیب کو گہن لگا گیا ہے۔ آج تو زندہ ہوتی تو دیکھتی کہ تیری دھی خود اپنے سہاگ کو کسی کو سونپنے جا رہی ہے۔ اماں! تیری شاداں تو ہار گئی۔''

اچانک خدا بخش نے کمرے میں آ کر اس کی خود کلامی کا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ شاداں نے افسوس سے اس کی جانب دیکھا اور دل ہی دل میں بولی۔ ''خدا بخش تیری محبت کا رنگ تو بہت ہی کچا نکلا ذرا سی آزمائش کی دھوپ پڑی اور تمام دھنک رنگ اڑ گئے۔''

وہ لوگ تیار ہو کر لڑکی کے گھر پہنچے۔ لڑکی چائے لے کر جب ان کے سامنے آئی تو شاداں کو جھٹکا لگا۔ لڑکی گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ عمر بھی پینتیس سال کے لگ بھگ تھی، سب سے بڑی بات یہ کہ مطلقہ تھی۔ وہ لڑکی والوں کے گھر سے نکلے تو شاداں کی ساس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''شاداں پتر! دل بڑا کر۔ یہ لڑکی اگر خدا بخش کی بیوی بن بھی گئی تب بھی اس کا دیا تیرے حسن کے آگے نہیں جل پاتا۔ خدا بخش تیرا ہے اور تیرا ہی رہے گا۔''

شاداں نے دل کڑا کیا سینے پر مصلحت کی سل رکھ کر خدا بخش کو دوسری شادی کی اجازت دے دی۔ نکاح سے لے کر ولیمے تک کے جوڑے اس کے اور دلہن کے ایک جیسے بنے۔ وہ ولیمے کی تقریب میں بھی خدا بخش کے پہلو میں ہی بیٹھی تھی۔ نئی دلہن بظاہر بہت خاموش اور چپ چاپ سی تھی مگر شاداں کو یہ خاموشی کسی آنے والے طوفان کی خبر سناتی دے رہی تھی۔ اس کی خاموشی میں ایک عجب سی للکار تھی، اس کے ہونٹ خاموش رہتے تھے مگر آنکھیں بہت زیادہ بولتی تھیں۔

آنے والے دنوں میں شاداں کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ چنو نے خدا بخش پر اپنی گرفت مضبوط کرنی شروع کر دی تھی۔ اس سانولی سلونی کم شکل عورت نے کچھ ایسا جادو چلایا تھا کہ خدا بخش اس کے کمرے کا راستہ تک جیسے بھول گیا

UUNOVELS.COM

تھا۔ رات بھر پینو کے کمرے سے سرگوشیوں اور چوڑیوں کے چھنکنے کی آوازیں آتی رہتیں شاداں بیچاری برہا کی آگ میں جلتی سسکتی رہتی۔ شاداں کے روپ کا دیا بجھ چکا تھا اور نئی دلہن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ نئی دلہن نے ابھی تک گھر کے کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ شاداں کا دن گھر کے کام سمیٹتے گزرتا تھا۔ شادی کے تیسرے مہینے ہی وہ خبر آگئی جس کی اُمید پر خدا بخش نے دوسری شادی کی تھی۔ پینو کے پاؤں بھاری ہوگئے تھے۔ اس کی اُمید کی خبر سن کر شاداں بہت خوش ہوئی مگر پینو نے تو اپنی کینچلی ہی بدل ڈالی۔ اس کے اندر کا زہر اب اس کے لب و لہجے سے ٹپکنے لگا تھا۔ شاداں محض گھر کی نوکرانی بن کر رہ گئی تھی۔ شاداں کا بے دھیانی میں ہاتھ اپنے چہرے پر لگ گیا اور اس کا رواں رواں درد سے کانپ اٹھا۔ وہ ماضی سے دوبارہ حال میں واپس آچکی تھی۔ اس نے بے دلی سے کوئلے کے چولہے میں کوئلے دہکانے شروع کر دیئے۔ وہ جانتی تھی کہ خدا بخش اپنی لاڈلی بیوی کو کھانا کھلانے ضرور گھر آئے گا۔ اس میں اب ہمت نہیں تھی کہ وہ مزید مار کھاتی۔ اس نے تیزی سے ہاتھ چلانے شروع کر دیئے۔ کھانا بناتے بناتے اس کی نظر باورچی خانے میں کونے میں پڑی چوہے مار گولیوں پر پڑی۔ اس کے ہاتھ تھم سے گئے۔ اس کی صبیح پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ ابلیس ملعون چوکنا ہو گیا تھا، اس نے اس کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ اعتبار کی عمارت میں سیندھ تو پہلے ہی لگ چکی تھی۔ اب گھر کا راستہ ہر چور اُچکے کے لیے کھل چکا تھا۔ زہر کی گولیاں اسے لبھا رہی تھیں۔ اسے آزما رہی تھیں۔ وہ آنکھیں چرائے اپنا دھیان کھانا پکانے پر لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں پتا نہیں کوئلوں کا کچا دھواں اسے ستا رہا تھا یا من میں اٹھتی ترغیبات اسے ڈرا رہی تھیں۔ ابلیس لعین لڈی ڈالتا اس کے اردگرد پھر رہا تھا۔

☆......☆

وہ کھانے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو پینو بستر پر بیٹھی اپنے ناخن نیل پالش سے رنگ رہی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور پشت دروازے کی جانب تھی۔ اس کے فون کا اسپیکر آن تھا اور وہ اپنی ماں کو لہک لہک کر بتا رہی تھی۔

''اماں جی! یقین کیجیے کہ آپ کی دعاؤں اور مشوروں سے سب معاملات بہترین چل رہے ہیں۔ آج خدا بخش نے خوب شاداں کی پھینٹی لگائی ہے۔ بہت جلد اس چڑیل کو میں چلتا کروں گی۔ خدا بخش خود اسے طلاق کا کاغذ ہاتھ میں پکڑا کر اسے باہر کا راستہ دکھائے گا۔''

شاداں کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب سا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بات بعید از قیاس ہرگز نہیں تھی۔ اس نے ہراساں ہو کر سوچا۔

میں کہاں جاؤں گی؟ ماں باپ تو کب کے مرکھپ گئے۔ بھائی اپنی بیویوں کی ناز برداریوں میں مصروف ہیں۔ میں کیسے زندہ رہ پاؤں گی۔ یہ سماج تو مطلقہ عورت کو رسوا کر دیتا ہے۔

فون پر دوسری طرف سے پینو کی ماں بولی۔ ''نی جھلی ہوئی ہے۔ کیوں مفت کی نوکرانی ہاتھ سے گنوا رہی ہے۔ تجھے بچوں کی نوکرانی کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ کہاں پیسے خرچ کر کے نوکرانی ڈھونڈے گی۔ یہ تو روکھی سوکھی کھا کر تیری اترن پہن کر ایک کونے میں پڑی رہے گی۔''

پینو کھلکھلا کر ہنسی اور ادا سے بولی۔ ''اماں جی! تو تو بہت سمجھ دار ہے۔ کیا دور کی کوڑی لائی ہے۔''

شاداں کے ہاتھ پاؤں کپکپا اٹھے۔ اسے احساس ہوا کہ اب اس کی حیثیت اس گھر میں ایک باندی سے زیادہ ہرگز نہیں، اس کی سوتن کی آمد درحقیقت اس کی ہنستی بستی زندگی کا اختتام تھی۔ اس نے جلدی سے کھانا تپائی پر رکھ دیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اب اس کے ہاتھ اس ٹرے کا بوجھ نہیں اٹھا پائیں گے۔ برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر پینو کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ غیض و غضب سے دیوانی ہوگئی اور چیخ کر بولی۔ ''نامراد! میرے کمرے میں بغیر دستک کے تو کیسے آگئی؟''

شاداں نے سنگ کرا سے دیکھا اور کہا۔ ''پاکھنڈی! میں تو صرف تیرے کمرے میں بغیر دستک کے آئی ہوں مگر تو تو میرے گھر میں سیندھ لگا کر آگئی ہے اور مالکن بن بیٹھی ہے۔ جو حق ہم دونوں کو اللہ اور اس کے رسول نے برابر کا دیا ہے وہ تو اکیلے ہڑپنا چاہتی ہے۔ یاد رکھ اس کی عدالت میں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ تو نے میری اترن پہنی ہے میں نے نہیں......''

اتنی دیر میں خدا بخش کمرے میں داخل ہوا، پینو نے اسے دیکھ کر چیخنے چلانے مگرمچھ کے آنسو بہانے شروع کر دیئے۔ شاداں فوراً پھرتی سے کمرے سے نکل گئی۔ اسے پتا تھا کہ خدا بخش نے پینو کی شکایت پر اس کا کیا حشر کرنا تھا۔

☆......☆

شاداں ہانپتی کانپتی غسل خانے میں داخل ہوگئی۔ اس

نے دروازے کو جھٹ سے کنڈی لگا دی۔ باہر خدا بخش دیوانوں کی طرح اس کا نام پکارتا گھر بھر میں بپھرا ہوا پھر رہا تھا۔ وہ بار بار قسمیں کھا رہا تھا کہ آج اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ شاداں نے کانپتے ہوئے سوچا۔ ''میں کس عذاب ناگہانی میں گرفتار ہو کر رہ گئی ہوں۔ کیا میں ناکردہ گناہوں کا بوجھ ساری عمر ان ناتواں کاندھوں پر اٹھائے پھرتی رہوں گی؟ کیا اب میرے صحن میں کبھی صبح طلوع نہیں ہوگی؟''

اس کے ہر سوال کا جواب اسے نفی میں مل رہا تھا۔

اس کے جسم سے جان نکل سی گئی۔ وہ دھپ سے گیلے فرش پر گر سی گئی۔ اس کے اردگرد مایوسی کے مہیب اندھیروں کے سانپ پھنکاریں مارتے پھر رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار سانس لیتے ہوئے اُمید کے جگنو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہر طرف صرف مہیب اندھیرا تھا۔ اس کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی گہری کھائی میں گرتی جا رہی تھی۔ اس نے چیخنا چاہا مگر اس کے ہونٹوں پر کسی نادیدہ ہاتھ کا پہرا تھا۔

☆......☆

خدا بخش جب فیکٹری پہنچا تو تمام ورکر کام چھوڑ کر ٹولیوں کی شکل میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ خدا بخش نے حیرت سے پوچھا۔ ''آج کام کیوں نہیں شروع ہوا؟''

پھر اس نے چیخ کر کہا۔ ''تم لوگ کن خوش گپیوں میں مصروف ہو؟''

اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ کے زاہد صاحب آگے ہو کر بولے۔ ''صاحب! خبر ہی کچھ ایسی ہے۔ فیاض سپروائزر کی پہلی بیوی نے اس کو اور اس کی دوسری بیوی کو چھریوں سے جان بحق کر دیا اور خود تھانے میں پیش ہو گئی۔ اب ہم سب چندہ اکٹھا کر رہے ہیں کہ ان کی تدفین کی جا سکے۔''

خدا بخش کو دھچکا سا لگا، وہ فیاض اور اس کی پہلی بیوی سکینہ کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ اکثر ان کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ سکینہ فیاض پر جان چھڑکتی تھی۔ شادی کے بارہ سالوں بعد جب ان کے آنگن میں کوئی پھول نہیں کھلا تو اس نے خود اصرار کر کے فیاض کی دوسری شادی کروائی تھی۔ خدا بخش نے سوچا۔

سکینہ بھابی ایسے کیسے کر سکتی ہے۔ وہ تو فیاض پر واری واری جاتی تھی۔ انھوں نے کیسے دو جانوں کو قتل کیا۔ ضرور پولیس والوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ زاہد صاحب کو ضروری ہدایات دے کر تھانے روانہ ہو گیا۔ تھانیدار اس کا لنگوٹیا یار تھا۔ اس کے اصرار پر اسے سکینہ سے تنہا ملنے کی اجازت مل گئی۔ وہ ملاقات کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ لیڈی کانسٹیبل سکینہ کو لے آئی۔ سکینہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ سفید تھا مگر اس کے انداز سے ایک عجب سی بے پروائی جھلک رہی تھی۔ خدا بخش نے بے تابی سے کہا۔

''بھابی! سچ کہہ! یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں نا۔ تو فیاض کو کیسے مار سکتی ہے؟''

سکینہ نے سر اٹھایا اور کہا۔ ''بھا خدا بخش! یہ سچ ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے دونوں کو جہنم رسید کیا ہے۔''

خدا بخش بے یقینی کے عالم میں بولا۔ ''بھابی! صدمے سے تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تو جھوٹ بول رہی ہے۔''

سکینہ چیخ کر بولی۔ ''میرا بس چلے تو ہر اس مرد کو قتل کر دوں جو چار شادیوں کے مذہبی احکام کو تو یاد رکھتا ہے مگر ان بیویوں میں انصاف رکھنا بھول جاتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نہیں فرمایا۔

''تو اگر تمھیں یہ خدشہ ہو کہ تم ان کے درمیان برابر اور عدل نہیں کر سکتے تو پھر ایک ہی کافی ہے النساء (3)۔''

''میں نے فیاض کی شادی خود کروائی تھی۔ میں اس کے بچے گود میں کھلانے کے لیے بے تاب تھی مگر نسرین کے آتے ہی میں ایک بھولی بسری کہانی بن گئی۔ ایک پرانی ردی شے جو گھر کے کسی کونے میں رکھ کر فراموش کر دی جاتی ہے۔ میں فیاض کی راہ ہر رات تکتی رہی مگر وہ نسرین کی باہوں میں کھو کر رہ گیا۔ میں روئی، چیخی جواب میں مجھ کو مارا گیا۔ کل فیاض نے نسرین کے کہنے میں آ کر مجھے طلاق دے دی۔ تین الفاظ اور میرا سالوں کا رشتہ ایک پل میں ختم ہو گیا۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر اپنی نسوانیت کی تذلیل نہیں برداشت کر سکتی۔''

خدا بخش کو لگا جیسے سکینہ نے اسے آئینہ دکھا دیا ہو۔ اس کے اپنے گھر میں بھی تو یہی کہانی دہرائی جا رہی تھی۔ وہ بے اختیاری میں اٹھا اور ایک تنویم زدہ معمول کی طرح باہر کی سمت چل پڑا۔ سکینہ نے اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور فرش پر تھوک کر بولی۔ ''آخ تھو! سماج کے نام نہاد ٹھیکیدارو، فیصلہ کرو کہ اصل پاکھنڈی کون؟''

خدا بخش خاموشی سے باہر نکل گیا مگر اس کے کانوں میں سوال کی گونج بازگشت کر رہی تھی۔ اپنی غلطی سدھارنے اسلامی حکم پر قائم رہنے کے لیے وہ دو جوڑی پھولوں کے کنگن لے کر جا رہا تھا، یہ سوچتا ہوا کہ انصاف قائم کرنا بھی عاقبت کی کنجی ہے۔''

UUNOVELS.COM

کسی بھی مصور کے لیے جو اپنے فن میں مہارت رکھتا ہو کسی کی تصویر بنانا مشکل اور دشوار نہیں ہوتا کیونکہ یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ بعض تصویریں جلد اور آسانی سے بن جاتی ہیں اور بعض کچھ وقت لیتی ہیں۔ اس پر توجہ اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ آج جو تصویر میں نے مکمل کی تھی اسے مکمل کرنے کے بعد اس کا بڑی دیر تک ناقدانہ نظروں سے جائزہ لیتا رہا تھا۔ اسے ہر زاویے سے پرکھا تھا۔ ایک جوہری کی طرح جانچتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس تصویر

انوکھی خواہش

محترم مدیر
السلام علیکم!
زیرِ نظر سچ بیانی میرے ایک دوست کی ہے۔ یہ سارا واقعہ اس کے ساتھ رونما ہوا ہے۔ اس کہانی کے سارے کردار زندہ ہیں۔ وہ بچہ بھی جس نے اس کہانی کو صفحۂ قرطاس پر سجانے کی ترغیب دی۔ میں نے صرف اس کہانی میں رنگ بھرنے کے لیے کرداروں کے نام اور پیشے بدلے ہیں۔ اُمید ہے میری یہ پہلی ہی تحریر آپ کو پسند آئے گی اور مستقبل میں بھی موقع دیں گے۔

زوہیب احمد
(کراچی)

UUNOVELS.COM

میں کوئی نقص رہ جائے اس لیے کہ میں نے اس تصویر کو مکمل کرنے لیے کوئی بیس راتیں جاگ کر بڑی محنت سے بنائی تھی۔ میں نے کبھی کسی تصویر پر اتنی محنت نہیں کی تھی اور نہ ہی اتنا وقت صرف کیا تھا۔ میں اس تصویر کو شاہکار بنانے پر تل گیا تھا جیسے میں انٹرنیشنل پرائز لینا چاہتا ہوں۔

یہ تصویر میری پچھلی تمام تصویروں کے مقابلے میں سب سے بہتر تھی کیوں کہ میں نے ایک سے ایک تصویریں بنائی تھیں لیکن مجھ سے کبھی ایسا شاہکار تخلیق نہیں ہوا تھا۔ میں ایک انجانی مسرت سے دوچار تھا۔ میں نے کبھی کسی بھی تصویر کے مکمل ہو جانے پر ایسی خوشی محسوس نہیں کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے دنیا کی انمول دولت پالی ہو۔ میری روح بھی سرشار تھی۔ میں نے سوچا کہ صنوبر کو بھی یہ تصویر دکھا کر اپنی خوشی میں شریک کرلینا چاہیے۔ اس دنیا میں صنوبر ہی ایک ایسی ہستی تھی جو میری تصویروں کی سب سے بڑی مداح اور قدر دان تھی اور میری خداداد صلاحیتوں کی معترف اور پرستار تھی۔ میں سب سے پہلے اپنی تصویر اسے اس لیے بھی دکھاتا تھا کہ اگر اس میں کوئی خاص نقص یا کمی رہ گئی ہو تو مجھے بتا دے۔ وہ کھل کے اس لیے تنقید کر دیتی تھی کہ وہ ایک اچھی اور باصلاحیت مصورہ رہ چکی تھی۔ وہ مصوری کے فن اور اس کی باریکیوں کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ میں نے ایسی قابلیت بہت کم مصوروں میں پائی تھی۔ میں اس کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا اور عظیم ترین فنکار تھا... اس لیے کہ وہ مجھ سے اور میرے فن سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ میں آج تک اس کی بے پایاں محبت کا اندازہ لگا نہیں سکا تھا۔ اس میں میرے لیے جنون تھا۔ محبت کا اندھا جنون جو صرف عورت میں ہوتا ہے۔

اس کی اس قدر دانی نے مجھے اس قدر متاثر کیا تھا کہ میں نے اسے اپنی شریکِ حیات بنا لیا تھا میری زندگی میں آنے کے بعد اس نے مصوری سے کنارہ کشی کرلی تھی۔ اپنا برش، کینوس اور رنگ مجھے سونپ دیے تھے۔ سہاگ کی پہلی رات اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''خیال صاحب! اب میں بھی کوئی تصویر نہیں بناؤں گی۔''

''وہ کس لیے؟'' میں نے پوچھا تھا۔ ''میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا۔ میری طرف سے تمہیں پوری پوری اجازت ہے۔''

''اس لیے کہ آپ میری منزل مراد ہیں۔ اب میں کیوں اور کس لیے مصوری کروں؟ ویسے بھی میں ایک عام سی مصورہ ہوں۔''

صنوبر ایک اچھی مصورہ تھی۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ مصوری کرتی رہے جب کبھی میں اصرار کرتا تو وہ ہنس کر کہتی تھی۔ ''ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ آپ تصویریں بناتے رہیے۔ میں گھر بناتی رہوں گی۔''

صنوبر نے یہ غلط بات نہیں کہی تھی کیونکہ مصوری ایک ایسا شوق اور جنون ہے کہ اس میں بڑا وقت لگتا ہے۔ بڑی توجہ، عرق ریزی کے ساتھ انہماک بھی ضروری ہے۔ میاں بیوی دن رات اگر مصوری میں لگے رہے تو زندگی اور گھر کا کاروبار کیسے چلے؟ صنوبر کا گھر سنبھالنا بے حد ضروری تھا اس لیے صنوبر نے گھر کی ذمے داری بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لی۔ میں چونکہ والدین، بھائی اور بہن سے محروم تھا اس لیے زندگی میں بڑی بے ترتیبی اور بدنظمی تھی۔ صنوبر نے گھر کو کیا سنبھالا اس نے میری زندگی کو بھی سنوار دیا۔ وہ ایک بہترین شریکِ حیات ہی نہیں، خوب سیرت، سگھڑ اور سلیقہ مند بھی ثابت ہوئی۔ اوپر والے سے بڑا مصور بھلا کون ہو سکتا ہے۔ اس نے صنوبر کو ہر طرح سے خوب صورت و انمول اور لطیف بنایا تھا۔ میری ویران زندگی میں بہار آ گئی تھی اور میں اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ مجھے صنوبر کی صورت میں ایک نایاب اور قیمتی ہیرا ملا ہے۔ ہم دونوں کا جوڑ ہر لحاظ سے مثالی تھا۔ میں صرف ایک اچھا مصور ہی نہیں بلکہ ایسا خوب صورت و وجیہہ اور دراز قد مرد تھا جو لڑکیوں کے تصوراتی محبوب ہوتے ہیں۔ صنوبر مجھے پا کے نہ صرف بہت خوش تھی بلکہ سرشار بھی۔ اس کی محبت و خود سپردگی اور والہانہ پن مجھے نہال کر دیتا۔

جب ہماری شادی کو دو برس بیت گئے تو صنوبر نے مجھے ایک چاند سے بیٹے کا باپ بھی بنا دیا۔ نوزائیدہ بچے یوں تو بہت پیارے، خوب صورت اور ماں باپ کی آنکھوں کا تارا ہوتے ہیں لیکن کچھ بچے غیر معمولی طور پر خوب صورت ہوتے ہیں۔ ہمارا بچہ بھی قدرت کا ایک انمول اور بے مثال شاہکار تھا۔ وہ اتنا پیارا اور خوب صورت تھا کہ جو دیکھتا اس کی تعریف اور پیار کیے بغیر نہیں رہتا۔ وہ ہماری قسمت پر رشک کرتا اور پھر وہ بڑے خلوص اور محبت سے دعائیہ کلمات ادا کرتا کہ اسے زمانے کی نظر نہ لگے۔ خدا اسے آفات، بدنظر اور مصائب سے محفوظ رکھے۔ بوڑھی عورتیں اسے دیکھتے ہی اس کی بلائیں لیتی تھیں اور درود شریف پڑھ کے اس پر پھونک دیتی تھیں۔ ہم اللہ کا ہر وقت

UUNOVELS.COM

شکر ادا کرتے کہ اس نے جنت کا پھول عطا کر دیا تھا۔ اس کی خوشبو ہمیں معطر کرتی رہتی تھی۔ ہم دونوں کو یہ نام بہت پسند تھا۔

ہم دونوں نے اتفاق رائے سے بچے کا نام ثناء اللہ رکھا۔ آج کل جو نام رکھے جا رہے ہیں ان میں سے ہمیں کوئی پسند نہیں آیا تھا۔ ثنا کے دو برس بعد بتول پیدا ہوئی۔ وہ بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ قدرت کا نادر شاہکار۔ قدرت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم تھی۔ یہ قدرت کی مہربانی تھی ورنہ ثناء اللہ اور بتول کو تو کسی شاہی خاندان میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ قدرت نے اپنے کارخانے سے ان نادر شاہکاروں کو مجھ قلاش آرٹسٹ کے گھر اتار کے بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ ایک طرح سے ہمارے لیے یہ بڑی آزمائش تھی۔ ہم میاں بیوی بڑے صابر و شاکر اور قناعت پسند واقع ہوئے تھے۔ اللہ پر توکل کرتے تھے۔ ہم نے کسی حال میں بھی اللہ کی ناشکری، ناقدری اور نافرمانی نہیں کی تھی۔ ان دو پھولوں کی وجہ سے گھر کی فضا ہر وقت مہکتی رہتی تھی۔ یہ دونوں ہمیں اس قدر عزیز تھے کہ ہم ان کی وجہ سے اپنا ہر دکھ اور ساری احساس محرومی فراموش کر دیتے تھے۔ یہ چاند کے ٹکڑے ایک طرح سے ہمارے لیے دولت بھی ہیں۔ ایک ایسی دولت جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

میں نے تصویر کی نوک پلک درست کرنے کے بعد اپنا سارا سامان سمیٹا۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں نے تمام بتیاں گل کر دیں اور اسٹوڈیو کا دروازہ بند کر کے خواب گاہ میں آ گیا۔ دودھیا رنگت کا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ صنوبر پلنگ پر دونوں بچوں کو لیے سو رہی تھی۔ سوتے میں اس کے ریشمی سیاہ بال اس کے عارض پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا چاند چہرہ بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ پلکوں کے دریچے بند کیے خوابوں کی وادی میں گھوم رہی تھی۔ جی میں آیا کہ اس کے چہرے پر جھک جاؤں۔

میں نے سوچا کہ کیا میں اپنا شاہکار دکھانے کے لیے اسے جگا دوں؟ وہ کہتی تھی کہ رات کتنی ہی کیوں نہ ہو میں اسے جگا دیا کروں۔ وہ میری مکمل تصویر دیکھنے کے لیے بے چین ہوتی تھی۔ نہ جگانے کی صورت میں صبح شکایت کرتی اور روٹھ جاتی تھی لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی نیند خراب کروں۔ میں کمرے میں رکھی اکلوتی کرسی پر بیٹھ کر اس حسن مجسم کو دیکھنے لگا۔ وہ آج بھی شادی سے پہلے کی طرح حسین اور سولہ برس کی دوشیزہ لگ رہی تھی۔ رات کے فسوں اور دودھیا نائٹ بلب کی روشنی میں اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ وہ سو رہی تھی لیکن اس کا حسن جاگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ ممتا کا نور تھا۔ میں نے بڑے کرب اور دکھ سے سوچا۔ ”کاش! یہ کسی بڑے گھرانے کی بہو ہوتی، میں تو کسی بھی لحاظ سے اس کے قابل نہیں ہوں۔ صرف ایک مصور ہوں۔ ایک فنکار ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ میری فنکاری کس کام کی؟ کتنا کما پاتا ہوں۔ بیوی بچے، آسائش و راحت کے طلب گار ہوتے ہیں اور میں اتنا کچھ فراہم نہیں کر پاتا تھا۔ صنوبر کتنی بدنصیب ہے۔

میں آج کی رات بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ رات میں جب بھی اسٹوڈیو سے خواب گاہ میں آتا تو فوراً ہی سونے کے لیے بستر پر نہیں جاتا تھا، چاہے کتنا ہی تھکا ہوا ہوں۔ اس اکلوتی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ آج بھی بیٹھ کے بیوی بچوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ میرے دونوں بچوں کے نیچے آرام دہ بستر تھا اور نہ ہی ان کے جسموں پر اچھا لباس تھا۔ وہ اچھی غذا اور کشادہ ہوادار مکان سے بھی محروم تھے۔ یہ تین کمروں کا کوارٹر ایک پس ماندہ علاقے میں تھا۔ ہر کمرا جیل کی کال کوٹھڑی کی طرح تھا۔ صرف دو کمرے استعمال میں تھے۔ ایک کمرے کو میں نے اسٹوڈیو بنا رکھا تھا۔ شہزادوں جیسے بچے کیسے بدنصیب تھے۔ ان کی بدنصیبی پر دل کڑھتا تھا اور سینہ کٹ کے رہ جاتا تھا۔

لیکن اس گھر میں صنوبر بہت خوش تھی مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اگر یہ رسمی اور دکھاوے کی خوشی ہوتی تو اس کا رنگ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہتا۔ محبت کے بول پر کون کب تک جیتا ہے، خصوصاً ایک عورت جو آسودگی اور فراغت کی تمنائی ہوتی ہے۔ صنوبر نے کبھی کسی بات کا شکوہ نہیں کیا۔ وہ فرمائش بھی نہیں کرتی تھی۔ میں نے اسے جس حال میں رکھا تھا وہ اس حال میں اسی طرح خوش تھی جیسے کوئی خوش قسمتی کے در کھلنے پر شاداں ہوتا ہے۔ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔ میں نے کبھی اس کے سرخ و گداز ہونٹوں کو مسکراہٹ سے محروم نہیں دیکھا تھا۔

میں ادھر دو تین مہینے سے بڑی تنگدستی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ ضروریات ایسی تھیں کہ وہ پیسوں سے ہی پوری ہو سکتی تھیں۔ میری تنخواہ مہنگائی کے عفریت کے سامنے سکڑ کے رہ گئی تھی۔ میں دفتر سے پیشگی رقم لینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ہر ماہ اس میں سے کٹوتی ہوتی اور گھر کے اخراجات متاثر ہو

UUNOVELS.COM

جاتے۔ اس کمی کو پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں قرض لینے کا قائل نہیں تھا لیکن مجھے قرض کون دیتا؟ میری مالی حیثیت سے میرے دوست احباب بھی واقف تھے۔

آخر میں نے دو تین دن کے بعد اپنی تصویروں کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں ایک گمنام آرٹسٹ تھا۔ میری شہرت محدود تھی۔ میں کبھی شہرت کے پیچھے نہیں بھاگا تھا اور نہ اس کے لیے کوئی کوشش کی تھی۔ تصویر کشی جزوقتی ذریعہ معاش تھا۔ کیوں کہ میرا کوئی باقاعدہ ٹھکانا نہیں تھا، اس لیے کام برائے نام ہی ملتا تھا۔ میں نے کچھ لوگوں کو اپنی تصویریں دکھائی تھیں۔ وہ فن کے قدردان نہ تھے بلکہ خالص کاروباری لوگ تھے۔ وہ سودے بازی کرتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ میں کتنا مجبور اور پریشان حال ہوں۔ وہ میری مجبوری اور پریشانی کا اندازہ مجھے دیکھتے ہی کرلیا کرتے تھے۔ میری ضرورت کے پیشِ نظر میری تصویروں کو ردی کے بھاؤ خریدنا چاہتے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس بازار میں فن اسی طرح خریدا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے جو دام لگائے، سن کر میں دل برداشتہ ہوگیا تھا کیونکہ یہ تصویر کے نہیں ردی کے دام تھے۔ کینوس اور جو رنگ استعمال ہوئے تھے ان کی آدھی قیمت بھی نہ تھی۔

میں نے سوچا کہ ان تصویروں کو کوڑیوں کے مول بیچنے سے تو بہتر ہے کہ انہیں آگ لگادوں یا پھر کسی فن شناس کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کردوں۔ کم از کم میری تصویریں اور محنت ضائع ہونے کی بجائے اس کے کمرے کی زینت تو بنی رہیں گی۔

آج ایک شخص نے تمام تصویریں خریدنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس نے فی تصویر تین سو روپے قیمت لگائی تھی۔ یہ قیمت سن کے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ جی میں آیا کہ یہ تصویریں اس کے سامنے پھاڑ دوں اور دھکے دے کر گھر سے نکال دوں مگر میری یہ جذباتی حرکت مناسب نہیں تھی۔ وہ میری مجبوری اور ضرورت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔ اسے یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ کل بتاؤں گا۔

میں صنوبر سے اس پیش کش کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس تصویر کو مکمل کرنے میں ایسا مصروف رہا کہ صنوبر میرے لیے دو تین بار چائے لے کر آئی۔ تب بھی اس کی پیشکش کے بارے میں بتانا یاد نہیں رہا۔ ذہن سے نکل گیا تھا۔ اب یاد آیا تو وہ گہری نیند میں غرق تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ کے اس کے حسن میں ایسا کھویا کہ جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ تب وہ اچانک بیدار ہوگئی۔

''آپ ابھی تک سوئے نہیں؟'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا اور بہت ہی آہستگی سے بولی۔ ''کہیں بچوں کی نیند نہ ٹوٹ جائے، تین بج رہے ہیں آپ کو صبح دفتر بھی جانا ہے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

''تمہارا یہ حسن و شباب اور گداز بدن سونے کہاں دے رہا ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا تو لہجے میں شوخی تھی۔ ''دل پر قیامت ڈھا رہا ہے۔''

''چائے کی طلب ہو رہی ہے تو چائے بنا لاؤں؟'' وہ سرخ ہو کر بولی۔ ''آپ تصور میں شاعر کب سے ہوگئے؟''

''جب سے تمہیں دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کاش! میں شاعر ہوتا۔ تمہارے حسن کی تعریف میں تین چار دیوان لکھ مارتا۔ چائے سے زیادہ اس وقت طلب حسن ہو رہی ہے۔''

وہ حیا آلود ہوگئی جس نے اس کا حسن اور نکھار دیا۔ اس نے موضوع بدلا۔ ''کیا تصویر مکمل ہوگئی؟''

''دیہاتی عورت اور بچے کی تصویر ابھی ابھی مکمل ہوئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آخر میں نے اسے مکمل کر کے ہی دم لیا، اس لیے اتنی دیر ہوگئی۔''

''تصویر کیسی بنی ہے؟'' صنوبر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں اشتیاق اور تجسس تھا۔

''تم تصویر دیکھو گی تو نہ صرف جھوم اٹھو گی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''داد دیے بغیر نہیں رہو گی۔''

''آپ کی کون سی ایسی تصویر ہے جو لاجواب نہیں ہے اور میں نے اس کی داد نہ دی ہو؟'' صنوبر کہنے لگی۔ ''ہر تصویر بے مثال اور شاہکار ہوتی ہے اس لیے کہ آپ اسے اپنے خونِ جگر سے سینچتے ہیں۔''

''آج شام ادریس صاحب آئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں بتانا بھول گیا اس لیے کہ اس وقت تم بچوں کے ساتھ پڑوس میں تھیں۔''

''ادریس صاحب؟'' وہ بولی۔ ''انہوں نے تصویریں دیکھ کے کیا فرمایا؟ ان کی دکان ہے شاید؟''

''ہاں جی، وہی ادریس صاحب۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''انہیں میری تصویریں بہت پسند آئیں اور وہ تمام

UUNOVELS.COM

تصویریں خریدنے کے لیے تیار ہیں۔"

"انہوں نے تصویروں کے کیا دام لگائے؟" اس کے حسین چہرے پر سایہ پھیل گیا۔ وہ اٹھ بیٹھی اس نے لباس کو درست کیا اور اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹ کے جوڑا بنایا۔ "کہیں وہ بھی ردی کے بھاؤ تول کر خریدنا تو نہیں چاہتے؟"

"نہیں...... ان کی پیشکش دوسروں کے مقابلے میں بہت مناسب ہے۔" میں نے بتایا۔

"انہوں نے کیا پیشکش کی ہے؟" اس کا اشتیاق بڑھ گیا۔ "آپ کے خیال میں کیا وہ قبول کی جا سکتی ہے؟"

"چونکہ میں ان کی پیشکش کے بارے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا تھا اس لیے ان سے کہہ دیا کہ کل جواب دوں گا۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے فی تصویر تین سو روپے قیمت لگائی ہے۔"

"صرف تین سو روپے؟" اس کا چہرہ لٹک گیا لہجہ بے جان سا ہو گیا تھا۔ آواز میں دکھ بھر گیا۔ "صرف تین سو روپے؟ جانی! یہ تو بہت ہی کم ہیں۔ ان کے تو فی دو ہزار روپے بھی کم ہیں۔ یہ مناسب قیمت تو نہیں ہوئی؟"

"دو ہزار روپے......" میں ہنسا۔ میری ہنسی میں دکھ اور کرب نمایاں تھا۔ میرا لہجہ ٹوٹ کے رہ گیا۔

"اس میں ہنسنے اور حیرت کی کیا بات ہے؟" اس نے پلکیں جھپکائیں۔ "آپ اتنے دکھی کیوں ہو رہے ہیں؟"

"میں نے خواب میں بھی اپنی کسی تصویر کی اتنی قیمت نہیں پائی۔" میں نے کہا۔ "مجھے اب تک جو پیشکش وصول ہوئیں ان میں یہ سب سے اچھی اور مناسب پیشکش ہے۔ وہ تصویریں کم از کم ردی کی طرح تول کے تو نہیں لے رہے ہیں۔"

"ہاں...... یہ تو ٹھیک ہیں۔" اس نے سر ہلا دیا اس کا لہجہ اور چہرہ بجھا ہوا تھا۔ "آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"سوچ رہا ہوں کہ ان سے سودا کر لوں۔" میں نے جواب دیا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سودا بھی ہاتھ سے نکل جائے؟"

"تصویروں کو کوڑیوں کے مول بیچ کے آپ...... آپ کریں گے کیا؟" اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔

"کروں گا کیا؟ کس لیے تصویریں بیچنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ تمہارے بچوں کے

بچپن

البیرونی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ آتش پرستوں کا دور تھا۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں آتش کدے بنے ہوئے تھے۔ زرتشت کی تعلیمات عام تھیں۔ مسلمان اقلیت میں تھے لیکن حکومت انہی کے ہاتھوں میں تھی گویا ہندوستان کا نقشہ تھا کہ اکثریت ہندوؤں کی حکومت مسلمان اقلیتوں کی۔ حکومت اور اقتدار ہی کی وجہ سے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود بے خوف خطر اپنے عقیدے پر قائم رہ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک ابوریان بھی تھا جو ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا تھا لیکن علم حاصل کرنے کا بے پایا شوق اسے قدرت کی طرف سے ملا تھا۔ اس وقت خوارزم کی ریاست پر احمد بن محمد بن عراق کی نسبت سے جس خاندان کی حکمرانی تھی وہ آل عراق کہلاتا تھا۔ احمد کا چچا زاد بھائی امیر ابونصر منصور علمی مزاج رکھتا تھا۔ اس نے البیرونی کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور اسے حصول علم میں ہر ممکن سہولت پہنچائی چنانچہ البیرونی اپنی تصانیف میں منصور کو استاذی کے لقب سے یاد کرتا ہے اور اس کا نام عقیدت و احترام کے ساتھ لیتا ہے۔ منصور ہی نے البیرونی کو اقلیدس کی جیومیٹری اور بطلیموس کی فلکیات کے ابتدائی درس دیے تھے۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقراستی۔ کراچی

جوتے کپڑے بن جائیں۔ دودھ والے کا حساب بے باق ہو جائے۔ ادھر مکان کا کرایہ بھی چڑھا ہوا ہے، وہ بھی اتر جائے اس میں سے شاید کچھ رقم بھی پس انداز ہو جائے۔ تم ایک جوڑا خرید لینا۔"

"نہیں میرے سرتاج! ہرگز نہیں۔" اس نے بچوں کے جاگ جانے کے خیال سے آہستہ سے کہا۔ "یہ شہ پارے ہیں۔ ان شہ پاروں کو آپ خدا کے لیے کوڑیوں کے مول نہ بیچیں۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے صنوبر۔" میں نے ایک گہری سانس لے کے دکھ سے منجمد آنکھوں میں جھانکا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ "میں کتنے مہینوں سے کتنی کوشش کر رہا ہوں۔ کیا کیا نہیں کیا۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ میں تمہیں تو بتا بھی چکا ہوں کہ کوئی دو سو روپے بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہے اس لیے میں نے

UUNOVELS.COM

فیصلہ کرلیا ہے کہ ان تصویروں کو تین سو روپے فی کس فروخت کردوں۔ اب میں مزید خوار ہونا نہیں چاہتا۔''

صنوبر بستر سے اٹھ کر کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں پھر اس نے آہستگی سے دریافت کیا۔ ''کل کتنی تصویریں ہیں جنہیں آپ بیچنا چاہتے ہیں؟''

''تصویریں تو چالیس سے زائد ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ان میں سے صرف 36 بیچ رہا ہوں اس طرح سات ہزار دو سو روپے مل جائیں گے۔ کیا یہ رقم کافی نہیں ہے؟''

وہ کرسی سے اٹھ کے میرے سامنے کھڑی ہوگئی اور میرے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے بولی۔ ''اگر آپ نے اس قیمت میں ان تصویروں کو بیچنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر تمام تصویریں میرے ہاتھ بیچ دیں۔''

''کیا کہا؟ تمہارے ہاتھ؟'' میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ''36 عدد تصویریں تم خریدو گی؟''

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعی بے حد سنجیدہ تھی۔ سچائی اس کے لہجے اور آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ میں نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔ ''تم کہاں سے اور کیسے خریدو گی صنوبر؟ تمہارے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔''

''آپ کو اس سے کیا مطلب؟'' اس کے رسیلے ہونٹوں پر تبسم ابھر کے بکھر گیا۔ ''آپ صرف ہاں کردیں۔''

''تو کیا تم کل ان تصویروں کو کہیں لے جا کے فروخت کرنے کی کوشش کرو گی؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایک انوکھا سا تبسم اس کے شیریں لبوں پر رقصاں تھا۔ ''مجھے کیا ضرورت پڑی کہ خوار ہوتی پھروں۔''

''پھر۔'' میری حیرت دوچند ہوگئی۔

''پھر یہ کہ میں ان تصویروں کی قیمت ابھی اور اسی وقت ادا کرسکتی ہوں؟ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔''

''اچھا!'' میں اب بھی حیران تھا۔ ''کیا تمہارے ہاتھ الہ دین کا چراغ لگ گیا ہے؟ یا پھر کوئی انعامی بانڈ لگ گیا ہے؟ لیکن ہمارے پاس تو کوئی انعامی بانڈ بھی نہیں تھا۔ سات ہزار دو سو کی رقم بنتی ہے۔''

''جی ہاں۔ میں نے حساب کرلیا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ سودا منظور ہے یا نہیں؟'' وہ شگفتگی سے بولی۔

''منظور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا پوری رقم ابھی ادا کردو ادھار بالکل نہ ہوگا۔'' میں نے مذاق کیا۔

میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہا تھا کہ دیکھوں تو سہی وہ اتنی بڑی رقم کیسے ادا کرتی ہے۔

وہ مسکراتی ہوئی الماری کی طرف بڑھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ الماری کا دروازہ بند کر کے واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ہزار کے پانچ اور سو سو کے نئے نوٹ تھے۔ اس نے رقم گن کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی کچھ نوٹ باقی تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دو ڈھائی ہزار سے زیادہ ہوں گے۔ شاید اس کے پاس دس ہزار کی رقم تھی۔

میں پلنگ پر بیٹھ کے رقم گننے لگا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کے بولی۔ ''حساب سے سات ہزار دو سو روپے بن رہے ہیں۔ میں آپ کو تین سو روپے زیادہ دے رہی ہوں۔ آپ ساڑھے سات ہزار لے لیں۔ اب یہ تصویریں میری ملکیت ہیں۔''

''ہاں وہ تمہاری ملکیت ہیں لیکن یہ تو بتاؤ کہ آخر اتنی بڑی رقم تمہارے پاس آئی کہاں سے ہے؟'' میں نے رقم گننے کے بعد اس سے پوچھا۔ ''یہ رقم کب سے تمہارے پاس ہے۔ پہلے تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ آخر کیوں؟''

''آج میں نے اپنی سونے کی چوڑیاں بیچ دیں۔ وہ چوڑیاں دس ہزار روپے میں بک گئیں۔'' وہ نظریں نیچی کر کے بولی۔

''کیا...... !! تم نے چوڑیاں بیچ دیں؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' میں ششدر رہ گیا۔ ''وہ کس لیے؟''

''اس لیے کہ کہیں آپ ان شہ پاروں کو کوڑیوں کے دام نہ بیچ دیں۔'' صنوبر نے دبی زبان سے جواب دیا۔

''مگر تم نے یہ بھی سوچا کہ تمہارے سہاگ کی نشانی تھیں؟'' میری آواز تیز ہوگئی۔ ''عورت کی زندگی میں وہ یادگار رات ہوتی ہے یہ تم نے اچھا نہیں کیا صنوبر۔ اب تم پچھتا رہی ہوں گی؟''

''چوڑیوں کا کیا ہے وہ پھر بن جائیں گی؟'' وہ بڑے اطمینان سے بولی اور مجھے دلاسا دیا۔ ''لیکن ایسے شہ پارے بار بار نہیں بنتے۔''

میں اپنی آواز اور غصے پر قابو نہ پا سکا۔ ''بن جائیں گی...... بن جائیں گی۔''

UUNOVELS.COM

بچے سو رہے تھے ان کا بھی خیال نہیں کیا۔

''یہ بات تم نے زیور بیچتے وقت ہمیشہ کہی تھی کہ اللہ نے چاہا تو حالات جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ زیورات کا کیا ہے پھر بن جائیں گے؟ کہاں بنے زیورات؟ یہ بھی بک گئیں آخر، میں تمہارے بچوں کے کپڑے نہیں بنا سکتا۔ زیورات کیسے بنا سکوں گا؟''

''آپ اس قدر برہم کیوں ہو رہے ہیں؟'' اس نے بڑے پیار سے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔

''نہیں تو کیا جشن مسرت مناؤں کہ میری وجہ سے چوڑیاں بھی بک گئیں۔'' میں بپھر کے بولا۔

''ٹھنڈے دل سے سوچیں۔'' اس کی آواز بھرّانے لگی۔ ''میں نے کہا تھا کہ زیورات کا کیا ہے پھر بن جائیں گے مگر ایسی نادر تصویریں برسوں میں بھی پھر سے بن نہ سکیں گی، میں کسی قیمت پر بھی نہیں چاہتی کہ آپ کے فن کی ناقدری ہو۔ تین سو روپے کی ایک تصویر۔ یہ تو ردی کے بھاؤ ہوئی۔ اس رقم سے ہم اپنے گھر کے مسئلے حل کر لیں گے لیکن ان فن پاروں کی معقول قیمت حاصل کیے بغیر نہیں بیچیں گے۔''

''معقول قیمت؟'' میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''معقول قیمت تو ملک کے نامور مصوروں کو نہیں ملتی ہے۔ اگر ملتی بھی ہو گی تو بڑی مشکل سے۔ خریدار فن پارے نہیں مصور کو دیکھتا ہے۔ ایک تصویر کے عوض تین سو روپے جو مل رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ بڑی قیمت ہے میرے فن پاروں کی۔''

''آپ اپنا دل چھوٹا نہ کریں۔'' وہ میری پشت پر آ کر اپنی ٹھوڑی میرے کندھے پر رکھ کے بولی۔ ''میں کل ہی آرٹس سرکل والوں سے بات کروں گی۔ ان شاء اللہ آپ کی تصویروں کی نمائش آرٹ سرکل میں ہو گی۔ اخبارات میں اس کی نمائش کی خبریں شایع کراؤں گی۔ اس نمائش کو دیکھنے ہزاروں نہیں سینکڑوں تو آئیں گے۔ ان میں سب ہی ناقدرے تو نہیں ہوں گے۔ کچھ قدر دان بھی نکل آئے تو آپ کی تصویروں کے اچھے دام تو مل جائیں گے پھر ہمارے سارے دلدر ایک ایک کر کے دور ہو جائیں گے۔''

پھر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا تو کسمسائی بچوں کی طرف دیکھا پھر اس کا چہرہ سامنے کیا۔ اس کے چہرے پر ایک دل فریب سی دمک تھی اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں افق تا افق جیسے ہزاروں طاقت ور برقی قمقمے روشن تھے۔ ہونٹوں پر ایک انجانا سا تبسم بکھرا ہوا تھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں باہم پیوست ہوئیں تو میں اس کے چہرے پر جھکنے لگا۔ اس نے حیا آلود ہو کر کسی دلہن کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔

☆......☆

کئی دن کی دوڑ دھوپ اور ایک آرٹسٹ دوست کی کوششوں اور اثر و رسوخ سے آرٹس سرکل میں میری تصویروں کی نمائش منعقد ہو گئی۔ یہ میرے لیے بڑی خوشی اور اعزاز کی بات تھی۔ مجھ سے کہیں زیادہ صنوبر سرشار تھی۔ ایک دیرینہ آرزو اور خواب پورا ہو گیا تھا۔ میرے ایک کرم فرما نے اس نمائش کی افتتاح کے لیے ایک بہت بڑے نامور مصور کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا تھا جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اخبارات نے اس مصور کی وجہ سے اس نمائش کی خبر کو پہلے صفحے پر نمایاں طور پر شایع کیا تھا ورنہ مجھے کون جانتا تھا۔ میری شہرت بڑی محدود تھی۔ بڑے بڑے مصوروں کو میرے نام کا علم تک نہ تھا۔

افتتاح والے دن مجھے ایسا لگا جیسے میں جاگتے میں سہانا خواب دیکھ رہا ہوں۔ آج یہ دن جو آیا تھا اس میں صنوبر کی حوصلہ افزائی اور کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ میں اس کا مرہون منت تھا۔ پہلے دن میری توقع سے کہیں زیادہ لوگ آئے تھے۔ گیلری لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ان میں مصور بھی تھے اور فن شناس بھی۔ مردوں کے مقابلے میں نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کی کثرت تھی۔ ان میں زیادہ تر کا تعلق امیر گھرانوں سے تھا۔ دولت مند لوگ فیشن اور دکھاوے کے طور پر حصہ لیتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کو بڑا باذوق اور فن شناس ثابت کرتے ہیں۔ تصاویر خرید کے اپنے گھروں، خواب گاہوں، نشست گاہوں اور دفتر میں سجاتے

شمارہ مارچ 2020ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆ اول: فراری......زین مہدی (کراچی)

☆ دوم: خالی......کامران چودھری (لاہور)

☆ سوم: ع ش ق......علی عمران ممتاز (ملتان)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ہیں تاکہ خوب صورتی میں بھی اضافہ ہو۔

میں آرٹس سرکل اس وقت ضرور آتا تھا جب کسی مصور کے فن پاروں کی نمائش ہوتی تھی کیونکہ یہ تصویریں رہنمائی کرتی تھیں اور فن کو جلا بخشتی تھیں۔ فن کار کے لیے دوسرا فنکار استاد ہوتا ہے۔ میں نے بڑے مصوروں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ انہوں نے میرے اندر گہرائی اور گیرائی پیدا کی تھی۔ استاد اللہ بخش کی تصویریں میرے دل کے نہاں خانوں میں نقش تھیں۔ میرے خیال میں ملک میں شاید ہی کوئی اس پائے کا مصور پیدا ہوا ہو۔ وہ نہ صرف قابل احترام بلکہ عظیم مصور تھے۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ میرا فن کیسا ہے؟ کیا میں ایک اچھا مصور ہوں؟ صنوبر کے علاوہ میرے وہ دوست جو سراہتے اور تعریف کرتے ہیں اس میں کتنی صداقت ہے۔

مجھے اس وقت بے پناہ مسرت ہوئی تھی جب ملک کے ایک بڑے مصور نے بڑی ایمان داری اور دیانت داری سے ان الفاظ میں سراہا تھا۔

''جب میرے ایک دوست نے مصور ابن خیال کے بارے بتایا کہ ان کی تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے جس کا افتتاح آپ کو کرنا ہے۔ تب میں نے سوچا تھا کہ یہ کوئی عام سے مصور ہوں گے۔ میں ایک مصور ہونے کے ناتے ہر مصور کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ فن کار چھوٹا بڑا نہیں ہوتا، اس کا فن اسے چھوٹا بڑا بناتا ہے۔ ہر فن کار جب کوئی تصویر بناتا ہے تو بڑی محنت اور عرق ریزی کرتا ہے، اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی تخلیق بے مثال ہو، فن مصوری میں کمال حاصل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ابن خیال ایک بڑے مصور ہیں۔ میں حیران ہوں کہ اتنا بڑا مصور اب تک گم نام کیوں رہا؟ اس کی پذیرائی کیوں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے فن پاروں نے مجھے بڑا متاثر کیا۔''

انہوں نے میرے فن کی جو تعریف کی تھی، اسے سن کے میں پھولا نہیں سمایا۔ اس تعریف نے مجھے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ ذرّے کو آفتاب بنا دیا تھا۔ میں ہر کسی کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ میری عزت میں بے پناہ اضافہ اس لیے بھی ہو گیا کہ انہوں نے مجھے اسٹیج پر بلا کر میرے ہاتھ چوم لیے اور کہا تھا کہ آپ نہ صرف عظیم ہیں بلکہ فن مصوری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ مجھے وہ عزت اور پذیرائی ملی تھی جس کا میں مستحق تھا جس سے میں اب تک محروم تھا۔

صنوبر بھی پہلے دن بچوں کے ساتھ اس افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے آئی تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ میری تصویروں کی کیسی قدر اور پذیرائی ہوتی ہے۔ آخر وہ کیوں نہ آتی۔ اس کی قربانی اور کوششوں سے تو یہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔

کوئی مہمان کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے میرے فن پاروں کی تعریف میں زمین آسمان ایک نہ کر دیے ہوں۔ مجھے پورے خلوص، گرم جوشی اور جذبے سے مبارک باد نہ دی ہو۔ ادھر پریس فوٹو گرافروں نے میری اور میرے تمام فن پاروں کی تصویریں نہ بنائی ہوں۔ اخباری نمائندوں نے میرا انٹرویو لیا جو میرے لیے اعزاز تھا۔ ایک خواب جو میں سوتے جاگتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ آج حقیقت بن کے میری نظروں کے سامنے تھا۔ ایک اور بات بھی ہوئی تھی جس کی مجھے کوئی توقع نہیں تھی۔ وہ یہ کہ کچھ لڑکیوں عورتوں نے میرے ساتھ میرے فن پاروں کے پاس سیلفی بنائی تھی اور آٹو گراف بھی لیے تھے۔ میں اندر ہی اندر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس بے پناہ مسرت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مہمان میرے فن کی تعریف کر رہے تھے اور مجھے تین تصویروں کے عوض تیس ہزار کی رقم مل چکی تھی۔ خوشی اس بات سے ہوئی تھی کہ فن کی پذیرائی ہو رہی تھی۔ ان کی قدر دانی میرے لیے بہت بڑا صلہ تھا۔ میں ایک مصور اور فنکار کی حیثیت سے یہی چاہتا تھا کہ فن کی قدر دانی ہو۔ میں بیوی بچوں کے ساتھ گھر پہنچا تو سارے بدن میں خون جیسے رقصاں تھا۔ میری نس نس میں ایک انوکھا اور لطیف احساس بجلی کی رو بنا ہوا تھا۔ خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ صنوبر کی بھی یہی کیفیت تھی۔ فرطِ خوشی نے اسے ایسا گلنار بنا دیا تھا کہ وہ سہاگ کی پہلی رات کی طرح لگ رہی تھی۔ خوشی بھی کیا عجب چیز ہے کہ دکھ، درد اور احساس محرومی کو مٹا دیتی ہے۔ اگر بچے نہیں جاگ رہے ہوتے تو ہم دونوں پر جذباتی دیوانگی طوفان بن جاتی۔

بچے نیند میں ڈول رہے تھے۔ صنوبر نے انہیں سلا دیا اور میرے پاس آ کر بولی۔ ''عبداللہ شاہ صرف بڑے مصور ہی نہیں بلکہ عظیم انسان ہیں۔''

''تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ انہوں نے میرے فن کی تعریف اور قدر دانی میں بخل سے کام نہیں لیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''جی ہاں۔'' صنوبر نے سر ہلایا۔ ''اور پھر انہوں نے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ایک پرستار اور عقیدت کی طرح آپ کے ہاتھ چوم لے۔''

''ہاں..... ! اس بات نے انہیں ایک عظیم فن کار بنا دیا۔''

''یہ لمحات ہماری زندگی کے ناقابل فراموش بن گئے۔''صنوبر بولی۔

''کیا میں ایسے لمحات کو اس وقت بھی ناقابلِ فراموش بنا سکتا ہوں؟''

''وہ کیسے؟''صنوبر نے اپنی پلکیں جھکائیں۔

''تمہارے ہاتھ اور منہ چوم کے۔''میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کرلیا۔''ایک تو تم نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ دلاسا دیتی رہیں۔ میری تصویروں کو ردی کے بھاؤ فروخت ہونے نہیں دیا اور اپنی چوڑیاں فروخت کر کے ایثار اور قربانی دی۔ اس جذبے نے تمہیں اتنا عظیم اور بلند بنا دیا ہے کہ میں تمہیں چھو نہیں سکتا لیکن چوم سکتا ہوں۔''

وہ ایسی حیا آلود ہوئی کہ میں اسے اٹھا کے بستر پر لے گیا۔ وہ میری بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں جانتا تھا سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

☆......☆

گھر جو کل تک کاٹنے کو دوڑتا تھا آج خوشیوں کا گہوارہ لگ رہا تھا۔ در و دیوار سے بھی خوشیاں ٹپکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی رنگین خواب فضا میں بکھرا ہوا ہو۔ ماحول خواب ناک ہونے لگا تھا۔ ہمارے گھر اور زندگی میں پہلی بار بہار آئی تھی اس لیے کہ آج میں نے اپنا خواب اور منزل پالی تھی۔ میرے شب و روز کی محنت اور عرق ریزی رائیگاں نہیں گئی تھی۔ میں نے اپنے لہو سے جو چراغ جلایا تھا آج اس نے ہماری زندگی کو منور کر دیا تھا اور اندھیرے اس کی آغوش میں سما گئے تھے۔

''اللہ صبر کا پھل کیسا میٹھا دیتا ہے۔''صنوبر نے کہا۔ ''اس نے آج ہمیں کیسا نوازا ہے۔ ہم اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔''

''ہاں صنوبر!''میں نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔''

آج کی رات گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔ ہم دونوں پر ایک عجیب سا سحر طاری تھا اور اس کا اثر آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ رات خمار آلود ہونے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے آج شادی کی پہلی رات ہو۔ ہم دونوں جاگتے رہے اس لیے کہ یہ جاگنے کی رات تھی۔ بے پایاں خوشی سونے نہیں دے رہی تھی۔ بچے کب کے گہری نیند سو چکے تھے۔ ہم باتیں کرنے، خواب دیکھنے اور تابناک مستقبل کے منصوبے میں ایسے کھو گئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی۔

☆......☆

میری تصویروں کی نمائش ایک ہفتے کے لیے تھی۔ آج آخری دن تھا۔ آج تک میری تیس تصویریں بہت اچھی قیمت پر فروخت ہو چکی تھیں۔ صرف چھ تصویریں فروخت ہونے سے رہ گئی تھیں۔ مجھے ان کے نہ بکنے کا کوئی غم اور فکر نہیں تھی اس لیے کہ ان تیس تصویروں کی فروخت سے میرے پاس اتنی رقم آ گئی تھی کہ دو برس تک میں بڑی آسانی سے گھر چلا سکتا تھا۔ بیوی، بچوں اور اپنے لیے ملبوسات بنا سکتا تھا۔ آج بھی ایک بہت بڑی تعداد میرے فن پاروں کی نمائش دیکھنے آئی ہوئی تھی۔ میری تصویروں کی فروخت اور روزانہ لوگوں کی بڑی تعداد میں نمائش دیکھنے میں میرے صحافی دوست کا بڑا دخل تھا۔ وہ میرے لیے بڑا مخلص ثابت ہوا تھا۔ وہ میری تصویروں کے بارے میں روز ہی کوئی نہ کوئی خبر لگا دیتا تھا۔ اس کا یہ کردار میرے لیے کسی احسان سے کم نہیں تھا۔

میں آرٹ گیلری کے ایک کونے میں کھڑا نوآموز مصور لڑکوں، لڑکیوں سے فن مصوری کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا کہ ایک عورت میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ رات کی رانی کی طرح مہک رہی تھی۔ میں چونکہ ان مصوروں سے محوِ گفتگو تھا اس لیے اس کی طرف ٹھیک سے نہ دیکھ سکا اور نہ ہی توجہ دے سکا۔

معاً اس کی جانب نگاہ اٹھ گئی۔ اس وقت وہ مصور آگے بڑھ گئے تھے۔ تب میں اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوا۔ وہ تمام تر ناز و ادا کے ساتھ کھڑی میری طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک نفیس، پُرشباب گداز بدن کی جواں سال عورت تھی لیکن اس کے چہرے پر جو لطافت، شادابی اور ملاحت تھی وہ میں نے شاید ہی کسی عورت کے چہرے پر دیکھی ہو۔

چہرہ کیا تھا، چاند کا ٹکڑا تھا۔ اس مکھڑے کے تیکھے تیکھے نقش و نگار جو آنکھوں کے راستے دل میں اترتے چلے گئے۔ وہ ایک عمدہ، جامہ زیب عورت تھی۔ وہ کالی ساڑی اور اس رنگ کے سلیولیس بلاؤز میں ملبوس تھی جس کا گریبان نیچی

UUNOVELS.COM

تراش کا تھا۔ اس پرشکوہ لباس میں اس کا سراپا نہ صرف دل کش نظارہ تھا بلکہ شعلے کی طرح آنچ دے رہا تھا کہ نظریں بار بار پھسل جاتی تھیں اور مجھے اپنی نگاہوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ وہ شعلہ مجسم تھی۔

وہ اپنے چہرے اور وضع قطع سے کسی امیر گھرانے کی لگ رہی تھی۔ قدرت کے اس شاہکار کے سامنے میرے فن پارے ہیچ لگ رہے تھے۔ میں اسے محویت سے دیکھنے لگا۔ وہ مسکرائی اور نفیس انداز میں ترشے ہوئے بال سہلاتی ہوئی بولی۔

''میرے خیال میں آپ ہی ابن خیال ہیں، آپ مصور ہیں لیکن نام بڑا شاعرانہ سا ہے۔'' اس کا لہجہ شوخ ہو گیا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نظر جمانے کی کوشش کرتے ہوئے اثبات میں اسے نظروں میں جذب کرتے ہوئے بولا۔

''جی ہاں...... خاکسار کو ابن خیال کہتے ہیں لیکن اصل میں تو میرا نام کچھ اور ہے۔ میں نے یہ تخلص کسی اور خیال سے رکھا تھا۔''

اس کے بھرے بھرے گداز شیریں لبوں پر دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے اپنی گھنیری پلکیں جھپکا کے شوخی سے کہا۔

''اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو ایک بات عرض کرنے کی جسارت کروں؟''

''ایک نہیں دس باتیں کہیں۔'' میں نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ ''ہم فنکار کسی بات کا برا نہیں مانتے۔''

''آپ مصور تو بالکل بھی نہیں لگتے؟'' یہ کہہ کر وہ مسکرا دی۔

''پھر میں کیا لگتا ہوں؟'' میں نے جوابی مسکراہٹ سے پوچھا۔ ''کیا مصور اس طرح کے ہوتے ہیں۔''

''آپ تو کسی فلم کے ہیرو دکھائی دیتے ہیں۔'' وہ انوکھے انداز سے مسکرائی۔ ''پہلی نظر میں آپ کو ہیرو ہی سمجھی تھی۔''

''مگر آج تک کسی نے یہ بات نہیں کہی اور نہ میں نے سوچا۔'' میں نے کہا۔ ''جب کہ میں روز ہی آئینہ دیکھتا ہوں۔''

''حیرت کی بات ہے کہ آپ سے کسی نے نہیں کہا کہ آپ کسی ہیرو سے کم نہیں ہیں۔ اس مصوری کے پیشے میں کیا رکھا ہے۔ آپ شوبزنس میں جائیں، آج کل ٹی وی چینلو کی بھرمار ہے۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری کیا، اس میں بھی آپ کے پائے کا ایک بھی ہیرو نہیں ہے۔ بالی ووڈ میں تو آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ ہر جگہ آپ جیسے خوب صورت، وجیہہ اور دراز قد جوانوں کی مانگ رہتی ہے۔''

''آپ کی اس تعریف اور قدر دانی اور مشورے کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے ممنونیت سے کہا۔ ''میں اس بارے میں سنجیدگی سے سوچوں گا۔''

''آپ کی تو ساری اچھی تصویریں بک گئی ہیں۔'' اس نے موضوع بدلا۔ ''میں مصروفیت کی بنا پر یہاں نہیں آ سکی۔ آج آئی ہوں تو معلوم ہوا کہ باذوق لوگوں نے تصویریں خرید لی ہیں۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں نے دیر کیوں کر دی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اندازہ نہ تھا کہ ایک گم نام مصور اس قدر باکمال ہو سکتا ہے۔ میری سہیلیوں نے آپ کے فن پاروں کی اس قدر تعریف کی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی۔''

''آپ نے میری تعریف کی ہے یا میرے فن پاروں کی؟'' میرے زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

''دونوں کی۔'' اس نے بڑی سچائی سے اعتراف کیا۔ ''میں یہاں تصویریں خریدنے آئی تھی۔''

''جو تصویریں فروخت ہونے سے رہ گئیں وہ بھی بہت اچھی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ ان میں سے کوئی تصویر پسند کر لیں۔''

''وہ تصویریں یقیناً اچھی ہیں۔'' اس نے اپنا خوش نما سر ہلایا۔ ''میں آپ کی کوئی بہت اچھی تصویر خریدنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پاس اور تصویریں بھی ہوں گی اگر ہیں تو مجھے بتا دیں۔''

''میرے پاس دو تین تصویریں ایسی ہیں جو میں نے کسی وجہ سے نمائش میں نہیں رکھیں۔'' میں نے بتایا۔ ''اگر آپ چاہیں تو کسی دن میرے غریب خانے پر آ کر دیکھ لیں۔''

اس نے ایک لمحے سوچا۔ ''اچھا...... آپ اپنے گھر کا پتا دے دیں۔ میں کسی دن آپ کے دولت کدے پر ہو جاؤں گی۔'' میں نے ایک چٹ پر اپنے گھر کا پتا لکھ دے دیا۔

اس نے اپنے پرس میں میرا پتا رکھ لیا اور اپنا خوب صورت رنگین ملاقاتی کارڈ نکال کے میری طرف بڑھایا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

"میرا نام بشریٰ چودھری ہے۔ آپ کسی دن میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ رات کا کھانا ساتھ کھا لیں تو بڑی خوشی ہوگی۔"

"اس عزت افزائی کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے کارڈ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "کسی دن حاضر ہو جاؤں گا۔"

وہ بہت دیر تک میرے ساتھ رہی اور بڑی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی رہی۔ میں نے اس کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ میرے فن سے زیادہ میری ذات میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ میری وجاہت سے متاثر ہو رہی ہے۔ میں نے کبھی اپنی خوب صورتی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا نہیں تھا اور نہ کسی نے متاثر ہو کے فلمی دنیا میں جانے کا مشورہ دیا تھا۔ لڑکیاں عورتیں میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتی تھیں تو میں سمجھتا تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر دیکھتی ہیں۔ میں کسی حسین نوجوان لڑکی کو نظر بھر کے دیکھتا بھی نہیں تھا کیونکہ میں صنوبر کے علاوہ کسی اور عورت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ میں نے اس کی دلچسپی کو واہمہ سمجھ کے جھٹک دیا اس لیے کہ وہ ایک امیر کبیر شادی شدہ عورت تھی۔ وہ مجھے اور مجھ جیسے مصوروں کو ملازم رکھ سکتی تھی۔ میں اپنی حیثیت اور اوقات کو خوب پہچانتا تھا۔

پھر وہ اپنی نئے ماڈل کی مرسڈیز میں بیٹھ کے چلی گئی مگر اپنے بدن کی سوندھی خوشبو چھوڑ گئی۔ وہ ایک ایسا بے مثال پورٹریٹ تھی جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ بشریٰ نہ تو مجھ سے ملنے آئی اور نہ ہی میں اس کے گھر گیا اس لیے کہ میرا یہ ہفتہ بہت مصروف گزرا تھا۔ گھر کو ٹھیک کیا۔ رنگ و روغن کرایا۔ صنوبر کے لیے نئے زیورات خریدے، بچوں کے لیے نئے کپڑے خریدے، پرانے بوسیدہ بستروں کی جگہ آرام دہ بستروں نے لے لی، نیا فرنیچر صنوبر خرید لائی۔ غرض کہ گھر کا ہی نہیں زندگی کا بھی نقشہ بدل گیا۔

ایک مشہور آرٹ گیلری میں کراچی کے ایک ممتاز مصور کی تصویروں کی نمائش تھی۔ افتتاحی تقریب میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں پہنچا تو ایک عجیب سا سماں نظر آیا تھا۔ اس تقریب پر کسی شادی کی محفل کا گمان ہو رہا تھا۔ مجھے کبھی کسی مصور کی ایسی افتتاحی تقریب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ خواتین خوب سج دھج کے آئی تھیں۔ ان کے لباسوں سے ایسی خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں کہ فضا کو معطر کر دیا تھا۔

ماحول بڑا رنگین اور خواب ناک ہو رہا تھا۔ فضا بڑی حسین لگ رہی تھی۔ آخر کیوں نہ ہو یہ لڑکیاں بھی آخر قدرت کا شاہکار تھیں۔ وہ اپنی نمائش کے لیے بن سنور کے بڑے اہتمام سے آئی تھیں۔ انہوں نے فن پاروں کو بھی ماند کر دیا تھا۔ یہ تجریدی آرٹ کی نمائش تھی۔ میں ایک مصور ہونے کے باوجود اس آرٹ کو سمجھ نہ سکا تھا۔ یہ مغرب کی ایجاد تھی جو اب ایک فیشن بن چکا تھا۔ میں اس کے خلاف تھا لیکن پھر بھی اس نمائش کو دیکھنے آ گیا تھا۔

میں ایک تصویر کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا کہ یہ کیا ہے؟ اور جو لوگ کھڑے تھے ان کے تبصرے سن رہا تھا کہ کسی نے عقب سے مجھے پکارا۔ یہ مدھر آواز مجھے بڑی مانوس سی لگی جس نے مجھے ابن خیال کہا تھا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو بشریٰ چودھری کو اپنے سامنے اور اس کی نظروں کی گرفت میں پایا۔ آج اس نے غضب کا سنگھار کیا ہوا تھا۔ حالانکہ اس کا حسن کسی میک اپ کا محتاج نہیں تھا۔ اس کا سراپا نظروں میں جذب ہونے لگا پھر اس نے اپنے ساتھی مرد کا تعارف کرایا۔ "آپ ان سے ملیے، یہ ہیں میرے شوہر چودھری پرویز۔"

اس کے شوہر چودھری پرویز نے میری طرف دوستانہ انداز سے ہاتھ بڑھایا اور بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"ابن خیال صاحب! مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

لیکن مجھے اس سے مل کر کوئی خوشی نہ ہوئی۔

مجھے یقین نہیں آیا کہ بشریٰ شوہر کے معاملے میں بڑی بدنصیب واقع ہوئی ہے۔ اس کے شوہر کو دیکھ کے مجھے بڑا افسوس ہوا۔ اس کا اور اس کے شوہر کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ اس کا شوہر موٹا، بھدا اور پستہ قد تھا۔ گینڈا لگ رہا تھا۔ نہ صرف بے کشش تھا بلکہ اس کی رنگت بے حد سیاہ تھی کسی سیاہ فام افریقی کی طرح۔ اس پر کسی نیگرو کا دھوکا ہوتا تھا۔ اس کی ساری کشش اس کی بے پناہ دولت تھی۔ وہ ارب پتی تھا۔ اس نے بشریٰ سے اس لیے شادی کی تھی کہ وہ نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔ اسے دنیا کی سب سے حسین اور انمول ترین شے کی تلاش تھی۔ دنیا میں عورت سے زیادہ حسین شے کوئی اور نہیں ہے۔ عورت جتنی سستی ارزاں ہے اتنی ہی قیمتی بھی ہے۔ یہ اس کی کشش اور حسن پر منحصر ہے۔ چودھری نے دنیا والوں کو دکھانے کے لیے اسے ڈیکوریشن پیس کی طرح سجا لیا تھا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

مجھے اس بات پر دکھ اور حیرت تھی کہ بشریٰ نے ایسے بدصورت مرد سے کیسے شادی کرلی۔ اسے بھلا مردوں کی کیا کمی تھی۔ ایک سے ایک............ بانکا اور سجیلا مرد اس کا اسیر بن جاتا۔ اسے اپنانا اعزاز سمجھتا۔ اس نے شاید چودھری کی دولت دیکھ کر شادی کرلی تھی۔ دولت شاید اس کی بہت بڑی کمزوری تھی۔

دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی معلوم نہیں وہ چودھری سے شادی کرکے خوش تھی بھی یا نہیں؟ مگر اس کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خوش ہے کیونکہ وہ اپنے شوہر کو وارفتہ اور تیکھی نظروں سے باتوں کے دوران دیکھے جارہی تھی اور بڑے محبت بھرے انداز سے اس کا بازو بھی تھام رکھا تھا۔ میں نے چند لمحوں تک چودھری سے رسمی انداز سے بات بھی کی تھی پھر میں تصویریں دیکھنے لگا۔

☆......☆

ایک روز میں، بچے اور صنوبر سہ پہر کے وقت سفاری پارک جانے کے لیے تیار ہورہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جاکر دروازہ کھولا تو دروازے پر بشریٰ کھڑی تھی۔ آج وہ بڑی سادگی سے آئی تھی۔ اس سادگی میں بھی اس کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ میں نے صنوبر سے اس کا تعارف کرایا وہ بڑے خلوص و تپاک اور گرم جوشی سے ملی۔

وہ میرے بچوں کو دیکھ کر ان پر لٹو ہوگئی اور باری باری ان دونوں کو بے تحاشا پیار کیا۔ بالوں کو سہلا کے بولی۔ ''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... کتنے پیارے ہیں دونوں۔''

وہ جتنی دیر گھر میں رہی اس نے زیادہ تر بچوں سے ہی گھل مل کے باتیں کیں۔ ان کے ساتھ وقت گزارا اور ان کے ساتھ ہنستی رہی۔ ان پر واری ہوتی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ اس کے ہی بچے ہوں اور وہ ان پر ممتا نچھاور کررہی ہو۔ اس نے مجھے اور صنوبر کو جیسے نظر انداز کردیا تھا۔ اس کی شاید وجہ یہ تھی کہ اس کی شادی کو تین برس ہوگئے تھے لیکن اس کے گھر کے آنگن میں ابھی تک ایک پھول بھی نہیں کھلا تھا۔ شاید اسی لیے بھی وہ میرے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی بڑی جذباتی ہوگئی تھی۔ انہیں بڑی حسرت سے دیکھتی رہی، اس میں احساس محرومی پیدا ہوگیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو شاید وہ ان بچوں کی خاطر رک بھی جاتی۔

اس نے میری بنائی ہوئی تصویر ''دیہاتی عورت اور بچہ'' بیس ہزار روپے میں خرید لی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت میرے دونوں بچوں کو پانچ پانچ سو روپے دیے۔ وہ اس وقت بھی جذباتی ہوگئی تھی جیسے ایک ماں اپنے بچوں سے بچھڑتے وقت ہوتی ہے۔ میں نے اسے بہت منع کیا کہ بچوں کو اتنی بڑی رقم نہ دے لیکن وہ نہ مانی۔

اس نے دوسرے دن دفتر میں مجھے فون کیا۔ ''ابن خیال صاحب! آج آپ کا کیا پروگرام ہے۔ آپ آج شام مصروف تو نہیں ہیں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں دفتر سے اٹھ کر گھر جانے والا تھا۔ خیریت تو ہے کیا حکم ہے؟''

''حکم نہیں...... درخواست ہے۔'' وہ خوش ہوتی ہوئی بولی۔ ''آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ میں اور چودھری صاحب آپ کا انتظار کریں گے۔ بھول نہ جایئے گا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں سر کے بل چل کر آپ کے دولت خانے آجاؤں گا۔ میرے لیے کوئی اور حکم ہے تو صادر فرمائیں۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' وہ شگفتگی سے بولی۔ ''آپ کے دونوں بچے کیسے ہیں؟ انہیں دیکھنے کے لیے میرا دل بہت تڑپتا ہے۔''

''وہ اچھے ہیں اور آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس روز تو آپ نے ان کا دل موہ لیا۔ کبھی فرصت ملے تو آکر مل لیں۔''

''میں ضرور آؤں گی۔ میں نے ان کے لیے بہت ساری ٹافیاں، چاکلیٹ اور کھلونے خرید رکھے ہیں۔ اچھا...... خدا حافظ۔'' اس نے فوراً ہی سلسلہ منقطع کردیا۔ میں اسے منع کرنے والا تھا کہ وہ تکلف سے کام نہ لے۔

میں دفتر سے شام کے وقت نکل کے اس کے ہاں پہنچا۔ دو ہزار گز کے رقبے پر بنی ہوئی کوٹھی تھی۔ بشریٰ اور چودھری صاحب کے علاوہ اور لوگ بھی میرے منتظر تھے۔ چودھری صاحب کے بڑے بھائی، ان کی بیوی اور بچے بھی مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ سب مصوری سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ چودھری صاحب کے بڑے بھائی چودھری شجاعت علی بھی اپنے بھائی کی طرح کوئلے کی کان تھے لیکن ان کی بیوی نگہت ایک حسین اور پرکشش عورت تھی۔ ان کے چار بچے تھے۔ وہ سب اپنے باپ پر گئے تھے اور کسی سیاہ فام افریقی کے بچے لگ رہے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ایک بچہ بھی اپنی ماں پر نہیں گیا تھا۔ البتہ ان کے نقوش بڑی حد

UUNOVELS.COM

تک اپنی ماں سے مماثلت رکھتے تھے۔

کھانا بے حد پُرتکلف اور مزیدار تھا۔ اس قدر اہتمام کیا گیا تھا جیسے میں کوئی وی آئی پی ہوں۔ کھانے کی میز پر بشریٰ سے زیادہ میرا خیال رکھا گیا تھا۔ تین چار گھنٹے تک محفل جمی رہی۔ چودھری صاحب کو بھی فنونِ لطیفہ سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ صرف کاروباری شخص نہیں تھا۔ اچھے ذوق کا حامل تھا۔ نشست گاہ میں ملک کے نامور مصوروں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ انکشاف میرے لیے حیرت کا باعث تھا کہ یہ ساری تصاویر چودھری صاحب نے خریدی تھیں۔ ان میں صرف ایک میری تصویر بشریٰ نے پسند کی تھی۔ اسے فنِ مصوری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن وہ شوہر کے ساتھ تصویروں کی نمائش میں جاتی رہی تھی تو اب اسے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے میری پہلی تصویر خریدی تھی۔ چودھری صاحب نے اس کی پسند اور ذوق کو بہت سراہا تھا اور خوب داد بھی دی تھی۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ ان کی بیگم اتنا نفیس ذوق رکھتی ہیں۔

کھانے کی میز پر جب مصوری کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی تو بشریٰ کسی بات پر کہنے لگی۔ ''ابن خیال صاحب! اگر آپ امریکا یا یورپ میں پیدا ہوتے تو آپ کا شمار نہ صرف نامور مصوروں میں ہوتا بلکہ دولت مندوں میں بھی ہوتا۔ ذاتی ہوائی جہاز، ہوٹل، ساحلی اور پُرفضا مقامات پر بنگلے ہوتے جیسا کہ وہاں دوسرے مصوروں کے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں ادیب، اداکار اور دوسرے فنکاروں کو اس قدر گراں معاوضہ ملتا ہے کہ وہ شاہانہ زندگی گزارتے ہیں جب کہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔''

''مصوروں اور دوسرے فنکاروں کی ناقدری ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ امریکا اور یورپ میں بھی ہے۔ وہاں مفلس اور قلاش مصوروں سے نامور مصور ان کی تخلیقات کوڑیوں کے مول خرید لیتے ہیں اور ان کا نام مٹا کے اپنا نام لکھ دیتے ہیں پھر اسے اپنے نام سے ہزاروں لاکھوں میں بیچ دیتے ہیں۔''

''ہمارے ملک میں بھی تو ایسا ہوتا ہوگا۔ کیوں ابن خیال صاحب؟'' بشریٰ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کسی نے آپ کے ساتھ ایسی کوئی نازیبا حرکت کی؟ آپ کا استحصال کیا؟''

''دو ایک نامور مصوروں نے میری مالی پریشانیوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا مگر میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ میرے نزدیک یہ گھٹیا اور مذموم حرکت تھی اور ہے بھی۔ میں کیا کوئی بھی حساس فنکار یہ بات کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا کہ اپنی کاوش جسے وہ خون سے سینچتا ہے۔ فنکار کو عزیز ہوتی ہے اسی طرح جیسے ایک ماں کو اس کا بچہ۔ کیا دنیا کی کوئی ماں اپنا لختِ جگر بیچ سکتی ہے؟ ہرگز نہیں...... کوئی بھی فنکار یہ بات بالکل پسند نہیں کرتا کہ اس کی تخلیق پر کسی اور کا نام ہو۔''

''جی ہاں۔'' چودھری صاحب کی بھابی نگہت نے تائید کی۔ ''میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ کسی فنکار کی تخلیق پر کسی اور کا نام ہو۔ فنکار کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی ہے؟ جس طرح ایک ماں اپنا بچہ نہیں بیچتی اس طرح فنکار کو بھی اپنی تخلیق نہیں بیچنا چاہیے۔ بھلے وہ بھوکا ہی کیوں نہ مر جائے۔''

اس روز کے بعد سے بشریٰ سے دو چار ملاقاتیں اور ہوئیں۔ وہ بظاہر تصویروں کے لیے آتی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ تصویروں سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ پہلے تو اسے میں نے اپنا واہمہ سمجھا لیکن پھر اس کی باتیں، حرکات و سکنات، والہانہ پن اور سرشاری دیکھ کے میرے دل کے کسی کونے میں ایک انجانے شک نے جنم لیا۔ اس کی بڑی بڑی مخمور آنکھوں میں محبت کا گہرا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ وہ مجھ سے بہت بے تکلف ہو چکی تھی۔ بہت سارے موضوعات پر کھل کر باتیں کرتی تھی جن میں سنسنی خیزی بھی ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی زبان سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کی زبان دل کا حال کہے دیتی تھی۔ اگر وہ مجھ پر مرمٹی تھی تو اس میں حیرت کی بات نہ تھی۔ تعجب اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ میں دراز قد، خوب صورت اور وجیہہ آدمی تھا۔ وہ یہ بات غلط نہیں کہتی تھی کہ میں کسی فلمی ہیرو کی طرح ہوں لیکن یہ بات اسے کون سمجھاتا کہ میں صنوبر کا ہیرو ہوں اور صنوبر میری ہیروئن ہے۔ میرے نزدیک کسی ہیروئن میں دلچسپی لینا گناہِ عظیم تھا۔

جب سے میری شہرت ہوئی تھی اور میں کوئی مصوری کی نمائش دیکھنے جاتا تھا تو وہاں لڑکیاں مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ اب آٹوگراف کی روایت نہیں رہی تھی بلکہ سیلفی بنائی جاتی تھی۔ بہت ساری آرٹسٹ لڑکیاں جن کا تعلق امیر گھرانوں سے تھا انہوں نے متعدد بار اپنے گھر مشورے اور رہنمائی کے لیے مدعو کیا تھا۔ وہ مجھ پر

UUNOVELS.COM

فریفتہ ہوگئی تھیں۔ وہ حد سے باہر جانے کے جنون میں بھی تھیں لیکن جب میں نے انہیں باتوں باتوں میں بتایا کہ میں نہ صرف شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں، میں نے صنوبر اور بچوں کے ساتھ سیلفی دکھائی تو تب سے انہوں نے میرے ساتھ شامیں گزارنا بند کردی تھیں۔ کبھی اتفاق سے ان سے کہیں ملاقات ہوجاتی تو وہ عام سے انداز سے مل کے آگے بڑھ جاتی تھیں کیونکہ میں انہیں بتا چکا تھا کہ میں اپنی بیوی بچوں سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔

وہ جس قدر حسین تھی اتنی ہی عجیب عورت بھی واقع ہوئی تھی۔ وہ ایک معما بھی تھی۔ وہ دو ایک مرتبہ میری غیر موجودگی میں میرے گھر آئی تھی۔ اسے میرے بچوں سے بڑی انسیت اور جذباتی لگاؤ ہوگیا تھا۔ میرے بچوں کو ڈھیر سارے قیمتی ملبوسات اور کئی جوڑے جوتے دلوائے، جیسے بچے صنوبر کے نہیں اس کے ہوں۔ اس نے انہیں جنا ہو، آئس کریم کھلائی، کھلونے چاکلیٹ بسکٹ اور ٹافیاں بھی لے کے دیں اس نے ان کے ساتھ کئی سیلفیاں بھی لیں صنوبر کو بھی سونے کا ایک لاکٹ دیا۔ اس کے علاوہ قیمتی ملبوسات اور میچنگ سینڈل بھی دلوائے، انہیں پرفضا تفریحی مقامات اور سی ویو بھی لے گئی۔ رات کا کھانا اس نے قبائلی ریسٹورنٹ میں کھلایا اور میرے لیے کھانا پارسل کروالیا۔

وہ گھر آتی تو بچے آنٹی...... آنٹی کہہ کے اس کی طرف لپکے جاتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچوں کو اس سے بہت پیار ملا تھا۔ بچے اپنی ماں سے زیادہ اسے چاہنے لگے تھے۔ اس کی موجودگی میں اپنی ماں کو بھی بھول جاتے تھے۔ وہ انہیں سینے سے چمٹا کے بے تحاشا چومتی۔ وہ میری موجودگی میں بھی دو ایک مرتبہ آئی تو ان کے لیے ڈھیر ساری چیزیں لے کر آئی تھی۔

ایک روز صنوبر اور بچے سامان سے لدے پھندے اندر آئے تو صنوبر بہت پریشان اور متفکر تھی۔ اس نے سارے دن کی روداد پوری تفصیل سے مجھے سنائی۔ اس نے لاکٹ، سینڈل اور ملبوسات بھی دکھائے اور بولی۔ ''مجھے اس کی جذباتی اور بے پایاں محبت سے ایک انجانا سا خوف محسوس ہورہا ہے۔ آخر وہ کیوں اس قدر مہربان ہورہی ہے؟''

''کیا تم اس لیے پریشان ہو کہ وہ بہت حسین اور ایک مالدار عورت ہے۔'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیا تمہیں اس سے کوئی خطرہ ہے؟''

''نہیں۔'' صنوبر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں یہ بات جانتی ہوں کہ اس جیسی دس عورتیں بھی آپ کو مجھ سے چھین نہیں سکتیں۔''

''پھر تم کس لیے اس قدر ہراساں اور پریشان ہورہی ہو؟'' میں ہنس دیا۔ ''تمہیں ڈر اور خوف کس بات کا ہے، کھل کر بتاؤ؟''

''میں اس بات پر حیران اور پریشان ہوں کہ وہ کون سا جذبہ کارفرما ہے جو مجھ پر اور میرے بچوں پر مہربان ہورہی ہے؟'' صنوبر نے پھر اپنی بات دہرائی۔ ''اگر وہ مجھ پر اور بچوں پر مہربان ہورہی ہے اور نوازشات کررہی ہے تو ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارے دل میں جو شکوک پیدا ہورہے ہیں وہ صاف صاف بتاؤ۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ آپ کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔'' صنوبر کہنے لگی۔ ''وہ آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے راہ ہموار کررہی ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ مجھے طلاق نہیں دیں گے اس لیے وہ مجھ سے دوستی کررہی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہ سکتی ہیں۔ وہ بچوں کو اپنے سے قریب کررہی ہے۔''

''لیکن تم ایک بات بھول رہی ہو کہ وہ شادی شدہ ہے اور ایک ارب پتی کی بیوی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بھلا وہ ایک مصور سے کیسے شادی کرسکتی ہے؟ اس کا شوہر اسے جو راحت و آسائش دے رہا ہے وہ ایک معمولی مصور کیسے دے سکتا ہے؟''

''وہ اس سے طلاق لے لے گی۔'' صنوبر فکرمندی سے بولی۔ ''اس لیے کہ اس کا شوہر بہت بدصورت ہے۔ جب عورت کسی کی محبت میں گرفتار ہوجاتی ہے تو وہ دولت اور سلطنتوں کو بھی لات ماردیتی ہے۔ آپ اس کے لیے بڑی دولت ہیں۔ وہ ہر قیمت پر یہ دولت حاصل کرنا چاہتی ہے۔''

''میرا خیال کچھ اور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم بلاوجہ اس پر شک کررہی ہو شک کو دل سے نکال دو۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟'' صنوبر نے سنجیدہ ہوکر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ ایک بانجھ عورت ہے۔'' میں

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

نے جواب دیا۔ ''اور پھر ہمارے بچے اتنے خوب صورت اور پیارے ہیں کہ اسے ان پر بے اختیار پیار آجاتا ہے۔ وہ اپنے دکھ اور احساس محرومی دور کرنے کے لیے بے پناہ محبت کرنے لگی ہے۔ لہٰذا اس سے خوف زدہ اور پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کی نیت اور خلوص پر شک نہ کرو۔''

صنوبر شکی مزاج نہ تھی۔ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ ''اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو اگر بالفرض محال اس نے کبھی دوسری شادی اور طلاق لینے کا خیال ظاہر کیا تو آپ کیا کریں گے؟ جب کہ وہ مجھ سے کہیں حسین اور پرکشش ہے۔''

''تمہارے خیال میں کیا میں اس کی بات مان لوں گا؟'' میں نے بڑے پیار سے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ ''اس سے شادی کرلوں گا؟''

''مجھے آپ پر اعتماد ہے۔'' وہ بولی۔ ''مگر اس کا حسن اس قدر خطرناک ہے کہ مرد بڑی آسانی سے گھائل ہوسکتا ہے۔ وہ ایک حسین ناگن ہے۔''

''ہاں! وہ واقعی بے حد حسین ہے۔'' میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں کتنے مرد اس پر ریشہ خطمی ہو چکے ہوں گے لیکن میرے نزدیک حسین عورت ہی سب کچھ نہیں ہوسکتی۔ وہ تم سے لاکھ حسین سہی لیکن تم میں جو بات ہے وہ اس میں کہاں۔ تمہاری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تم شوہر پرست ہو، اس کا حسن تمہارے سامنے ہیچ ہے۔''

صنوبر ایک عورت تھی۔ اس ناتے اس کے اندیشے اور وسوسے اپنی جگہ بجا تھے۔ بشریٰ اس قدر حسین تھی کہ مرد اسے پانے کی آرزو کرتے ہوں گے لیکن میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ صنوبر کا حسن اور سیرت کو ماند نہیں کرسکتی تھی۔

ایک روز میں دفتر سے چھٹی کے وقت باہر آیا تو میں نے دفتر کی عمارت کے باہر بشریٰ کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اپنے شاندار ماڈل کی مرسڈیز میں بیٹھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ اسے مجھ سے ملنا ہوتا تو وہ مجھے ٹیلی فون کردیا کرتی تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کبھی وہ ملنے کے لیے ٹیلی فون کیے بغیر آئی ہو۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میں نے اس کی گاڑی کے پاس جاکر پوچھا۔ ''یہاں کس کا انتظار ہو رہا ہے؟''

''آپ کا؟'' اس نے مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھا۔ اپنا خوب صورت، سڈول اور گداز ہاتھ بڑھا کے دروازہ کھول دیا۔

جب میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے اس لیے آئی ہوں۔''

''بندہ حاضر ہے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' میں نے انکساری سے کہا۔

آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں لیکن یہاں نہیں وہ شگفتگی سے بولی۔ ''کسی پُرسکون جگہ پر چل کر باتیں کریں گے۔''

''لیکن اس شہر کراچی میں کوئی گوشہ پُرسکون نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی نظر میں ہے تو بتائیں۔ وہیں چلتے ہیں۔''

اس نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں کلفٹن کا ساحل مناسب رہے گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد ہم کلفٹن کے ساحل پر پہنچ گئے۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتی ہوئی اس طرح سے لائی تھی جیسے کوئی تعاقب میں ہو۔ دو ایک جگہ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بال بال بچے تھے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جلد سے جلد پہنچنے اور بات کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ راستے میں وہ صرف بچوں کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ صنوبر کے بارے میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ معلوم نہیں اسے مجھ سے کیا کام تھا۔ مجھے دفعتاً صنوبر کی

پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ایس پی سنگھا کے گیارہ بچوں کے نام کا آخری حصہ ''سنگھا'' تھا۔ جب ان کے ہاں بارہواں لڑکا پیدا ہوا تو شوکت تھانوی سے مشورہ کیا کہ اس کا کیا نام رکھوں۔ اس پر شوکت صاحب نے بے ساختہ کہا۔ ''آپ اس کا نام بارہ سنگھا رکھ دیجیے۔''

مرسلہ: عابد بیگ۔ کراچی

ایک ناشر نے کتابوں کے نئے گاہک سے شوکت تھانوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''آپ جس شخص کا ناول خرید رہے ہیں وہ یہی ذات شریف ہیں لیکن یہ چہرے سے جتنے بے وقوف معلوم ہوتے ہیں اتنے ہیں نہیں۔''

شوکت تھانوی نے فوراً کہا۔ ''جناب مجھ میں اور میرے ناشر میں یہی بڑا فرق ہے۔ یہ جتنے بے وقوف ہیں چہرے سے معلوم نہیں ہوتے۔''

مرسلہ: تحسین علی خان۔ ڈسکہ

UUNOVELS.COM

بات یاد آئی کہ کہیں وہ دوسری شادی اور شوہر سے طلاق لینے کے بارے میں بات کرنا تو نہیں چاہتی؟ اگر یہ بات تھی تو وہ مجھے کسی بھی ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل میں لے جا سکتی تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز سے اسے ٹٹولا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا وہ بڑی گہری عورت تھی۔ تاہم میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر اس نے شوہر سے طلاق لینے اور دوسری شادی کے موضوع پر بات کی تو میں اسے مایوس کر دوں گا۔

اس نے گاڑی پارکنگ لاٹ پر روک لی۔ وہ گاڑی سے نہیں نکلی۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے سمندر کا نظارہ کرتے رہے۔ ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ ہمارے درمیان ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ میں نے عقبی آئینے میں اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے یکسر عاری تھا۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جانے وہ کیا سوچنے لگی اور کیا کہنے والی تھی۔

میں خاموش اس خیال سے رہا کہ اسے بولنے اور سکوت کی دیوار گرانے دوں اس لیے کہ وہ مجھے یہاں بات کرنے کے لیے تو لائی تھی۔ آخر تھوڑی دیر بعد اس نے سکوت خود ہی توڑا۔

''ابن خیال صاحب! کیا آپ میرا ایک کام کر سکیں گے؟ آپ کہیں انکار تو نہیں کریں گے؟''

''حکم!'' میں نے اپنا سر خم کر دیا۔ ''میری کیا مجال کہ میں آپ کے کسی کام سے انکار کر سکوں۔ ہاں اگر میرے اختیار میں ہو۔''

''آپ کے اختیار میں نہیں بلکہ بس میں بھی ہے۔'' وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ''آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ سے چاند کا ٹکڑا لانے کو نہیں کہوں گی۔'' پھر سنجیدہ ہوتی ہوئی بولی۔ ''بات یہ ہے کہ میں آپ سے اپنی پسند کے مطابق اپنا ایک پورٹریٹ بنوانا چاہتی ہوں۔ بنا دیں گے نا؟'' اتنا کہہ کے وہ مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

میں ایک دم ہنس پڑا۔ ''آپ صرف یہ بات کہنے کے لیے یہاں لائی ہیں۔ آپ فون پر بھی کہہ سکتی تھیں؟''

''آپ کو یہاں اس لیے بھی لائی ہوں کہ یہ معاملہ ذرا تفصیل سے طے کر لوں؟'' اس نے کہا۔ ''آپ بتائیں کہ تیار ہیں کہ نہیں؟''

''بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس آپ حکم کریں تاکہ میں کل سے ہی کام شروع کر دوں۔''

''شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک شرط پر اپنا پورٹریٹ بنواؤں گی۔''

''جب میں تیار ہوں تو پھر شرط کس بات کی؟'' میں نے کہا۔ ''بہرکیف آپ اپنی شرط بتائیں تاکہ میں سوچوں۔''

''شرط یہ ہے کہ میں اس کا معاوضہ پیش کروں گی۔ وہ آپ بغیر کسی پس و پیش کے قبول کریں گے۔''

''میں ایک مصور ہوں۔ میں کوئی کاروباری شخص نہیں ہوں جو آپ مجھ سے کاروباری انداز میں بات کر رہی ہیں۔'' میں بولا۔

''پورٹریٹ بنانے میں بڑا وقت لگتا ہے اور محنت بھی صرف ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں کاروباری بات نہیں کر رہی، آپ کوئی شوقیہ مصور نہیں ہیں۔ یہ آپ کا ذریعہ معاش ہے۔''

''کیا میں آپ کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا؟'' میں نے کہا۔ ''آپ میرے بچوں سے اتنی محبت کرتی ہیں جتنی ایک سگی ماں کرتی ہے۔ میری بیوی سے گہری دوستی ہو گئی ہے۔ آپ نے بیوی بچوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہم اس کا احسان ساری زندگی نہیں اتار سکتے۔ جب آپ اتنا کچھ کر سکتی ہیں تو کیا میں آپ کا ایک پورٹریٹ نہیں بنا سکتا۔ آپ پلیز! مسز چودھری مجھے شرمندہ نہ کریں۔''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے پرس میں پیسے نکال کے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''یہ بیس ہزار روپے ہیں۔ یہ پیشگی ہے۔ مزید بعد میں دوں گی۔ آپ کل ہی سے میرا پورٹریٹ بنانا شروع کر دیں۔ اس کے لیے آپ کو دفتر سے میرا پورٹریٹ مکمل ہونے تک کی چھٹی کرنا ہو گی۔ ناغے کی جو تنخواہ کٹے گی وہ بھی میں ادا کروں گی۔ میرے پاس صبح کا وقت ہوتا ہے اور شام کے لیے وقت نکالنا میرے لیے بہت مشکل ہو گا کیونکہ مجھے چودھری صاحب کے ساتھ کلب جانا ہوتا ہے اور دوسری تقریبات میں شرکت کرنا بھی ضروری ہے۔''

میں نے معمولی ہچکچاہٹ کے بعد رقم جیب میں رکھ لی اور کہا۔ ''مجھے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لینی ہو گی۔ میں کل ہی سے چھٹی لے لوں گا اور کل ہی سے کام شروع کر دوں گا۔''

''کیا ایک ہفتے میں آپ میرا پورٹریٹ تیار کر سکیں گے؟'' اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''میں شاید اور جلد تیار کر لوں؟''

''مجھے اس لیے یقین نہیں آیا کہ میں نے سنا ہے کہ اس میں ایک ایک مہینا لگ جاتا ہے۔'' وہ بولی۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن میں کوشش کروں گا کہ چھ سات دن ہی میں آپ کا پورٹریٹ بنا لوں۔''

اس نے پرس میں سے پانچ ہزار کا ایک نوٹ نکال کر میری جیب میں ٹھونس دیا۔

''یہ کس لیے؟'' میں نے حیرت سے پانچ ہزار کے نوٹ کو دیکھا اور پھر اسے جیب سے نکالنے لگا۔

''نہیں...... آپ واپس نہیں کریں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ رقم دفتر سے چھٹی کرنے کے عوض ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کی تنخواہ کٹے۔''

''آپ نے جو بیس ہزار کی رقم دی ہے وہ کافی ہے۔ میں مزید رقم اور نہیں لوں گا۔ پلیز آپ مجھے قدم قدم پر اپنے احسانوں کے بوجھ تلے نہ دبائیں۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

''میں کوئی احسان نہیں کر رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''دیکھا جائے تو آپ مجھ پر احسان کریں گے کیونکہ پورٹریٹ بنانے میں بڑی محنت اور وقت درکار ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہیں ہے۔ اب بتائیں آپ کا کیا پروگرام ہے۔''

''میں ایک ہفتے ہی میں بڑی آسانی سے آپ کا پورٹریٹ تیار کرلوں گا۔ زیادہ دن نہیں لوں گا۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔

''آپ کون سا وقت مقرر کر رہے ہیں؟'' وہ بولی۔ ''اس پروگرام میں دیر نہیں ہونی چاہیے کل سے ہی کام شروع کر دیں۔''

''میں صبح ٹھیک نو بجے آپ کے ہاں پہنچ جایا کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''روزانہ تین گھنٹے کافی ہوں گے تاکہ آپ تھک نہ جائیں۔''

''نہیں...... نہیں۔'' وہ گھبرا کے بولی۔ ''آپ میرے گھر پر نہیں آئیں گے کیونکہ ہم وہاں بہت ڈسٹرب ہوں گے۔ ٹیلی فون اور ملاقاتی آتے رہیں گے جس سے کام متاثر ہوگا اور پھر میں کسی کو ابھی اس پورٹریٹ کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی۔ اپنے شوہر نامدار کو بھی نہیں۔''

''چودھری صاحب کو بھی نہیں!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کس لیے؟ ایک دن تو انہیں پتا چل ہی جائے گا اس قدر رازداری کیوں؟''

''اس لیے کہ میں انہیں سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''گھر پر نہیں تو کیا آپ ساحل سمندر پر پورٹریٹ بنوائیں گی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جن سے وحشت جھانک رہی تھی۔

''کلفٹن کے علاقے میں ایک نہایت آراستہ و پیراستہ فلیٹ میں نے اس غرض سے کرایہ پر لیا ہے۔'' وہ بتانے لگی۔ ''وہاں ہمیں کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہوگا۔ ابھی چل کے میں آپ کو وہ فلیٹ دکھائے دیتی ہوں۔ آپ وہاں روزانہ صبح دس بجے پہنچ جایا کریں۔ آپ اپنا کام کل سے شروع کر دیں۔ اوکے۔''

وہ مجھے ایک ریسٹورنٹ میں لے آئی۔ چائے پینے کے دوران اس نے مجھے بتایا کہ شادی کے بعد اس کے شوہر نے بڑی خواہش کی تھی اس کا ایک پورٹریٹ بنا کے خواب گاہ میں آویزاں کیا جائے۔ میں اسے ٹالتی رہی کیونکہ مجھے ایسا کوئی مصور نہیں مل سکا جو ایک اچھا پورٹریٹ بنا سکے۔ آپ کی تصویریں اور ہنر دیکھ کے میں متاثر ہوئی۔ میں نے اس روز فیصلہ کرلیا تھا کہ صرف آپ سے پورٹریٹ بنواؤں گی۔

وہاں سے اٹھ کے وہ مجھے اپنا فلیٹ دکھانے لے گئی۔ میں دل میں یہ بات سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ان امیر لوگوں کے پاس کس قدر پیسا ہوتا ہے وہ کیسی فضول خرچی کرتے ہیں۔ وہ اپنی کوٹھی میں بھی پورٹریٹ بنوا سکتی تھی۔ اس نے صرف پورٹریٹ بنوانے کے لیے نہ صرف ہزاروں کی رقم بلکہ پچاس ہزار روپے کرائے کا فلیٹ بھی لیا۔ یہ بہت خوب صورت اور کشادہ فلیٹ تھا۔ ایک ایسے ہی گھر کی خواہش میری اور صنوبر کی بھی تھی لیکن ہمارے لیے تو جیسے یہ ایک دیوانے کا خواب تھا جو کبھی بھی پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسا فلیٹ تو کیا دو کمروں کا مکان بھی میری دسترس سے باہر تھا۔

میں دوسرے دن صبح ٹھیک دس بجے اس کے فلیٹ پر پہنچا تو وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس طرح بے حجابی کی سی حالت میں آئی تھی جیسے مقابلہ حسن میں حصہ لے رہی ہو۔ اس کے حسن و شباب کی کرشمہ سازیاں میرے دل پر بجلیاں بن کے گریں۔ اس کا وحشی حسن میرے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔

میں پورٹریٹ بنانے کے لیے تمام لوازمات لے کے پہنچا تھا۔ میں جب تک تیاری کرتا رہا وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ وہ اپنی پسند کے پوز اور زاویے سے پورٹریٹ بنوانا

UUNOVELS.COM

چاہتی تھی۔ وہ جس انداز اور جس زاویے سے بیٹھی تھی وہ بڑا ہوش ربا اور بہکا دینے والا تھا۔ اس خیال سے میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی کہ اس فلیٹ میں صرف ہم دونوں تنہا ہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ اس کا شوہر بھی یہاں نہیں آئے گا۔ اس کے شوہر کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ اس نے یہ فلیٹ کرائے پر لیا ہوا ہے۔ اس کے پورٹریٹ بنانے کے انداز نے میرے رگ و پے میں آگ سی بھر دی تھی۔ میری نظریں کینوس کی بجائے بار بار اس کے مرمریں گداز بدن کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ میرے ساتھ پوری طرح تعاون نہیں کر رہی تھی۔ اس کی باتیں اور حرکتیں میرے کام میں رکاوٹ کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے غیر محسوس انداز سے ٹوکا بھی تھا لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آئی۔ کوئی ساڑھے بارہ بجے ہم وہاں سے نکلے۔ وہ قریبی ریسٹورنٹ میں مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے لے گئی۔ وہاں سے نکلے تو دو بج رہے تھے۔ میں نے گھر جاتے ہوئے سوچا کہ اس طرح تو دو مہینے میں بھی پورٹریٹ مکمل نہ ہوگا۔

دوسرے دن میں فلیٹ پر پہنچا تو وہ موجود تھی۔ اس نے مجھے فلیٹ کی ڈپلی کیٹ چابی دی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا کام شروع کیا لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا حسین بدن میرا بڑا سخت امتحان لے رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لمحے کوئی طوفان آ جائے اور میں اس کی زد سے نکل نہ سکوں۔ آخر میں بھی ایک جوان مرد تھا۔ میرے بھی جذبات و احساسات تھے۔ میں پتھر تو نہیں تھا۔ میرے جذبات بے قابو ہونے لگتے تو میں صنوبر کے بارے میں سوچنے لگتا۔ صنوبر کا تصور ابھرتا تو میرے جذبات سرد پڑ جاتے۔

آج وہ مجھے لنچ کرانے کے لیے ایک نئے ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ کھانے کے دوران وہ میرے بچوں کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

جب اس نے موضوع نہیں بدلا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''اگر میں آپ سے ایک ذاتی سوال کروں تو کیا آپ برا تو نہیں مانیں گی؟''

''آپ ایک نہیں دس سوال کریں۔'' وہ شگفتگی سے بولی۔ ''میں کیوں برا ماننے لگی؟''

''آپ کو بچوں سے اس قدر پیار ہے لیکن آپ اب تک ماں نہیں بنیں؟'' میں نے کہا۔ ''آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ دو ہی باتیں میری سمجھ میں آئی ہیں بعض حسین اور جوان عورتیں اس لیے ماں بننا پسند نہیں کرتی ہیں کہ کہیں ان کا حسن ماند نہ پڑ جائے۔ وہ سدا جوان رہنا چاہتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ بانجھ ہیں؟''

''نہیں...... میں بانجھ نہیں ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مگر میں ابھی خود ہی ماں بننا نہیں چاہتی ہوں۔ میں نے چودھری صاحب سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے پانچ برس تک ایک پرتعیش، پرسکون اور اطمینان کی زندگی گزارنے دیں۔ میں ازدواجی زندگی سے محظوظ ہونا چاہتی ہوں۔ بچوں کے جنجال میں پڑ کے اپنی آزادی ختم کرنا نہیں چاہتی۔ لہٰذا پانچ برس تک بچوں کے بارے میں نہ سوچیں۔''

''مگر یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔ ایک شادی شدہ عورت کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد ماں بن جائے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ خام خیالی ہے کہ عورت کا حسن ماں بننے کے بعد متاثر ہو جاتا ہے، جسم ڈھل جاتا ہے جس سے وہ بے کشش اور بھدی دکھائی دیتی ہے۔ آپ دور کیوں جائیں صنوبر ہی کو دیکھ لیں۔ اس کے ماں بننے کے بعد نہ تو حسن متاثر ہوا اور نہ ہی جسم ڈھلا بلکہ وہ مزید حسین، پرکشش و گداز بدن کی ہو گئی؟ میں نے چھ سات بچوں کی کئی ماؤں کو دیکھا ہے۔ حسن اور جسم، عمر اور بے پروائی کے باعث ڈھلتا ہے۔ بائی دا وے آپ ماں بن گئیں تو آپ کے بچے آپ کی طرح خوب صورت ہوں گے۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے۔'' اس کے حسین چہرے پر کرب سا چھا گیا۔ اس نے کھانے پر سے ہاتھ روک لیا۔ میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔ ''اگر میرے بچے چودھری کی طرح کالے اور بدصورت ہوئے تو......؟''

''یہ آپ نے کیسے فرض کر لیا کہ آپ کے بچے بدصورت ہوں گے؟ وہ آپ پر بھی تو جا سکتے ہیں۔'' میں نے سمجھایا۔

''اس روز دعوت میں آپ نے میرے ہاں میرے جیٹھ کے بچے دیکھے تھے جو افریقیوں کی طرح لگ رہے تھے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میرے جیٹھ بندر کی مانند ہیں۔ جب کہ جٹھانی بہت حسین و جمیل ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے بھی کالے پیلے ہوں۔ بدصورت ہوں۔ جب کہ میں حسن کی شیدائی ہوں۔''

''اگر آپ حسن کی شیدائی ہیں تو پھر آپ نے چودھری صاحب سے شادی کیوں کی؟'' میرے منہ سے بلا ارادہ نکل

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

گیا۔ ''اس سے شادی نہ کرتیں۔ آپ کے لیے خوب صورت مردوں کی کیا کمی تھی؟''

''اس لیے کہ میرا بچپن اور جوانی محرومیوں میں گزرا ہے۔ میں نے صرف پُرتعیش زندگی کے لیے اس شخص کو قبول کیا ہے۔ یہ شخص میرے اشاروں پر ناچتا ہے۔ ایک طرح سے زرخرید غلام ہے۔ اگرچہ میں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا لیکن میں اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتی۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ویسے آپ بلاوجہ خوف محسوس کررہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بچے آپ کی طرح خوب صورت ہوں گے۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کرسکتی۔'' وہ کہنے لگی۔ ''میرے سامنے متعدد مثالیں موجود ہیں۔ سب سے بڑی مثال تو آپ ہی کی ہے۔ آپ کے دونوں بچے آپ ہی پر گئے ہیں۔ دوسری مثال میرے شوہر کی پہلی بیوی جو بہت خوب صورت تھی۔ اس کے بطن سے دو بچے ہوئے جو اپنے باپ پر گئے ہیں۔ اس لیے میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوں۔''

''کیا چودھری صاحب کی پہلی بیوی بھی ہے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''وہ کہاں رہتی ہے؟''

''جی ہاں تھی...... لیکن اب نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس نے میری شادی کے بعد ہی چودھری صاحب سے طلاق لے لی اور اپنے بچوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ میں شادی سے پہلے چودھری صاحب کی پرائیویٹ سیکریٹری تھی۔''

اس موضوع پر اس سے بڑی دیر تک بات ہوتی رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر جیسے کالے اور بدصورت بچوں کی ماں بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے شوہر نے بھی کئی بار اس سے کہا تھا کہ بچے ہوں تو اس کی طرح خوب صورت ہوں۔ اس کا رنگ روپ ہوں، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس طرح ساری زندگی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

☆......☆

تیسرے دن وہ فلیٹ میں اس قدر بے تکلفی سے پیش آئی جیسے ہم دونوں میں برسوں کی شناسائی ہو۔ کوئی بھرم، دیوار اور حجاب نہیں ہے بلکہ ایک زنجیر سے بندھے ہوئے ہوں۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ اس کی حرکات، والہانہ انداز اور شوخیوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ پورٹریٹ بنانا تو ایک بہانہ ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس گھر کی تنہائی میں، میں بہک جاؤں اور وہ کسی پکے پھل کی طرح میری جھولی میں آگرے۔

مجھے خود پر قابو پانا ناممکن سا لگ رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی کے وجود کی آگ مجھ تک پہنچے اور میں اس کی تپش ہی محسوس نہ کروں۔ میں نے سوچا کہ میں یہاں سے ابھی اور اسی وقت چلا جاؤں۔ اس صورت میں غلاظت کے دلدل میں گرنے سے بچ سکتا ہوں۔ اگر میں گرگیا تو پھر کبھی نکل نہیں سکوں گا۔ دھنستا ہی جاؤں گا۔ مرد ہونے کے ناتے اس سخت آزمائش سے گزرنا میرے بس کی بات نہ ہوگی۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس فلیٹ میں اس کا پورٹریٹ نہیں بناؤں گا۔ اس کی رقم بھی لوٹا دوں گا اور دوبارہ اس فلیٹ میں قدم بھی نہیں رکھوں گا۔ وہ میرا گھر تباہ کرنا چاہتی تھی۔ ایک زہریلی ناگن کی طرح میری بیوی اور بچوں کو ڈس لینا چاہتی تھی۔ میں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کردیا۔

''ابن خیال صاحب۔'' اس کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ ''آپ اپنا سامان کیوں سمیٹ رہے ہیں۔ کیا آپ مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں؟'' وہ میرے پاس آکے کھڑی ہوگئی۔

''نہیں...... میں آپ کا پورٹریٹ نہیں بنا سکتا؟'' میں نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''آپ مجھے اجازت دیں۔ آپ کی دی ہوئی رقم کل......''

''آخر کیا بات ہوئی؟'' وہ شوخی سے بولی۔ ''کیا میں نے انجانے میں آپ سے کچھ کہہ دیا؟''

''آپ مجھے اس بات پر مجبور کررہی ہیں کہ میرے وجود کے صاف وشفاف آئینے پر دھبا پڑ جائے۔'' میں نے غصے کی حالت میں اسے صاف صاف بتا دیا۔ ''کیا یہ پورٹریٹ بنانا محض ایک بہانہ نہیں ہے مجھے شکار کرنے کا؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ کی بات سے مجھے انکار نہیں۔'' وہ آہستگی سے کسی مجرم کے انداز میں بولی۔ ''اس دنیا میں ایسا بدذوق کون ہوگا جو خوب صورت چیزوں کی قدر نہ کرے، ایک خوب صورت چیز کے حصول کے لیے میں نے تدبیر سوچی تھی۔ آپ کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ پہلے ہی دن پٹری سے اتر جاتا مگر آپ تو عام لوگوں سے یکسر مختلف نکلے۔''

''میرے پاس کوئی ایسی خوب صورت چیز نہیں جو میں آپ کو دے سکوں۔'' میں نے تند لہجے میں کہا۔ ''میں

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ایک فنکار ہوں۔ میں کینوس پر خوب صورت چہرے تخلیق کر سکتا ہوں۔ آپ کا شاندار پورٹریٹ بنا سکتا ہوں لیکن ان حالات میں نہیں۔''

''آپ کے پاس خوب صورت چیز کیوں نہیں ہے؟ آپ مجھے بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میرے بچے جو ہوں وہ خوب صورت ہوں۔ آپ جیسے۔ میں خوب صورت اور پیارے پیارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔''

میں اس کی بات کی تہہ میں پہنچ کے ششدر رہ گیا۔

''آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے؟''

''میں آپ کو ایک لاکھ روپے دینے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے اپنے پرس سے چیک بک نکالی پھر ایک چیک کاٹ کے میری طرف بڑھایا۔

''ایک لاکھ روپے......!!'' میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے چیک نہیں لیا۔

''اچھا تو دو لاکھ روپے لے لیجیے۔'' وہ دوسرا چیک کاٹنے لگی۔ ''اس طرح آپ کا مستقبل بن جائے گا۔ چودھری کو سرپرائز......''

دو لاکھ روپے میرے لیے یقیناً بہت بڑی رقم تھی۔ اس سودے کو منظور کر لینے میں میرا ہر طرح سے فائدہ تھا۔ ایک طرف زندگی خواب ناک ہو جاتی اور دوسری طرف اس کی رفاقت میں میرے دن رات حسین ہو جاتے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے چیک لے لیا تب اس چیک پر صنوبر کا چہرہ ابھر آیا۔ صنوبر جو میری زندگی کا محور تھی۔ زندگی کے نشیب و فراز میں میرا ہر طرح ساتھ دیا تھا۔ میں اس عظیم شریک سفر کو کیسے دھوکا دے سکتا تھا؟ اس کی پشت میں خنجر گھونپنے کا تصور بھی میرے لیے سوہان روح تھا۔ اس گھر کو کیسے اجاڑ سکتا تھا جو ایثار، قربانی خلوص و محبت کے اتھاہ جذبے سے بنا تھا۔

میں نے چیک کے پرزے پرزے کر کے فضا میں اچھال دیا۔ ''آپ نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔''

اس کا حسین چہرہ مرجھا گیا۔ وہ زخم خوردہ لہجے میں بولی۔ ''میں مزید ایک لاکھ روپے بڑھانے کے لیے تیار ہوں پلیز۔'' وہ گڑگڑانے لگی۔ ''آپ جذبات کی رو میں بہہ کر میری خواہش اور ارمانوں کا خون نہ کریں۔ آپ میرا خواب ہیں۔ یہ خواب کس مشکل سے ملا آپ کیا جانیں۔ تین لاکھ، اتنی بڑی دولت آپ کو کہاں سے مل سکتی ہے۔ میں وقتاً فوقتاً بھی نوازتی رہوں گی۔ آپ دنیا کے خوب صورت ترین شخص ہیں۔''

''مجھے اس خوش قسمتی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں فنکار ہوں اور کوئی بھی فنکار اپنے فن پارے پر کسی اور کا نام دیکھنا پسند نہیں کرتا۔''

اس نے ایک اور آخری حربہ آزمایا کہ جب میں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا وہ بے لباس ہو گئی لیکن میں باہر نکل گیا۔

☆......☆

وہ دس روز تک مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس کے بعد کچھ اور دن گزر گئے۔ ایک روز میں نے اسے ایک شاپنگ مال میں ٹی وی کے ایک خوبرو ہیرو کے ساتھ دیکھا۔ وہ اسے ایک ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان میں شاپنگ کرا رہی تھی۔ وہ دونوں بہت خوش دکھائی دیئے جیسے ان دونوں نے ایک دوسرے کو پا لیا ہو۔ بشریٰ نے مجھے دیکھا اور فاتحانہ انداز سے مسکرائی۔ اس کی چمکتی آنکھیں مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ دنیا میں تم جیسا احمق کون ہوگا۔ تمہیں بڑا غرور تھا اپنے جمال پر۔ دیکھو، مجھے تم سے کہیں خوب صورت مرد مل گیا ہے۔ اب میرے بچے اس کی طرح خوب صورت ہوں گے۔

ایک برس گزر گیا۔ میں اپنے باس کی عیادت کے لیے ایک بڑے اسپتال گیا تو وہاں میری ملاقات چودھری صاحب سے ہوگئی۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ وہاں آئے ہوئے تھے۔ بہت پریشان اور خائف لگ رہے تھے۔ سامنا ہونے پر رسمی علیک سلیک ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے، آپ یہاں کیسے؟''

''میری بیوی ایڈمٹ ہے اور آج ہی ڈلیوری ہوئی ہے۔''

''مبارک ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لڑکا ہوا ہے یا لڑکی؟''

''کیا بتاؤں ابن خیال صاحب!'' وہ وحشت زدہ سے لہجے میں آہستہ سے بولے۔ ''اس نے ایک عجیب الخلقت بچے کو جنم دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ قدرت نے آخر ہمیں کس جرم کی سزا دی ہے۔''

یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ قدرت نے انہیں نہیں بشریٰ کو سزا دی ہے۔

++

UUNOVELS.COM

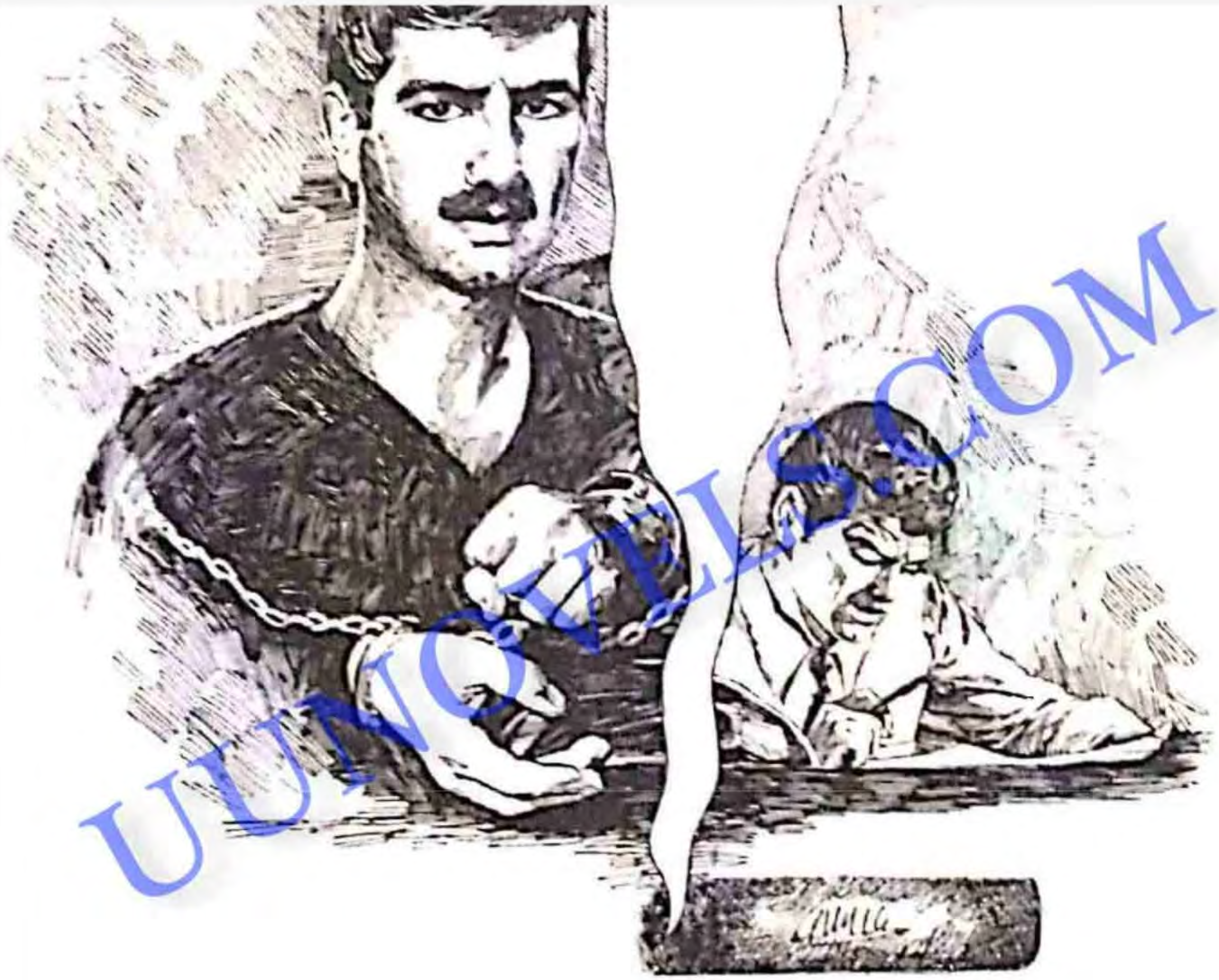

UUNOVELS.COM

ماں

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم!

ماں کی عظمت پر یہ چھوٹی سی سچ بیانی ارسال خدمت ہے۔ ماں کس طرح بچوں کے لیے خود کو مختص کردیتی ہے کیسے وہ بچوں کے درد کو بغیر کہے سن لیتی ہے اس کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اتنے عمدہ انداز میں لکھی گئی ہے کہ پڑھ کر مزہ آئے گا۔

فہمی فردوس

(لاہور)

UUNOVELS.COM

میں پچھلے دس سال سے محکمۂ پولیس میں ہوں۔ بطور کانسٹیبل بھرتی ہوا تھا۔ آج اے ایس آئی ہوں۔

میں روایتی پولیس والوں جیسا سخت مزاج اور سخت دل نہیں ہوں۔ اپنی ڈیوٹی و فرض سمجھتا ہوں۔ بلاوجہ کی کرختگی سے گریز کرتا ہوں۔

اور رشتوں خصوصاً خونی رشتوں کے معاملے میں تو رحمدل واقع ہوا ہوں۔

بہن بھائیوں سے صلہ رحمی کا سلوک روا رکھا۔ وہ بھی مجھ سے خوش ہیں۔

والد صاحب حیات نہیں رہے۔ امی جب تک حیات رہیں، ان کے عزت و احترام میں کبھی کمی واقع نہ ہونے دی۔

جو اپنے ماں باپ کی عزت اور قدر نہیں کرتے، مجھے ایسے لوگوں پر انتہائی غصہ آتا ہے۔ ان کی عاقبت نااندیشی پر افسوس ہوتا ہے۔

میری والدہ اگرچہ میرے ساتھ نہیں تھیں، چھوٹے بھائی کے گھر رہتی تھیں۔

ہم دونوں بھائیوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ ہم نے گھروں کی درمیانی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بھی بنا لیا تھا۔

ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کے لیے عموماً اسی دروازے کو استعمال کیا جاتا تھا۔

میں ڈیوٹی پر آنے سے پہلے، گھر سے نکلتے وقت والدہ سے مل کر ان کی دعائیں لینا کبھی نہیں بھولتا تھا۔

ماں جیسی عظیم ہستی کی دعائیں تو قسمت والوں کو نصیب ہوا کرتی ہیں۔

ماں کی ممتا اور محبت اولاد کے لیے ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے۔

کافی پرانی بات ہے۔ اس وقت امی جان بقید حیات تھیں۔

ایک دن ہم تھانے میں بیٹھے۔ روزمرہ کی کارروائیوں کو نمٹا رہے تھے کہ ایک عجیب کیس سامنے آیا۔

ستر اسی سال کی ایک بڑھیا روتی پیٹتی تھانے میں آ گئی۔ وہ کسی شاکر نامی بندے کو گالیاں نکال رہی تھی۔ اس کے سفید الجھے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ جھریوں بھرا تھا۔ کپڑے میلے کچیلے اور پیروں میں ایک گھسی پٹی سی ہوائی چپل تھی۔

واویلا سن کر میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اسے میرے کمرے میں لے آؤ۔

کانسٹیبل اسے بازو سے پکڑ کر میرے سامنے لے آیا۔

”جی اماں جی...... آپ یہاں کرسی پر بیٹھیں، اور مجھے بتائیں کہ آپ کو کس سے شکایت ہے۔ کس نے آپ پر ظلم کیا ہے۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”میرا مجرم شاکر ہے۔ وہ مجھ پر بہت ظلم کرتا ہے۔“ اس نے فریاد سنائی۔

”یہ شاکر کون ہے، اور آپ پر کیوں ظلم کرتا ہے؟“

”شاکر میرا بیٹا ہے۔ وہ مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ وہ مجھے مارتا پیٹتا ہے، اور کھانا بھی نہیں دیتا۔“ وہ بلک بلک کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

اس کی حالت زار دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

اس عمر رسیدہ خاتون کو دیکھ کر لگتا تو یہی تھا کہ اس کا ذہنی توازن بھی درست نہیں ہے۔

”آپ اپنے بیٹے کا نام بتائیں، ہم ابھی اسے پکڑ کر لاتے ہیں۔“ میں نے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

میں نے اس کے لیے کھانا منگوایا۔ کھانا اس کے آگے رکھا گیا تو وہ کھانے پر ایسے ٹوٹ پڑی، جیسے کئی دنوں سے کھانے کی شکل نہ دیکھی ہو۔

کھانے کے بعد میں نے اس کے لیے چائے منگوائی، جو وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

اس نے بیٹے کا نام شاکر علی بتایا تھا۔ گھر کا ایڈریس پوچھا تو وہ بھی اس نے تقریباً ٹھیک بتایا۔

میں نے دو اہلکاروں کو اس کے گھر روانہ کیا، وہ ایک گھنٹے میں شاکر کو پکڑ کر لے آئے۔

شاکر علی دیکھنے میں ہی خستہ حال اور غربت زدہ دکھائی دیتا تھا۔

کانسٹیبلوں کے ہمراہ ہاتھوں میں ہتھکڑی لگائے، جب وہ اپنی ماں کے سامنے حاضر ہوا تو ایک نیا مسئلہ سامنے آ گیا۔

ماں نے بیٹے کو ہتھکڑیوں میں دیکھا تو، آپے سے باہر ہو گئی۔ بولی۔ ”میرے پتر نوں چھڈ دیو۔ اسے ہتھکڑیاں کیوں لگائی ہیں؟“

”اماں جی، یہ وہی شاکر ہے، جو آپ پر ظلم کرتا تھا، آپ کو کھانا نہیں دیتا تھا۔“ میں نے اماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”میرا پتر ہے نا۔ میرے ساتھ جو بھی سلوک

UUNOVELS.COM

کرے۔ مجھے منظور ہے۔" اماں کی بات سن کر میں سٹپٹا گیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں جی۔ آپ نے باقاعدہ تھانے میں آ کر اپنے بیٹے کے خلاف شکایت درج کرائی ہے۔ ہم نے آپ کی شکایت پر اسے گرفتار کیا ہے۔" میرا لہجہ احتجاج لیے ہوئے تھا۔

"میں نے شکایت لگائی تھی نا۔ ٹھیک ہے، اب میں اپنی شکایت واپس لیتی ہوں۔ میں نے اسے معاف کیا۔"

اماں کی بات سن کر پہلے تو ہم سب بھونچکا رہ گئے اور پھر مسکرانے لگے۔

ماں کی ممتا کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ بیٹے کو ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھا تو وہ اس کے سبھی مظالم اور اگلے پچھلے سب گلے شکوے بھول گئی۔

میں نے اشارہ کیا تو کانسٹیبل نے اس کے بیٹے کی ہتھکڑی کھول دی۔

میرے کہنے پر شاکر نے اپنی ماں سے معافی مانگی اور ماں نے معاف کرنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگایا۔ دونوں ہنسی خوشی وہاں سے رخصت ہو گئے۔

یہ ماں کی ممتا اور محبت کی ایک ادنیٰ سی مثال تھی ورنہ تو میری زندگی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

خود میری ماں اپنی اولاد کے لیے سراپا محبت تھی۔

اشفاق احمد مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ آدمی عورت سے محبت کرتا ہے، جبکہ عورت اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے۔ اس بات کی مکمل سمجھ مجھے اس رات آئی۔

آج سے آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔

میری شادی ہوئے تقریباً دو سال ہو گئے تھے اور بڑا بیٹا قریب ایک برس ہوگا۔

خدا کی کرنی کچھ ایسی ہوئی کہ اس رات میں اور میرا بیٹا، دونوں کو بخار ہو گیا۔

کمرے میں تین لوگ تھے۔ میں، میرا بیٹا اور اس کی والدہ، یعنی میری بیوی۔

تین میں سے دو کو بخار تھا۔ مجھے کوئی ایک سو تین درجہ اور میرے بیٹے کو ایک سو ایک درجہ۔

اگرچہ میری حالت میرے بیٹے سے کہیں زیادہ خراب تھی۔ تاہم میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے کمرے میں صرف دو ہی لوگ ہیں۔ میرا بیٹا اور اس کی ماں۔

وہ بیٹے کی فکر میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

بری طرح نظرانداز کیے جانے کے احساس نے میرے خیالات کو زیر و زبر تو بہت کیا لیکن ادراک کے گھوڑے دوڑانے پر عقدہ یہی کھلا کہ عورت نام ہے اس ہستی کا کہ جب اس کو ممتا دیت کر دی جاتی ہے، تو اس کو پھر اپنی اولاد کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ اپنا شوہر بھی کہیں پس پشت چلا جاتا ہے اور جب اس کی اولاد کسی مشکل میں ہو، تو وہ ممتا کے ہاتھوں اندھی ہو جاتی ہے۔

اس نتیجے کے ساتھ ہی ایک نتیجہ اور بھی نکالا میں نے، اور وہ یہ کہ اگر میرے بیٹے کے درد کا درماں ماں کی آغوش ہے، تو یقیناً میرا علاج بھی میری ماں کی آغوش ہوگی۔

اس خیال کا آنا تھا کہ میں بستر سے اٹھا۔ چپل پہنی اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"آپ رات کے اس پہر کہاں جا رہے ہیں؟" بیوی نے بوکھلا کر پوچھا۔

"سکون کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں۔ آپ کس سکون کی بات کر رہے ہیں؟"

"اس سکون کی بات کر رہا ہوں، جو صرف ماں کی گود میں سر رکھنے سے ہی ملتا ہے۔"

وہ میری بات کی تہہ تک پہنچ گئی، اور خاموش ہو گئی۔

میں اپنے کمرے سے نکلا۔ برآمدے کے بعد صحن عبور کیا اور صحن میں لگے ہوئے اس چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا، جو میرے بھائی کے صحن میں کھلتا تھا۔

جس دروازے کی دوسری جانب میرا سکون، میری جنت تھی۔

دروازے کی کنڈی کھولی اور بھائی کے صحن میں داخل ہو گیا۔

سامنے امی کا کمرا تھا۔ میں ان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

رات کے دو بجے تھے مگر جونہی میں نے ان کے کمرے کا دروازہ کھولا، وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ جیسے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

میرا ہی انتظار کر رہی ہوں۔

''حیدر......'' انہوں نے مجھے پکارا۔

''جی امی۔'' میں ان کی چارپائی پر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

کمرے میں لگے نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں وہ میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگیں۔

''تم ٹھیک تو ہو نا...... تمہارا چہرہ کیوں لال انگارہ بنا ہوا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بخار ہو گیا ہے امی!'' میں نے جواب دیا۔ اور ان کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا۔

بس پھر کیا تھا۔ وہ میرے بالوں میں محبت سے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پھیرنے لگیں... اور میں ناقابل بیان سکون اور فرحت محسوس کرتے لگا۔ بالکل ایک سال کے بچے کی طرح ان کی گود میں منہ چھپالیا۔

انہوں نے ممتا بھری توجہ اور محبت کی اتنی ہیوی ڈوز سے میری آغوش تھراپی کی کہ میں صبح تک بالکل بھلا چنگا ہو گیا۔

وہ نماز پڑھنے کے لیے فجر کے وقت اٹھیں، تو میں ان کے بستر میں پُرسکون اور گہری نیند سو رہا تھا۔ بخار کا نام ونشان تک نہ تھا۔

پھر تو جیسے میں نے یہ اصول ہی بنا لیا۔ جب کبھی کسی چھوٹے بڑے مسئلے یا بیماری کا شکار ہوتا کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے سیدھا مرکزی ممتا شفا خانہ برائے توجہ اور علاج میں پہنچ جاتا۔

وہاں پہنچ کر مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بس میری شکل دیکھ کر ہی مسئلہ کی نوعیت کا اندازہ لگا لیا جاتا۔ میڈیکل ایمرجنسی ڈیکلئر کر دی جاتی۔ مجھے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ (امی جی) کے ہی بستر پر لٹا دیا جاتا اور ان کا ہی کمبل اوڑھا دیا جاتا۔ کسی کو یخنی کا حکم ہوتا تو کسی کو دودھ لانے کا، خاندانی معالج کی ہنگامی طلبی ہوتی۔ الغرض توجہ اور محبت کی ایسی ہیوی ڈوز اور آغوش تھراپی ہوتی اور میں بیماری کی نوعیت کے حساب سے کبھی چند گھنٹوں اور کبھی چند پہروں میں روبہ صحت ہو کر ڈسچارج کر دیا جاتا۔

یہ سلسلہ تقریباً امی جان کی وفات تک جاری و ساری رہا۔

مجھے آج بھی یاد ہے۔ وہ وسط نومبر کی ایک خنک شام تھی۔ جب میں ڈیوٹی کے لیے گھر سے روانہ ہونے لگا، تو مجھے لگا کہ مکمل طور پر صحتمند نہیں ہوں۔

تبھی میں نے آغوش تھراپی کروانے کا فیصلہ کیا اور دفتر جانے کی بجائے ماں جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

لیکن وہاں پہنچنے پر ایک اور ہی منظر دیکھنے کو ملا۔ امی جان کی اپنی حالت کافی ناگفتہ بہ تھی۔ پچھلے کئی روز سے چل رہے پھیپھڑوں کے عارضہ کے باعث بخار اور درد کا دور چل رہا تھا۔

میں خود کو بھول کر ان کی تیمارداری میں جت گیا۔ مختلف ادویات دیں۔ خوراک کے معروف ٹوٹکے آزمائے۔ کبھی چاپی کی۔

مختصر یہ کہ...... کوئی دو گھنٹے بعد ان کی طبیعت سنبھلی، اور وہ سو گئیں۔

میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔

ابھی گھر پہنچے آدھ گھنٹا ہی بمشکل گزرا ہو گا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

دیکھا تو چھوٹے بھائی کا نمبر تھا۔ سو طرح کے واہمے ایک پل میں آ کر گزر گئے۔ جھٹ سے فون اٹھایا، اور چھوٹتے ہی پوچھا۔

''بھائی سب خیریت ہے نا؟'' بھائی بولا۔ ''سب خیریت ہے۔ وہ اصل میں امی جی پوچھ رہی ہیں کہ آپ کی طبیعت ناساز تھی اب کیسی ہے؟''

''اوہ میرے خدایا......'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ مائیں بھی نا......'' حالانکہ میں نے امی کے سامنے اپنی ناسازی طبیعت کا بالکل بھی تذکرہ نہیں کیا تھا مگر وہ پھر بھی جان گئی تھیں کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔

اس روز میرے ذہن میں ماں کی تعریف مکمل ہو گئی تھی۔ ماں وہ ہستی ہے جو اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر اپنا دکھ، حتیٰ کہ اپنا آپ بھی بھول جاتی ہے۔

آج امی جان کو رحمان کی رحمت میں گئے ایک سال اور آٹھ ماہ ہو گئے ہیں۔

آج مجھے پھر بخار ہوا ہے۔ آغوش تھراپی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے... مگر میرا مرکزی ممتا شفا خانہ برائے توجہ اور علاج ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔

++

UUNOVELS.COM

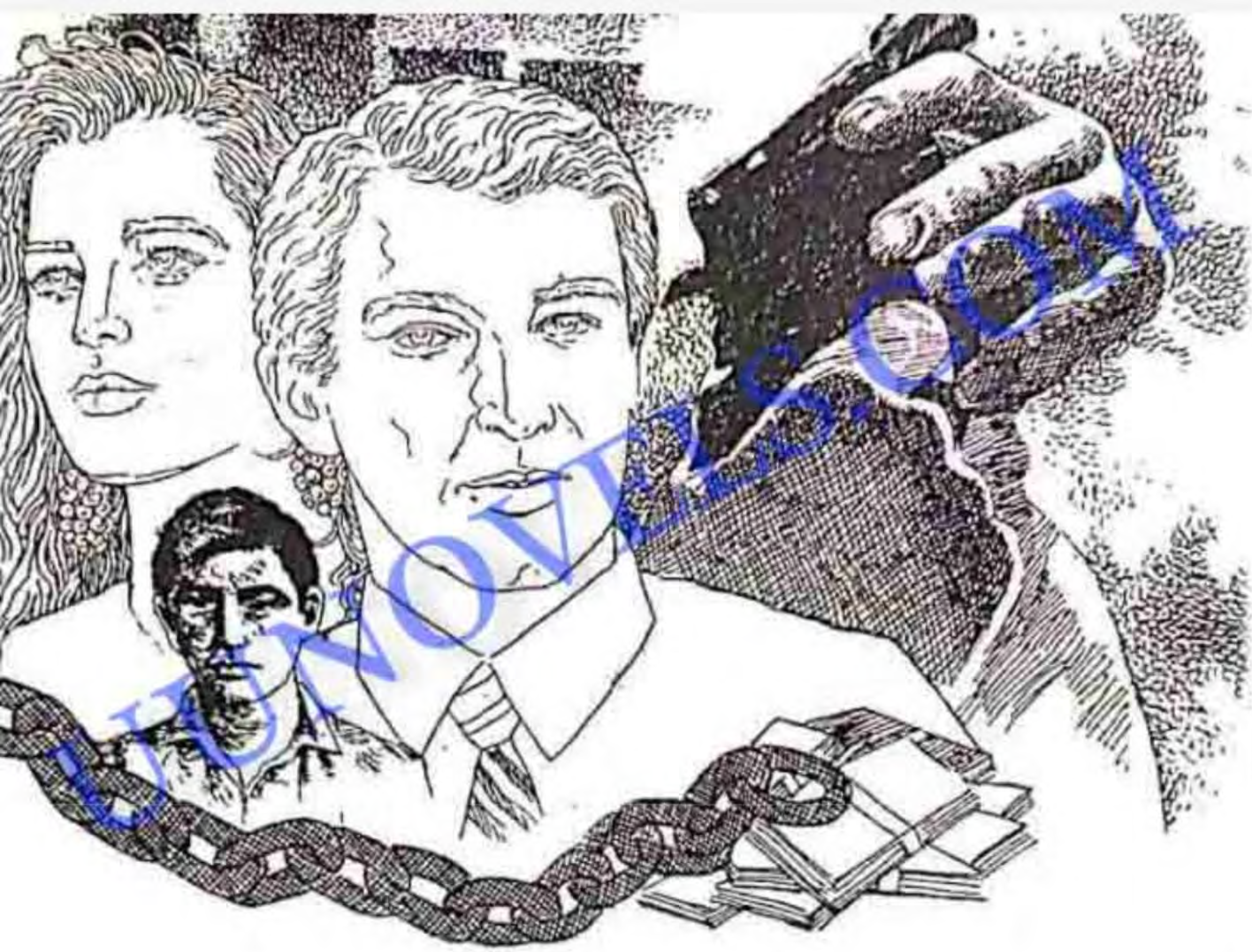

UUNOVELS.COM

عیار

محترم مدیر

السلام علیکم!

زیرِ نظر سچ بیانی میرے دوست افضل کے ایک رشتے دار کی ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ غم ناک ہے لیکن اس نے جو کچھ کیا، جس طرح سے انتقام لیا یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ روداد مجھے پسند آئی اس لیے پیش کر رہا ہوں۔

UUNOVELS.COM

خلیل جبار
(حیدر آباد)

آج صبح سے موسم بہت خوشگوار تھا۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا جہاں سے باہر سڑک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ دیکھنے میں یہ منظر بڑا دلکش و حسین لگ رہا تھا۔ بارش کی شدت میں تیزی آگئی جس کے باعث لوگ بارش کے پانی سے بچنے کو اِدھر اُدھر چھپنے کو جگہ تلاش کرنے لگے تھے۔ دکانداروں کو اپنے سامان کو بارش سے بچانے کی فکر لگ گئی تھی اسی لیے وہ بھی دکان سے باہر نکلے سامان کو اندر کرنے لگے تھے۔ یہ منظر

دیکھ کر مجھے کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اس دن بھی ایسا ہی موسم تھا۔ میں آفس جانے کو تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ آسمان پر چھائی گھٹا سے لگ رہا تھا کہ آج موسم برسنے کو ہے۔ آفس جانا بھی ضروری تھا۔ اس موسم کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے قدم بس اسٹاپ کی جانب بڑھ گئے۔ جب میں بس اسٹاپ پر پہنچا تو ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ مطلوبہ بس آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ بارش میں تیزی کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے میں نے خود کو بارش سے بچانے کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ سڑک کے کنارے گھنا درخت بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں جیسے ہی برگد کے درخت کے نیچے آیا۔ بارش کی شدت میں تیزی آ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کوئی اور بھی درخت کے نیچے پناہ لینے کو آیا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ نسرین تھی۔ اس وقت میں اس کا نام نہیں جانتا تھا صرف صورت آشنا تھا۔ صبح کے اوقات میں جب دفتر جانے کے لیے اسٹاپ پر پہنچا تو وہ بھی اسٹاپ پر موجود ہوتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی بس میں جاتے تھے۔ میں جب بھی اس پر نگاہ ڈالتا وہ فوراً نظریں نیچے کر لیتی تھی۔ میں بھی اس کے اس عمل پر دوسری طرف دیکھنے لگتا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے راہ رسم بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمیں بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔ لوگ ایک ملاقات میں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جاتے ہیں، ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھا لیتے ہیں۔ میں وہ واحد شخص تھا جو نسرین کو پسند کرنے لگا تھا مگر ایک سال میں بس اتنی بات بڑھی تھی کہ میں اس پر ایک نظر ڈال لیتا تھا۔

اکثر تنہائی میں اس کے متعلق سوچتا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے۔ ملازمت کہاں کرتی ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے۔

آج قسمت کو میری حالت پر ترس آ گیا تھا۔ ہم دونوں برگد کے درخت کے نیچے آ کھڑے ہوئے تھے۔ بہت قریب آ گئے تھے۔ نسرین سے ایک سال کی شناسائی تھی اور میں اس سنہری موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے دل نے سرگوشی کی۔ ''وقار اس سے اچھا موقع شاید پھر کبھی آئے یا نہ آئے تُو نے آج بات کرنے میں دیر کر دی تو ساری زندگی افسوس کرتا رہے گا کہ کاش اس کی شادی ہونے سے قبل بات کر لیتا۔''

درخت کے نیچے صرف ہم دونوں تھے اس لیے جو بھی بات کرتے وہ اس درخت تک ہی محدود رہتی۔ کوئی تیسرا نہ ہونے کے سبب بات آگے تک نہ پھیل پاتی۔

''بارش آج بالکل غیر متوقع ہوئی ہے۔'' میں نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

''کراچی کے موسم کا کچھ پتا ہی نہیں کب اور کس علاقے میں بارش ہو جائے۔'' نسرین نے کہا۔

''ہاں یہ بات بالکل درست ہے، یہاں بارش ہو رہی ہے آگے جائیں گے تو وہاں دھوپ نکلی ہو گی۔ پورے کراچی کا موسم ایک جیسا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''بارش ہونے پر گاڑیاں ملنا بھی دشوار ہو جاتی ہیں۔'' وہ بولی۔

''گاڑی والوں کے بھی بارش میں نخرے ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''جب سفر کرنا ہے تو ان کے نخرے بھی برداشت کرنا ہوں گے۔'' وہ مسکرائی۔

''ہاں یہ بات تو ہے، تمہاری جاب کہاں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''میں ستارہ انٹرنیشنل میں کام کرتی ہوں۔''

''ارے یہ کمپنی تو میرے آفس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی ہے۔'' میں چونکا۔

''جبھی تو ہم ایک ہی بس میں ایک ہی وقت اس اسٹاپ سے جاتے ہیں۔''

''ہم تقریباً ایک سال سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں مگر کبھی ایسا موقع ہی نہیں ملا کہ ایک دوسرے سے بات کر سکیں، ایک دوسرے کے بارے میں واقفیت کر لیں۔''

''ایک سال کے دوران بارش بھی تو نہیں ہوئی کہ اس طرح ہم ایک درخت تلے آ جاتے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''یہ بارش کی مہربانی ہے اس نے ہم دونوں کو بات چیت کا موقع دیا۔''

''ہاں واقعی قسمت کو ہم دونوں کی حالت پر رحم آ گیا ہے۔'' نسرین مسکراتے ہوئے بولی۔

''ایسا لگ رہا ہے کہ آج کمپنی سے چھٹی ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟'' وہ چونکی۔

''اگر بس نہ ملی تو۔''

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

"ہاں بارش بھی ایک طرح سے ہڑتال ہی ہوتی ہے۔لوگ بارش کو جواز بنا کر چھٹی کر لیتے ہیں۔"

"کراچی کی زندگی بھی مشین بن کر رہ گئی ہے۔اتوار کی چھٹی کے علاوہ کوئی اور چھٹی نہیں ہوتی۔ایسے میں لوگ بارش یا کوئی اور بہانہ مل جانے پر چھٹی کر لیتے ہیں تا کہ کچھ آرام کرنے کا موقع مل سکے۔"

"چھٹی کا بھی اپنا مزہ ہے۔" وہ بولی۔

"تمہارا گھر اسٹاپ کے قریب ہی ہے۔"

"ہاں اسٹاپ سے چند گلیاں چھوڑ کر ہی میں رہتی ہوں۔چچا بٹن والے کا نام سنا ہے۔"

"ہاں چچا بٹن والے کو کون نہیں جانتا۔ان کی بٹن اور کپڑوں کی سلائی میں استعمال ہونے والے سامان کی دکان ہے۔" میں نے اپنی یادداشت پر زور دیا۔

"ان کی دکان سے تین مکان چھوڑ کر ہی ہمارا گھر ہے۔" نسرین نے بتایا۔

اچانک دور سے آتی بس ہمیں نظر آ گئی اور ہم دونوں نے بس میں سوار ہونے کو اسٹاپ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔میں بھی کسی طرح سوار ہو کر اندر جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

آج نسرین سے بات کر کے دل کو ایک عجیب خوشگوار سا احساس ہو رہا تھا کہ جیسے میں نے کوئی بہت بڑی مہم سر کر لی ہو۔اس سے شناسائی ہو جانے پر ہم ایک دوسرے سے قریب آ گئے تھے۔ایک دوسرے کے بارے میں جو معلومات شیئر نہیں ہو سکی تھیں آنے والی ملاقاتوں میں پوری ہو جاتی تھیں۔دونوں کمپنیوں کا لنچ کا وقت ایک ہی تھا۔دو بجے سے تین بجے تک اس لیے ہم لنچ میں ایک دوسرے سے آسانی سے ملاقات کر سکتے تھے۔

وہ دن میرا بہت اچھا گزرا تھا۔دل کی عجیب کیفیت تھی،خوشی چھپائے چھپ نہیں رہی تھی۔میرا معمول تھا میں آفس کے کام سنجیدگی سے نمٹاتا تھا۔آج میرے ساتھی بھی میری شوخی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔

"لگتا ہے آج سفر بہت اچھا کٹا ہے۔" آفاق نے کہا۔

"ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

"سمجھ لو سے کیا مراد ہے۔" ثاقب کو بھی شوخی سوجھی۔"کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ......"

"کبھی کبھی انسان کو بغیر وجہ کے بھی خوش ہو جانا چاہیے۔" میں نے بات ٹالنا چاہی۔

"انسان کے چہرے سے پھوٹتی خوشی کبھی بے سبب نہیں ہوتی اس کے پیچھے بھی کوئی سبب ہوتا ہے۔" ثاقب نے کہا۔

"بارش کا ہو جانا بھی کبھی خوشی کا سبب بن جاتا ہے۔" میں نے بات کو ٹالنا چاہا۔

آفس کے ساتھی سمجھ گئے تھے کہ میری خوشی کا کوئی سبب ضرور ہے لیکن میں فی الحال ان پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

آج میری نسرین سے پہلی ملاقات تھی جس میں ہم دونوں میں بات چیت ہوئی تھی۔مستقبل میں ملاقاتیں جاری رہتی ہیں یا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

رات جب میں بستر پر سونے کو لیٹا تو دل کو خوشی و مسرت ہو رہی تھی۔یہ نسرین سے ملاقات کا اثر تھا۔دوسرے دن صبح پھر نسرین سے ملاقات کا تصور مجھے دلشاد کیے دے رہا تھا۔

صبح ہونے پر جب میں بس اسٹاپ پر گیا تو نسرین موجود تھی۔مجھے دیکھ کر مسکرائی۔رسمی طور پر حال احوال پوچھ کر میں نے دوپہر میں اس سے ملاقات کا وقت رکھ لیا۔لنچ کے وقت میں آفس سے نکلا اور قریبی ریستوران میں چلا گیا جہاں چند لمحوں بعد نسرین بھی آ گئی۔دوران گفتگو نسرین نے بتایا کہ اس کے والد دل کے عارضے میں مبتلا ہیں اور ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔گھر کے اخراجات پورے کرنے کو وہ یہ نوکری کر رہی ہے۔خوب صورت ہونے کے باوجود اس کے رشتے نہ آنا ان کی غربت زدہ زندگی ہے۔اس کے کزن کاشف نے ہی اس کمپنی میں اسے ملازمت دلائی ہے ورنہ اس کے والد کے ایسے تعلقات نہ تھے کہ اسے نوکری دلا سکیں۔

نسرین سے آج ملاقات ہونے سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ وہ کنواری تھی۔ہم دونوں کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ہم دونوں لنچ کے وقت ریستوران میں ملاقاتیں کرنے لگے۔اس ریستوران میں ایک یہ فائدہ تھا کہ فیملی روم الگ تھا جہاں بیٹھنے پر ہم دونوں کو کوئی کمپنی کا فرد نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن مجھے شاپنگ مال سے کچھ خریداری کرنی تھی۔میں ابھی شاپنگ مال سے دور تھا۔میں نے نسرین کو

UUNOVELS.COM

اپنے آفس ورکر کے ساتھ دیکھا۔ ان دونوں کے ہاتھ میں سامان تھا۔ وہ شاپنگ کر کے مال سے نکلے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ کاشف کو میں اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ اچھے کردار کا مالک نہیں تھا۔ لڑکیوں سے دوستی رکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ نسرین کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگنا یقینی بات تھی۔

"تو کیا نسرین بھی ایسی لڑکی ہے جو غیر مردوں کے ساتھ گھومنے اور تنہائی میں ملاقاتیں کرنے کو کوئی برائی نہیں سمجھتی۔" میں نے خود کلامی کی۔

میں نے اس کے بارے میں جو امیج بنایا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ واقعی انسان کسی کے بارے میں جو سوچتا ہے وہ سو فیصد درست نہیں ہوتا۔ کم از کم نسرین کو کاشف کے ساتھ دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا تھا۔ اس کا کردار میری نگاہ میں مشکوک ہو گیا تھا۔

میں اس سے کاشف کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر وہ میرے شاپنگ مال تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک رکشے میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میری نگاہیں ان دونوں کو ڈھونڈتی رہ گئیں۔

میرا خیال تھا دوسرے دن ملاقات ہونے پر وہ یہ کہے گی کہ وہ کوئی اور لڑکی ہوگی۔ میرا کسی بھی کاشف نامی نوجوان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب میں نے دوران ملاقات کاشف کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ شاپنگ مال سے نکل رہی تھی تو وہ مسکرا دی۔

"تم اس وقت کہاں تھے۔ ہمارے پاس کیوں نہیں آئے۔" وہ بولی۔

میں اس کی صاف گوئی پر حیران رہ گیا۔ اس نے جھوٹے سے بھی یہ بات نہیں کہی کہ وہ کاشف کے ساتھ نہیں تھی۔

"تم کاشف کو کیسے جانتی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"میں اسے کیسے نہیں جانوں گی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔"

"تم دونوں کو ساتھ دیکھ کر مجھے اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو جبھی ساتھ شاپنگ کر رہے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ تم اسے کیسے جانتی ہو۔"

"کاشف میرا کزن ہے۔ میرا کوئی بھائی نہ ہونے کی وجہ سے وہی گھر کے سارے کام کرتا ہے۔ والد اور والدہ کی طبیعت خراب ہو جانے پر ڈاکٹر کے پاس لے جانا، ان کا خیال رکھنا، اس کی ذمے داری میں شامل ہے۔"

"کیا وہ مستقبل میں گھر داماد بننے کا ارادہ تو نہیں رکھتا۔" میں نے پھیکی ہنسی چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

"تو یہ کریں میں اس سے شادی کروں گی۔"

"کیوں کیا خامی ہے اس میں۔" میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"کاشف دل کا اچھا ہے مگر اس میں ایک خامی ہے جس کی وجہ سے میں کبھی بھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔" نسرین نے کہا۔

"وہ کیا خامی ہے۔"

"کاشف دل پھینک ہے۔ ایسے لوگوں کی ازدواجی زندگی اچھی نہیں گزرتی، ہر وقت ایک دوسرے پر شک و شبے میں زندگی بیت جاتی ہے۔"

میں اس کی بات سے مطمئن ہو گیا۔ نسرین ایسی ویسی لڑکی نہیں تھی۔ وہ اگر خراب کردار کی مالک ہوتی تو ضرور کاشف میں دلچسپی لیتی۔

"تم بھی کاشف کو اچھی طرح سے جانتے ہو گے، وہ تمہارے ہی آفس میں کام کرتا ہے۔" نسرین نے کہا۔

"ہاں جبھی تو اسے تمہارے ساتھ دیکھ کر میں چونکا تھا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ دفتر کیوں نہیں لاتا۔"

"میں خود ہی کوشش کرتی ہوں کہ اس کے ساتھ نہ جاؤں، بہت مجبوری میں ہی اس کے ساتھ جاتی ہوں۔"

"وہ کیوں؟" میں چونکا۔

"اس کی شہرت اچھی نہیں ہے ورنہ لوگ طرح، طرح کی باتیں بنانے میں دیر نہ لگائیں گے، اسی لیے احتیاط کرتی ہوں۔" نسرین نے بتایا۔

"یہ تم بہت اچھا کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

نسرین سے ملاقات ہو جانے پر میں اچھی طرح سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس معاملے پر اس سے بات نہ کرنے پر میں اس سے بدگمان ہی رہتا۔ میں نسرین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ بس مجھے پروموشن کا انتظار تھا۔ میں جس گھر میں رہتا تھا وہ بہت چھوٹا تھا۔ اوپر سے بڑے بھائی کی فیملی بھی ساتھ تھی جو بڑی تھی۔ شادی کر کے ہر صورت میں مجھے اپنے لیے الگ گھر لینا تھا۔ میرے گھر والوں اور نسرین کے گھر والوں کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ کاشف کو جب یہ پتا چلا کہ میں نسرین سے شادی کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں تو اس نے اپنی خالہ اور خالو کے سامنے میری خوب تعریفیں کیں

UUNOVELS.COM

تا کہ یہ رشتہ طے پا جائے۔ کاشف بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ میری پروموشن ہونے والی ہے۔ پروموشن ہونے پر میں اس کا خیال رکھوں گا۔ میری سفارش پر اسے کیشیئر کا عہدہ مل جائے گا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ کمپنی میں کیشیئر بن جائے اس طرح لوگ اس کی خوب عزت کریں گے۔ اس کی مرضی پر ہی لوگوں کو ایڈوانس وغیرہ مل سکے گا اور وہ مالکان کے قریب آجائے گا۔ کیش اور دیگر معاملات میں مالکان اس کے مشورے ضرور سنیں گے اور عمل کریں گے۔

پروموشن ہوتے ہی میں نے گھر والوں سے نسرین کے گھر پیغام بھجوایا جسے فوراً قبول کرلیا گیا۔

نسرین سے شادی ہوجانے پر ہم نئے گھر میں شفٹ ہوگئے لیکن باقاعدگی سے ہر ہفتے والدین سے ملاقات کرنے بھی جاتے تھے۔ پہلے میں اپنے والدین کے اور پھر سسرال جاتا تھا۔ میں نے اور نسرین نے بہت چاہا کہ نسرین کے والدین کو اپنے گھر لے آئیں لیکن وہ لڑکی کے گھر رہنے کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے اپنے گھر میں ہی رہتے رہے۔ اس طرح میرے والدین بھی اپنے گھر میں خوش تھے۔ ہمارا پرانا گھر گنجان آبادی والا علاقہ تھا۔ رشتے داروں عزیزوں کے گھر اسی علاقے میں تھے اس وجہ سے والد نے پرانے گھر میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔

میں نے کاشف کی خواہش پر اسے آفس میں کیشیئر کی جاب دے دی اس طرح سے میرا وعدہ پورا ہوگیا اس لیے وہ مجھ سے بہت خوش تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا میرے تعریف کرنے کے ساتھ کیشیئر بنانے کا شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔

میری ترقی کے ساتھ میری ذمے داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ آفس کے سلسلے میں ہونے والی میٹنگوں کے سلسلے میں کبھی لاہور، پشاور، کوئٹہ بھی جانا پڑتا تھا۔ زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ بس کمی تھی تو اولاد کی تھی۔ میری شادی کو تین سال ہوچکے تھے لیکن ابھی تک اولاد کی دولت سے محروم تھا مگر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں تھا۔ میرے سننے میں اکثر یہ آتا تھا کہ کسی کو شادی کے پانچ سال کسی کو دس سال بیت جانے پر اولاد کی نعمت ملی ہے مگر ہماری شادی کو تو ابھی چند سال ہی ہوئے تھے۔

میں آفس کے کام سے لاہور گیا تھا۔ مجھے پورا ایک ہفتہ لاہور میں قیام کرنا تھا۔ نسرین کو بھی گھر میں اکیلے رہنے کی عادت ہوگئی تھی اس لیے میں نسرین کی طرف سے بے فکر رہتا تھا۔ اگر کبھی اس کا دل گھبراتا تو وہ ایک دو دن کے لیے کبھی اپنے والدین کو یا میرے والدین کو گھر پر بلالیتی تھی۔

میرا کام ہفتہ پورا ہونے سے دو دن قبل ختم ہوگیا تھا اس لیے میں نے لاہور میں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نسرین کو سرپرائز دینا چاہتا تھا اس لیے اپنی آمد کی اطلاع اسے نہیں دی تھی۔ فلائٹ لیٹ تھی اس لیے میں جب کراچی ائرپورٹ پر اترا اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ پھر بھی ٹیکسی مل گئی۔ گھر کے پاس ٹیکسی رکوائی اور ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر بنگلے کی جانب بڑھا۔

نسرین جلدی سوجانے کی عادی تھی اس لیے میں نے بیل بجا کر اس کی نیند خراب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چابی میرے پاس موجود تھی۔ تالا کھلنے پر میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا اور گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ دروازے کو لاک کرکے میں نے ابھی چند قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ گھر کے دروازے کے قریب والے کمرے سے نسرین کی کسی سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ کمرا ہم نے مہمانوں کے لیے مختص کیا ہوا تھا۔ نسرین کی باتیں کرنے پر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ کس سے بات کررہی ہے اور اتنی دیر تک کیوں جاگ رہی ہے۔ میری فلائٹ میں سوار ہونے سے قبل نسرین سے بات ہوئی تھی اس نے کسی مہمان کے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی تھی ورنہ میں یہی سمجھتا کہ مہمان سے بات کررہی ہے۔

میں نے بیگ کو ایک طرف رکھا اور دبے پاؤں کمرے کی جانب بڑھا۔ مجھے نسرین پر پورا بھروسا تھا۔ وہ کبھی بھول کر بھی امانت میں خیانت نہیں کرے گی۔ میں بھی ایک مرد ہوں میرے دل میں شک کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ کسی مرد سے بات کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آواز سن کر ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ آواز میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔

”یہ کون مرد ہے اور اس وقت یہاں کیا کررہا ہے؟ میرے اندر تجسس نے جنم لیا۔“

میں نے احتیاط کا مظاہرہ کیا اور کھڑکی سے اس طرح جھانکا کہ اندر والوں کو میں نظر نہ آسکوں۔ اندر کا منظر دیکھ کر میرا چہرہ فق ہوگیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نسرین اس حد تک گر سکتی ہے۔ نسرین اور کاشف دونوں قابل اعتراض حالت میں بیڈ پر پڑے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میری

UUNOVELS.COM

مردانہ فطرت جاگ اٹھی اور کیسے نہ جاگتی میں بھی ایک مرد تھا۔ میں یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ میری بیوی میری غیر موجودگی میں میری اور اپنی عزت کا خیال نہیں رکھے گی۔

میں غصے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ الماری سے ریوالور نکالا، اسے چیک کیا۔ اس میں پوری چھ گولیاں موجود تھیں۔ تین گولیاں بے وفا نسرین اور تین گولیاں کاشف کے لیے کافی تھیں۔ جو عورت شوہر کی امانت کی حفاظت نہ کرسکے اسے دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

میں سخت غصے میں تھا۔ زندگی میں کبھی مجھے اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔ جتنا اس وقت آرہا تھا۔ پولیس کے سامنے میں سب کچھ سچ، سچ بتادوں گا۔ یہ دونوں قتل غیرت کے نام پر کیے ہیں۔ میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ میری عزت سے کھیلتی رہے اور میں چپ رہوں۔

یہ ریوالور میرے پاس پانچ سال سے تھا۔ اس ریوالور سے میں نے ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں مارا تھا لیکن آج رات میں دو انسانوں کی جان لینے جارہا تھا۔ وہ مجھے اچانک سامنے دیکھ کر میرے ہاتھوں میں ریوالور پاکر دونوں ہی گڑگڑائیں گے۔ میری منتیں کریں گے لیکن میں کسی صورت ان کو معافی نہیں دوں گا۔

میں تیزی سے اس کمرے کی جانب بڑھا۔ اچانک ایک بات نے میرے قدم روک دیے۔ میں کمپنی میں ایک بڑے عہدے پر ہوں۔ جب اخبارات میں یہ واقعہ شائع ہوگا تو لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ اس وقت میں اپنے مستقبل کو شاندار بنا سکتا ہوں۔ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ بیک وقت کئی شادیاں کرسکتا ہوں۔ قاتل بنتے ہی میرا مستقبل تباہ ہوجائے گا۔ میری زندگی قید میں گزرے گی۔ میں اپنے انتقام کے لیے نسرین کو طلاق دے کر اپنی تسکین پوری کرسکتا ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں انتقام لینے کی طاقت رکھتا ہوں اگر کسی نے مجھ سے پوچھ بھی لیا تو میں یہ کہہ کر کہ نسرین بانجھ ہے یا مجھ سے اس کی نہیں نبھ سکتی اس لیے چھوڑ دیا۔ اسے طلاق دے کر لوگوں سے جان چھڑانے کو سو بہانے تھے لیکن اسے قتل کرکے مجھے یہ بتانا پڑتا کہ وہ آوارہ، بدچلن تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں جس تیزی سے ریوالور لے کر کمرے سے باہر گیا تھا اسی تیزی سے کمرے میں واپس آگیا۔

کمرے میں آکر میں پوری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند کوسوں دور ہوگئی تھی۔ صبح جب نسرین میرے کمرے میں آئی تو مجھے دیکھ کر بری طرح سے چونکی۔

''تت......تت......تم کب آئے؟'' وہ بولی۔

''میں رات گئے آیا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''بیل بجادیتے، میں دروازہ کھول دیتی۔'' نسرین نے کہا۔

''میں نے یہ سوچ کر بیل نہیں بجائی کہ تم جلدی سو جانے کی عادی ہو۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ تم جاگ رہی ہوگی۔'' میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

نسرین کا چہرہ فق ہوچکا تھا۔

''م......م......میں......''

''اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے رات وہ کھیل دیکھ لیا جو میرے پیچھے تم کھیل رہی ہو۔''

''تت......تت......تم نے......''

''رات تمہیں یہ یقین نہ تھا کہ میں آجاؤں گا اسی لیے تم دونوں بے فکری سے آپس میں گم تھے۔''

نسرین کے پاس اپنی جھوٹی گواہی دینے کو کچھ باقی نہ رہا تھا۔ اس کے زرد پڑتے چہرے کو میں غور سے دیکھ رہا تھا۔

''خدا کے لیے مجھے معاف کردو، میں شیطان کے بہکاوے میں آگئی تھی۔'' نسرین میرے پاؤں میں پڑگئی۔

''یہ مت کہنا کہ اس کھیل میں تم شریک نہ تھیں، میں کاشف کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں، رات جس بے باکی سے کھیل جاری تھا وہ دیکھ کر صاف پتا چل رہا تھا کہ تم یہ کام میری غیر موجودگی میں کرتی رہتی ہو، میرے ریوالور میں چھ گولیاں تھیں تم دونوں کے لیے تین تین گولیاں کافی تھیں۔ تم دونوں ہی اس بات کے مستحق تھے کہ تمہیں گولیاں ماردوں۔ امانت میں خیانت کا یہی انجام ہوتا ہے۔''

''تم پہلے میری بات سن لو۔'' نسرین نے کہا۔

''مجھے پتا ہے تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو، میں نے مجبور ہوکر ایسا کام کیا ہے بولو یہی کہنا چاہتی ہو نا؟'' میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

میری اس بات پر وہ ایک لمحے کو چونکی اور خاموشی سے نظریں نیچی کرکے زمین کو گھورنے لگی۔

''میرے تصور میں بھی نہ تھا کہ تمہارا کردار اس قدر گھناؤنا بن کر میرے سامنے آئے گا۔ میں تمہاری خوشیوں کی خاطر کتنی محنت کرتا ہوں کبھی تم نے سوچا ہے۔''

''مجھے احساس ہے تم میری ہر خواہش کو پورا کرنا اپنی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

اہم ذمے داری سمجھتے ہو میری زبان سے خواہش کا اظہار ہوا اور تم نے میری خواہش پوری کر دی۔"

"اور تم نے اس کا یہ صلہ دیا ہے۔"

"کاشف نے میری مجبوری کا فائدہ اٹھایا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے وہ میرا کزن تھا یہ بات تمہارے علم میں بھی ہے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"میری والدہ زینب اور والد شیراز اس پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتے تھے۔ مجھے کوئی بھی کام ہوتا تھا امی جان اس کے ساتھ بازار بھیج دیتی تھیں۔ تم سے ملاقات ہونے سے قبل ایک سال پہلے کی بات ہے مجھے گھر کا سودا سلف لینے کو بازار جانا تھا سامان خرید لینے کے بعد کاشف مجھے اپنے ایک دوست قاسم کے اسکول میں ملاقات کے بہانے لے گیا۔ قاسم ہمیں کولڈ ڈرنک دے کر چلا گیا۔ اس کولڈ ڈرنک میں جانے ایسی کیا چیز تھی کہ اس کے پیتے ہی میں بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو میں برہنہ حالت میں پڑی تھی۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ کاشف نے میرے ساتھ کیا حرکت کی ہے۔ میں نے اسے لعن طعن کی تو وہ ڈھیٹ بن کر مسکرانے لگا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "پہلی دفعہ ہر لڑکی ایسا ہی کہتی ہے جیسا تم کہہ رہی ہو مگر پھر وہی لڑکی مجھے ٹیلی فون کر کے بلاتی ہے۔"

گھر چھوڑتے ہوئے اس نے مجھے دھمکی دی۔ "آج جو کچھ بھی ہوا ہے اس کا ذکر مت کرنا۔ اس میں میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم لڑکی ہو، ساری بدنامی تمہاری ہوگی۔ جو لڑکی بدنام ہو جائے اس کا رشتہ بھی آسانی سے ہو نہیں سکتا اگر شادی ہو بھی جائے تو اس کا شوہر اپنی بیوی پر اعتماد نہیں کرتا۔"

"وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میرے شور کرنے پر میری ہی رسوائی تھی۔ وہ مرد ہو کر بھی بچ جاتا۔ مرد کو پھر بھی لڑکی مل ہی جاتی ہے۔ میں نے خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس میں میری بہتری تھی۔ میں نے اپنی کسی سہیلی اور والدین کو کچھ نہیں بتایا۔"

"اس نے میری خاموشی کو کمزوری سمجھا۔ وہ مجھے بلیک میل کرنے لگا تھا۔ کاشف نے میری برہنہ حالت میں تصویریں بنالی تھیں۔ اس کا جب دل چاہتا مجھے کسی نہ کسی جگہ لے جا کر من مانی کر لیتا تھا۔ ایک میں ہی نہیں اور بھی کئی لڑکیاں تھیں جن کو کاشف بلیک میل کر کے بلاتا تھا۔ شادی ہونے پر میں نے اسے سمجھایا خدا کا واسطہ دیا کہ اب میرا پیچھا چھوڑ دو، تمہارے پاس بہت لڑکیاں ہیں مگر یہ ڈھیٹ نہ مانا اور مجھے دھمکی دیتے ہوئے بولا کہ میری بات مان لینے میں تمہارا فائدہ ہے۔ میں کسی بھی ذرائع سے تمہاری برہنہ تصاویر تمہارے شوہر کو بھیج سکتا ہوں۔ یہ تصاویر دیکھ کر وہ شدید مشتعل ہو جائے گا اور وہ تمہیں طلاق دینے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرے گا۔ طلاق اور بدنامی کا داغ لے کر تم کہاں جاؤ گی۔ ہر جگہ رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرا کہنا ماننے میں ہی تمہاری عافیت ہے۔ میرے سمجھانے پر وہ باز نہیں آتا تھا۔ دفتر میں اس کی ترقی ہو جانے پر وہ کچھ سمجھداری کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے کم ملنے لگا تھا۔ خاص کر جب تم شہر سے باہر ہوتے تھے یہ آجاتا تھا۔"

"یہ بات جو تم کہہ رہی ہو مجھے شادی سے قبل بھی بتا سکتی تھیں پھر میری مرضی ہوتی کہ میں تم سے شادی کرتا یا نہیں۔"

"ہاں مجھے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ میں اس معاملے میں خود غرض ہو گئی تھی۔ تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے یہ حقیقت نہیں بتائی۔" نسرین نے کہا۔

"تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تم دونوں کو غیرت کے نام پر قتل کر دیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ جانتی ہو کیوں ایسا نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"ہم نے ایک ساتھ خاصہ عرصہ گزارا ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے مجھے ٹھیس پہنچائی ہے اس لیے ہم اب ساتھ نہیں چل سکتے۔ ساری زندگی میں تم پر شک کرتے گزاروں گا، شک بھری زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے راستے جدا کر لیں۔ تم سے میں نے جب کاشف سے شادی کرنے کے بارے میں پوچھا تو تم نے کہا تھا کاشف سے شادی کرنے پر ایک دوسرے پر شک وشبے میں زندگی گزرے گی اور تمہیں ہرگز منظور نہیں یاد ہے نا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے، اس لیے میں نے اپنے بارے میں یہ بات نہیں بتائی تھی۔ شادی ہو جانے پر تم مجھ پر شک کرتے ہوئے زندگی گزار دو گے۔"

"ایک بات ذہن نشین کر لو آج سے ہم دونوں کے راستے جدا ہیں۔ میں تمہیں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ تم طلاق ہونے کی اصل وجہ سب کو بتا دو، ہاں البتہ اپنے والدین کو ضرور بتا دینا تا کہ ان کو اندازہ ہو جائے کہ سگے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

رشتے کے علاوہ کسی اور پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ تم اپنے گھر جانے کو تیار ہو جاؤ۔ آفس جاتے ہوئے میں تمہیں گھر چھوڑتا چلا جاؤں گا۔ وکیل سے طلاق نامہ گھر بھجوا دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''کیا ایسی کوئی صورت نہیں نکل سکتی کہ تم مجھے معاف کر دو۔''

''میں نے تمہیں معاف ہی تو کر دیا ہے جبھی تم زندہ نظر آ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ کیا ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔''

''شیشہ ٹوٹنے پر چاہے اسے جوڑ دیا جائے مگر اس میں جو نشان آ جاتا ہے وہ ختم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح میں تم پر شک بھی کروں اور ساتھ بھی رکھوں ایسا کرنے پر مجھ سے بڑا منافق کوئی نہیں ہوگا۔ بہتر ہے ہم اپنے راستے جدا کر لیں تاکہ باقی بچ جانے والی زندگی سکون سے کٹ جائے۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا۔'' میں نے کہا۔

اتنا کچھ میرے سامنے آ جانے پر نسرین میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی مگر میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب زندگی بھر اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ عورت اپنے شوہر کی بے وفائی برداشت کر لیتی ہے مگر مرد کی فطرت میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ وہ بے وفا عورت کو برداشت کر لے۔ میں غیرت مند مرد تھا اس لیے پھر کس طرح نسرین کو برداشت کرتا۔

میں نے نسرین کا طلاق نامہ اس کے گھر بھجوا دیا۔ اس نے والدین کو سب کچھ سچ بتا دیا تھا اس لیے سسرال کی طرف سے کسی قسم کا کوئی احتجاج نہیں آیا۔ ان کے لیے یہی کافی تھا کہ میں نے نسرین کو عورت ہونے کی بنا پر معاف کر دیا تھا۔ میں نے کاشف کو بھی کچھ نہ کہا جو ہم دونوں میں دراڑ ڈالنے کا سبب بنا تھا۔ البتہ دل میں کاشف سے انتقام لینے کی شدت سے طلب تھی۔ وہ بھی میرے اس عمل پر حیران تھا کہ میں نے اسے کیوں سزا نہ دی۔ وہ شاید میری اس کمزوری کو میری بزدلی تصور کر رہا تھا اور واقعی میں نے انتقام نہ لے کر خود کو بزدل ثابت کیا تھا۔

نسرین کو طلاق دیے مجھے چار ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا مگر ذہن سے وہ واقعہ نہیں نکل سکا تھا۔ آج بھی جب آفس سے گھر کو نکلا۔ میرے ذہن میں نسرین کے متعلق ہی خیالات آ رہے تھے۔ میں اس بے وفا کو بھلا دینا چاہتا تھا مگر وہ ذہن سے جیسے چپک سی گئی تھی۔

میں ابھی گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر کال اٹینڈ کی۔ کال دفتر سے تھی۔ چپڑاسی ذوالقرنین کی بوکھلائی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''سر جلدی آفس پہنچیں۔''

''کیوں، کیا ہوا؟''

''کاشف پچاس لاکھ روپے کی رقم لے کر چلا گیا ہے۔ میں نے اسے روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر اس نے مجھے بھی زخمی کر دیا ہے۔''

''میں آفس پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

گھر سے نکلنے سے قبل متعلقہ تھانے کی پولیس کو بھی ٹیلی فون کر دیا تھا۔ جب میں آفس پہنچا، پولیس پہنچ چکی تھی اور چپڑاسی ذوالقرنین سے معلومات حاصل کر رہی تھی۔ پولیس کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''جب سب چلے گئے تو میں لائٹ چیک کرنے کاشف کے کمرے میں گیا تو وہ سیف سے رقم نکال کر بیگ میں رکھ رہا تھا۔ اس وقت سیف سے رقم نکالنا میری سمجھ سے باہر کی بات تھی اس لیے میں نے پوچھا کہ یہ اتنی رقم کہاں لے جا رہے ہو۔ بینک میں رقم جمع کرانے کا بھی وقت نہیں ہے۔'' اس پر وہ بولا۔ ''تم اپنی زبان کو خاموش رکھو، تم ابھی تک آفس سے کیوں نہیں گئے۔'' تب میں نے کہا کہ ''میں جا رہا تھا تمہارے روم میں روشنی دیکھ کر یہاں آ گیا۔'' اس پر وہ بولا کہ ''تم نے میرے کمرے میں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یہ بات بھی تمہارے علم میں آ گئی ہے کہ میں رقم بیگ میں ڈال کر لے جا رہا ہوں۔ میرے شاندار مستقبل کے لیے یہ رقم بہت ہے۔ کسی بھی دوسرے ملک میں جا کر شاہانہ زندگی گزاروں گا۔''

''میں تمہیں کمپنی کی رقم اس طرح نہیں لے جانے دوں گا۔''

کاشف میری اس بات پر مشتعل ہو گیا اور اس نے مجھ پر پیپر ویٹ سے حملہ کر دیا۔ زخمی سر سے خون بہہ رہا تھا مگر میں نے اسے چھوڑا نہیں۔ تب اس نے اس زور سے میرے گلے کو دبایا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ کاشف سمجھا کہ میں مر گیا ہوں اور مجھے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہوش آنے پر میں نے صاحب کو ٹیلی فون کر دیا۔'' چپڑاسی نے پولیس کو بتایا۔

مقدمہ درج ہوتے ہی کاشف کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس کو بار بار وہ یہ یقین دلاتا رہا کہ اس نے ایسا کوئی اقدام نہیں کیا اور نہ ہی اس کے پاس اتنی بڑی

UUNOVELS.COM

رقم موجود ہے۔ آفس کا کیمرا ہر وقت آن رہتا تھا لیکن اس دن آفس کا کیمرا سسٹم خراب تھا۔ کیمرا سسٹم خراب ہونے کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ یہ کام پوری پلاننگ سے کیا گیا ہے۔ اگر چپراسی نہ آجاتا تو وہ کامیاب ہو جاتا۔

کاشف پر پولیس نے خوب تشدد کیا لیکن وہ اس سے رقم برآمد نہ کرا سکی۔ پولیس نے کاشف پر دو دفعات لگوائی تھیں۔ اقدام قتل اور رقم چوری کرنے کی۔ کاشف پر اقدام قتل میں کم از کم سات سال قید ہو سکتی تھی۔ دوسرے مقدمے میں بھی کئی سال تک قید سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔

مجھے اس منصوبے پر کئی ہفتے لگے تھے۔ ذوالقرنین میرے آفس میں کام کرنے سے قبل اسٹیج پر اداکاری کرتا تھا۔ اس مہنگائی کے دور میں چھوٹے چھوٹے کردار ادا کرنے سے گھر کا گزارا کرنا بہت مشکل تھا۔ اس نے اداکاری کو خیرباد کہہ کر دفتر میں نوکری کر لی تھی۔ اسے دفتر میں کام کرتے ایک سال ہو گیا تھا۔ میں اکثر اس کی مالی مدد کر دیا کرتا تھا۔ ہر ماہ تنخواہ کے علاوہ الگ سے رقم ملنے سے وہ میرے قریب آ گیا تھا۔ میرے کام وہ بھاگ بھاگ کر کرتا تھا۔ وہ میری تعریفیں کرتا نہیں تھکتا تھا۔ ان دنوں وہ مالی طور پر بہت پریشان تھا۔ ذوالقرنین کی والدہ کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ علاج معالجے کو خاصی رقم درکار تھی۔ میں نے اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن موقع دیکھ کر اس سے کہا۔ ''ذوالقرنین تمہیں اچانک سے دس بیس لاکھ روپے کی رقم مل جائے تو تم اس رقم کا کیا کرو گے۔''

''سر کیوں ہم غریب لوگوں سے مذاق کرتے ہو، میرے پاس کوئی انعامی بانڈ نہیں ہے جس کے نکلنے پر اتنی رقم ہاتھ آ جائے اور نہ کوئی ایسا شخص دنیا میں موجود ہے جو اتنی بڑی رقم دے دے۔'' ذوالقرنین نے کہا۔

''فرض کر لینے میں کون سے پیسے خرچ ہو رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''سر مجھے آپ خیالی پلاؤ پکانے کا مشورہ دے رہے ہو۔''

''تم کیسے فنکار ہو، فنکار تو ڈائریکٹر کے اشارے کا منتظر ہوتا ہے وہ اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے لگتا ہے۔''

''سر میں اداکاری چھوڑ چکا ہوں۔''

''کیا اچھی آفر ملنے پر بھی اداکاری نہیں کرو گے، کیا تمہارے اندر کا فنکار بالکل ختم ہو چکا ہے۔'' میں نے اس کو جوش دلانے کو یہ بات کہی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے سر میرے اندر کا فنکار ابھی زندہ ہے۔ میں نے اپنے فن کو کچھ وقت کے لیے خیرباد کہہ دیا ہے۔'' ذوالقرنین نے کہا۔

''تمہیں کوئی اداکاری کرنے کو دس، بیس لاکھ روپے دے تو کیا تم اداکاری نہیں کرو گے؟'' میں نے کہا۔

''دنیا میں ایسے فن کے قدردان کہاں جو اتنی بڑی رقم مجھ غریب فنکار کو دے گا۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تمہیں پیسے مل گئے۔ فرض کرنے کو کہہ رہا ہوں۔''

''سر سچ پوچھیں اتنی رقم مجھے مل جانے پر میں بڑی شاہانہ زندگی گزاروں گا۔''

''وہ کیسے؟''

''ہمارا خاندانی کام ہارڈ ویئر اور آئل پینٹ کا ہے۔ اتنی رقم سے بہت شاندار طریقے سے کاروبار کر سکتا ہوں۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں فنکار بننے کے چکر میں خوار ہو گیا ہوں۔'' ذوالقرنین نے کہا۔

''میں تمہیں بیس لاکھ روپے کی رقم دوں گا۔''

''بب...... بیس لاکھ روپے......'' اس کے منہ سے نکلا۔

''آہستہ بولو میں تمہیں بیس لاکھ روپے دوں گا۔ بولو میرے لیے کام کرو گے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

''اداکاری کرنا ہوگی۔ اس اداکاری کے عوض تمہیں پورے بیس لاکھ روپے دوں گا۔ اس رقم سے تمہاری زندگی بن جائے گی۔ بولو کام کرو گے۔''

ذوالقرنین میری بات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

بیس لاکھ روپے کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ ذوالقرنین ایک غریب ضرورت مند انسان تھا۔ دو دن سوچ کر وہ میرے لیے کام کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ معمولی زخمی ہو کر کاشف کے خلاف عدالت میں گواہی دینا تھی۔ کاشف کو سزا ہونے پر ذوالقرنین کو بیس لاکھ روپے کی رقم مل جاتی۔ معاہدے کی رو سے کاشف کے خلاف مقدمہ درج ہو جانے پر اور کاشف کے جیل جانے پر دس لاکھ روپے دینے تھے اور دس لاکھ روپے کاشف کو قید ہو جانے پر دینا تھے۔

کمپنی کو آنے والی رقم بینک میں فوری جمع کرادی جاتی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھی۔ اس دن کمپنی کو پچاس لاکھ روپے کی رقم ملی تھی۔ وہ رقم میں نے جان بوجھ کر کاشف کو شام میں دی تھی تاکہ وہ رقم بینک میں جمع نہ کرا سکے اور معاملہ دوسرے دن پر چلا جائے۔ کاشف کے جانے سے ایک گھنٹا قبل کیمروں کا سسٹم خراب کرا دیا۔ کیمرے میں یہ چیز محفوظ تھی کہ میں نے کاشف کو لاکھ روپے کی رقم دی ہے۔ یہ بات محفوظ نہ تھی کہ میں نے کیسے سیف کو توڑ کر رقم نکالی تھی۔ کس طرح ذوالقرنین کو زخمی کیا آفس کے چوکیدار کو میں نے ایک کام سے بھیج دیا تھا۔ اس کی واپسی اس وقت ہی ہوتی جب کاشف دفتر سے جا چکا ہوتا۔ چوکیدار جب آفس آیا اسے دفتر میں ذوالقرنین کے سوا کوئی دکھائی نہ دیا اور وہ بھی بے ہوشی کی حالت میں۔ چوکیدار نے اس کے چہرے پر پانی چھڑکا تاکہ ہوش میں آجائے۔ میں اپنی پلاننگ میں بھرپور طریقے سے کامیاب رہا تھا۔ لاکھ روپے کی رقم میں نے گھر میں ایسی جگہ چھپائی تھی کہ پولیس اس کا سراغ نہیں لگا سکتی تھی۔

میں نے معاہدے کی رو سے بیس لاکھ روپے کی رقم ذوالقرنین کو ادا کر دی تھی۔ کاشف عدالت میں اپنے بے گناہ ہونے کا چیخ چیخ کر یقین دلاتا رہا مگر وہ یہ بات ثابت کرنے میں ناکام رہا کہ وہ بے قصور ہے جس دن اسے عدالت سے سزا سنائی گئی میں بہت خوش تھا۔ میرا انتقام پورا ہو گیا تھا۔ میں بزدل نہیں تھا بس میرے انتقام لینے کا انداز دوسروں سے جدا تھا۔

ذوالقرنین معاہدے کی رو سے اس بات کا بھی پابند تھا کہ وہ رقم مل جانے پر نوکری چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جا کر اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرے گا۔ اس شہر میں رہنے سے مجھے خدشہ تھا کہ کہیں میرا منصوبہ کسی کے علم میں نہ آجائے یا کاشف جیل سے رہائی پانے پر ذوالقرنین کو اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنا کر مجھے جھوٹا مقدمہ بنانے کے بارے میں اگلوا لے اور میں پولیس کی گرفت میں آجاؤں۔

مجھے اتنا یاد ہے جب ذوالقرنین نے نوکری چھوڑی تھی تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ ملک کے کس حصے میں گیا مجھے خبر نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اسے پھر کبھی دیکھا۔

''کہاں کھو گئے ہیں جناب؟'' مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر بیگم نے کہا۔

''کچھ نہیں بارش کے نظارے دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے بات بنائی۔

''وہ بھی بغیر چائے اور پکوڑوں کے۔'' سعدیہ بیگم نے کہا۔

''اس موسم میں چائے اور پکوڑے مل جائیں تو بات ہی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے ملازمہ کو پکوڑے اور چائے بنانے کو کہہ دیا ہے کیونکہ مجھے پتا ہے آپ کو بارش کے موسم میں یہ دونوں چیزیں اچھی لگتی ہیں۔'' سعدیہ بیگم نے کہا۔

''ایک بات تو ہے کہ تم میرا خیال بہت رکھتی ہو۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

''میں خیال نہیں رکھوں گی تو پھر کون رکھے گا۔'' بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ بات بھی ٹھیک ہے۔''

''ایسا لگتا ہے جیسے اس بارش سے کوئی خاص یاد وابستہ ہے جناب کی۔''

''بارش انسان کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے، جب دل کے تار چھڑ جائیں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''بارش انسان کا موڈ اچھا کر دیتی ہے اور بارش میں نہانے کا الگ ہی لطف ہے۔'' بیگم سعدیہ نے کہا۔

ملازمہ نسیم پکوڑے اور چائے لے آئی تھی۔ میں اس بارش میں بھرپور لطف اٹھانے کو پکوڑے کھانے لگا۔ بیگم چائے کپ میں ڈالنے لگی تھی۔

میں بیگم کو کیسے بتاتا کہ جس بارش کی وہ تعریف کر رہی ہے اس سے میری کتنی تلخ یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ ایسی بارش میں ہی نسرین سے میری ملاقات ہوئی اور وہ ملاقات دوستی میں پھر میاں بیوی کے رشتے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ بے وفا میری ہو کر بھی میری نہ ہو سکی تھی اسی لیے میں نے نسرین کو طلاق دے دی تھی۔ میں بے غیرت یا بزدل نہیں تھا۔ میں تعلیم یافتہ اور شعور رکھنے والا شخص تھا۔ پڑھے لکھے ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ جس نے میری عزت سے کھیلا اسے انتقام لیے بغیر چھوڑ دوں اسی لیے میں نے انتقام لینے کا طریقہ کار مختلف اپنایا تھا۔ وہ زندگی بھر نہیں جان سکے گا کہ اسے جیل میں قید کرانے میں میرا ہاتھ ہے۔ اس طرح میرا انتقام بھی پورا ہو گیا تھا۔ ذوالقرنین کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گیا۔ میری اس کے لیے دعا ہے کہ وہ جہاں رہے خوش رہے اور کاشف کی نظروں سے دور رہے تاکہ وہ ذوالقرنین کو کوئی لالچ دے کر میرا راز جان لے اور جیل میرا مقدر بن جائے۔

++

UUNOVELS.COM

غلط فہمی

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
ایک مختصر سی سچ بیانی ارسال خدمت ہے۔ کبھی کبھی ایک چھوٹی سی غلط فہمی انسان کو اس کے مقام سے کس طرح نیچے اور نیچے گرا دیتی ہے اسی نکتے نے مجھے اس واقعہ کو قلم بند کرنے پر اکسایا اور میں نے کہانی کے انداز میں پورا واقعہ لکھ دیا۔ یقینا سرگزشت کے قارئین اسے ضرور پسند کریں گے۔

ناظم بخاری
(لودھراں)

UUNOVELS.COM

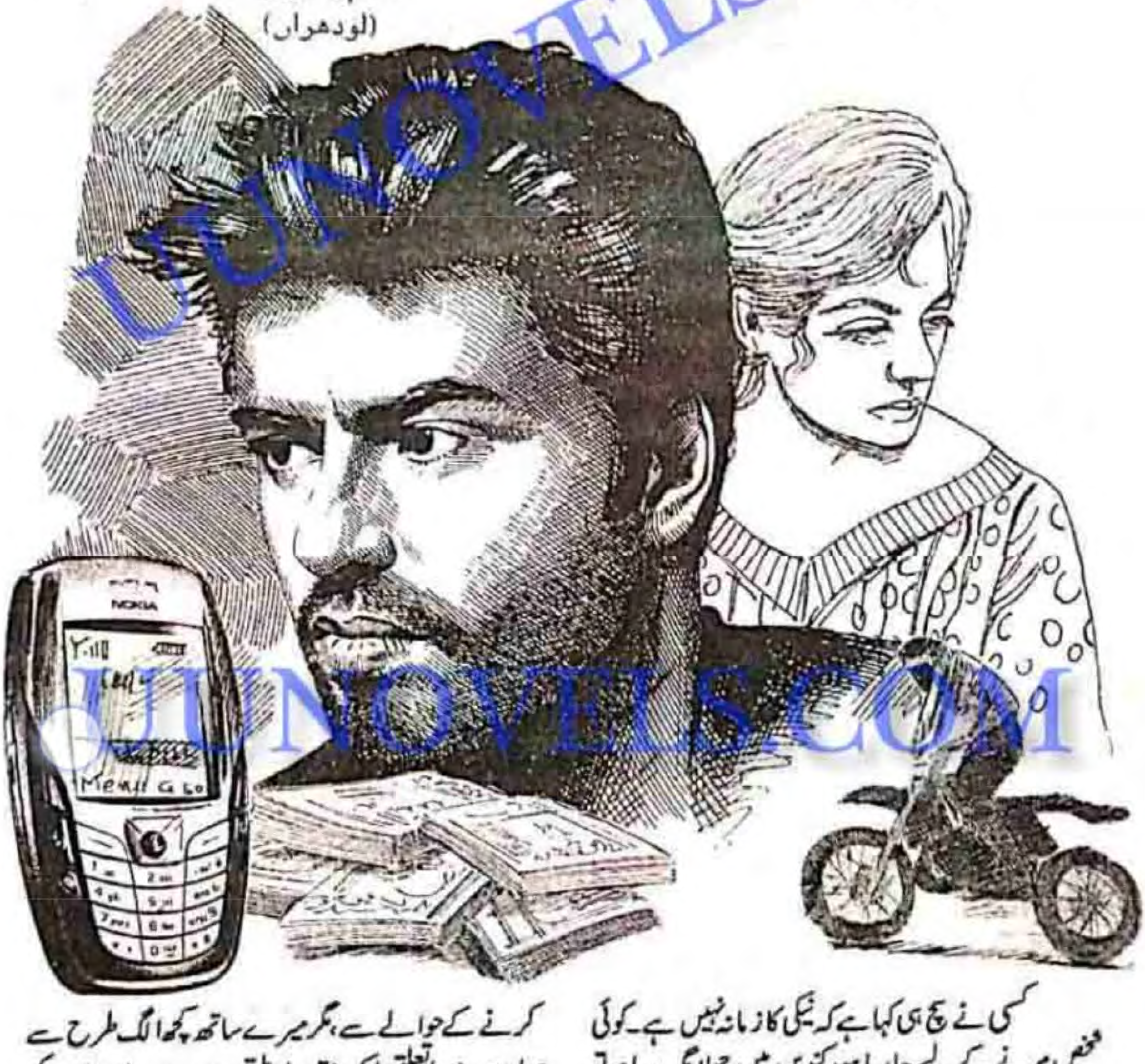

UUNOVELS.COM

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ کوئی شخص مرنے کے لیے جا رہا ہو، کنویں میں چھلانگ رہا ہو تو اسے روکیں مت، بلکہ پیچھے سے اس کی کمر پر لات مار کر اس کی مشکل آسان کر دیں...... خیر، یہ تو ایک بات تھی، میرا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ ہے تو وہ بھی نیکی اور مدد کرنے کے حوالے سے، مگر میرے ساتھ کچھ الگ طرح سے ہوا ہے۔ میرا تعلق ایک متوسط طبقے سے ہے۔ ماں باپ کی طرف سے ورثے میں چھ، سات مرلے کا ایک چھوٹا سا مکان ملا تھا، جس میں صرف ایک کمرا اور ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ جب تک بچے نہیں ہوئے، اس

چھوٹے سے مکان میں بھی اچھے سے گزارہ ہوتا رہا، مگر جونہی یکے بعد دیگر بچے ہوئے تو مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس چھوٹے سے مکان میں رہنا مشکل ہے۔ یا تو ہمیں اس مکان میں توسیع کرنا تھی، یا پھر کہیں اور دوسرا مکان تلاش کرنا تھا، جس میں ہمیں آسانی سے بچوں کے ساتھ رہ سکتا۔ دو بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی میں نے اس کام کے لیے چار پیسے جوڑنا شروع کر دیے۔ مجھے اور شازیہ کو جلد ہی آنے والے وقت کا اندازہ ہو گیا۔ چار پیسے جمع کرنے میں شازیہ نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں معمولی سا ملازم تھا۔ تنخواہ بس مناسب تھی۔ اگر زندگی میں دکھ سکھ نہ جڑے ہوتے تو شاید مکان کی توسیع کے لیے چار پیسے بہت جلد جمع ہو جاتے، مگر زندگی دکھ سکھ کا نام ہے۔ خوشیوں اور مسرتوں کے ساتھ دکھ بھی آتے رہے۔ کبھی شازیہ بیمار ہو جاتی تو کبھی ندیم...... کبھی چھوٹی لڑکی بیمار ہو جاتی تو کبھی کوئی اور...... اسی دکھ سکھ میں نئے مکان کی توسیع کے لیے قطرہ قطرہ چار پیسے جمع ہوتے رہے اور پھر ایک ایسا وقت آیا، جب ہمارے خواب حقیقت کے روپ میں ڈھلنے کے لیے تیار تھے۔ ہمارا گھر شہر سے قریباً بیس کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہے۔

شہر میں، میں اپنی سواری پر آتا جاتا تھا، یعنی بائیک پر۔ ہمارا گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بمشکل بیس پچیس گھرانے تھے۔ گاؤں سے شہر تک جو سڑک جاتی تھی، اس سڑک کے درمیان میں ایک بڑا سا جنگل تھا، جو کچھ پُراسرار سا تھا۔ وہاں کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا رہتا تھا کہ کوئی بھی شخص وہاں سے پیدل گزرنے کی حماقت نہیں کرتا تھا۔ پیدل تو دور، کوئی شخص سواری پر بھی، اکیلے وہاں سے گزرتے ہوئے ڈرتا تھا۔

اگر کسی شخص کو کہیں جانا ہوتا تو وہ اپنے ساتھ ایک دو افراد ضرور لے کر جاتا۔ دن کو اس جنگل کے پاس سے گزرتی سڑک پر سفر کرنا اتنا پُرخطر نہیں تھا، جتنا رات کو تھا۔

اس حوالے سے گاؤں کے ایک، دو لوگوں کے ساتھ کچھ ایسے واقعات پیش آئے تھے کہ لوگوں کو اس پُراسرار جنگل سے خوف آنے لگا تھا۔ خیر، ان دنوں میں نے اور شازیہ نے گھر کی توسیع کے لیے کافی رقم جمع کر لی تھی۔ میں نے مکان بنوانے کے لیے کچھ دن کی چھٹی لے لی تھی۔ ان دنوں پانچ پانچ ہزار کے نوٹ، نئے نئے متعارف ہوئے تھے۔ میں نے پانچ پانچ ہزار کے بیس نوٹ اپنے بٹوے میں ڈالے، بٹوا جیب میں ڈالا، بائیک نکالی اور شہر کی طرف چل دیا۔ میں جونہی جنگل کے قریب سے گزرا، اچانک وہاں سے ایک عجیب سا شخص بڑی تیزی سے نکلا اور سڑک کے عین درمیان میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کپڑے عجیب و غریب تھے۔ مختلف، چھوٹے چھوٹے رنگین کپڑوں کے ٹکڑوں سے سلا ہوا تھا۔ گلے میں منکوں کے ہار تھے۔ ہاتھ میں... بڑا سا عصا تھا۔

ابھی میں کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ نہ جانے کیوں، میرے وجود میں خوف کی ایک سرد سی لہر اتر گئی۔ میں نے موٹر سائیکل روکنے کی بجائے مزید اسپیڈ بڑھا دی۔ میں اس کے پاس سے گزرا تو مجھے اس کے چہرے پر بے بسی کی جھلک صاف دکھائی دی۔ مجھے یوں لگا، جیسے وہ بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہو۔ میں اس کے پاس سے گزر کر تھوڑا سا آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک مجھے لگا کہ مجھے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ شخص واقعی ضرورت مند ہے اور مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے بریک لگائی، واپس لوٹا اور اسے ساتھ لے کر شہر کی طرف چل دیا۔ ”بہت شکریہ جناب، مولا آپ کو سلامت رکھے۔ اللہ کا فقیر بندہ ہوں، غلطی سے اس طرف آ نکلا تھا۔ آپ نے مدد کی میرا رب آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔“ بائیک پر بیٹھنے کے بعد اس بابا جی نے سادگی سے کہا اور میرے لبوں پر مسکراہٹ در آئی۔

”کوئی بات نہیں بزرگو، یہ میرا فرض تھا۔“

اگلے دس منٹ بعد اس نے کہا۔ ”بس یہیں اتار دیں مجھے۔“ ہم اس وقت شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں وہیں اتار دیا۔

انہیں اتارنے کے بعد میں اپنی مطلوبہ دکان کی طرف چل دیا۔ راستے میں، میں بہت مسرور تھا۔ اس جنگل سے بابا جی کو لفٹ دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں ان کے کام آیا تھا اور اپنی اس نیکی پر خوش ہو رہا تھا۔ میں مکان کی تعمیر کا سامان لینے کے لیے مطلوبہ دکان پر پہنچا، پیسے نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو دوسرے ہی پل میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری جیب میں، بٹوا نہیں تھا۔ میں نے بوکھلا کر اوپر نیچے ہر جیب چیک کی، مگر بٹوے کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ میرا ذہن بے اختیار بابا جی کی طرف گیا اور دوسرے ہی پل میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ کچھ دیر پہلے تک کی گئی نیکی مجھے مہنگی پڑی تھی۔ وہ بابا جی، جنہیں میں نے بہت

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ڈیرہ اسماعیل خان کا نام سردار ملک سہراب کے بیٹے نواب اسماعیل کے نام پر رکھا گیا۔ یہ خطہ ارض 1400ء میں سلطان شاہ حسین ملتان کی لانگاہ سلطنت کے حکمراں کی جانب سے عطا کی گئی تھی۔

ڈیرہ غازی خان کا نام نواب غازی خان میرانی ولد نواب حاجی خان میرانی، سردار میرانی قبیلہ کے نام پر رکھا گیا جو ملتان کی لانگاہ سلطنت کے زیر انتظام تھا لیکن یہ قبیلہ جب طاقت ور ہو گیا تو اس نے لانگاہ سلطنت سے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

رحیم یار خان۔ یہ شہر پہلے نوشہرہ کے نام سے مشہور تھا لیکن اسی نام سے کے پی کے کا بھی ایک شہر تھا اس وجہ سے ہی نام تبدیل کر کے نواب بہاولپور کے بیٹے کے نام پر رحیم یار خان کر دیا گیا۔

دریا خان۔ بھکر ضلع کی یہ تحصیل جنرل دریا خان لاشاری کے نام سے موسوم ہے جو ایک جنگ کے دوران بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

مرسلہ: آفتاب احمد خان، مورخ

ضرورت مند اور مجبور سمجھ کر لفٹ دی تھی، وہ جاتے جاتے میرا کام کر گئے تھے۔ وہ ایک لاکھ کی رقم، جو ہم نے جمع کی تھی، وہ میری بے وقوفی کی بدولت کسی اور کی جیب میں چلی گئی تھی۔

میرا دل چاہا کہ میں اس بابا جی کی شان میں کچھ نازیبا کلمات ادا کروں اور میں نے دل ہی دل میں خوب ادا کیے اور بائیک اسٹارٹ کر کے واپس گھر کی طرف چل دیا۔

میں تمام راستے، گالیوں سے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ گھر پہنچا تو میری صورت پر بارہ بجے ہوئے تھے۔ بارہ کیا بجے ہوئے تھے، میرا پورا چہرہ اترا ہوا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ میرے ساتھ یقیناً کچھ انہونی ہو چکی ہے۔ شازیہ نے میرا چہرہ دیکھا تو بے اختیار میرے قریب چلی آئی۔ ''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا؟''

''نہیں، خیریت نہیں ہے۔ کسی نے میری جیب کاٹ لی ہے......''

''کیا......!'' شازیہ بے حد پریشان ہو گئی۔ ''یہ کیسے ہوا؟''

میں نے ساری کہانی اسے سنا دی۔ شازیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ بھلے کا زمانہ نہیں ہے۔ کتنی محنت سے روپیا روپیا جمع کیا تھا۔ کیا پتا تھا کہ سب کچھ اس طرح ہاتھ سے نکل جائے گا...... کاش آپ اس بابا جی کی مدد نہ کرتے۔''

میرا جی چاہا کہ میں اسے حوصلہ دوں، مگر میں اسے کیا حوصلہ دیتا، میرا خود برا حال تھا۔ وہ سارا دن پریشانی میں گزر گیا۔ رات کو بھی میں دیر تک جاگتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر کہیں جا کر میری آنکھ لگی۔ صبح میں سویا ہوا تھا کہ شازیہ نے مجھے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کی۔ ''سنیں جی! دیکھیں، ہمارے پیسے ہمیں واپس مل گئے ہیں۔''

مجھے محسوس ہوا، جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ بھلا جیب سے نکلے ہوئے پیسے بھی واپس ملتے ہیں؟ شازیہ نے دوسری بار مجھے زیادہ زور سے جھنجوڑا۔ اس بار میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا؟''

''یہ دیکھیں، آپ کے پیسے، پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔'' شازیہ کے لہجے میں عجیب سی خوشی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میرا بٹوا تھا۔ وہی بٹوا، جو کل میری...... جیب سے نکل گیا تھا۔

''یہ...... یہ کہاں سے ملا تمہیں؟''

''باتھ روم سے...... آپ کے کل والے پرانے کپڑوں سے۔ کل جب آپ شہر جانے لگے تھے تو کپڑے تبدیل کر کے گئے تھے۔ شاید آپ نے بٹوا اپنے میلی قمیص کی جیب میں ڈالا تھا اور جلدی میں بٹوا نکالنا بھول گئے تھے۔ آپ نے یہی سمجھا ہوگا کہ آپ نے بٹوا نئے کپڑوں میں ڈالا ہے۔'' میں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا اور دوسرے ہی پل اپنا سر پکڑ لیا۔ شازیہ کی بات بالکل درست تھی۔ کل لاشعوری طور پر مجھ سے یہ چھوٹی سی غلطی ہو گئی تھی اور میں نادانی اور بھول میں یہ سمجھا تھا کہ بابا جی نے میرا بٹوا نکالا ہے۔ اس نے مجھے عرش سے فرش پر لا پھینکا ہے۔ اصل بات سامنے آئی تو میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ مجھے ایک ایک کر کے وہ سب نازیبا کلمات یاد آنے لگے، جو میں نے بابا جی کی شان میں کہے تھے۔ کاش! اس وقت میں اپنے ذہن پر تھوڑا سا زور ڈال لیتا تو......!

▲▲▲

UUNOVELS.COM

UUNOVELS.COM

ادھورا خواب

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

میں کافی عرصے سے سرگزشت پڑھ رہی ہوں۔ اکثر سوچتی ہوں کہ میں بھی کچھ لکھوں لیکن میرے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ میں افسانے کہانیاں پڑھتی تو ہوں لیکن لکھ نہیں سکتی۔ پہلی بار یہ تحریر مکمل کی ہے۔ یہ میری اپنی سرگزشت ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ تحریر "سرگزشت" کی زینت بنے تاکہ دوسری لڑکیاں بھی سبق حاصل کریں۔

شائستہ شاہد

(لاہور)

UUNOVELS.COM

میں دھڑکتے دل کے ساتھ باس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ میری پہلی ملازمت تھی اس لیے کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک بڑی سی میز پر ایک بارعب شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں باس کا جو تصور تھا، وہ ہو بہو ویسا ہی تھا۔ اس کی عمر پچاس پچپن کے قریب تھی۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی، کلین [illegible]ر پر سلیقے سے جمے ہوئے سیاہ بال۔ اس نے سفید قمیص، سیاہ پتلون اور ہلکے آسمانی رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی

وہ کرسی سے اٹھا اور نرم لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''آیئے مس شائستہ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ویسے آپ پورے پندرہ منٹ دیر سے آئی ہیں۔''

یہ سنتے ہی میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ فرسٹ امپریشن از دا لاسٹ امپریشن۔ تو یہاں پہلا تاثر ہی غلط قائم ہو گیا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''جی......جی......وہ میں رشید صاحب کو جوائننگ دے رہی تھی۔''

''او کے......او کے......اٹ از آل رائٹ۔ میں نے آپ سے وجہ نہیں پوچھی اور آپ کو بھی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے آپ تشریف رکھیں۔'' اس نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں شکریہ کہہ کر بیٹھ گئی اور پرس سے ٹشو نکال کر اپنے ماتھے پر آیا پسینا صاف کرنے لگی۔ اس نے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''میرا نام شاہنواز ہے اور میں اس چھوٹے سے دفتر کا مالک ہوں۔ میں نے آپ کا انتخاب صرف اس وجہ سے کیا ہے کہ آپ ضرورت مند ہیں اور ایسے لوگ زیادہ ذمّے دار ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میری توقعات پر پورا اتریں گی۔''

''جی، میں پوری کوشش کروں گی۔'' میری گھبراہٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

''آپ اتنی نروس کیوں ہو رہی ہیں۔'' وہ میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی انسان ہوں کوئی بھیڑیا نہیں کہ آپ کو کھا جاؤں گا۔ ہمارے درمیان صرف مالک اور ملازم کا فرق ہے لیکن اگر آپ دیانت دار ہیں، اپنا کام محنت اور لگن سے کرتی ہیں تو پھر آپ کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ان شاء اللہ! آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

''گڈ! رشید صاحب نے بتا دیا ہو گا کہ آپ میرے ساتھ اسسٹنٹ کے طور پر کام کریں گی۔ یہ انتہائی ذمّے داری ،اور راز داری کا کام ہے۔ آپ جو کچھ بھی کریں گی، اس کے بارے میں دفتر کے کسی فرد کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ایسی بات نہیں کہ ہم کوئی ناجائز یا غیر قانونی کام کر رہے ہیں لیکن بہت سے معاملات کو اپنے تک رکھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ آپ میرے برابر والے کمرے میں بیٹھیں گی۔ وہاں کمپیوٹر اور نیٹ کی سہولت بھی موجود ہے۔ آپ کمپیوٹر پر کام کر لیتی ہیں؟''

''سوری سر! تھوڑی بہت واقفیت ضرور ہے لیکن میں نے کبھی اس پر کام نہیں کیا۔''

''کوئی بات نہیں۔ کمپیوٹر خود آپ کو سکھاتا ہے۔ آپ اس پر جتنا زیادہ کام کریں گی۔ اتنی ہی جلدی سیکھیں گی۔ ویسے میں کمپیوٹر آپریٹر سے کہہ دوں گا۔ وہ آپ کو بنیادی باتیں سکھا دے گا۔''

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وہ کسی سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ فارغ ہونے کے بعد اس نے فون رکھا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب آپ اپنی سیٹ پر جائیں۔ تھوڑی دیر میں ساجد بھی آ جائے گا۔ سب سے پہلے آپ کی کمپیوٹر پر ٹریننگ ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جلد از جلد ٹائپنگ سیکھ لیں کیونکہ میرے سارے خطوط آپ کو ہی ٹائپ کرنے ہوں گے۔''

میں شکریہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہاں ایک میز، گھومنے والی کرسی، فائل کیبنٹ، کمپیوٹر ٹیبل، ٹیلی فون، انٹر کام اور ملاقاتیوں کے لیے تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے پانچ منٹ ہوئے تھے کہ چپراسی پانی کی بوتل اور گلاس لے کر آ گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بولا۔ ''میرا نام سلیم ہے، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ گھنٹی بجا کر مجھے بلا سکتی ہیں۔ آپ کے لیے چائے لاؤں؟''

''نہیں میں چائے نہیں پیتی۔ مجھے تھوڑی سی اسٹیشنری لا دو۔''

''میڈم! آپ اپنی دراز کھولیں۔ اس میں کچھ چیزیں ہوں گی۔ اس کے علاوہ اگر اور کچھ چاہیے تو مجھے ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں۔''

میں نے دراز کھولی۔ اس میں ایک نوٹ پیڈ، بال پوائنٹ کا پیکٹ اور کچھ دوسری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے مطمئن ہو کر دراز بند کر دی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ فی الحال کافی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو بتا دوں گی۔''

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور قریب آ کر راز دارانہ انداز میں بولا۔ ''صاحب غصے کے بہت تیز ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کا میٹر گھوم جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کوئی نہیں رکتا۔ کئی لڑکیاں جاب چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ آپ کو بہت محتاط رہنا ہو گا۔ انہیں ناراض ہونے کا موقع نہ دیں ورنہ آپ یہاں زیادہ دن نہ رہ سکیں گی۔''

UUNOVELS.COM

اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے یہ ملازمت بڑی مشکل سے ملی تھی اور میں کسی قیمت پر بھی اس سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔ گھر کے حالات کی وجہ سے میں باہر نکلنے پر مجبور ہوئی تھی۔ ابو ریٹائر ہو چکے تھے اور بیماری کی وجہ سے وہ گھر بیٹھنے تک محدود ہو گئے تھے۔ انہیں بہت معمولی پینشن ملتی تھی جس سے گزارہ ہونا مشکل تھا۔ امی وفات پا چکی تھیں اور ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا جو ابو کے بڑھاپے کا سہارا بنتا۔ ہم تین بہنیں تھیں۔ بڑی بہن سلمٰی کی شادی ہو چکی تھی۔ ان کے شوہر کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ وہ بھی بہت زیادہ خوش حال نہیں تھے لیکن عزت سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ ان کے یہاں اوپر تلے دو بچے ہوئے تو اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا، اس کے باوجود سلمٰی باجی ہماری کچھ نہ کچھ مدد کرتی رہتی تھیں لیکن ابو کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ انہوں نے کئی بار منع کیا تھا مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ ہم لوگ کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزاریں اس لیے انہوں نے نقد رقم دینے کی بجائے گھر کے لیے سامان لانا شروع کر دیا۔ کبھی وہ چپکے سے میرے پرس میں کچھ نوٹ ڈال دیتیں تاکہ بجلی گیس وغیرہ کے بل ادا ہو جائیں۔

مجھ سے بڑی بہن نسیمہ تھی۔ وہ بی اے کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہ رہی تھی لیکن گھر کے مخدوش حالات کے سبب اسے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا اور اس نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد اسے ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب مل گئی گو کہ تنخواہ کم تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا۔

میں نے میٹرک کرنے کے بعد کامرس کا انتخاب کیا تھا اور میرا خیال تھا کہ بی کام کے بعد بی بی اے میں داخلہ لوں گی لیکن اس کے لیے بھاری فیس کی ضرورت تھی جو میں نہیں دے سکتی تھی اس لیے میرا یہ خواب پورا نہ ہو سکا اور میں نے بھی بی کام کے بعد ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ میرا خیال تھا کہ کامرس گریجویٹ کو کسی بھی بینک یا کمرشل فرم میں آسانی سے ملازمت مل جائے گی لیکن جب میں نے اخبارات میں اشتہار دیکھے اور مختلف جگہوں پر درخواست لے کر گئی تو پتا چلا کہ اب بی کام کو کوئی نہیں پوچھتا۔ پرائیویٹ یونیورسٹیاں تھوک کے حساب سے بی بی اے کی ڈگریاں بانٹ رہی ہیں اس لیے ہر جگہ خصوصاً بینکوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں میں بی کام کی جگہ انہیں ترجیح دی جا رہی تھی۔

یہ صورتِ حال بڑی مایوس کن تھی لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور جہاں کہیں بھی تھوڑی سی اُمید ہوتی میں درخواست بھیج دیتی۔ کئی جگہ انٹرویو دیئے لیکن تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے ٹھکرا دی گئی۔ کوئی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ جب تک میں کام نہیں کروں گی تو تجربہ کہاں سے آئے گا۔ بہرحال میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے شاہنواز صاحب کی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔

انٹرویو دیتے وقت مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ میں منتخب کر لی جاؤں گی۔ یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں تجربہ کی شرط آڑے نہ آ جائے۔ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار کر لیا چنانچہ جب رشید صاحب نے میری درخواست پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! آپ تو بالکل فریش ہیں۔ اس سے پہلے کہیں کام نہیں کیا۔ ہمیں کسی تجربہ کار کی ضرورت ہے۔''

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے بے دھڑک جواب دیا۔ ''سر! کوئی ماں کے پیٹ سے سیکھ کر نہیں آتا۔ کام کروں گی تو تجربہ بھی ہو جائے گا۔''

''معاف کرنا بی بی۔ ہم نے کوئی اسکول نہیں کھول رکھا ہے۔'' رشید صاحب بولے۔

''ایک منٹ۔'' شاہ نواز صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ضرورت مند ہیں یا شوقیہ ملازمت کرنا چاہتی ہیں۔''

''سر اگر ضرورت مند نہ ہوتی تو آرام سے گھر پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی یا دوستوں سے فون پر گپ شپ کرتی۔ مجھے ملازمت کی شدید ضرورت ہے۔ والد صاحب ریٹائر ہو چکے ہیں اور بیماری کی وجہ سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ایک بہن پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اس کی تنخواہ اتنی کم ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' شاہ نواز صاحب بولے۔ ''آپ کل سے کام پر آ جائیں۔ فی الحال یہ ملازمت عارضی ہے۔ چھ ماہ بعد آپ کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے مستقل ہو سکتی ہے۔ آپ باہر بیٹھیں۔ تھوڑی دیر بعد اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے گا۔''

لیٹر دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک ناتجربہ کار فریش گریجویٹ کو پندرہ ہزار کی ملازمت مل جائے گی۔ رشید صاحب نے یقین دلایا تھا کہ کنفرم ہونے کی صورت میں تنخواہ بڑھ سکتی ہے۔ میں خوشی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

خوشی گھر آئی اور ابو کو یہ خوش خبری سنائی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں لیکن حقیقی خوشی اس وقت ہوگی جب تم دونوں اپنے گھر کی ہو جاؤ گی۔''

''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' میں ان کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ ''بے وقوفوں والی باتیں مت کرو۔ ہر لڑکی کو ایک نہ ایک دن دوسرے گھر جانا ہوتا ہے۔''

''اگر ہم دونوں چلی گئیں تو آپ کا کیا ہوگا؟''

''میرا کیا ہے جو تھوڑی بہت زندگی رہ گئی ہے وہ بھی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی۔''

''نہیں آپ میرے ساتھ رہیں گے۔ میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں نہیں سمجھتی کہ شاہد کو اس پر کوئی اعتراض ہوگا۔''

شاہد میرا چچازاد بھائی تھا۔ ہماری منگنی ہو چکی تھی۔ وہ میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔ ابو کا خیال تھا کہ اس کا ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی ہماری شادی کر دی جائے لیکن شاہد اس کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اور اس کے بینک اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ہوں کہ وہ اپنی گاڑی خرید لے تاکہ ہم شادی کے بعد آرام سے گھوم پھر سکیں۔

ابو، نسیمہ کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ ابھی تک اس کی کہیں بات طے نہیں ہوئی تھی۔ رشتے تو کئی آئے لیکن وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتی تھی۔ دراصل اسے اپنے برابر کے لوگوں سے رشتہ جوڑنا پسند نہیں تھا اور وہ کسی امیر کبیر شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس کی عقل میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ کوئی امیر آدمی ہمارے دروازے پر کیوں آئے گا۔ ایسا شاید فلموں اور ڈراموں میں ہوتا ہو لیکن حقیقی زندگی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر لوگ اپنے برابر یا اپنے سے اونچے لوگوں میں رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ یہ سوچنا بھی محال ہے کہ ڈیفنس میں رہنے والا کسی غریب بستی کا رخ کرے گا۔ میں نے جب بھی اسے بات سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے ہنسی میں ٹال دیا اور یہی کہا کہ اگر لگن سچی ہو تو خدا بھی مدد کرتا ہے۔ تم دیکھ لینا کہ ایک دن میں اس مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی۔

اسے شاہد کے ساتھ میری منگنی پر بھی اعتراض تھا۔ وہ کہتی تھی کہ صرف ایم بی بی ایس کرنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک بندہ اسپیشلائزیشن نہ کرے۔ اس کے لیے پانچ چھ سال چاہئیں اور شاہد اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔ اسے ہاؤس جاب کے بعد فوراً کوئی ملازمت کرنی ہوگی، جب کہ سرکاری نوکری قسمت والوں کو ملتی ہے اور پرائیویٹ اسپتال والے بہت کم تنخواہ دیتے ہیں۔

اس نے مجھے ڈرانے کے لیے کہا۔ ''تمہیں شادی کے بعد جوائنٹ فیملی میں رہنا پڑے گا اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے بعد شاہد تمہیں وہ سکھ اور آرام نہیں دے سکے گا جو تم جیسی خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکی کا حق ہے۔''

وہ چاہتی تھی کہ میں شاہد سے منگنی ختم کر کے کسی امیر زادے سے شادی کر لوں لیکن میں اس کی طرح خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی ایسا کوئی احمقانہ قدم اٹھا کر اپنے بزرگوں کو کوئی دکھ دینا چاہتی تھی۔ مجھے شاہد ہر حال میں قبول تھا اور میرا ماننا ہے کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہ مجھے ضرور ملے گا پھر میں سایوں کا تعاقب کیوں کروں۔

☆......☆

سلیم کی باتیں سن کر میں ڈر گئی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ باس کو ناراض ہونے کا کوئی موقع نہیں دوں گی اور اسے ہر قیمت پر خوش رکھوں گی چاہے اس کے لیے مجھے اپنی انا اور اصول ہی کیوں نہ قربان کرنے پڑیں۔ اب یہ ملازمت میری کمزوری بن گئی تھی اور مجھے اس کو ہر قیمت پر بچانا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ساجد آگیا۔ اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے قسائی کسی بکرے کو دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''باس کا حکم ہے کہ میں آپ کو کمپیوٹر سکھاؤں۔ آپ اس بارے میں کیا جانتی ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یوں سمجھ لیں کہ میں ابھی پہلی کلاس میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہ اتنی مشکل چیز نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد سیکھ جائیں گی۔''

سب سے پہلے اس نے کی بورڈ کے بارے میں بتایا پھر اس نے کہا کہ میں اپنا نام ٹائپ کروں کیونکہ یہ میرا پہلا تجربہ تھا اس لیے مجھے حروف ڈھونڈنا پڑے جب میں نے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

پورا نام ٹائپ کرلیا تو وہ بولا۔ اسے دوبارہ ٹائپ کریں اور اس وقت تک یہ مشق جاری رکھیں جب تک آپ کو حروف کی لوکیشن کا اندازہ نہ ہو جائے۔ مثلاً اگر آپ کو S ٹائپ کرنا ہے تو آپ کی انگلی سیدھی اسی پر جانی چاہیے۔

وہ کچھ دیر مجھے ٹائپ کرتے ہوئے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''آپ کی بورڈ کو دو حصوں میں تقسیم کرلیں۔ دائیں ہاتھ سے رائٹ سائیڈ اور بائیں ہاتھ سے لیفٹ سائیڈ کے حروف ٹائپ کریں۔ اس طرح آپ کی اسپیڈ بہتر ہو جائے گی۔'' پھر اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دیا اور بولا۔ ''اب آپ یہ ڈرافٹ ٹائپ کریں۔ اسے آپ جتنی بار ٹائپ کریں گی۔ اتنی ہی آپ کے ہاتھ میں روانی آئے گی۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ایک بجنے میں پانچ منٹ پر ایک لڑکی میرے پاس آئی اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام روزینہ ہے۔ اس دفتر میں میرے علاوہ چار لڑکیاں ہیں۔ ہم سب ایک ساتھ ہی لنچ کرتے ہیں۔ میں تمہیں بھی دعوت دینے آئی ہوں کیا تم ہمارے ساتھ لنچ کرنا پسند کرو گی؟''

''کیا میں باس کو بتا دوں؟''

''ضروری تو نہیں لیکن آج تمہارا یہاں پہلا دن ہے اس لیے احتیاطاً بتا دو۔''

میں باس کے کمرے میں گئی اور ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''سر میں لنچ کے لیے جا رہی ہوں۔''

''ہاں ضرور جاؤ۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ابھی ایک بجنے میں تین منٹ باقی ہیں۔ خیر آئندہ خیال رکھنا۔''

''اوہ میرے خدا۔ یہاں تو منٹ منٹ کا حساب رکھا جا رہا ہے۔ ایسی جگہ پر کام کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے محتاط رہنا ہوگا۔'' میں نے سوچا اور روزینہ کے ساتھ لنچ کرنے چلی گئی۔ اس نے دوسری لڑکیوں سے میرا تعارف کروایا اور وہ سب مجھے ایسے دیکھنے لگیں جیسے پوچھ رہی ہوں کہ کہاں آکر پھنس گئیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی باس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ شاید وہ ڈر رہی تھیں کہ میں باس کی اسسٹنٹ ہوں اور ان کی کہی ہوئی بات باس تک نہ پہنچا دوں۔

میں گھر سے لنچ لے کر نہیں آئی تھی اس لیے روزینہ سے کہا کہ وہ کسی سے کہہ کر میرے لیے کھانا منگوا دے۔ اس پر وہ بولی۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔ تم ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ کل سے اپنا لنچ لے کر آنا۔ بازار کے کھانے کا کوئی بھروسا نہیں نہ جانے اس میں کیا الا بلا ڈالتے ہیں۔''

کھانے کے بعد سب لڑکیاں ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں۔ روزینہ نے آنکھ کے اشارے سے مجھے روک لیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ بولی۔ ''شائستہ تم نئی آئی ہو اس لیے تمہیں ہوشیار کرنا میرا فرض ہے۔ شاہ نواز صاحب بڑے دل پھینک واقع ہوئے ہیں اس لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں کچھ عرصہ ان کے ساتھ کام کر چکی ہوں۔ انہوں نے مجھ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ وقت بے وقت ان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ ان سے دور رہنے کی کوشش کرو۔''

روزینہ کی زبانی یہ انکشاف سن کر میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ جی میں آیا کہ اسی وقت یہ جاب چھوڑ کر گھر چلی جاؤں لیکن دماغ نے مشورہ دیا کہ اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ روزینہ غلط بیانی یا مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہو۔ مجھے تیل دیکھو اور تیل کی دھار کے مصداق آنے والے وقت کا انتظار کرنا چاہیے اگر شاہ نواز صاحب ایسے ہی ہیں جیسا کہ روزینہ نے بتایا تو خاموشی سے گھر بیٹھ جاؤں گی۔ میں اتنی کمزور بھی نہیں کہ اپنی عزت کی حفاظت نہ کر سکوں۔

دوسرے دن باس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولے۔ ''میرے کمرے میں جتنی بھی فائلیں ہیں وہ میں آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ آپ ہر فائل پر سبجیکٹ اور نمبر ڈال کر ان کی ایک فہرست بنالیں اور اس کی ایک کاپی مجھے بھی دے دیں تاکہ آپ کی غیر موجودگی میں اگر کسی فائل کی ضرورت ہو تو وہ آسانی سے مل جائے۔''

میں بہت اچھا کہہ کر اٹھنے لگی تو وہ بولے۔ ''بیٹھ جائیں۔ ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔'' مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ اس دوران وہ کچھ کاغذات دیکھتے رہے پھر انہیں ایک فولڈر میں رکھ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''یہ کاغذات متعلقہ فائلوں میں لگا دیں۔ خیال رہے کہ کوئی کاغذ اِدھر اُدھر نہ ہو۔ اب یہ آپ کی ذمے داری ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چند سیکنڈ خاموش رہے پھر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میں نے سنا ہے کہ کل آپ نے

UUNOVELS.COM

دوسری لڑکیوں کے ساتھ لنچ کیا تھا؟''

''جی۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ آپ کہاں اور کس کے ساتھ لنچ کرتی ہیں۔ آپ ان کے ساتھ بے شک گپ شپ کریں لیکن دفتر کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ میں آپ کو کل بھی بتا چکا ہوں۔''

''سر آپ مطمئن رہیں۔ انشاء اللہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''گڈ، ایک بات اور۔ آپ ذرا اپنی ڈریسنگ ٹھیک کریں۔ ان کپڑوں میں تو بالکل دیہاتی عورت لگتی ہیں۔''

میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''دیکھیں، یہ ایک کمرشل فرم ہے، یہاں ہمارے کلائنٹ بھی آتے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پر ایک اچھا تاثر قائم ہو۔ کاروبار میں یہ سب چیزیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔''

''جی۔'' میں نے کہا۔'' آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔''

اس دوران میں نے ایک بات نوٹ کی۔ میں جتنی دیر ان کے سامنے بیٹھی ان کی نظریں مسلسل میرے جسم کا جائزہ لیتی رہیں۔ نہ جانے وہ کیا دیکھنا چاہ رہے تھے۔ ایک دو مرتبہ میں نے دوپٹا ٹھیک کرنا چاہا تو ان کی نظریں فوراً میرے گریبان پر جم گئیں۔

میں اپنے کمرے میں آکر سوچنے لگی کہ روزینہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شاہ نواز صاحب دل پھینک ہی نہیں بلکہ نظر باز بھی ہیں اور مجھے جدید فیشن کا لباس پہنا کر اپنی ٹھرک پوری کرنا چاہتے ہیں... ورنہ ان کے مہمانوں کو میرے لباس سے کیا لینا دینا اور میں نے سوچ لیا کہ ان کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی، میں اپنی مرضی کا لباس ہی پہنوں گی۔

تھوڑی دیر بعد سلیم بہت ساری فائلیں لے کر آگیا۔ میں نے ایک فائل اٹھا کر دیکھی اس میں بہت سے کاغذ یونہی رکھے ہوئے تھے۔ کسی نے انہیں فائل میں لگانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ باقی فائلوں کا بھی یہی حال تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام کاغذ ترتیب وار فائلوں میں لگائے۔ ہر ایک پر صفحہ نمبر ڈالا۔ ہر فائل پر سبجیکٹ اور فائل نمبر لکھا پھر ان تمام فائلوں کی فہرست بنائی اور اس کی ایک نقل شاہ نواز صاحب کے سامنے رکھ دی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے اور بولے۔ ''اتنی جلدی آپ نے کام ختم کر لیا۔'' پھر انہوں نے ایک فائل منگوائی اور اس میں کاغذوں کو ترتیب سے لگا ہوا دیکھ کر خوش ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ آپ کی پہلی جاب ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ آپ نے واقعی اپنا کام پوری ذمے داری سے کیا ہے۔''

اپنی تعریف سن کر میرا خوش ہونا ایک فطری امر تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ سلیم، ساجد اور روزینہ سب جھوٹ بول رہے تھے۔ شاہ نواز مجھے کہیں سے بھی ایک سخت گیر انسان نہیں لگے بلکہ وہ میرے ساتھ انتہائی نرمی اور شرافت سے پیش آرہے تھے۔

میں اٹھنے ہی والی تھی کہ وہ اچانک بولے۔'' آپ کو چائے بنانی آتی ہے۔''

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی۔ چائے بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

انہوں نے کہا۔'' دراصل میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے سلیم کو ایک کام سے بھیجا ہے لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا اور مجھے چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔ اسی لیے میں نے آپ سے پوچھا تھا۔''

''کوئی بات نہیں سر۔ میں بنا دیتی ہوں۔''

ان کے کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کچن تھا۔ میں نے پانچ منٹ میں چائے بنائی اور ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔'' یہ کیا، آپ نہیں پئیں گی؟''

''نو سر! میں صرف دن میں دو مرتبہ چائے پیتی ہوں۔ ایک صبح اور ایک شام۔''

''پھر تو مزہ نہیں آئے گا۔ آپ کو کم از کم میرا ساتھ تو دینا چاہیے۔''

میں نے ان کے کہنے پر اپنے لیے ایک پیالی بنائی اور ان کے سامنے بیٹھ کر پینے لگی۔ انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بولے۔'' واہ مزہ آگیا۔ بہت ہی عمدہ چائے ہے۔ میں نے آج تک اتنی اچھی چائے نہیں پی۔''

میں نے انکساری سے کہا۔'' شکریہ۔''

وہ کچھ دیر خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ اس دوران ان کی نظریں مسلسل میرے چہرے اور جسم کا طواف کر رہی تھیں۔ ان کی نظروں کی تپش محسوس کر کے مجھے الجھن

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ہونے لگی۔ میں نے بے اختیار دوپٹے کو اپنے سر اور سینے کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا پھر وہ اچانک بولے۔ ''آپ کی فیملی میں کتنے لوگ ہیں؟''

یہ ایک بالکل ذاتی نوعیت کا سوال تھا جس کا جواب دینے کے لیے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھی پھر بھی میں نے کہہ دیا۔ ''میرے والد اور ایک بڑی بہن۔ والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اوہ آئی سی۔ بہن کی شادی نہیں ہوئی ابھی؟''

''جی نہیں۔ رشتے تو بہت آئے لیکن انہیں کوئی پسند ہی نہیں آتا۔''

''وہ بہت بڑی غلطی کر رہی ہیں۔ میرے خیال میں لڑکیوں کی شادی وقت پر ہو جانی چاہیے ورنہ بعد میں بہت مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔''

''جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اور آپ کا کیا ارادہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی؟''

''جی نہیں۔'' نہ جانے کیوں میں نے شاہد کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا اور یہی میری غلطی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے کوئی بات نہیں کی اور چند لمحوں تک مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''اب آپ جا سکتی ہیں۔ آئندہ جب بھی میرا اچھی چائے پینے کو دل چاہے گا میں آپ کو ہی زحمت دوں گا۔''

میں کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ فائلوں کا کام تو ختم ہو چکا تھا اس لیے میں نے کمپیوٹر آن کیا اور ٹائپنگ کی مشق شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ساجد بھی آ گیا اور بولا۔ ''میں دو چکر لگا چکا ہوں۔ لگتا ہے آج باس سے بڑی میٹنگ ہو گئی۔''

''ہاں، انہوں نے ایک کام دیا تھا اسی پر بات ہو رہی تھی۔''

اس نے اپنی جیب سے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ''اسے ٹائپ کریں اور گھڑی میں وقت دیکھ کر چیک کریں کہ آپ کی اسپیڈ کتنی ہو گئی ہے۔ آپ جتنی زیادہ ٹائپنگ کریں گی اتنی ہی آپ کی اسپیڈ بہتر ہوتی جائے گی۔''

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور گھڑی دیکھ کر ٹائپ کرنے بیٹھ گئی۔ میں نے وہ کام ختم کرنے کے بعد دوبارہ وقت دیکھا۔ اس میں آدھ گھنٹا لگا تھا۔ میں نے دوبارہ وہ کاغذ ٹائپ کرنا شروع کیا اور ایک بار پھر وقت نوٹ کیا۔ مجھے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس مرتبہ میں نے ستائیس منٹ میں وہ کاغذ ٹائپ کر لیا تھا۔ ساجد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں جتنا زیادہ ٹائپ کروں گی اتنی ہی میری اسپیڈ بہتر ہو گی چنانچہ میں فارغ وقت میں زیادہ سے زیادہ ٹائپ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

دو دن بعد باس نے مجھے بلایا اور ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ ''مس شائستہ! یہ میں نے ایک لیٹر لکھا ہے۔ اسے ٹائپ کر کے مجھے دکھائیں۔ سمجھیں کہ یہ آپ کا ٹیسٹ ہے۔''

میں نے وہ کاغذ لیا اور اپنے کمرے میں آ کر ٹائپ کرنے لگی۔ وہ ایک چھوٹا سا لیٹر تھا۔ جس میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی اور میں نے اسے بیس منٹ میں ٹائپ کر لیا پھر اس کی غلطیاں درست کیں اور پرنٹ نکال کر باس کے پاس لے گئی۔ انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور خوش ہوتے ہوئے بولے۔ ''واہ، آپ نے تو کمال کر دیا۔ اگر آپ اسی ذمے داری اور لگن سے کام کرتی رہیں تو بہت ترقی کریں گی۔''

مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ میرے کام کی اتنی تعریف کریں گے۔ میں نے شرما کر سر جھکا لیا تو وہ بولے۔ ''اسی خوشی میں آپ مجھے اچھی سی چائے بنا کر پلائیں اور اوپر والے کیبنٹ میں بسکٹ رکھے ہیں وہ بھی نکال لیں۔''

میں نے چائے اور بسکٹ ان کے سامنے رکھے تو وہ بولے۔ ''اب میرے سارے لیٹر آپ ہی ٹائپ کریں گی۔ ساجد کے پاس بہت کام ہے۔ اسی لیے میرے لیٹر دیر سے ٹائپ ہوتے ہیں۔''

اس کے بعد تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ اس بہانے مجھے بار بار اپنے کمرے میں بلاتے میں ایک لیٹر ٹائپ کر کے دیتی تو وہ مجھے دوسرا پکڑا دیتے۔ پہلے لیٹر میں انہوں نے میرے کام میں کوئی غلطی نہیں نکالی تھی لیکن اب وہ ہر خط میں دو چار سرخ دائرے ضرور لگاتے اور پھر مجھے وہ خط دوبارہ ٹائپ کرنے پڑتے۔ فائلوں کا کام اس کے علاوہ تھا۔ وہ کبھی ایک فائل منگواتے تو کبھی دوسری۔ بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ وہ کام کے بہانے مجھے زیادہ دیر تک اپنے پاس روکنا چاہتے ہیں۔ مجھے سلیم اور روزینہ کی باتیں یاد آئیں اور اپنا عہد بھی کہ اپنی نوکری بچانے کے لیے باس کو

UUNOVELS.COM

ہر قیمت پر خوش رکھوں گی اور انہیں ناراض ہونے کا کوئی موقع نہیں دوں گی۔

میں اب تک اس حکمت عملی میں کامیاب تھی۔ وہ نہ صرف میرے کام سے خوش تھے بلکہ میرے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آرہے تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر چائے پلاتے اور مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ مجھ پر کام کا کوئی دباؤ نہیں تھا اور میں بڑے سکون سے وقت گزار رہی تھی۔

دوسری طرف روزینہ نے مجھے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ باس بڑے دل پھینک واقع ہوئے ہیں اور میں حتی الامکان ان سے دور رہنے کی کوشش کروں جب کہ عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ میں باس کی اسسٹنٹ تھی اور کام کے سلسلے میں مجھے دن میں کئی بار ان کے کمرے میں جانا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی بلاتے مجھے ان کے دربار میں حاضری دینا ہوتی تھی۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے دشمنی نہیں کی جاسکتی۔

مجھے روزینہ کی بات میں کوئی وزن نظر نہیں آیا۔ وہ اگر دل پھینک تھے یا مجھ سے فلرٹ کرتے تو مجھے بھی اپنی حفاظت کرنا آتی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کبھی انہوں نے کوئی غیر اخلاقی حرکت کی تو لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر ملازمت چھوڑ کر چلی جاؤں گی لیکن اگر وہ میرے ساتھ نرمی اور شرافت سے پیش آتے رہے تو میں بھی انہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے اثرات میری زندگی پر بھی پڑے۔ ہوا یوں کہ میری بڑی بہن نسیمہ جس اسکول میں پڑھاتی تھی اس کے مالک کے ساتھ اس کا تعلق استوار ہو گیا۔ وہ پیسے والا شخص تھا اور اس اسکول کے علاوہ اس کے دوسرے کاروبار بھی تھے۔ وہ ایک پیٹرول پمپ اور شادی ہال کا مالک ہونے کے علاوہ کنسٹرکشن اور پراپرٹی کا کام بھی کرتا تھا۔ بیوی مر چکی تھی اور اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ نسیمہ کی خوب صورتی پر مر مٹا اور اس نے اسے پروپوز کر دیا۔

نسیمہ بھی اس کی امارت اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے مرعوب ہو گئی اور اس نے شادی کے لیے رضا مندی ظاہر کر دی۔ جب اس نے مجھے یہ بات بتائی تو میں حیران رہ گئی۔ وہ شخص نسیمہ سے کم از کم پندرہ سال بڑا تھا۔ جب میں نے نسیمہ کی توجہ اس جانب دلائی تو وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مرد کی عمر نہیں بلکہ اس کی حیثیت دیکھی جاتی ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ میں نے ہمیشہ امیر آدمی سے شادی کرنے کا خواب دیکھا اور اسی لیے کئی رشتے ٹھکرا دیے۔ اب قدرت نے ایک موقع دیا ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے ابو مان جائیں گے؟''

''انہیں راضی کرنا تمہارا کام ہے۔ میں نے باجی کو بتا دیا ہے۔ وہ بھی ان سے بات کریں گی۔ ویسے... ابو کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ان کا ایک بوجھ کم ہو رہا ہے۔''

پہلے تو ابو تیار نہیں ہو رہے تھے لیکن شملی باجی اور ان کے شوہر کے سمجھانے پر وہ اس رشتے کے لیے راضی ہو گئے اور چند ہی دنوں بعد نسیمہ اور سعید صاحب کی شادی ہو گئی۔ جب میں نے پہلی بار سعید بھائی کو دیکھا تو وہ مجھے بالکل پسند نہیں آئے۔ چھوٹا قد، سانولا رنگ، گنجا سر اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں لیکن نسیمہ بہت خوش تھی۔ سعید بھائی نے اسے پرنسپل بنا کر سارا انتظام سونپ دیا تھا اور اب وہ اسکول کے سیاہ وسفید کی مالک تھی۔ وہ ایک سے ایک قیمتی لباس پہنتی۔ اس کا پرس ہمیشہ نوٹوں سے بھرا رہتا۔ سعید بھائی نے ایک گاڑی مع ڈرائیور اس کے حوالے کر دی تھی اور وہ مزے سے اس میں گھومتی۔

وہ ہر دوسرے تیسرے دن ابو سے ملنے ضرور آتی۔ سعید بھائی بھی ساتھ ہوتے کبھی نہیں لیکن اسے ہر جگہ آنے جانے کی آزادی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ ڈھیروں پھل، بسکٹ کے ڈبے، جام جیلی اور نہ جانے کیا کیا لے کر آتی۔ ابو منع کرتے تو کہتی۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں سعید کے پیسے سے یہ سب کچھ کر رہی ہوں۔ جی نہیں، یہ میری اپنی کمائی ہے۔ ان کا اسکول سنبھال رکھا ہے، اس کی تنخواہ لیتی ہوں۔''

میں نسیمہ باجی کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر رشک کرنے لگی۔ میرے خیال میں انہوں نے بڑا صحیح فیصلہ کیا کہ کسی معمولی حیثیت کے بندے سے شادی کرنے کی بجائے ایک امیر اور کھاتے پیتے شخص کا انتخاب کیا۔ ساری عمر گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے کہ چار دن کی زندگی عیش و آرام سے گزاری جائے۔ میرے دماغ میں بھی یہی سوچ پروان چڑھنے لگی نہ جانے نسیمہ باجی نے کیسے میرا ذہن پڑھ لیا۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگیں۔

''شائستہ! تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''مجھے کیا سوچنا ہے۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ میری منگنی شاہد سے ہو چکی ہے اور جیسے ہی اسے ملازمت ملی تو ہماری شادی بھی ہو جائے گی۔''

UUNOVELS.COM

"ہونہہ ملازمت۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ شاہد کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اسے سرکاری ملازمت تو ملنے سے رہی۔ پرائیویٹ اسپتال والے بیس پچیس ہزار سے زیادہ نہیں دیتے۔ اس تنخواہ میں اس کا اپنا گزارہ ہونا مشکل ہے۔ تمہیں کیا دے گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" میں نے بے بسی سے کہا۔

"تم نے کرکٹ کا میچ دیکھا ہے۔ اس میں وہی ٹیم کامیاب ہوتی ہے جس کے کھلاڑی ٹک ٹک کرنے کی بجائے چوکے چھکے لگاتے ہیں۔ تمہیں بھی چھکا لگانے کی ضرورت ہے میری طرح۔"

"یعنی آپ چاہتی ہیں کہ میں شاہد سے منگنی ختم کر کے کسی امیر شخص سے شادی کرلوں۔"

"بالکل، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"لیکن ہر کوئی آپ کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ امیر آدمی کا انتظار کرتے کرتے میں بوڑھی ہو جاؤں۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" وہ بڑے یقین سے بولی۔ "انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ تم مجھ سے زیادہ خوب صورت اور پڑھی لکھی ہو۔ دفتر میں کام کرتی ہو۔ تمہارا کئی طرح کے مردوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اپنے اردگرد نظر دوڑاؤ۔ کوئی نہ کوئی مطلب کا بندہ مل ہی جائے گا۔"

نسیمہ باجی کے مشورے پر عمل کرنا آسان نہ تھا اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ کسی خیالی شخص کی خاطر شاہد سے منگنی توڑ دوں۔ البتہ نسیمہ باجی کی باتیں سن کر وہ مجھے بہت حقیر لگنے لگا اور میں بھی کسی امیر آدمی سے شادی کا خواب دیکھنے لگی۔

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے لباس اور گیٹ اپ پر توجہ دینا شروع کردی۔ جدید فیشن کے مطابق کپڑے بنوائے، بیوٹی پارلر جا کر فیشل کروایا اور بالوں کو نئے انداز سے سنوارا۔ پہلے میں صرف ہلکی سی لپ اسٹک لگا لیا کرتی تھی لیکن اب میں نے مکمل میک اپ کرنا شروع کر دیا۔

پہلے دن جب میں اس جدید وضع قطع کے ساتھ دفتر گئی اور باس سے سامنا ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں نے انتہائی چست قمیص اور ٹخنوں سے اوپر کا چھوٹے پائنچوں والا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پہلے میں سر اور سینے کو دوپٹے سے ڈھانپ کر رکھتی تھی لیکن اب وہ میرے کندھے پر جھول رہا

مولانا محمد علی جوہر

پیدائش 10 دسمبر 1878ء، وفات 4 جنوری 1931ء۔ ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم رہنما، جوہر تخلص۔ ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ دو سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ مذہبی خصوصیات کا مرقع تھیں، اس لیے بچپن ہی سے تعلیمات اسلامی سے گہرا شغف تھا۔ ابتدائی تعلیم رام پور اور بریلی میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔

قاضی محمد عیسیٰ

پیدائش 18 جولائی 1913ء، وفات 19 جون 1976ء۔ تحریکِ پاکستان بلوچستان کے سرگرم رکن تھے، انہوں نے ہی قائداعظم کے کہنے پر مسلم لیگ بلوچستان قائم کی اور اس پلیٹ فارم سے اہم خدمات سرانجام دیں۔

بیگم رعنا لیاقت علی

پیدائش 13 فروری 1905ء۔ وفات 13 جون 1990ء (85 سال) مدفن مزار قائد۔ بیگم رعنا لیاقت علی پاکستان کی خاتون اوّل، پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کی بیگم، تحریکِ پاکستان کی رکن اور سندھ کی پہلی خاتون گورنر تھیں۔

احمد ندیم قاسمی

پیدائش 20 نومبر 1916ء، وفات 10 جولائی 2006ء۔ پاکستان کے ایک معروف ادیب، شاعر، افسانہ نگار، صحافی، مدیر اور کالم نگار تھے۔ افسانہ اور شاعری میں شہرت پائی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نمایاں مصنفین شمار ہوتا تھا اور اسی وجہ سے دو مرتبہ گرفتار کیے گئے۔ قاسمی صاحب نے طویل عمر پائی اور لگ بھگ نوے سال کی عمر میں انہوں نے پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔

مولانا حسرت موہانی

پیدائش 14 اکتوبر 1878ء، وفات 13 مئی 1951ء۔ بیسویں صدی کے اردو زبان کے مشہور شاعر اور تحریک آزادی ہند کے کارکن تھے۔ آپ کے والد کا نام سید اظہر حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ 1903ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھا۔ کندھوں تک ترشے ہوئے بال، ہونٹوں پر گہری لپ اسٹک، مصنوعی پلکیں وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ کہ میں تمام ہتھیاروں سے لیس تھی۔

باس زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکے اور بے اختیار بول اٹھے۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں مس شائستہ۔ آپ نے تو اپنے آپ کو بالکل ہی بدل لیا۔''

''کیا کریں سر۔'' میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ''زمانہ کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔''

''گڈ، بہت اچھا کیا۔'' وہ چہکتے ہوئے بولے۔ ''میں نے تو آپ کو پہلے ہی یہ مشورہ دیا تھا۔ آپ جیسی خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی کو ایسا ہی نظر آنا چاہیے۔ آپ اس ڈریس اور گیٹ اپ میں بہت اچھی لگ رہی ہیں بلکہ اگر تھوڑا سا بے تکلف ہونے کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ قیامت ڈھا رہی ہیں۔'' وہ بے باکانہ انداز میں میرے گریبان پر نظریں جمائے ہوئے کہہ رہے تھے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو میں فوراً اپنا دوپٹا سینے پر پھیلا لیتی لیکن اب میں اپنے آپ کو ایک ماڈرن لڑکی سمجھ رہی تھی جس کے لیے مردوں کی گستاخ نظریں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ باس نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور ان کی ہمت بڑھ گئی۔ بے حد رومانٹک انداز میں بولے۔ ''چلیں اس خوشی میں پہلے تو آپ اچھی سی چائے پلائیں پھر آج ہم کہیں باہر لنچ کریں گے۔''

''لیکن سر! میں تو دوسری لڑکیوں کے ساتھ لنچ کرتی ہوں۔ ان سے کیا کہوں؟''

''کہہ دیجیے کہ باس کے ساتھ ایک میٹنگ میں جا رہی ہوں۔''

اس وقت میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ دفتر کے لوگ خاص طور پر روزینہ کیا سوچے گی لیکن شاید میں خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ بظاہر تو میرا مقصد انہیں خوش کرنا تھا لیکن لاشعوری طور پر میرے اندر ایک خواہش جڑ پکڑ رہی تھی۔

دوسرے دن میں دفتر آئی تو سب کی نظریں بدلی ہوئی تھیں۔ سلیم آیا اور خاموشی سے پانی کی بوتل رکھ کر چلا گیا۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ اس نے مجھے سلام نہیں کیا بلکہ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کوئی جرم کر کے آئی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ہی باس نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا اور کوئی کام بتانے کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اچانک میری نظر ان کے کپڑوں پر گئی۔ انہوں نے بغیر استری کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اصولاً مجھے خاموش رہنا چاہیے تھا لیکن میں بے اختیار بول اٹھی۔

''سر یہ کیا؟ آج آپ کے کپڑوں پر استری نہیں ہوئی؟''

وہ جھینپتے ہوئے بولے۔ ''بس آج جلدی میں موقع نہیں ملا جو قمیص ہاتھ آئی وہی پہن لی۔''

''کیا آپ اپنے کپڑے خود استری کرتے ہیں؟''

''ہاں...... اور کون کرے گا۔''

''اور آپ کی بیگم؟''

''انہیں سونے اور کھانے سے فرصت ہو تو وہ کچھ کریں۔ میں اپنے سارے کام خود ہی کرتا ہوں۔''

''اوہو...... یہ تو بہت بری بات ہے۔'' میں نے خوانخواہ کی ہمدردی جتائی۔

''مس شائستہ! میں اپنے گھر کی باتیں کسی کے سامنے نہیں کرنا چاہتا لیکن آپ کے خلوص اور ہمدردی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اس لیے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں سچ پوچھیں تو میں اس عورت سے شادی کر کے پچھتا رہا ہوں۔ وہ انتہائی بدمزاج، جاہل اور پھوہڑ عورت ہے۔ اس نے میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اس سے پیچھا چھڑا کر دوسری شادی کر لوں۔''

میں بت بنی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ حیرانی بھی تھی کہ وہ میرے سامنے ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے۔ ان کی گھریلو زندگی سے مجھے کیا لینا دینا۔ وہ مالک، میں ملازم۔ کیا انہیں میرے سامنے ایسی باتیں کرنی چاہئیں یا وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ میں ان سے ہمدردی کروں۔ ان کا دکھ بانٹوں اور زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزاروں۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ میں واقعی ان کے لیے ہمدردی محسوس کرنے لگی۔ مجھے ان پر ترس آ رہا تھا۔ وہ پڑھے لکھے شریف، مہذب اور دولت مند ہونے کے باوجود ایک جاہل، گنوار، بدمزاج اور پھوہڑ عورت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ کاش میں ان کے لیے کچھ کر سکتی۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ نسیمہ باجی نے کہا تھا کہ میں اپنے اردگرد پر نظر رکھوں۔ کوئی نہ کوئی مطلب کا بندہ مل ہی جائے گا۔ وہ بھی تو اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہ رہے تھے۔ ان کی بے باک نظروں نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھا۔ ان کے التفات بلاوجہ نہیں تھے۔ مجھے بار بار کمرے میں بلاتا۔ دیر تک اپنے پاس بٹھائے رکھتا۔ بات بات پر میری تعریفیں کرتا۔ میرے حسن کے قصیدے پڑھتا میں بچی نہیں تھی جو ان باتوں کا مطلب نہ سمجھتی۔

میں نے نسیمہ باجی سے ذکر کیا تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ”دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ تمہیں بھی کوئی امیر شخص مل جائے گا۔ تمہارے سامنے اپنی بیوی کی برائی اور تمہاری تعریف کرنے کا مطلب بالکل واضح ہے۔ وہ تمہارے دل میں جگہ بنانا چاہتا ہے اور اگر تم ذرا سی بھی حوصلہ افزائی کرو گی تو وہ تمہیں پروپوز کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ جاؤ۔ اس کے ساتھ گھومو پھرو۔ ہوٹلوں میں جاؤ۔ اسے چھوٹے موٹے تحفے دے کر یہ ظاہر کرو کہ تمہیں اس کا کتنا خیال ہے۔ قدرت نے تمہیں ایک موقع فراہم کیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل جائے۔“

”اور شاہد کا کیا ہوگا؟“

”وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اس کا پتا صاف کرنا میری ذمے داری ہے لیکن ابھی نہیں۔ تمہارے باس کے پروپوزل کے بعد۔“

مجھے نسیمہ باجی کے مشورے پر عمل کرنے میں کچھ زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ میں تو پہلے ہی باس کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ میرا تقریباً پورا دن ہی ان کے کمرے میں گزرتا، ہم اکثر دوپہر کا کھانا باہر ہی کھاتے۔ ایک دو مرتبہ وہ مجھے شاپنگ کرانے بھی لے گئے۔ میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو ان کا پروپوزل سننے کے لیے تیار کر لیا تھا اور انتظار کر رہی تھی کہ وہ کب اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔

ایک دن لنچ کے بعد روزینہ نے مجھے روک لیا جب سب لڑکیاں چلی گئیں تو اس نے کہا۔ ”شائستہ! میں نے تمہیں پہلے روز ہی باس کی فطرت کے بارے میں بتا دیا تھا اور محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا لیکن افسوس کہ تم نے میری بات پر دھیان نہیں دیا اور اسی راستے پر چل رہی ہو جس کے لیے میں نے منع کیا تھا۔ میں اب بھی کہہ رہی ہوں کہ لوٹ آؤ ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ دراصل میرے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ مجھے دن میں کئی مرتبہ ان کے پاس جانا پڑتا ہے۔“

ایک اور صاحبِ کمال اٹھ گیا

ابھی سیماب صاحب کی جدائی کا زخم ہرا ہی تھا کہ آرزو صاحب کی مفارقت نے دل میں ایک تازہ گھاؤ ڈال دیا۔ آرزو صاحب کو میں بچپن سے جانتا تھا۔ وہ میرے والدِ مرحوم کے روز آنے جانے والے بےتکلف دوست اور حضرت جلال لکھنوی کے شاگردِ رشید تھے۔ الفاظ کی تحقیق، لغات کی پرکھ، فنِ شعر کے نکات، زبان کا اتار چڑھاؤ، اصوات کا زیر و بم اور عروض کی دقیقہ سنجیوں میں وہ ایک زبردست مجتہد اور قدیم ادب سے وابستگی کے باوجود، فن اور زبان کے مسائل میں وہ ترقی پسندانہ خیالات کے حامل تھے۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا لکھنو میں یہ خوش خبری سنی تھی کہ آرزو صاحب کا کراچی ریڈیو میں تقرر ہو گیا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ اس خوش خبری کو حضرت آرزو کی خبرِ مرگ بہت جلد ماتمی لباس پہنا دے گی۔ کراچی کی خاک کو کیا معلوم کہ اس کے آغوش میں وہ گنجِ گراں مایہ دفن ہوا ہے جسے حریم لکھنو کی آسمان بدوش زمین نے پیدا کیا اور فضائے ادب پر آفتاب کی طرح دمکایا تھا۔ جہاں تک آرزو صاحب کی آخری دردناک زندگی کا تعلق ہے موت ان کے حق میں آیہ رحمت ثابت ہوئی اس لیے کہ ”مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور۔ رکھ لی مرے خدا نے مری بےکسی کی شرم۔“ بہرحال اس سیاسی بحران کے دورِ ناقدری میں صاحبِ کمال کا مر جانا ہی اس کی زندگی ہے اور جو لوگ ابھی زندہ ہیں وہ ہر میت کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ ”کیا قافلہ جاتا ہے، تُک تو بھی چلا جاتا۔ اے خاکِ پاک لکھنو یہ تیری کتنی عبرت ناک بدبختی ہے کہ تیرے صاحبانِ کمال معاش سے تنگ آ کر زندگی میں بھی تجھ سے دور، بہت دور رہتے ہیں اور مر کر بھی تجھ میں دفن نہیں ہونے پاتے۔

اقتباس: ماہنامہ آج کل، از جوش ملیح آبادی

مرسلہ: انور اعجاز خان۔ پشاور

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

"چلو مان لیا لیکن یہ جو تم اکثر لنچ کے وقت غائب ہو جاتی ہو۔ اس کے بارے میں کیا کہو گی؟"

"وہ دراصل باس مجھے اپنے ساتھ میٹنگ میں لے جاتے ہیں۔ واپسی میں دیر ہو جاتی ہے تو ہم باہر ہی لنچ کر لیتے ہیں۔"

"میں بھی ان کے ساتھ کام کر چکی ہوں۔ مجھے تو وہ کبھی کسی میٹنگ میں لے کر نہیں گئے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ "خیر یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ تم جو چاہو کرو جہاں چاہو جاؤ، میرا کام تمہیں خبردار کرنا تھا۔ جانتی ہو دفتر میں تمہارے بارے میں کیسی کیسی باتیں ہو رہی ہیں؟"

"ہونہہ...... مجھے اس کی پرواہ نہیں۔" میں نخوت سے بولی۔ "یہ لوگ جلتے ہیں کہ میں باس کے اتنا قریب کیوں ہوں۔"

"اگر تم اس طرح سوچ رہی ہو تو تمہاری مرضی۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "لیکن مجھے لگتا ہے کہ کوئی طوفان آنے والا ہے۔"

اور وہ طوفان اگلے روز ہی آ گیا۔ شاہ نواز صاحب کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے میں اپنے کمرے میں بیٹھی خطوط ٹائپ کر رہی تھی کہ انٹر کام کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو ایک اجنبی زنانہ آواز سنائی دی۔ "مس شائستہ! ایک منٹ کے لیے اندر آئیں۔"

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ شاہ نواز صاحب کے کمرے میں کون بیٹھا ہے اور مجھے کیوں بلا رہا ہے۔ میں اندر گئی تو باس کی کرسی پر ایک خوش شکل اور فیشن ایبل عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے مجھے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ "شائستہ! تم مجھے نہیں جانتیں اس لیے بہتر ہوگا کہ پہلے اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام صائمہ ہے اور میں تمہارے باس شاہنواز کی بیوی ہوں۔"

بیگم شاہنواز کو اپنے سامنے دیکھ کر میں خوف زدہ ہونے کے ساتھ حیران بھی تھی۔ باس نے اپنی بیوی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا یہ عورت اس سے بالکل مختلف تھی۔ مجھے کہیں سے بھی وہ جاہل، بدمزاج اور بدسلیقہ نظر نہیں آئی بلکہ پڑھی لکھی، مہذب اور شائستہ مزاج لگ رہی تھی۔

"تم واقعی بہت خوب صورت ہو۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "کوئی بھی مرد تمہیں دیکھ کر پاگل ہو سکتا ہے اور شاہنواز تو ویسے بھی دل پھینک واقع ہوا ہے۔ ہر لڑکی کو دیکھ کر اس پر فدا ہو جاتا ہے۔"

خوف کے مارے میری ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ میرا حلق خشک ہو گیا اور مجھ سے کچھ نہیں بولا گیا۔ ویسے بھی میرے پاس بولنے کے لیے کیا رہ گیا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ وہ آج کل تم پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ تم سارا سارا دن اس کے پاس بیٹھی رہتی ہو اور اکثر اس کے ساتھ ہوٹلوں میں بھی جاتی ہو۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور بولی۔ "جھوٹ مت بولنا۔ یہاں میرے کئی جاسوس ہیں اور مجھے پل پل کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ اس نے تمہیں بھی شادی کا جھانسا دیا ہوگا اور تم ہر مڈل کلاس لڑکی کی طرح اس کی باتوں میں آ گئی ہو گی لیکن میں بتا دوں کہ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد وہ تمہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکے گا۔"

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں اگر تم سمجھ رہی ہو کہ وہ تم سے شادی کرے گا تو یہ تمہاری بھول ہے کیونکہ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت ضروری ہوتی ہے جو میں اسے کبھی نہیں دوں گی۔ وہ مجھے طلاق بھی نہیں دے سکتا کیونکہ ایسی صورت میں وہ ایک منٹ میں سڑک پر آ جائے گا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں اس کاروبار کی مالک ہوں۔ اس کی حیثیت ایک ملازم سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں نے تمہیں اس کی اوقات بتا دی ہے اس لیے تم فوری طور پر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لو ورنہ دفتر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا پرس اٹھایا اور اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ پھر میں نے اپنے کمرے میں آ کر استعفیٰ لکھا اور شاہ نواز کی میز پر رکھ کر گھر چلی آئی۔ اب میرے لیے اس دفتر میں کام کرنا بہت مشکل تھا۔ ویسے بھی شاہد کو جاب مل گئی تھی اور چچی جان ابو سے شادی کی تاریخ مانگ رہی تھیں۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ نسیمہ باجی کی باتوں میں آ کر میں نے شاہد سے اپنی منگنی ختم نہیں کی ورنہ میں کہیں کی نہ رہتی۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔

++

UUNOVELS.COM

میری جنت

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

میرا تعلق ایک این جی او سے ہے اکثر زنانہ جیل بھی جاتی ہوں۔ وہیں میری ملاقات اس عورت سے ہوئی جو اس سچ بیانی کا مرکزی کردار ہے۔ اس کردار سے جڑے کئی اہم نام بھی تھے۔ اس وجہ سے میں نے نام اور مقام بھی بدل دیئے ہیں۔ اُمید ہے کہ قارئین کو یہ سچ بیانی بہت پسند آئے گی کیونکہ انجام چونکانے والا ہے۔

زرینہ بٹ

(لاہور)

میں نے نوجوان اور حسین لڑکیوں کی طرح محبت، دولت اور محل کے خواب کبھی نہیں دیکھے اور نہ ہی اس کے پیچھے بھاگنے کی کوئی کوشش کی۔ حالانکہ میں جوان ہی نہیں جاذبِ نظر اور دلکش بھی ہوں۔ مجھ میں ایسی کشش ہے کہ میں مردوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہوں اور وہ مجھے بار بار مڑ کے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں رشک بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہیں۔ میں نے سولہ برس کی دہلیز پر قدم کیا رکھا کہ زندگی کا سارا بوجھ میرے کندھے پر اس طرح ڈال دیا گیا جیسے میں دنیا میں اس کام کے لیے ہی پیدا ہوئی ہوں۔ امی بیمار پڑ گئیں تو مجھے ان کی تیمارداری، ابو اور دو

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

بڑے بھائیوں کے لیے کھانا پکانا اور گھر بھی سنبھالنا پڑا۔
میں اس گھر کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتی جس میں رہا کرتی تھی۔ ریلوے لائن کے قریب واقع ایک حویلی جو کھنڈر بن چکی تھی وہی ہمارا گھر تھا۔ بارش ہوتی تھی تو اس کھنڈر کی چھت سے جا بجا ٹپکتے ہوئے پانی کے نیچے رکھنے کے لیے ہمارے برتن بھی کم پڑ جاتے تھے پھر بھی ہم اس میں رہ کر وقت گزار رہے تھے اور وقت بھی تیزی سے گزر رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد ابو وفات پا گئے۔ وہ دیہاتی آدمی تھے اس لیے انہیں شہر کی سکونت راس نہیں آئی تھی۔ ابو کے انتقال کے بعد بھائیوں نے اپنی اپنی پسند کی لڑکیوں سے شادیاں کر لیں بھاوجوں نے آتے ہی گھر پر قبضہ کر لیا، مجبوراً مجھے اور امی کو عقبی کمروں میں منتقل ہونا پڑا جن کے دروازے گندی گلی میں کھلتے تھے۔ میرے بھائی بس اتنے پیسے دیتے تھے کہ میں اور امی زندہ رہ سکیں لیکن یہ بھی ان کی بیویوں کو برا لگتا تھا۔ میں ماں کو ہر طرح سے آرام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ انہیں ہر حال میں زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ نہ میرے پاس کوئی تعلیمی سند تھی اور نہ ہی ایسا کوئی ہنر تھا جو پیٹ کا ایندھن بھرنے کے کام آ سکے۔ دوسرے میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ ابو کی وفات کے بعد بھابیاں نہ صرف بھائیوں کو میری مدد کرنے سے روک دیں گی بلکہ سر چھپانے کی جگہ بھی چھین لیں گی اور میں اتنی بڑی دنیا میں بے سہارا ہو کے رہ جاؤں گی۔
پہلے ہی آلام کم نہ تھے کہ ایک روز موت کے بے رحم پنجے نے میری ماں کو بھی مجھ سے سدا کے لیے جدا کر دیا۔ آخری ہچکی لیتے وقت ان کے ہونٹوں پر میرے لیے ایک ممنون مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ دراصل آخری دم تک میں نے ان کا بڑا خیال کیا اور ہر طرح سے ان کی خوب خدمت کی تھی ماں کی موت کے بعد میری دونوں بھابیوں نے میرے ساتھ وہی کیا جس کی مجھے ان سے توقع تھی۔ مجھے کسی لگی لپٹی کے بغیر صاف صاف بتا اور جتا دیا کہ اب مجھے خود اپنی زندگی کا بوجھ اٹھانا ہوگا۔ کس طرح اور کیسے؟ یہ ان کا مسئلہ نہیں۔ مجھے اس بات کی پوری پوری آزادی ہو گی کہ جیسے اور جس طرح چاہوں زندگی گزاروں۔ میں کیوں کہ ایک جوان دوشیزہ ہوں اس لیے گزر بسر کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ میرا ہاتھ تھامنے کے لیے جانے کتنے بے تاب ہوں گے۔
میں بہت پریشان اور متفکر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھ سے پچیس برس بڑے سرفراز نے ایک روز اپنے گھر کی تنہائی میں مجھے شادی کی پیشکش کی تو میں انکار کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ ان کی بیوی حیات نہیں تھی۔ سر چھپانے کی غرض سے قطع نظر میں ان کے ساتھ ایک مخلصانہ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ ان کی بیوی بننے کے بعد مجھے جس گھر میں رہنا نصیب ہوا وہ میرے سابقہ گھر سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ اس کی دیوار پر پلستر کی جگہ سیاہ کائی جمی ہوئی تھی۔ پانی کے پائپ ناکارہ ہو چکے تھے۔ باورچی خانے میں برتن دھوتے وقت مجھے بار بار پائپ پر ٹھوکریں مارنا پڑتی تھیں کہ ٹونٹی سے پانی آ سکے اور اس وجہ سے میری دائیں ٹانگ میں درد رہنے لگا تھا۔ میں نے درد دور کرنے کی گولیاں کھائیں پھر بھی افاقہ نہ ہو سکا۔ سرفراز بیمار پڑ گئے اور انہیں اپنی جوتوں کی وہ چھوٹی سی دکان بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک چھوٹا سا لکڑی کا کھوکھا جو انہوں نے گلبرگ کے علاقے میں ایک بڑے دکاندار کی خوشامد کر کے سامنے رکھ لیا تھا، بیچنا پڑا۔ ان کا بینک بیلنس چند سو روپے کا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ایک انشورنس پالیسی بھی تھی مگر وہ ابتدائی چھ ماہ کے بعد پریمیم ادا نہ کرنے کی وجہ سے منسوخ ہو چکی تھی۔
میں نے انہیں آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی کیونکہ میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تھے۔ میرے دل میں ان کے لیے پیار تھا۔ عزت بھی تھی۔ آخر کیوں نہ ہوتی، وہ میرے مجازی خدا جو تھے میں خود گھر میں کپڑے دھوتی تھی۔ انہیں ہر دوسرے تیسرے دن دھلے کپڑے پہننے کو دیتی اور ان کے بستر کی چادر بدلتی تھی۔ سارے کام سے تھک ہار کے میں اس تنگ و تاریک کمرے میں مسرت بھرے جلوؤں کی شمع روشن کرتی جہاں سرفراز لیٹے ہوتے تھے۔ ان کی خوشی میرے لیے کسی دولت سے کم نہیں تھی۔
لیکن اس دنیا میں کوئی عمر خضر لے کر نہیں آیا۔ ایک دن وہ بھی دنیا سے روٹھ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔
ان کی وفات کے بعد مجھ پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ مجھے چھت سے بھی محروم ہونا پڑا۔ میں ان مشکلات کا ذکر کرنا نہیں چاہتی جو مجھے بیوہ ہونے کے بعد اٹھانا پڑیں۔
میں جو کام کر سکتی تھی اس کے عوض کبھی کبھار پیٹ بھر کے کھانا اور سر چھپانے کی جگہ مل جاتی تھی۔ میں کوئی سند یافتہ نرس نہیں تھی مگر اسپتال میں کام کرنے والی کئی نرسوں سے دوستی تھی۔ انہوں نے جو سکھایا تھا اسے کام میں لا کر

UUNOVELS.COM
©UUNOVELS.COM

مریضوں کی نگہداشت کرنا اچھی طرح جان گئی تھی۔ جو لوگ میری خدمات حاصل کرتے تھے میرے پاس سند نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھے صرف دو وقت کا کھانا اور عارضی سکونت کے سوا کچھ دینے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ ان کے خیال میں میری خدمات کا معاوضہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے جوتے پھٹ چکے تھے اور نہانے کے لیے صابن تک میسر نہ تھا۔ جب بھی میں نے کسی سے ان ضروریات کے لیے تھوڑے بہت پیسے مانگے تو انہوں نے میری طرف اس طرح گھور کے دیکھا جیسے میں بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں چونکہ سند یافتہ نرس نہیں ہوں، محض ایک ملازمہ ہوں اس لیے مجھے پیسے کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

میں نے تب چوریاں شروع کر دیں لیکن صرف بے کار اشیاء کی۔ ایسی چیزیں جو لوگ عموماً کباڑ خانوں میں پھینک دیتے تھے۔ وقتاً فوقتاً کچھ چیزیں چرا کے میں.... کباڑی کی دکان پر فروخت کر دیا کرتی تھی۔

یہ نقرئی ڈبا ہرگز میں نے چرایا نہیں جس کا مجھ پر الزام ہے۔ جہاں تک اس ڈبے کا تعلق ہے۔ وہ ڈبا میرا اپنا تھا۔ رقیہ کی بھتیجی کچھ بھی کہے میری بلا سے۔ اس جیسی پچاس ہزار بھتیجیاں بھی مل کے اس حقیقت کو بدل نہیں سکتیں کہ ڈبا میرا اپنا تھا۔ وہ مجھ پر الزام تراشی اور بہتان پر اس لیے اتر آئی تھی کہ میں اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

جہاں تک پولیس والے کا تعلق ہے تو میں اسے ہلاک کرنا ہرگز ہرگز نہیں چاہتی تھی لیکن میں یہ بھی نہیں کہتی کہ اس کے متعلق میرے دل میں اچھے خیالات موجزن تھے۔ بہرحال میں جس مصیبت میں گرفتار ہوئی اسے اللہ کی مرضی اور میری بدنصیبی ہی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے نقرئی ڈبا چرایا نہیں تھا لیکن اللہ نے اس بہانے میری تمام سابقہ چوریوں کی سزا دے دی تھی۔ جیسا کہ میں نے مسجد کے ایک پیش امام سے سنا تھا کہ اگر آدمی ایک جرم کر کے بچ جائے تو اس کی سزا دنیا میں بھی کسی نہ کسی طرح مل جاتی ہے۔ وقوع کے وقت میرا ذہن صحیح کام نہیں کر رہا تھا کہ میں بہتر طریقے سے اس واقعے کو بیان کرتی۔

میں نے اب تک جتنے مریضوں کی خدمت اور تیمارداری کی عالیہ بیگم ان سب میں سب سے زیادہ نرم دل اور احسان کو محسوس کرنے والی عورت تھیں۔ وہ بستر علالت پر دراز تھیں اور ہلنے جلنے سے بھی معذور تھیں۔ میں رات کے وقت ان کے جسم کی مالش کیا کرتی۔ میری مالش سے انہیں بہت آرام اور سکون ملتا تھا۔ وہ میری ہر چھوٹی بڑی بات پر بڑی شکر گزار ہوتی تھیں۔ میں اگر ان کی بستر کی چادر بھی درست کر دوں تو بڑی ممنون اور احسان مند ہوتی تھیں۔ انہیں رات کو نیند نہیں آتی تھی تو میں پوری پوری رات بیٹھ کے ان کے بچپن کے قصے اور دکھ سکھ کی کہانیاں سنتی تھی جس سے ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہیں لطیفے سنا سنا کے ہنسانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ بہرحال بیماری انہیں گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ انتقال سے دو روز پہلے انہوں نے کہا کہ وہ میری بے حد شکر گزار ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ میرے لیے کچھ کریں لیکن وہ معذور ہونے کے سبب اپنا تمام اثاثہ اپنی بھتیجی کے نام کر چکی تھیں۔ اب ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی کہ وہ مجھے دیتیں اس لیے انہوں نے مجھے ایک بیکار سا ڈبا دیا کہ اسے میں اپنے گھر لے جاؤں۔ وہ یہی ڈبا تھا جس کی وجہ سے مجھے اذیتیں سہنی پڑیں۔

میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ مجھے یہ جان کے بے حد مسرت ہوئی تھی کہ انہوں نے مجھے بے حد پسند کیا تھا اور میری خدمت کو سراہا تھا ورنہ بیشتر لوگوں نے میری خدمت کے سلسلے میں دو اچھے الفاظ کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ میں نے ان سے ڈبا لے لیا۔ حالانکہ میرے لیے اس کا کوئی مصرف نہ تھا، وہ صرف زیورات رکھنے کے کام آ سکتا تھا۔

میرے پاس بھلا کون سا زیور تھا۔ عالیہ بیگم کو یہ ڈبا بہت عزیز تھا۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے برابر والی تپائی پر رکھتی تھیں کیونکہ ڈبا انہیں شادی پر ملا تھا۔ اسے دیکھ کے ان کی آنکھوں میں وہی چمک آ جاتی تھی جو کوئی کھلونا پا کے بچے کی آنکھوں میں آ جاتی ہے۔

جب عالیہ بیگم اس دنیا سے رخصت ہوئیں تب میں نے پہلی مرتبہ ان کی بھتیجی کو دیکھا۔ اس نے آتے ہی مجھے چھٹی دے دی۔ میں نے اپنی چھوٹی موٹی چیزیں اکٹھا کیں اور ان کے ساتھ وہ نقرئی ڈبا بھی رکھا اور وہاں سے چلی آئی۔

چوری کی چیزوں کی فروخت سے حاصل ہونے والے کچھ روپے میرے پاس جمع تھے جو میں نے بڑی مشکل اور اپنی تمناؤں، خوابوں، خواہشات کا گلا گھونٹ کے اور اپنا پیٹ مار کے جمع کیے تھے۔ میں نے ایک ماہ کا پیشگی کرایہ

UUNOVELS.COM

نبی

شریعت اسلامی میں نبی اس ہستی کو کہتے ہیں جسے خدائے واحد اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے چن لے، یا اس پر وحی آتی ہو۔ خدا نبی سے براہ راست ہمکلام ہوتا ہے، بعض نبیوں پر کتب اور نئی شریعت بھی خدا نے دی، یہ نبی رسول کہلواتے ہیں۔ جب کسی فرد کو نبوت کے لیے چن لیا جائے تو وہ نیکی و خیر میں خدا کا نائب ہوتا ہے اور ہر قسم کے شر سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے نبی بھیجے، پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام اور آخری نبی حضرت محمد ہیں۔ ان پر نبوت ختم ہو جاتی ہے۔ نبی کی نبوت سے انکار گناہ میں شمار کی جاتی ہے۔ نبیوں کے بھیجنے کی وجہ خود خدائے واحد نے قرآن عظیم کی آیات میں فرمایا ہے کہ:

''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی اور بنی اسرائیل کے لیے رہنما مقرر کیا تھا کہ میرے سوا کسی اور کو کارساز نہ ٹھہرانا'' (بنی اسرائیل 2) اسی طرح کا ایک ارشاد سورہ بقرہ 76 اور 110 میں بھی ہے۔ ''اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ...... جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن تو اللہ (ان) کافروں کا دشمن ہے۔'' (124)

سورہ آل عمران میں نبیوں کے بارے میں ارشاد ہے۔ ''اللہ نے آدم اور نوح اور ابراہیم کے گھرانے اور عمران کے خاندانوں کو قوموں پر چن لیا۔ 23'' اسی سورہ میں خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان تمام نبیوں پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور ان کی مدد کرنا ہوگی۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والے نبیوں سے سابقہ نبیوں کے بارے میں لیا۔ اسی طرح اس نے بعد کے نبیوں کو پرانے نبیوں پر گواہ مقرر کیا۔ اس گواہی کے ساتھ ساتھ اس نے تمام نبیوں کو اپنی قوم پر گواہ مقرر کیا کہ یہ روز محشر

ادا کر کے ایک کمرا کرائے پر لیا۔ میں نے اب تک جتنی جگہوں پر قیام کیا تھا ان میں یہ سب سے بدترین جگہ تھی۔ وہاں زبردست سیلن اور اندھیرا تھا۔ اس کی وجہ سے ہاتھ پیر سُن ہو جاتے تھے۔ دیواروں کا پلستر ادھڑا ہوا تھا اور چوبی فرش پر جا بجا گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے پاس موجود دو تین جوڑے بچھن کے میلا گدا فرش پر بچھایا۔ گھسا پٹا کمبل لپیٹے اس کمرے میں بیٹھی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ جسم میں حرارت کی کوئی رمق جنم لینے کی منتظر تھی کہ عالیہ بیگم کی بھتیجی میرے کمرے میں دندناتی ہوئی آ گھسی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے بتایا کہ بڑی مشکل سے میرا اتا پتا لگایا اور یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا کہ میں اس کی چچی کا وہ نقرئی سوروتی ڈبا واپس کر دوں جو میں چرا کے لائی ہوں۔ میری زبان گنگ ہو گئی کیونکہ مجھ پر یہ جھوٹا الزام تھا۔ وہ ہیجان انداز میں اس طرح چیختی چلاتی رہی جیسے کسی مرد نے اسے دبوچ رکھا ہو۔ اس کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم ہچکولے کھا رہا تھا جیسے بہت دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں وہ ڈبا شرافت سے واپس کر دوں تو وہ میرے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کرے گی۔ چند لمحوں کے بعد جب میں نے خود پر قابو پا لیا اور میری قوت گویائی واپس آئی تو میں نے اسے بتایا کہ میں نے ڈبا نہیں چرایا، آپ کی آنٹی نے مجھے تحفے میں اس لیے دیا تھا کہ میں نے دن رات ان کی خدمت کی تھی۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟ کوئی گواہ پیش کر سکتی ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ جب کوئی کسی کو تحفہ دیتا ہے تو تحفہ لینے والا ثبوت اور گواہوں کا بندوبست نہیں کرتا۔ شکریہ کہہ کے قبول کر لیتا ہے۔

میں نے بڑے مضبوط لہجے میں یہ بھی کہا کہ میں کسی قیمت پر یہ تحفہ واپس نہیں کروں گی۔

''تم اس کا خمیازہ بھگتو گی؟'' وہ ہذیانی لہجے میں چیخی اور غصے سے فرش پر پیر پٹختی کسی سنسناتے تیر کی مانند باہر نکل گئی۔ یہ کمرا مجھے ایک بیوہ عورت نے کرائے پر دیا تھا جس کا دنیا میں کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ عالیہ بیگم کی بھتیجی نے قانونی کارروائی کی جو دھمکی دی تھی اس نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا کیونکہ میں نے لاہور کے تھانوں کا جو احوال سنا ہوا تھا وہ روح فرسا تھا۔ ان تھانوں میں جو کالی بھیڑیں تھیں وہ خون آشام بھیڑیوں کو شرما دینے والی تھیں۔

کو قوموں کے خیر وشر کی گواہی دیں گے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ قوموں کو بھی چاہئے کہ رسولوں اور نبیوں کی پیروی کریں کہ اس میں عافیت ہے اور وہ لوگ جو رسولوں کی پیروی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ دوسروں سے الگ کر دیئے جائیں گے (سورہ بقرہ 180) تاکہ یہ لوگ بھی پراگندہ نہ ہو اور یہ جو رسول کی اطاعت کریں گے وہ اللہ کی اطاعت کریں گے۔ اس بارے میں ہدایت سورہ انساء کی 80 ویں آیت میں مذکور ہے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ دنیا نے اپنی گمراہی اور سخت گیری کے باعث بہت سے نبیوں کو خون میں نہلا دیا۔ ان پر ظلم و ستم ہوئے۔ بعض کو اللہ نے بڑے بڑے معجزوں سے گزار کر منکروں پر حکومت دی اور جو خونم ہوئے اللہ اس کا حساب یوم الحشر کو لے گا۔ وہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ناحق قتل کے بارے میں سورہ آل عمران آیت نمبر 112 اور اس کے علاوہ اور بہت سی سورہ میں صاف طور پر پوچھتا ہے کہ ان کے خون سے ناحق ہاتھ کیوں رنگے گئے جب کہ وہ قوموں میں تفرقہ ختم کرنے اور رہنمائی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس کے ان بندوں پر ظلم و جور کرنے والے بعض تو اس جہان فانی ہی میں گھٹ گھٹ کر، سسک سسک کر مرے اور باقیوں سے روز مکافات کو سمجھے گا۔ چند نبیوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں بھی اتاریں، ان میں حضرت داؤدؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، اور نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہیں۔ ان پر بالترتیب زبور، انجیل، توریت اور قرآن کا نزول ہوا۔ مسلمانوں کے لیے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں، مفسرین اور علماء کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم عام عقیدہ یہ ہے کہ کل ایک لاکھ چھیاسی ہزار پیغمبر وقتاً فوقتاً آئے۔
بعض کا ذکر قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ہے اور بعض کے صرف نام یا مختصر حالات ہی درج ہیں۔

مرسلہ: احمد توحید خان، ژوب، بلوچستان

اس کے وقوع ہونے کے بعد اس خوف، اندیشے اور خیال سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے دانت بجنے لگے تھے۔ میرا جسم اس طرح لرزنے لگا تھا جیسے میں پارکنز کی مریض ہوں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چوبی سیڑھیوں پر بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔

میں اچھل سی گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی مرد یا محلے کے کسی بدمعاش کے علم میں یہ بات آگئی ہو کہ بیوہ عورت کے مکان کا کمرا جو جانے کب سے خالی اور ویران پڑا ہوا تھا اسے ایک نوجوان، حسین اور پرکشش لڑکی نے جو بے سہارا ہے کرائے پر لیا ہوا ہے۔ وہ اس میں اکیلی رہتی ہے۔ یہ کسی بھی مرد کے لیے سنسنی خیز اور رال ٹپکنے والی بات تھی کہ اس سے تنہائی میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مالکن ستر برس کی بوڑھی اور ناتواں عورت ہے، کوئی درندہ گھس آیا تو میں نہ مزاحمت کر سکوں گی اور نہ ہی دفاع اور زیادتی کا نشانہ بن جاؤں گی۔

پھر مجھے یکایک یہ خیال آیا کہ کہیں عالیہ بیگم کی بھتیجی اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے میری گرفتاری کے لیے پولیس نہ لائی ہو۔ دہشت نے مجھے پاگل سا کر دیا۔ یہ خوف اور اندیشہ بھی لاحق تھا کہ ڈبا ان کے ہاتھ لگنے کے بعد وہ بدمعاش بھتیجی کہہ سکتی ہے کہ اس میں زیورات بھی تھے، زیورات کہاں ہیں یہ اگلوانے کے لیے مجھ پر تشدد کریں گے اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ میری بے حرمتی کریں گے۔

میں نے ڈبا تھیلے سے نکالا، پچھلا دروازہ کھول کے عقبی زینے کی طرف آگئی۔ میرا ارادہ تھا کہ پچھلی گلی میں اتر کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر یا کسی ایسی جگہ چھپا دوں گی کہ کسی کو نظر نہ آئے۔ یہ گول زینہ تھا جو صرف اس عمارت میں تھا۔ یہ عمارت کافی پرانی تھی۔ اس گول زینے کی سیڑھیاں بہت تنگ تھیں۔ صرف ایک ہی آدمی یہ مشکل اتر سکتا تھا۔ سیڑھیاں میلی چیکٹ ہونے کے سبب کچھ چکنی بھی ہو چکی تھیں۔ میں باوجود کوشش اس تیزی سے اتر نہ سکی جس طرح میں چاہتی تھی کیونکہ سیڑھیوں پر پھسلن بہت زیادہ تھی۔ میں نے ابھی آدھی سیڑھیاں بھی طے نہیں کی تھیں کہ ایک دہاڑ سنی اور میں یک دم ٹھٹک گئی۔

میں نے فوراً ہی مڑ کے دیکھا۔ ایک بھاری بدن کا پولیس والا مجھے اپنے تعاقب میں نظر آیا۔ اس کا چہرہ غصے سے چقندر ہو رہا تھا۔ اتنا غصہ آج تک میں نے کسی آدمی کے چہرے پر نہیں دیکھا۔ شاید اس لیے کہ میں کمرے میں

موجود نہیں تھی اور فرار ہو رہی تھی۔ اس کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ شاید وہ مجھے کمرے میں پا کے دست درازی کرتا۔ اسی بات نے اسے آپے سے باہر کر دیا تھا۔ وہ جامے میں نہیں رہا تھا مجھے اوپر آنے کا کہا تو میں باقی کی سیڑھیوں کو پھلانگ کر نیچے اتر گئی۔ اسی بات نے اسے مزید مشتعل کر دیا اور وہ مجھے پکڑنے کے لیے تیزی سے بڑھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سیڑھیوں سے پھسلتا ہوا نیچے جا گرا۔ اس نے اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ اس نے گرتے وقت بڑے زور کی چیخ ماری تھی۔ اس کی چیخ نے خاموش فضا میں شور پیدا کر دیا تھا۔

میرا ذہن، ہاتھ اور پیر مفلوج ہو گئے تھے۔ میرے حلق سے ایک اضطراری چیخ نکلی تھی۔ اردگرد کی عمارتوں اور مکانات کی کھڑکیاں دھڑا دھڑ کھلنے لگیں۔ وہاں کچھ لڑکیاں اور عورتیں بھی آ گئیں۔ کچھ لوگ عقبی گلی کی طرف بے تحاشا بھاگے۔

پولیس والا یقیناً مر چکا تھا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور خون نکل کے پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس کا ایک ساتھی اس کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں ایک ایمبولینس آ گئی۔ اس ایمبولینس میں مردہ پولیس والے کو اسپتال بھیجا گیا اور مجھے جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ کاغذی کارروائی کے بعد پھر مجھے جیل بھیج دیا گیا۔

میرے لیے جو وکیل مقرر کیا گیا تھا وہ شروع ہی سے مجھے سخت ناپسند تھا۔ اس کا پورا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن اسے شاہ جی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ میں اس کی کسی برائی کی نشاندہی اس لیے نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے اس کے چہرے پر ایک پھٹکار سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت حریصانہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کی نگاہوں کی گرفت میں اپنا چہرہ اور سراپا دیکھ کے میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا جاتی تھی۔ میں اس وقت شکر ادا کرتی کہ میرے ماں باپ حیات نہیں ہیں ورنہ میری رسوائی مجھ سے زیادہ ان کے لیے شرمناک ہوتی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔''

وہ مجھے آخری دم تک دلاسا دیتا رہا لیکن اس کی ساری کی ساری کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ مجھے گرفتاری میں مزاحمت، عمداً قتل اور چوری کی مجرم قرار دے دیا گیا لیکن ان میں سے کوئی الزام درست نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی ثبوت تھا اور نہ ہی عینی گواہ۔ بعض قتل اور معصوم بچیوں سے زیادتی کے کیس میں بھی عدم ثبوت کی بنا پر ملزم کو معافی مل جاتی مگر مجھے نہ مل سکی۔ بدنصیب کی کون مانتا، حالات و واقعات اور شواہد میرے خلاف تھے، غربت اور بدنصیبی بدترین دشمن تھے۔

میں نے زندگی بھر ایک صاف ستھرے اور آرام دہ گھر کا خواب دیکھا تھا۔ مجھے ایسا گھر تو نہ ملا مگر جیل کا یہ بیرک بھی برا نہ تھا۔ دیواروں پر تازہ رنگ و روغن تھا۔ کمرے کی کھڑکی خوب صورت لان کی طرف کھلتی تھی۔ سرسبز گھاس تھی۔ اور رنگ برنگے پھولوں سے لدے پودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اس خوبصورتی کے پیچھے قیدی عورتوں کی محنت تھی۔ جو قیدی عورت کھانا تیار کرتی تھی وہ ایک اچھی باورچن تھی۔

میرے ساتھ رہنے والی عورتیں ملنسار اور خوش اخلاق تھیں۔ ہاں، کبھی کبھار ان کے درمیان ایسے جملوں کا تبادلہ ہو جاتا جو عام طور پر نچلے طبقے کی آبادیوں کی دیواروں پر لکھے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی کبھی یہ عورتیں آپس میں گتھم گتھا بھی ہو جاتی تھیں۔ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ کے تار تار کر دیتیں۔ اگر بیچ بچاؤ نہیں کیا جاتا تو ان کے بدن پر چیتھڑا تک نہ ہوتا، منہ بھی نوچ لیتی تھیں لیکن جلد ہی ان میں صلح بھی ہو جاتی تھی۔ یہ عورتیں بڑی دکھی، بے قصور اور مظلوم تھیں۔ مردوں اور حالات کی ستائی ہوئی تھیں۔ بڑی زخم خوردہ تھیں۔ ان کی کہانیاں دردناک اور عبرتناک بھی تھیں۔ وہ اپنے دکھ درد کی کہانیاں سنا کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھیں۔ ان میں جو نوجوان حسین لڑکیاں اور جواں سال عورتیں تھیں ان میں اکثریت ان کی تھی جنہوں نے درندگی بننے سے اپنی آبرو بچائی تھی۔ خون آشام درندوں کو زخمی کر دیا یا موت کی نیند سلا دی تھی۔

ہر منگل کی شب محفل موسیقی ہوتی تھی۔ خود میں تو گا نہیں سکتی تھی لیکن مجھے موسیقی پسند تھی۔ میں نے دو ایک مرتبہ فلمی گانا جو اتفاق سے پورا یاد تھا انہیں سنایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میری آواز بہت اچھی ہے۔ سوز بھی ہے۔ مجھے فلم یا ٹی وی میں چانس مل سکتا تھا۔

ہم سب کے لیے کوئی نہ کوئی کام مخصوص کیا گیا تھا۔ مجھے میری خواہش پر قیدیوں کے اسپتال میں تعینات کیا گیا تھا۔ وہاں کا انچارج میرا کام اور تیمارداری دیکھ کے بہت خوش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سند یافتہ نرس بن سکتی ہوں اور ان سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہوں۔ کیوں کہ میں انسانی جذبے کے تحت مریضوں کی خدمت کرتی ہوں۔

UUNOVELS.COM

مجھے نہیں معلوم کہ وہ سچ کہتا تھا یا غلط؟ بہرحال یہ ضرور تھا کہ مجھے بدمزاج، بوڑھے اور قریب المرگ مریضوں کی تیمارداری کا طویل تجربہ تھا۔ چھوٹے موٹے اور معمولی قسم کے امراض میں مبتلا لوگوں کی مدد کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

میں اپنی اس زندگی سے جیل میں گزر رہی زندگی سے اس قدر خوش تھی کہ یہ سب مجھے ایک خواب سا لگتا تھا مگر کبھی کبھی ایک ان جانا سا خوف بھی محسوس ہوتا کہ کہیں کوئی میری پسند کی یہ زندگی نہ چھین لے۔

پھر ایک روز وکیل مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے خوشی سے دیوانہ ہوتے ہوئے بتایا کہ میری اپیل عدالت نے منظور کرلی ہے اور اب میں آزاد ہوں اور آج یہاں سے نکل سکتی ہوں۔ اس نے میٹرن سے کہا کہ میرا سامان باندھ دے۔ وہ کسی وقت آ کے لے جائے گا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے وہاں لے گیا جہاں اخباری نمائندے بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔ جیسے ہی فوٹو گرافروں کے کیمرے حرکت میں آئے وکیل نے میرے بالوں میں ایک پھول لگا دیا۔

پھر اس نے تقریر شروع کردی کہ انصاف کے تقاضوں کو جس بری طرح مجروح کیا گیا تھا آج اس کی تلافی ہوگئی۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کیس میں اس نے بڑی سخت اور عرق ریزی سے کام لیا۔ بالآخر ایسے گواہ تلاش کرلیے جنہوں نے تصدیق کی کہ عالیہ بیگم نے وہ نقرئی ڈبا اس کی شوکلہ کو دیا تھا۔ یہ گواہ عالیہ بیگم کا خانساماں اور مالی تھے جن کا وہ ذکر کر چکی تھی کہ اپنا نقرئی ڈبا تیمارداری کرنے والی لڑکی کو دے دیا ہے۔ پہلے وہ اس لیے سامنے نہیں آئے کہ قانونی کارروائی میں الجھنا نہیں چاہتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ایک زندگی کسی ناکردہ جرم کے سبب سزا کی بھینٹ چڑھ چکی ہے تو ان کے ضمیر نے ملامت کی۔

اس کے علاوہ وکیل نے یہ بھی بتایا کہ میرے ہاتھوں ہلاک ہونے والے سپاہی کے ذاتی ریکارڈ کی چھان بین کی گئی جس کے قتل کا الزام مجھ پر عائد کیا گیا تھا اس ریکارڈ کو کھنگالنے سے اہم نکتے سامنے آئے ہیں جن میں پولیس کے ڈاکٹر کی تازہ ترین رپورٹ بھی شامل تھی۔ اس نے مذکورہ پولیس والے کا طبی معائنہ کر کے لکھا تھا کہ وہ نفسیاتی مریض ہوتا جا رہا ہے۔

جتنی دیر وکیل بولتا رہا وہ مجھے یوں احتیاط سے پکڑے رہا جیسے میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں جو موقع ملتے ہی بھاگ جاؤں گی۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑی سب کچھ سنتی اور دیکھتی رہی۔ وکیل کی تقریر کے اختتام پر رپورٹروں نے اسے مبارک باد دی۔

وکیل کیمروں کے سامنے کسی اداکار کی طرح خاص انداز سے مسکرایا اور مجھے غیر محسوس انداز سے کھینچ کے گاڑی تک لے آیا اگر اس مردود کے بس میں ہوتا تو وہ دواع ہوتی دلہن کی طرح گود میں اٹھا کے لے آتا۔

لیکن میں دہشت زدہ تھی۔ ایک طرف اس خیال سے کہ اس نے جیل میں متعدد بار ملاقات پر رہائی کے خواب دکھاتے ہوئے اوچھی حرکتیں کر چکا تھا پھر میں یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ باہر ایک وہی نہیں اور بھی بھیڑیے تھے جو مجھ جیسی عورتوں کے تاک میں رہتے ہیں۔ پریشان اور متفکر ہوئی تھی کیونکہ ساری زندگی ترستے اور خوار ہونے کے بعد مجھے رہنے کے لیے جو ایک جنت نصیب ہوئی تھی وہ مجھ سے چھن رہی تھی۔ در بدر بھٹکنے کا عذاب مسلسل ایک بار پھر میرا منتظر تھا۔ ایک گھپ اندھیرا جس میں کچھ بھائی نہیں دیتا تھا کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس کے ہاں پناہ لوں؟ میں پھر سے بے سہارا ہوگئی تھی۔

فوٹو گرافر اور رپورٹر بھی ہمارے پیچھے پیچھے آ گئے۔ ایک فوٹو گرافر نے مجھے گاڑی کا شیشہ اتارنے کے لیے کہا تاکہ وہ میری خصوصی تصویریں بنا سکے۔ اس لمحے میں نے دو آدمیوں کو باتیں کرتے سنا۔ میری سماعت غیر معمولی تیز ہے۔ ابو کہتے تھے کہ میں شہر کے ایک سرے پر بیٹھ کے دوسرے سرے پر آنے والے طوفان کی آواز سن سکتی ہوں۔

مبارک باد اور اس طرح کی بھن بھناہٹ کے درمیان دو آدمیوں کو باتیں کرتے سنا۔ ایک کہہ رہا تھا ”یار! دیکھو تو سہی اس بابر کے بچے نے اپنے آپ کو ہیرو ثابت کرنے کے لیے کیا تماشا کیا؟ یہ شروع ہی میں اس مالی اور خانساماں کو گواہی دینے کے لیے سامنے لا سکتا تھا اور پولیس ریکارڈ تو اسے پہلے دن ہی چیک کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح یہ کیس ایک دن بھی نہیں چلتا لیکن اس طرح بابر کو شہرت نہ ملتی۔ سارا مسئلہ تو شہرت حاصل کرنا تھا جس کے لیے اس نے ایک منصوبے کے تحت یہ چکر چلایا۔ کیا تم نے اس بات پر غور کیا کہ یہ شخص کس قدر مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ اس نے اپنی غرض کے لیے یہ سب کیا ہے۔ اس غریب کی مدد کے لیے نہیں؟“

UUNOVELS.COM

وکیل مجھے سیدھا اپنے دفتر لے گیا اور سمجھانے لگا کہ وہ آئندہ چند دن بڑی ہیجان خیزی میں گزریں گے۔ اس نے باقاعدہ پروگرام ترتیب دینا شروع کر دیا تھا کہ اگلے دن مجھے ٹی وی کے پروگرام میں جو اسٹیج شو ہوگا شرکت کرنی ہوگی۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ مدد کرنے کے لیے ساتھ موجود ہوگا۔ تمہیں ٹی وی پر صرف یہ کہنا ہوگا کہ بابر وکیل صاحب کی کوششوں کا میری رہائی میں بڑا دخل ہے۔ انہوں نے ایک عظیم قانونی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کی صلاحیت اور قابلیت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کیا ہوا تم میری فیس ادا کرنے کے قابل نہیں ہو؟'' اس نے کہا۔ ''یہ سوال شاید تم سے کوئی نوجوان وکیل کرے۔ تم اس کے جواب میں اتنا کہنا کہ بابر وکیل صاحب نے میرا کیس بغیر کسی فیس کے لڑا ہے۔ میں تم سے فیس نہیں طلب کر رہا لیکن میری کوشش کا لفظی معاوضہ تو دے سکتی ہو اور عوام کو بتا سکتی ہو کہ میں کتنی ہی صلاحیتوں کا مالک ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ لوگ مجھ پر اش اش کر اٹھیں۔ جانتی ہو تمہاری اس بات پر میڈیا مجھے بہت کوریج دے گا۔ میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاؤں گا۔''

''مگر مجھے جیل میں ایک عورت نے بتایا تھا کہ جو لوگ وکیل کی فیس ادا کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے عدالت انہیں اپنے خرچ پر وکیل مہیا کرتی ہے۔ عدالت نے آپ کو میری فیس دی ہوگی؟''

''ہاں...... یہ درست ہے۔'' وہ فوراً بول اٹھا۔ ''مگر میرا مطلب تھا کہ میرے متعلق اس قسم کے ہمت افزا کلمات سے تم درحقیقت میرا معاوضہ ادا کر سکتی ہو۔ آخر میں نے تمہارے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔ ذرا سوچ کے دیکھو میں نے تمہیں جیل کی کال کوٹھڑی سے نکالنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے؟ لہٰذا تمہیں میری کسی بات سے انکار اور تعرض نہیں ہونا چاہیے۔''

اس نے کہا کہ وہ ان تمام مکالموں کی ریہرسل کرائے گا جو مجھے ٹی وی پر بولنے ہیں۔ وہ اس سے پہلے... اپنے معاون وکیل کے کمرے میں جا رہا ہے تاکہ وہ اس کی اگلی تمام ملاقاتیں منسوخ کر دے اور اس کی تمام مصروفیات خود سنبھال لے۔

وہ اپنے معاون وکیل کو ہدایات دینے اس کے کمرے میں چلا گیا تو میں سوچنے لگی کہ واقعی میری رہائی اس کی کوششوں سے ہوئی ہے مگر اس سے کس نے کہا تھا کہ میری جنت مجھ سے چھیننے کے لیے آئے؟ وہ جیل کا چھوٹا سا کمرا۔ وہ پیٹ بھر کھانے...... میں ان سے اچانک اور غیر متوقع محروم ہو چکی تھی۔ مجھے وکیل سے اتنی سخت نفرت ہوئی کہ شاید ہی میں نے کسی سے محسوس کی ہو۔

مجھے سزا سنانے سے پہلے ارادی اور غیر ارادی طور پر عدالت میں خوب بحث ہوئی تھی لیکن میں یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس بار کوئی بحث نہیں ہوگی اور نہ ہی عدالت کے پاس کوئی جواز ہوگا۔

اس پولیس والے کو ہلاک کرنے میں یقیناً کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس وکیل کے ساتھ میں نے جو کچھ کیا وہ ہوش میں رہ کے اور پورے ارادے کے ساتھ کیا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ میں اس کے ساتھ مہربانی کروں تو پوری فیاضی کے ساتھ۔ جیسے میں کوئی کھلونا تھی۔ میرے سابقہ شوہر نے شادی سے پہلے قرض دیا تھا اور مجھے آلودہ کیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں شادی کروں گا مگر اس وکیل نے شادی کا نام تک نہیں لیا اور اس کا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھے زندان سے رہائی دلوائی کہ میں اس کی شہرت کو چار چاند لگا دوں اور اس وقت تک اس کے بستر کی زینت بن کے اپنا وجود میلا کرتی رہوں جب تک اس کا جی مجھ سے نہ بھر جائے وہ اس مقدس پیشے پر ایک بدنما داغ تھا۔

جب وہ اپنے معاون کے کمرے میں گیا تب میں نے اس کی لفافے کھولنے والی چھری اٹھا لی تھی اور دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ جیسے ہی معاون کے کمرے سے نکلا میں نے اپنی قوت جمع کی اور اس کے نرخرے میں وہ چھری اتار دی۔ وہ اسٹیل کی چھری تھی جو بے حد تیز اور نوکیلی تھی۔ میں نے اس پر ہیجانی حالت میں پے در پے کئی وار کیے۔ وہ بے دم ہو کر گر پڑا۔

☆......☆

آج میں دوبارہ وہیں ہوں جہاں میں رہنا چاہتی تھی۔ اب کوئی وکیل مجھے یہاں سے نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میرے لیے یہ دنیا کی بہت خوب صورت جگہ ہے۔ لوگ اسے جیل کہتے ہیں تو میری بلا سے۔ یہ میرا گھر، مسکن، میری جنت، میرا پسندیدہ آشیانہ...... یہ آشیانہ بھی میں نے اس طرح بنایا ہے جیسے پرندے بناتے ہیں۔ یہ میرا پسندیدہ آشیانہ ہے۔

UUNOVELS.COM

مجھے ہارون آباد سے بہاولنگر آئے تین برس ہو گئے تھے۔ بہاولنگر میں میری سرکاری نوکری تھی کلرک کی نوکری۔ یہاں ہمارا برسوں پرانا ایک چار مرلے کا مکان بھی تھا۔ جو عرصہ دراز تک کرایہ داروں کے رحم وکرم پر رہا تھا مگر جیسے ہی میری وہاں جاب ہوئی، میں نے وہ مکان خالی کروالیا اور وہاں شفٹ ہو گیا۔

میں اپنے کسان والدین کا اکلوتا چشم و چراغ ہوں۔ ایسا چراغ جو پردیس کاٹتے ہوئے اپنی روشنی کھو چکا ہے۔ ان

UUNOVELS.COM

رنگِ زندگی

مکرمی و محترمی!

سلامِ شوق!

ایک اور سچ بیانی ارسال کررہا ہوں۔ یہ سرگزشت ہے ارحم کی، آپ کی گو کہ نام فرضی ہیں مگر جذبات سچے ہیں۔ کہانی جوڑنے کے لیے میں نے افسانوں کی تکنک استعمال کی ہے تاکہ قارئین بوریت محسوس نہ کریں۔ ارحم جیسے کردار ہمارے معاشرے میں مفقود ہوتے جارہے ہیں۔ پھر بھی قارئین کو اس کا کردار پسند آئے گا۔

سلمان بشیر

(حافظ آباد، بہاول نگر)

دنوں میری زندگی کسی مشین کی طرح تھی جسے میرے افسر اپنی مرضی سے چلاتے تھے۔ سارا دن کمپیوٹر پہ انگلیاں چلاتے ہوئے گزر جاتا۔ شام کو جب گھر لوٹتا تو بدن اتنا تھک چکا ہوتا کہ کچھ بھی کرنے کا یا کچھ بھی سوچنے کا خیال تک نہیں آتا۔ یہاں تک کہ میں مہینوں اپنے والدین سے ملنے بھی نہیں جا پاتا تھا۔

یہ بات نہیں کہ مجھے وہ لوگ یاد نہیں آتے تھے۔ یاد تو بہت آتے تھے مگر میں مہینا بھر اتنا مصروف ہوتا کہ جب بھی کوئی چھٹی ملتی، آرام کرنے کو ہی ترجیح دیتا۔ اماں ابا سے موبائل پر بات ہو جاتی تھی۔

تین سالوں میں پانچ سات بار ہی گھر گیا تھا۔ وہ بھی ایک دن کے لیے۔ میری کوشش ہوتی کہ وہ ایک دن بس اماں ابا کے ساتھ گزرے اور یہی ہوتا۔ میں ان دونوں کے ساتھ سارا وقت گزارتا اور ان سے ڈھیروں باتیں کرتا۔

گاؤں کی کچی نہر، جس میں عمر بھر غوطے لگائے تھے، مجھے لگتا کہ وہ میرے انتظار میں پلکیں بچھائے بیٹھی ہیں، پھر بھی میں اس سے ملاقات کے لیے جا نہ پاتا۔

غفور چاچا کا امردوں کا باغ، ماے لطیف کی جلیبیوں والی ریڑھی، مائی سکینہ کا تندور، کھیت میں لگا ٹیوب ویل، ٹریکٹر پہ چلتے پرانے گیت، گاؤں کا چوراہا اور میری منگیتر بانو۔

یہ سب چیزیں اور لوگ میری پہنچ میں ہوتے ہوئے بھی دسترس سے باہر ہو چکے تھے۔ یا شاید میں ہی ان کے لیے وقت نہیں نکال پا رہا تھا۔

نوکری کرنا میری مجبوری تھی... کیونکہ ہماری اراضی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس سے سب کا پیٹ بھر سکے۔

کسان تو چھ ماہ تک فصل پہ اپنی محنت لگاتا ہے۔ پھر بھی چھ ماہ کے بعد کبھی فصل اچھی ہوتی ہے تو کبھی اچھی نہیں ہوتی۔

بانو ہماری بستی کی ہی تھی۔ دو سال پہلے سادگی سے ہماری منگنی ہوئی تھی۔ وہ اماں کے میکے کی طرف سے رشتہ دار تھی۔ میں نے اسے بس چار پانچ بار ہی دیکھا تھا لیکن بات چیت ایک بار بھی نہیں کی۔ آمنے سامنے بات چیت کرنے کی ہمت نہ تھی۔ نہ اس میں نہ مجھ میں...اور موبائل اس کے پاس تھا نہیں۔

بس جب بھی اماں ابا سے بات چیت ہوتی تو بانو کا احوال معلوم ہو جاتا۔

میں اپنی زندگی کی چادر کو، وقت کے پہیے میں کہیں پھنسا بیٹھا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود آزادی نہیں مل رہی تھی۔ نہ تو وقت کا پہیا رک کر مجھے خود سے آزاد کروانے کی مہلت دے رہا تھا نہ میں اس تیز رفتار پہیے سے نیچے اتر سکتا تھا۔

کاش کہ وقت کا پہیا، ہاتھوں سے چلایا جا سکتا۔ آہستہ آہستہ، رک رک کر، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد۔

میری زندگی کسی بورنگ انڈین سیریل کی طرح تھی۔ جو نہ تو ختم ہو رہی تھی اور نہ ہی اس میں کوئی مزہ آ رہا تھا۔ بس نظریں سامنے اسکرین پر جمائے، روکھے سوکھے دل سے، سیریل دیکھتے جاؤ اور خود کو کوستے جاؤ۔

میں بھی تو بس یہی کر رہا تھا۔

مگر زندگی ہر پل رنگ بدلتی ہے۔ ست رنگی جو ہوئی۔ کبھی سبز رنگ میں بہار دکھاتی ہے، کبھی زرد رنگ میں خزاں، کبھی لال رنگ میں محبت و ڈر، کبھی سیاہ رنگ میں خلوت نشینی و اندھیرا۔ کبھی جامنی رنگ کی خواہشیں اس سے پھوٹتی ہیں تو کبھی نیلے رنگ کا زہر بھر لاتی ہے۔

یہ زندگی، زندگی نہیں، گرگٹ ہے۔

ماضی کو میں یاد کرتا رہتا تھا اور حال سے راضی نہیں تھا۔

نہ جانے مستقبل میرے لیے کیا پلان بنائے بیٹھا تھا۔

مجھے خبر تک نہ ہوئی کہ میری زندگی نے کب اور کیسے رنگ بدلنے شروع کر دیے۔

☆......☆

"وہ بھی باقی کے عام دنوں کی طرح ایک عام سا دن تھا۔"

میں صبح کے سات بجے تیار ہو کر، گھر کو لاک کر کے، بائیک پہ بیٹھ کر، ہلکی ہلکی گرمی کو جھیلتا ہوا، رحمان بابا کے ناشتا پوائنٹ کی طرف رواں دواں تھا۔

رحمان بابا کا ناشتا پوائنٹ ایک کھلی جگہ پر واقع تھا۔ بڑی سی شیشے کی شاپ، سلیقے سے رکھے ہوئے میزوں کے سامنے نئی کرسیاں اور چار ملازم۔

شاپ کے باہر کا ماحول کسی ہندی فلم کے سیٹ کی طرح تھا۔

شاپ میں داخلے سے پہلے، اگر باہر نظر دوڑائی جائے تو قدرت کا حسن دیکھ کر نظریں وہیں ٹھہر جائیں۔

نیم کے چھتری نما پیڑوں سے گھرا ہوا ہرا بھرا لان،، لان میں کیاریوں کے اندر لگے ہوئے ہر رنگ و بو کے پھولوں کے پودے۔ ان کے درمیان آٹھ میز اور بتیس کرسیاں۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

شاپ کی عمارت کے بالکل ساتھ ایک بڑی سی میٹھے پانی کی ٹنکی، واش بیسن اور خوشبودار صابن۔ رحمان بابا کا ناشتا پوائنٹ علاقے بھر میں مشہور تھا۔ صبح کی سیر کے بعد اکثر لوگ اور فیملیاں وہیں آ کر ناشتا کرتی تھیں۔

عورتیں شاپ کے اندر بیٹھ کر ناشتا کرتیں۔ کچھ مرد بھی شاپ کے اندر بیٹھ کر ناشتا کر لیتے۔

میں بھی شاپ کے اندر بیٹھتا تھا۔ اپنے مخصوص میز کے سامنے۔ جہاں میرے علاوہ کوئی اور نہیں بیٹھتا تھا۔ تین سالوں میں، میں نے رحمان بابا کی پکائی ہر چیز کا سواد چکھا تھا۔ وہ ہرفن مولا تھے۔ جو بھی پکاتے، انسان انگلیاں چاٹتا رہ جاتا۔

رحمان بابا کی عمر پچاس سال کے قریب تھی مگر وہ اتنے صحت مند تھے کہ کوئی بھی انہیں چالیس سے اوپر کا نہ سمجھتا تھا۔ ان کا ایک بیٹا تھا جو دوسرے شہر میں ڈاکٹری پڑھ رہا تھا۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو گئی تھی۔ اہلیہ کو دنیا سے گزرے سات برس بیت گئے تھے۔

ان کا گھر بھی ان کی شاپ کے پچھواڑے تھا۔ سات مرلے کا خوبصورت گھر، جس میں زندگی گزارنے کے لیے تمام سہولتیں موجود تھیں۔

میں نے رحمان بابا کے ناشتا پوائنٹ پر پہنچ کر بائیک کھڑی کی اور بائیک کو لاک لگا کر شاپ کے اندر داخل ہو گیا۔

''السلام علیکم ارحم بھائی۔'' کاشف جو کہ رحمان بابا کا ملازم تھا اس نے مجھے دیکھ کر ہر روز کی طرح سلام کیا۔

''وعلیکم السلام کاشف۔ کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں ارحم بھائی۔ آپ بیٹھیں میں ابھی آپ کا ناشتا لے کر آتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر کاشف آگے بڑھ گیا اور میں کاؤنٹر پر آ گیا۔ جہاں رحمان بابا روز کی طرح، لوگوں کے لیے ناشتے کی چیزیں تیار کر رہے تھے۔

''السلام علیکم بابا۔''

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔'' رحمان بابا نے ہمیشہ کی طرح میرے سلام کا خوش دلی سے جواب دیا۔ ''آج دس منٹ لیٹ آئے ہو ارحم میاں۔''

رحمان بابا نے سامنے دیوار پر ٹنگے کلاک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس تیاری کرنے میں تھوڑی تاخیر ہو گئی بابا۔ اب آپ جلدی سے مجھے ناشتا کروا دیں۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔'' میں نے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو رحمان بابا مسکرا دیے۔

''بھئی کاشف کو پتا ہے کہ تم آ گئے ہو۔ اب وہ تمہارے بیٹھنے تک تمہارا ناشتا حاضر کر دے گا۔'' رحمان بابا نے کاشف کو ناشتا تیار کرتے دیکھ کر کہا۔

میں نے مسکرا کر رحمان بابا اور کاشف کو دیکھا، اور اپنی میز پر آ کے بیٹھ گیا۔ کاشف میرے سامنے میرا ناشتا رکھ کر اگلی میز کا آرڈر دینے چلا گیا۔

رحمان بابا اور کاشف میرے دل کے بہت قریب تھے۔ دونوں ہی میری بہت عزت کرتے تھے۔ میں بھی ان کو عزت دیتا تھا۔

خلوص رشتے کو مضبوط بناتا ہے ہمارا رشتہ بھی خلوص کا ہی تھا۔

☆......☆

میں ناشتا کر چکا تھا اور اب چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لے رہا تھا۔ تبھی وہ ہوا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

میری میز کے سامنے پڑی کرسی پر ایک پری چہرہ لڑکی آ کر بیٹھ گئی۔ میں چائے کا سپ لیتے لیتے رک گیا کیونکہ اس... مدہوش کی نظریں مجھ پر تھیں۔

وہ تھوڑی پریشان لگ رہی تھی اور میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ شاید میری آنکھوں سے سوال پڑھ چکی تھی۔ اس نے دھیرے سے اپنا دائیاں ہاتھ میز پر رکھا اور ذرا سا آگے میز کی طرف جھکی۔

اس کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی مگر چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔

''سنیں۔''

اس نے ڈرتے، جھجکتے ہوئے کہا۔

میں نے سر کو ہلا کر بنا کچھ کہے جواب دیا۔ میری آنکھیں اب بھی اس سے سوال کر رہی تھیں اور وہ جواب دینے میں تذبذب کا شکار تھی۔

''وہ...... وہ...... وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں نے ابھی یہاں سے ناشتا کیا ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔

''تو پھر؟''

میں نے سوال کیا۔

''ناشتا کرنے کے بعد میں نے اپنا پرس چیک کیا۔

پرس میں صرف ساٹھ روپے ہیں۔ جبکہ ناشتے کا بل ایک سو ستر روپے ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے اس پہ ترس آ گیا تھا۔ شاید اس کا معصومیت سے بھرا چہرہ اس کی وجہ تھا۔

"اگر آپ میرا بل ادا کر دیں تو......"

میں نے بیلے سے بیرے کو بلایا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بات کرنے سے روک دیا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی کسی مجبوری کا خلاصہ سنائے۔ اپنے دکھ میرے سامنے پیش کرے تاکہ میں ان قیمتی جذبات کا مول لگا سکوں۔

دکھ تو انسان کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ راز ہوتے ہیں۔ جینے کی وجہ ہوتے ہیں۔ یہ کیسے کسی انجان شخص پر عیاں کر دیے جائیں؟

"میں آپ کا بل ادا کر دیتا ہوں...... آپ پریشان مت ہوں۔" میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے چہرے پر سکون ابھر آیا۔ میں نے ویسا سکون پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"آپ یہ ساٹھ روپے رکھ لیں۔ باقی ایک سو دس روپے آپ میری طرف سے ان میں جمع کر کے بل ادا کر دیں...... اور آپ مجھے اپنا نمبر بھی دے دیں تاکہ میں آپ کے پیسے واپس کرنا چاہوں تو آپ کو کال کر سکوں......"

میں نے انجانے میں اس پر نگاہیں مرکوز کر رکھی تھیں۔ مجھے بہت شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ وہ بولتے ہوئے بہت پیاری لگتی ہے۔ اس کے باریک تراشیدہ ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح مہکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اس کے موتی جیسے دانت بالکل ایسے تھے جیسے سفید کلیوں کی ایک مالا۔

"آپ یہ ساٹھ روپے بھی اپنے پاس رکھیں۔ میں پورا بل ادا کر دوں گا۔ آپ کے پاس بھی ساٹھ روپے تو ہیں۔ یہ بھی ضائع ہو گئے تو آپ آگے کیا کریں گی۔" میں نے ساٹھ روپے انگلی کی مدد سے اس کی جانب کھسکاتے ہوئے کہا۔

تبھی کاشف وہاں آ گیا۔ "ارحم بھائی اور کچھ چاہیے آپ کو؟"

"نہیں کاشف۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔" پھر میں نے ڈریس پینٹ کی جیب سے پرس نکالا اور کاشف کو اشارے سے سمجھا دیا کہ وہ میرے ساتھ ساتھ اس محترمہ کا بھی بل وصول کر لے۔

کاشف نے آنکھوں کی مدد سے جی حضوری کا اشارہ کیا اور پیسے لے کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

بقیہ پیسے کاشف نے مجھے آ کر واپس کر دیے اور چلا گیا۔

اب ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ...... میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی اور وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کے پیسے آپ کو جلد واپس کر دوں گی۔" وہ متشکر لہجے میں بولتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح بولتی رہے اور میں سنتا رہوں۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ اللہ پاک نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں کسی کے کام آ سکوں... اور دوسری بات یہ کہ مجھے آپ سے اس نیکی کی واپسی کی قیمت نہیں چاہیے لیکن ہاں! اگر کبھی آپ کو موقع ملے تو اسی طرح کسی اللہ کے بندے کی لاج رکھ لیجیے گا۔ میں سمجھوں گا کہ مجھے میرے پیسے واپس مل گئے۔"

میں نہ جانے اتنا زیادہ کیسے بول گیا تھا۔ مگر وہ میری فلاسفی سن کر اکتائی نہیں تھی بلکہ بہت دھیان سے ہمہ تن گوش رہی تھی۔

"اچھا میں اب چلتا ہوں۔ مجھے آفس پہنچنا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔" میں نے ہاتھ پہ بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے شاپ سے باہر نکلنے سے پہلے ہمیشہ کی طرح رحمان بابا کو اور کاشف کو سلام کیا، پھر آفس کی طرف چل پڑا۔

مجھے نہیں پتا کہ وہ پری چہرہ لڑکی وہاں کب تک رہی اور کب وہاں سے نکلی تھی۔

لیکن میں بائیک پہ بیٹھا ہوا، آفس کی جانب سفر کرتے ہوئے پہلی بار بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ پہلی بار مجھے دلی خوشی ملی تھی۔ وہ خوشی اس حسینہ سے ملنے کی وجہ سے تھی یا اس کی مدد کرنے کی وجہ سے...... یہ میں خود نہیں جانتا تھا۔ مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ خوشی کی وجہ وہ لڑکی لازمی تھی۔

☆......☆

شام کے سات بج رہے تھے اور میں بائیک پہ بیٹھا، تھکا ہارا، ڈھیر ساری شاپنگ کرنے کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ آفس

UUNOVELS.COM

سے تو چار بجے چھٹی ہو جاتی تھی اور میں تقریباً ساڑھے چار بجے تک گھر واپس آ جاتا تھا مگر آج تھوڑی دیر ہو گئی تھی کیونکہ میں کچھ خریداری کرنے مارکیٹ چلا گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا تو میں آفس میں ہی کھا لیتا تھا مگر شام کا کھانا ہمیشہ ہوٹل میں ہی کھاتا تھا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شام کا کھانا خود بنا سکوں۔ آج مارکیٹ بھی اسی لیے گیا تھا... تاکہ کچھ راشن پانی خرید آؤں اور آئندہ سے شام کا کھانا خود گھر میں ہی بنایا کروں۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہوٹل کا کھانا بہت مہنگا پڑتا تھا......اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے باہر کے کھانے میں صرف رحمان بابا کے ہاتھ کا کھانا پسند تھا۔ اور رحمان بابا کا ناشتا پوائنٹ دن گیارہ بجے تک بند ہو جاتا تھا۔

میں درمیانی رفتار میں بائیک چلاتا ہوا بازار سے نکل کر مین روڈ پہ آ گیا تھا۔ سامنے بس اسٹینڈ تھا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ سورج دور افق کے پار ڈوب چلا تھا۔

بس اسٹینڈ کے بالکل سامنے کا منظر بہت حسین تھا۔ ڈوبتے سورج کی ہلکی ہلکی سرخ کرنیں، جو ہلکی ہلکی کاسنی سی تاریکی میں مل کر کوئی الگ ہی رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ اچانک میں نے بے اختیاری کے عالم میں بائیک کی رفتار کم کر دی پھر بریک لگا کر روک دی۔ بس اسٹینڈ کی عمارت کے سائے میں ایک جانا پہچانا سا وجود پریشان حال کھڑا تھا۔

وہ وہی لڑکی تھی جو آج صبح مجھے رحمان بابا کی شاپ پہ ملی تھی۔ کتنا حسین اتفاق تھا کہ میں ابھی کچھ لمحے پہلے اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے دوبارہ بھی ملے گی بھی یا نہیں......اور اللہ پاک اتنا مہربان کہ میرے دل کی تمنا کو ایک لمحے میں پورا کر دیا۔ وہ میرے مالک۔ بیشک تو ہی دلوں کے حال جانتا ہے۔

میں نے اس کے سامنے بائیک کھڑی کی تھی۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ مجھے دیکھ کر نہ جانے کیسے، کچھ وقتی سکون کی حالت میں آ گئی پھر اس نے میری جانب قدم بڑھا دیے۔ اب وہ میرے روبرو کھڑی تھی۔ ڈوبتے سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں جس کی وجہ سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے آہستہ سے مجھے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے سلام کا جواب دیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ صبح سے زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ عجیب سی الجھن کا شکار تھی۔ لاکھ چاہ کر بھی زبان کو جنبش نہ دے پا رہی تھی۔ میں نے ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔ یہ بول کر ''خیریت تو ہے۔ آپ اتنی شام کو یہاں کیسے؟''

میں نے بھی عجیب سا سوال کر ڈالا۔ دراصل اس سے بات کرتے ہوئے میں خود کچھ جھجک محسوس کر رہا تھا۔

''وہ...وہ...میں...نہیں کچھ نہیں۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔ وہ رونے والی تھی کہ میں گویا ہوا۔

''اگر آپ نے گھر جانا ہے تو میں ڈراپ کر دوں آپ کو؟'' میں نے سوچا کہ وہ شاید گھر جانے کے لیے تاخیر کا شکار ہو رہی تھی مگر جب وہ بولی تو معاملہ اور ہی نکلا۔

''وہ...وہ...وہ میں گھر نہیں جا سکتی۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ گھر کیوں نہیں جا سکتیں؟''

''کیونکہ میرا گھر یہاں نہیں ہے۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ پائی اور نظریں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی چھلکتا ہوا واضح نظر آ رہا تھا۔

اردگرد کھڑے لوگ ہم دونوں کو تفتیشی نظروں سے دیکھ رہے تھے جو ہم دونوں نے بھانپ لیا تھا۔

''اگر آپ کو برا نہ لگے تو ہم کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھ کر بات کریں۔'' میں نے اتنا کہا ہی تھا کہ اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

''دیکھیں مجھے غلط مت سمجھیے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں کھڑے لوگ ہم دونوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہے...اور یہاں کھڑے ہو کر مزید بات کرنا ہم دونوں کے لیے ہی اچھا نہیں ہوگا۔''

میں اپنی بات ختم کر کے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ پھر اس نے ہلکے سے سر ہلایا اور خود کو چادر میں مزید لپیٹتے ہوئے میری بائیک کے پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔

میں نے بائیک اسٹارٹ کر دی اور اس بھیڑ والی جگہ سے نکل کر کھلی سڑک پر آ گیا۔ میں آہستہ آہستہ بائیک چلا رہا تھا۔

''اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟'' میں نے اس سے بات جاری رکھنے کے لیے تمہید باندھی۔

''جی کہیں۔''

''وہ میرا گھر یہاں سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ اگر آپ کو پریشانی نہ ہو تو کیا ہم پہلے یہ سامان گھر رکھ دیں۔ کیونکہ یہ اتنا سارا سامان ہوتے ہوئے مجھ سے بائیک

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

ٹھیک سے چلائی نہیں جا رہی۔"

وہ میری بات سن کر چپ رہی۔

میں کچھ لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا مگر وہ کچھ نہ بولی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ڈر رہی ہے کہ میں اسے اپنے گھر لے جا کر کہیں فائدہ نہ اٹھالوں۔

اس کا ڈر بجا تھا اور میرا ماننا ہے کہ ایسا ڈر ہر لڑکی کے دل میں ہونا چاہیے۔۔ کیونکہ عزت روئی کے گولے کی طرح ہوتی ہے جو کسی کی بری نظر سے ہی داغدار ہو جاتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ ہم کسی پارک میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔"

میں نے اس کی خاموشی کو اس کا انکار سمجھ کر اس کا بھرم رکھ لیا۔ جو کہ شاید اسے مجھ پر نہیں تھا اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھا کیونکہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے انجان تھے۔

کچھ سیکنڈ کے بعد وہ ہلکے سے گویا ہوئی۔ "آپ پہلے یہ سامان گھر رکھ دیں۔ کہیں یہ شاپر پھٹ ہی نہ جائیں اور آپ کا نقصان ہو جائے۔"

میں نے ہلکے سے مسکرا کر بائیک کو گھر کی جانب موڑ دیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ہم گھر کے سامنے کھڑے تھے۔

میں نے اپنی جیب سے گھر کی چابی نکال کر باہر گیٹ پر لگا تالا کھولا۔

"کیا آپ کے گھر میں کوئی نہیں ہے؟" اس نے پہلی بار مجھ سے کوئی سوال کیا تھا۔

"جی۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔" میں نے اتنا کہہ کر بائیک پہ ٹنگے شاپر اتارے اور گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ شاید میرے جواب سے مزید ڈر گئی تھی۔

میں جب واپس آیا تو وہ ڈری ڈری سی کھڑی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کس چیز کی پریشانی ہے۔

"آپ کا ڈر جائز ہے۔ اکیلے مرد کے ساتھ اس کے خالی گھر تک آنا کسی بھی لڑکی کے لیے پریشانی اور ڈر کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر آپ یقین رکھیں۔ آپ کو یہاں مجھ سے یا کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" پھر سانس لے کر کہا۔ "آپ پہلی بار میرے گھر آئی ہیں اسی لیے میرے گھر کا پانی تو ضرور پینا ہوگا آپ کو لیکن اگر آپ نہ چاہیں تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔"

میں نے بڑے نرم گو لہجے میں درخواست کے ساتھ ساتھ شاید التجائیہ لہجہ اپنایا تھا۔

اس نے مجھے دیکھا تو میں نے نگاہیں نیچے کر لیں۔ دراصل جب بھی میں اس کو یا وہ مجھے دیکھتی تھی تو ہم دونوں کی نگاہوں کا محور ہمارے پاؤں ہوتے تھے۔ نہ وہ مجھے مکمل نظروں سے دیکھتی تھی اور نہ ہی میں۔

"مجھے بہت پیاس لگی ہوئی ہے مگر میں آپ کو کہہ نہیں پائی کہ مجھے پیاس لگی ہے۔" وہ بہت معصومانہ لہجے میں بولی تو مجھے ایک لمحے کے لیے اس پہ ٹوٹ کر پیار آیا۔

"تو آیئے نا۔ اندر آیئے۔" میں نے آگے سے تھوڑا سائیڈ ہو کر اسے اندر آنے کی جگہ دی۔ اس نے ایک بار پھر خود کو چادر سے لپیٹا اور اندر داخل ہو گئی۔ میں نے بائیک کو اسٹینڈ سے اتارا اور گھر کے اندر کھڑا کر دیا۔ گیٹ کی کنڈی لگا کر میں برآمدے میں آ گیا۔ وہ برآمدے کے پاس ہی خود میں سمٹی ہوئی کھڑی تھی۔

میں نے گھر کی بتیاں روشن کیں۔ اپنے روم کا دروازہ کھولا۔ کچن کا دروازہ کھولا۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور اندر روم میں آ گیا۔

"آیئے اندر آیئے نا۔" میں نے ادب سے درخواست کی تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہو گئی۔

"آپ یہاں بیٹھ جائیں۔" میں نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کمرے میں لگے پنکھے کو فل اسپیڈ میں چلا دیا۔

پنکھے کی ہوا سے تھوڑی راحت ملی۔ میں نے شیشے کے گلاس میں ٹھنڈا پانی ڈال کر اسے پیش کیا۔ اس نے تین گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیا۔

میں نے گلاس کو پھر بھرا۔ اس نے دوسرا گلاس بھی خالی کر دیا۔ تیسرا گلاس پی کر اس نے ایک لمحے کے لیے راحت کی سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔

"آپ کچھ دیر یہیں آرام کریں۔ میں چینج کر کے آتا ہوں۔"

"نہیں آپ یہاں سے کہیں مت جائیں۔ پلیز بیٹھے رہیں۔" وہ اچانک ڈرنے لگی۔

میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ "آپ ڈریں مت۔ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دراصل میں صبح سے اسی ڈریس میں گھوم رہا ہوں اسی لیے تبدیل کرنا چاہ رہا تھا...... بس پانچ منٹ لگیں گے۔"

میں نے آہستہ آہستہ رک رک کر اسے سمجھایا تو وہ مان گئی۔ میں وہاں سے اٹھا، الماری سے اپنے پریس کیے ہوئے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کپڑے نکالے اور واش روم میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں نہا کر کپڑے تبدیل کر کے اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

وہ اب تھوڑی نارمل لگ رہی تھی۔ چلو اچھا ہی تھا۔ اس کو تھوڑا پرسکون دیکھ کر میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ گھر کیوں نہیں جانا چاہتیں۔ اور یہ بھی کہ آپ کہاں رہتی ہیں۔ آپ کی پریشانی کی وجہ کیا ہے؟" میں نے ایک ساتھ کئی سوال پوچھ لیے۔ وہ بھی شاید اسی بات کی اُمید کر رہی تھی کہ میں اب اس سے کوئی سوال کروں گا اسی لیے وہ ہڑبڑائی نہیں، نہ ہی چونکی۔ بلکہ تحمل سے بیٹھی رہی اور پھر اس نے اپنے گلاب کی پتیوں کی مانند ہونٹوں کو ہلایا۔

"میں میلسی شہر میں رہتی ہوں۔ اوہ سوری۔ رہتی تھی لیکن چند وجوہات کی وجہ سے مجھے وہ شہر چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ اس وقت مجھے ایک ہی راستہ سجھائی دیا تھا کہ شہر چھوڑ دوں۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی دوسرے شہر جا کر کوئی نوکری کر لوں گی اور کسی ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لوں گی مگر یہاں آ کر میری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ حقیقت کا ادراک ہوا کہ میں نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے اور تو اور جلد بازی میں ایک اور غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے جس پرس میں پیسے رکھے تھے وہ پرس گھر ہی بھول آئی۔" وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔

"تو آپ کے والدین نے آپ کو یوں اکیلے کسی دوسرے شہر میں جانے کی اجازت کیسے دے دی؟" میں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے والدین اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انہیں دنیا سے گزرے ہوئے آٹھ سال ہو چکے ہیں۔" والدین کے ذکر پر وہ روہانسی ہو گئی۔ مجھے بھی اس کے والدین کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔

یہ والدین ہی تو ہوتے ہیں جن کے سہارے انسان بھنور سے بھی بچ نکلتا ہے... اور جب یہ نہیں رہتے تو کنارے بھی ڈبو دیتے ہیں۔

"لیکن میں پھر بھی نہیں سمجھا کہ آپ اکیلی اس پرائے شہر میں کیوں آئی ہیں۔ بنا کسی سہارے کے۔ بنا کسی کے ساتھ کے۔"

"تقدیر لے آئی ہے یہاں...... اس نے آنکھوں کی نمی کو صاف کیا، پھر دوبارہ بات کو جاری رکھا۔"

"جب اپنے اپنے نہ رہیں تو رشتے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں۔ زخمی کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ من چاہا کچھ بھی اختیار سے باہر کر دیتے ہیں......" وہ اب تواتر سے آنسو بہائے جا رہی تھی۔ میں چپ رہا۔ اسے رونے دیا۔

کبھی آنسو دل کا سکون چھین لیتے ہیں تو کبھی یہی آنسو باعث راحت بن جاتے ہیں۔

گھر بدر ہونے سے قبل وہ شاید سکون چھین لینے والے آنسوؤں کا شکار رہی ہو گی۔ مگر اب وہی آنسو اسے اس بے سکونی سے نجات دینے والے تھے۔

"آپ اس شہر میں کسی کو جانتی ہیں؟ مطلب کوئی رشتہ دار یا دوست جس کے پاس آپ جانا چاہتی ہیں؟"

میں نے اس سے مزید معلومات اکٹھی کرنا چاہی تاکہ اسے کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ آؤں۔

"نہیں۔ میرا کوئی رشتہ دار یا دوست نہیں ہے۔ نہ یہاں نہ کہیں اور۔ بس اللہ پاک کی ذات ہے جو میرا مددگار ہے۔ جلد بازی میں اٹھائے قدم کا نتیجہ یہی تو ہوتا ہے۔"

وہ اپنی چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ دراصل میں اس کے لیے کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ اس شہر میں اکیلی تھی۔ کوئی رشتہ دار یا دوست بھی نہیں تھا اس کا۔ نوکری بھی نہیں تھی۔ کوئی رہنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ کوئی سہارا بھی نہیں تھا۔ ایسے میں جاتی تو کہاں جاتی۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" اس نے دوسری بار مجھ سے سوال کیا۔ مجھے اس کا خود سوال کرنا اچھا لگا تھا۔

"میں آپ کے لیے سوچ رہا تھا۔"

"کیا سوچ رہے ہیں میرے لیے؟"

"یہی کہ آپ کو مستقبل میں کیا کرنا چاہیے یا کیا کر سکتی ہیں۔" اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "دیکھیں۔ آپ اس شہر سے اس شہر کے لوگوں سے مکمل طور پر انجان ہیں۔ یہاں آپ کی کوئی واقفیت بھی نہیں ہے۔ رہنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ نوکری بھی نہیں ہے...... ایسے میں تو آپ صرف ایک کام ہی کر سکتی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"واپس اپنے شہر لوٹ جائیں۔ اپنے گھر چلی جائیں۔"

میں نے اپنی طرف سے بہت اچھا مشورہ دیا تھا مگر اسے وہ بہت ناگوار لگا۔

"نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں بہت مشکل سے موت کے

UUNOVELS.COM

کنویں سے باہر نکلی ہوں۔ سب کشتیاں جلا کر آئی ہوں۔ اب میں چاہ کر بھی واپس نہیں جا سکتی...... اور جاؤں بھی تو کس کے پاس؟ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے دھوکے سے میرا گھر اپنے نام لکھوا لیا۔ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے میرے والدین کو وقت سے پہلے مار دیا۔ ان لوگوں کے پاس جو مجھے ایک پاگل سے بیاہنا چاہتے ہیں؟ نہیں۔ کبھی نہیں۔ آیت مر تو سکتی ہے مگر اب دوبارہ وہاں لوٹ کر نہیں جا سکتی۔"

اس کی باتوں اور جذبات کو سن اور سمجھ کر میں نے نوٹ کیا کہ وہ کسی طور بھی واپسی کی خواہشمند نہیں ہے...... اور باتوں باتوں میں مجھے اس کا نام بھی پتا چل گیا تھا۔

آیت...... کتنا پیارا نام تھا۔ آب زم زم سے دھلا ہوا۔ پاک، صاف و شفاف۔ اور بہت خوبصورت۔

"مگر پھر آپ رہیں گی کہاں۔ کریں گی کیا؟ مطلب اگر آپ کی جاب ہوتی سر چھپانے کی جگہ ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا لیکن فی الحال آپ کے پاس جاب بھی نہیں ہے۔ ایسے میں آپ کہاں رہیں گی؟"

میں نے اس پر حقیقت آشکار کی تو وہ تھوڑا جذباتی ہو گئی۔ "کہیں بھی رہ لوں گی۔ کوئی بھی کام کر لوں گی مگر واپس نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔" اس نے نم آنکھوں اور مضبوط لہجے میں کہا۔

میں بھی کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آگے کیا بات کروں۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ آج میں ہوٹل سے کھانا بھی نہیں کھا کر آیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ شاید آیت نے بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ اس کے پاس تو صرف سات سو روپے تھے۔ وہ بھی شاید اس نے خرچ نہیں کیے ہوں گے۔

"آپ نے صبح ناشتے کے بعد کچھ کھایا یا نہیں؟" میں نے شائستگی سے اس سے سوال کیا۔

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر ہلکے سے نفی میں سر ہلا کر سر کو جھکا لیا۔

مجھے اس پر بہت ترس آ رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آئندہ سے گھر میں ہی رات کا کھانا بنایا کروں گا مگر اب تو دیر ہو گئی تھی اسی لیے اب میں گھر میں تو کچھ نہیں بنا سکتا تھا۔

"آپ ادھر آرام کریں۔ یا ایسا کریں آپ فریش ہو لیں۔ وہ سامنے واش روم ہے۔۔۔ سامنے الماری میں دو نئے تولیے ٹنگے ہوئے ہیں، وہاں سے تولیا نکال لیں۔ تب تک میں کچھ کھانے کے لیے لے آتا ہوں۔"

"آپ پلیز باہر مت جائیں۔ مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔" وہ التجائیہ لہجے میں بولی تھی۔

"ڈریں نہیں۔ آپ ایک محفوظ جگہ پر ہیں۔ اور بے فکر رہیں یہاں آپ کو کوئی ڈسٹرب کرنے نہیں آئے گا۔ آپ ایسا کریں گیٹ اندر سے لگا لیں۔ میں بس دس منٹ تک واپس آ جاؤں گا۔"

میں نے اس کا ڈر کافی حد تک ختم کر دیا تھا۔ شاید وہ بھی خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی پھر وہ میرے ساتھ ساتھ گیٹ تک آئی۔ میں نے بائیک باہر نکالی۔ اس نے گیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور میں مارکیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جب واپس لوٹا تو وہ نہا چکی تھی۔ اس کا رنگ و روپ اور زیادہ نکھر گیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ہم دونوں کھانا کھا کر فری ہو چکے تھے۔ میں نے اسے الگ کھانا دیا تھا تاکہ وہ میرے ساتھ کسی جھجک کا شکار نہ ہو۔ میں چاہتا تھا وہ پیٹ بھر کر کھائے۔

کولڈ ڈرنک پینے کے بعد میں جب برتن اٹھانے لگا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

"برتن میں اٹھا لیتی ہوں۔ انہیں دھو دیتی ہوں۔" وہ برتن اٹھانے کے لیے نیچے میز پر جھکی تو میں نے جلدی سے برتن اٹھا لیے۔ "ارے نہیں نہیں۔ آپ یہاں مہمان ہیں۔ اور مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ میں آپ سے بھلا کوئی کام کیسے کروا سکتا ہوں اور ہاں، آپ کو اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا جھجک بتا دیجئے گا۔ مجھے اچھا لگے گا۔"

میں نے خوش دلی سے کہا۔ پہلی بار اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان کی جھلک دیکھی تھی۔ واقعی وہ مسکراتے ہوئے بہت پیاری لگتی تھی۔

پہلی بار، تین سالوں میں پہلی بار، مجھے یہ گھر واقعی ایک گھر لگا تھا۔ کیونکہ گھر کی خوبصورتی تو عورت سے ہوتی ہے اور آج آیت کی موجودگی نے مجھے اس گھر سے جذباتی طور پر جوڑ دیا تھا.. ورنہ تو میرا اس گھر میں دم گھٹتا تھا۔ مجبوری کی ڈور اس گھر سے باندھے رکھے تھی۔

میں برتن اٹھا کر کچن میں چلا گیا۔ سینک پر کھڑا برتن دھونے لگا۔ آیت کچن کے دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور مجھے برتن دھوتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"آپ کے گھر والے یہاں نہیں رہتے؟" آیت نے اپنا کاندھا کچن کے دروازے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ یہاں سے 50 کلومیٹر دور رہتے ہیں۔ وہاں میرا گاؤں ہے۔ میرے ابا اور اماں، وہاں رہتے ہیں۔"

UUNOVELS.COM

"پھر آپ یہاں اکیلے کیوں رہتے ہیں؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"کیونکہ مجبوری ہے۔ دراصل یہاں میری سرکاری نوکری ہے اسی لیے یہاں رہنا پڑ رہا ہے۔" میں نے وضاحت پیش کی۔

"یہ گھر آپ کا ذاتی گھر ہے یا کرائے کا؟"

"اللہ کا شکر ہے یہ میرا ذاتی گھر ہے۔ میری جاب سے پہلے یہاں کرائے دار رہتے تھے مگر جیسے ہی یہاں میری جاب ہوئی میں نے گھر خالی کروا لیا اور خود رہنے لگا۔"

میں نے برتن دھو کر رکھے اور کچن سے باہر آ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ باہر آ گئی۔

"آپ سے ایک بات کہوں؟" میں نے چلتے چلتے کہا۔

"ہاں، کہیں۔" اس نے برآمدے کے پلر سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ میں اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

"اب تک جتنا بھی میں نے آپ کے بارے میں جانا ہے اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ آپ کا یوں باہر اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ مطلب آپ کو کسی سائبان کی ضرورت ہے۔ سر پہ چھت درکار ہے آپ کو۔ اگر آپ چاہیں تو جب تک آپ کا دل کرے اس گھر میں رہ سکتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اکیلے مرد کے ساتھ یوں رہنے میں آپ تحفظ کا شکار ہوں گی مگر آپ مجھ پر تھوڑا سا یقین کر سکتی ہیں۔

میں آپ کے لیے کسی اچھی سی جاب کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔ میرے بہت سے افسر جاننے والے ہیں۔ میرا کوئی بھی کام ہو وہ انکار نہیں کریں گے۔" میں نے رک کر اس کے چہرے پر تاثر دیکھا اور پھر سلسلہ جوڑا۔ "جب تک آپ کو جاب نہیں مل جاتی اور کوئی رہنے کے لیے اچھی سی جگہ نہیں مل جاتی تب تک آپ یہیں رک جائیں۔ اگر آپ یہاں نہیں رکنا چاہتیں تو پھر آپ کو مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ آپ کسی محفوظ جگہ پر جائیں گی۔ پہلے کی طرح دربدر دھکے نہیں کھائیں گی۔"

میں نے اسے تفصیل سے ساری بات سمجھائی۔ اس پر ہر چیز واضح کر دی تاکہ اسے فیصلہ کرنے میں دشواری نہ ہو۔

وہ کچھ دیر وہیں چپ کھڑی سوچتی رہی۔ میں اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا پھر اس نے بہت سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ لیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرے یہاں رکنے سے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی نا؟ مطلب لوگوں کو آپ کیا جواب دیں گے؟ میری وجہ سے کہیں آپ کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو جائے۔"

وہ نرم لہجے میں بول رہی تھی۔ کتنی معصومیت بھری تھی اس کے لہجے اور چہرے پر۔

"پہلی بات تو یہ کہ مجھے یہاں کوئی ملنے نہیں آتا۔ نہ گھر والوں میں سے نہ دوستوں میں سے نہ ہی بستی والوں میں سے۔ دوسری بات یہ کہ جب مجھ سے کوئی ملنے ہی نہیں آتا تو پھر لوگ مجھ سے آپ کے بارے میں کیوں پوچھیں گے۔ فرض کریں محلے کے کسی نے پوچھ لیا تو میں کچھ بھی کہہ دوں گا اور دل میں ایسا کچھ مت سوچیں کہ آپ کی وجہ سے مجھے کوئی مشکل یا پریشانی پیش آ سکتی ہے، بلکہ آپ کے ہونے سے یہ گھر، گھر لگے گا۔ بہت سالوں کے بعد یہاں میرے علاوہ کوئی دوسرا موجود ہے اسی لیے آپ بے فکر رہیں۔ اللہ نے چاہا تو مستقبل میں آپ بہت کامیاب ہوں گی۔"

میری باتیں وہ بہت دھیان لگا کر سن رہی تھی۔ اس کے گالوں پر ہلکی سی مسکان کی پرت جمتی نظر آ رہی تھی۔ اب اس کے چہرے پر مکمل طور پر سکون پھیل گیا تھا اور اب وہ مجھ سے نارمل انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہم نے مزید گفتگو کی۔ پھر میں نے کہا کہ اب ہمیں آرام کرنا چاہیے۔

میرا اتنا کہنا تھا کہ اس کے ماتھے پر اچانک ڈر کی وجہ سے سلوٹیں پڑ گئیں۔ میں اس کی حالت سمجھ کر ہلکے سے مسکرا دیا۔ وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آپ کا کمرہ وہ سامنے والا ہے۔ میں دوسرے کمرے میں سو جاؤں گا۔"

اس نے سکھ کا سانس لیا اور تھوڑی شرمندہ بھی ہوئی۔

"اگر رات کو پیاس لگے تو کچن میں فریج سے پانی کی بوتل نکال لیجیے گا یا پانی کی بوتل کمرے میں رکھ لیں۔ گھر کی باہر والی تمام لائٹس برآمدے میں لگے بورڈ سے آن ہوتی ہیں۔ واش روم کا تو آپ کو پتا ہی ہوگا۔ اور سونے سے پہلے اپنے روم کا دروازہ اندر سے لاک کر لیجیے گا۔ الماری کے اندر سے گہرے رنگ کی چادر نکال لیجیے گا۔ رات کو اکثر ٹھنڈ ہوتی ہے۔ اگر ٹھنڈ لگے تو اوپر اوڑھ لیجیے گا۔"

میں اسے کسی استاد کی طرح سمجھا رہا تھا اور وہ کسی اسٹوڈنٹ کی طرح مجھ پر نظریں گاڑے کھڑی سنتی جا رہی تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے جی۔ میں نے سب سمجھ لیا ہے۔ اگر کچھ رہ گیا تو صبح آپ سے پوچھ لوں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر۔ چلیں گڈ نائٹ۔ صبح وقت پر آفس

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

پہنچنا ہوتا ہے۔"
گھر کی بتیاں بجھا کر ہم دونوں اپنے اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔

☆......☆

اگلی صبح میں اپنی فطرت کے عین مخالف، تھوڑا جلدی بیدار ہو گیا۔ دراصل میں رات دیر تک آیت کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس کی گھر بدری، اس کے دکھ، اس کی پریشانیاں، اس کا ماضی یہ سب چیزیں بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ جب میں بیدار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو میرے قدم ایک دم ساکت ہو گئے۔

برآمدے میں جا، نماز بچھی تھی۔ سرخ رنگ کی جائے نماز اور آیت فجر کی نماز کا آخری سجدہ دینے کے بعد سلام پھیر چکی تھی۔ میں بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں اس کے پارسا وجود سے کہیں اور نہیں بھٹک رہی تھیں۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ آنکھیں موند کر وہ اللہ پاک سے نجانے کیا کچھ مانگ رہی تھی۔ نجانے میرے دل میں یہ خواہش کیوں بیدار ہو گئی کہ اے کاش وہ اپنی دعاؤں میں مجھے بھی شامل کر لے۔

جا، نماز کو فولڈ کر کے اس نے سامنے پڑے صوفے پر رکھا اور اچانک میری طرف اس کی نظر اٹھ گئی۔

"السلام علیکم ارحم جی۔" اس نے میرے قریب آتے ہوئے سلام کیا اور کچھ پڑھ کر میرے چہرے پر پھونک دیا۔

"وع۔ وع۔ وعلیکم السلام۔" میں اس کے اچانک بولنے پر ہڑبڑا سا گیا تھا۔

"ماشاء اللہ یہ دیکھ کر بہت اچھا لگا کہ آپ صبح جلدی جاگنے کے عادی ہیں۔ جلدی سے وضو کر لیں۔ فجر کی نماز کا وقت گزرا جا رہا ہے۔"

میں ابھی تک اس کو دیکھے جا رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود پلکیں نہیں جھپکا پا رہا تھا۔

مجھے دم بخود دیکھ کر اس نے پھر مجھے پکارا۔ "ارحم جی۔ جاگ جائیں۔"

اس نے میرا نام کچھ اس انداز میں پکارا کہ میں ہلکے سے مسکرا دیا۔

اس صبح تین سالوں میں پہلی بار میں نے فجر کی نماز ادا کی تھی۔ وہ بیچاری تو یہ سمجھ رہی تھی کہ میں نماز کا بہت پابند ہوں مگر یہ میں ہی جانتا تھا کہ میں کتنا نافرمان تھا۔ عید کی نماز اور جمعے کی نماز کے سوا کبھی کوئی عبادت نہیں کر پایا تھا۔

نماز سے فراغت کے بعد میں نے آیت سے کہا کہ میں ناشتا لینے جا رہا ہوں۔ اگر آپ نے کچھ اسپیشل بتانا ہے تو بتا دیں۔

"کیا گھر میں گھی چینی اور آٹا وغیرہ نہیں ہے؟" اس نے تفکر سے سوال کیا۔

"کچن میں سب کچھ موجود ہے۔ کل شام کو ہی تو سارا سامان لایا تھا۔ کچھ ضرورت کی چیزیں پہلے سے ہی موجود ہیں۔ مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خود کھانا بنا سکوں۔" میں نے ساری تفصیل بتاتے ہوئے اپنی ہڈحرامی کا احوال بھی بتا دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ سارا سامان کچن میں موجود ہے تو میں ناشتا بنا لیتی ہوں۔"

"ارے نہیں نہیں۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں، میں بازار سے کچھ لے آتا ہوں۔" میں نے اسے کوئی تکلیف دینا گوارا نہیں سمجھا۔

"اس میں تکلیف کی کیا بات۔ بتائیں؟ گھر کے کھانے میں زیادہ مزہ ہوتا ہے۔ اور سچ بتاؤں تو مجھے بازاری کھانے زیادہ پسند نہیں ہیں۔ بہت زیادہ مرچ مصالحے ڈالے ہوتے ہیں ان میں اسی لیے آپ بے فکر ہو کر آفس جانے کی تیاری کریں۔ تب تک میں ناشتا تیار کر لیتی ہوں۔" وہ مجھے لاجواب کرتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی اور میں وہیں کھڑا مسکراتا رہا۔

ایک دم سے زندگی کا پہلا رنگ بہت پیارا سا لگنے لگا تھا۔ سبز رنگ۔ بہاروں کی نوید سناتا۔ میری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔

میں جب تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو وہ کھانا تیار کر کے کمرے میں سجا چکی تھی۔ وہ سب کام خود سے کر رہی تھی۔ اسے کچھ بھی بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

کمرے میں کھانا دسترخوان پر سجا ہوا تھا اور وہ مجھے ہلکے سے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ میں بھی تھوڑا سا مسکرایا اور اس کی محنت کی بھرپور تعریف کی۔

پہلی بار میں نے اپنے گھر میں کسی کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔

پہلی بار مجھے اپنا گھر جنت کی طرح لگ رہا تھا۔

پہلی بار مجھے ہر شے پیاری لگنے لگی تھی۔ یہ سب آیت کی بدولت تھا۔ ابھی اس سے ملے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تھے اور زندگی اتنی بدل گئی کہ یقین کرنا مشکل تھا۔

شاید اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ پردیس میں وہ یوں خوشی محسوس کرے گی۔ اتنی جلدی کسی پر بھروسا کر لے گی۔ میں نے آیت سے اس کے تمام تعلیمی سرٹیفکیٹ لے لیے تھے۔ ارادہ تھا کہ ایک دو جگہ پر اس کی جاب کے لیے کوشش کروں گا۔

"اللہ حافظ آیت۔ ان شاء اللہ پانچ بجے ملاقات ہو گی۔ تب تک آپ گھر میں رہیں۔ آرام کریں۔ ٹی وی دیکھیں۔ میں گیٹ کو باہر سے تالا لگا کر جاؤں گا لیکن اگر آپ کو باہر جانا ہو تو بڑا گیٹ کھول کر باہر جا سکتی ہیں کیونکہ تالا صرف چھوٹے گیٹ کو لگا ہو گا۔"

میں نے اسے ایک ایک بات سمجھائی۔ وہ دھیان سے سنتی رہی۔ سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں اس کے چہرے کو مزید روشن کر رہی تھیں۔ اس کے قدرتی سنہری بالوں کی ایک لِٹ دوپٹے کی آغوش سے نکل کر اس کی پیشانی پر سجدہ ریز تھی جو سورج کی روشنی سے مزید سنہری بلکہ سونے کی مانند لگ رہی تھی۔

اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور میں بائیک نکال کر گھر کو باہر سے تالا لگا کر رحمان بابا کے ناشتا پوائنٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گو کہ میں ناشتا کر چکا تھا۔ چائے بھی پی چکا تھا مگر رحمان بابا اور کاشف سے نہیں ملا تھا۔

جنت کے باغیچے میں بائیک پارک کر کے میں رحمان بابا کی شاپ کے اندر داخل ہو گیا۔ داخل ہوتے ہی کاشف مل گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے خوش دلی سے مجھے سلام پیش کیا۔ سلام کا جواب دے کر میں رحمان بابا کی طرف بڑھ گیا۔

"السلام علیکم رحمان بابا۔" میں نے ادب سے پُر مسرت لہجے میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام ارحم میاں۔ آج پھر لیٹ آئے ہو۔ وہ بھی پورا آدھا گھنٹا۔" رحمان بابا نے گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے میری تاخیر کا ذکر کیا۔

"ہاں بابا۔ آج میں لیٹ آیا ہوں وہ بھی پہلے سے زیادہ مگر آج لیٹ آنے کے پیچھے ایک خوبصورت وجہ ہے لیکن وہ وجہ میں ابھی نہیں بتا سکتا کیونکہ میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔ اگر اسی طرح آپ سے باتیں کرتا رہا تو افسروں کی باتیں سننا پڑیں گی اسی لیے بابا جانی میں تو چلا...... اللہ حافظ۔ فی امان اللہ۔ پھر ملیں گے۔

میں نے ایک ہی سانس میں چہک کر ساری باتیں رٹے رٹائے سبق کی طرح پڑھ دیں... اور بہت پیار و ادب سے رحمان بابا کو دیکھتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔

شاپ کے دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے دیکھا کہ رحمان بابا ہلکے سے مسکرا رہے تھے۔ میں بھی ان کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

"ارے ارحم بھائی ناشتا نہیں کرنا کیا؟" کاشف نے مجھے شاپ سے باہر نکلتے دیکھ کر سوال کیا۔

"نہیں کاشف میاں۔ ناشتا تو کر لیا۔ اب بس ہضم کرنا باقی ہے۔" یہ کہہ کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

آفس سے چار بجے فری ہوا تو جلدی سے بائیک اٹھائی اور مارکیٹ چلا گیا۔ تھوڑی سی خریداری کرنے کے بعد میں نے گھر کی راہ لی۔

گھر کے گیٹ کا تالا کھولا تو آیت پر نظر پڑی جو شاید میرے ہی انتظار میں برآمدے میں بیٹھی تھی۔ میں نے اسے سلام کیا اور بائیک کھڑی کر کے شاپنگ بیگ آیت کو پکڑایا اور فریش ہونے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔

☆......☆

میں اور آیت شام کے وقت گھر کے صحن میں بیٹھے تھے...... آسمان پر پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ ہلکا ہلکا کاسنی رنگ کا اندھیرا بہت پیارا لگ رہا تھا۔

"آیت آپ نے تو گھر کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔" میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟ مطلب گھر کی ڈیکوریشن آپ کو پسند نہیں آئی؟" آیت تھوڑی جذباتی ہو گئی تھی۔

"ارے نہیں نہیں۔ میں نے ایسا کب کہا کہ مجھے پسند نہیں آئی... بلکہ میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ کو کیا ضرورت تھی خود کو ہلکان کرنے کی۔ آپ بس آرام کرتیں... مگر آپ نے تو پورے گھر کو سجا کر رکھ دیا ہے... اور تو اور میرے سارے کپڑے دھو کر استری بھی کر دیے آپ نے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آیت جی آپ کو اس گھر میں رہنے کے لیے کوئی کام کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے کام خود کر لوں گا۔ آپ خود کو تکلیف مت دیجیے گا۔"

"میں تو اکیلے فری بیٹھے بور ہو رہی تھی اسی لیے کام کاج میں لگ گئی تا کہ وقت گزر سکے اور میں نے تو آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ جبکہ آپ نے میری اتنی مدد کی۔ آپ نے مجھے تب سہارا دیا جب میں سارے سہارے کھو چکی تھی۔

UUNOVELS.COM

اب اگر میں نے آپ کے گھر کا تھوڑا سا کام کر دیا تو اس میں کون سا تیر مار لیا۔" وہ ایک لے میں بولتی چلی گئی۔

"اچھا چلیں ٹھیک ہیں۔ آپ کو جو اچھا لگا آپ نے کر دیا۔ اب آپ وہ شاپنگ بیگ لے آئیں جو میں ابھی لایا تھا۔"

"اوہ ہاں۔ وہ میں نے آپ کے روم میں رکھ دیا ہے۔ میں ابھی اٹھا کر لاتی ہوں۔"

پانچ سات سیکنڈ بعد میرے سامنے وہی شاپنگ بیگ پڑا تھا جو میں لایا تھا۔

میں نے آیت کو دیکھا۔ جو آرام و سکون سے بیٹھی تھی۔

"آیت جی آپ ذرا اس بیگ کو کھولیں۔" میں نے چہرے پر ہلکی سی مسرت سجائی۔

آیت نے "جی" کہتے ہوئے شاپنگ بیگ کو کھولا اور اس میں موجود چیزیں نکال کر سامنے چارپائی پر رکھ دیں۔

آیت مجھے حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی ناراضگی تھی۔ جب کہ میں پُرسکون لہجے میں ہونٹوں پر مسکان سجائے بیٹھا تھا۔

"آیت جی یہ دو جوڑے کپڑے، دو عدد جوتے، پرفیوم، تھوڑا سا میک اپ کا سامان ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس اس پہنے ہوئے سوٹ کے علاوہ کوئی دوسرا سوٹ نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے اندازے سے ہی آپ کے ناپ کے دو جوڑے خرید لیے۔ باقی بھی آپ کی ضرورت کی چیزیں ہیں۔ اگر کوئی چیز اور چاہیے تو بتا دیجیے گا کیونکہ مجھے لڑکیوں کی پسند اور ضروریات کا کوئی علم نہیں ہے۔"

آیت چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب اس نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ اس کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ میں پریشان ہو گیا اور بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر آیت کے پاس آ کر اسے دلاسہ دینے لگا۔

"آیت جی روئیے مت۔ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب تو آپ کے جینے کا وقت آیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ آپ مجھے کوئی بہت بڑا نیک دل انسان سمجھ رہی ہوں گی مگر یہ سب پتا نہیں کیوں کر رہا ہوں اس کی مجھے بھی کوئی سمجھ نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہو رہا اس کی آپ حقدار ہیں۔"

آیت مجھے دیر تک تکتی رہی پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ عقیدت سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے اور اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ میرا دل اچانک سے اچھل کر حلق تک آ گیا۔ کچھ لمحے میں پریشان حال کھڑا رہا۔ میرے دل میں بہت تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ جو میرے اندر موجود رشتوں کو جڑ سے اکھاڑنے لگی تھیں۔

میرا دل بار بار آیت آیت پکار رہا تھا اور شاید میرا دل آیت سے محبت کا اقرار بھی کر رہا تھا، مگر میں جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو کیا قیامت آ جائے گی۔ میں پہلے سے ہی ایک رشتے میں بندھا ہوا تھا۔ وہ رشتہ اگر ٹوٹ جاتا تو بہت سے لوگوں کا دل ٹوٹ جاتا۔ خوشیاں چھن جاتیں۔

لیکن ایک سچ یہ بھی تھا کہ آیت کا میری زندگی میں آنے سے میں جینے لگا تھا۔ خوش رہنے لگا تھا۔ بھلے ہی آیت کو آئے ہوئے ایک دو دن ہی ہوئے تھے مگر ہم نے کئی صدیوں کے مساوی باتیں کر لی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم جنموں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

اس رات میں ایک پل بھی سو نہیں پایا......

میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن آیت یہاں سے چلی جائے گی، مگر جب یہ سوچتا کہ اس کے جانے کے بعد میرا کیا حال ہوگا تو سوچ کر ہی جان نکل جاتی۔

میں نے زندگی کا ایک رنگ دیکھ لیا تھا، سبز رنگ۔ بہاروں کے موسم۔ شاید میں نے ہزاروں زندگیاں جی لی تھیں۔ ہزاروں بہاروں کو جوان ہوتے دیکھا تھا۔

مگر میں اس بات سے قطعی انجان تھا کہ میری زندگی میں خزاں بھی زیادہ دوری پر نہیں کھڑی۔

زندگی آیت کے سنگ بہت حسین گزر رہی تھی۔ رحمان بابا کو میں آیت کے بارے میں بتا چکا تھا۔ دراصل رحمان بابا مجھے والد کی طرح عزیز تھے اور مجھے وہ اپنا بیٹا مانتے تھے۔ ان کے مشورے، ان کی صلاحیتیں میرے بہت کام آتی تھیں۔ انہوں نے دبے لفظوں میں کہا تھا کہ جتنی جلد ہو، اس رابطے کو رشتے میں بدل لو ورنہ دشواری پیدا ہو جائے گی مگر مجھے کیا پتا تھا کہ دشواری اس طرح آئے گی۔

میں اور آیت کبھی کبھار باہر گھومنے بھی چلے جاتے۔ ان دنوں زندگی بہت پیاری ہو گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں پیار میں پڑ گیا تھا۔ آیت کے دل کا حال میں نہیں جانتا تھا اور میں اس سے اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں رشتوں کی ڈور سے بری طرح الجھا ہوا تھا۔

آیت کی جاب کے لیے میں نے تین چار جگہ اپلائی کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے میرے ایک افسر کی مہربانی سے آیت کو ایک پرائیویٹ کمپنی میں کمپیوٹر آپریٹر کی نوکری مل گئی۔ یہ صرف

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

آغاز تھا کیونکہ میرے افسر کے بقول وہ چند دن کے بعد اسے پرموٹ کر دیں گے لیکن اس سے پہلے اسے نچلے درجے پر رہ کر کام سیکھنا ہوگا۔

آیت کو جس دن جوائننگ لیٹر ملا اس دن وہ بہت زیادہ خوش تھی۔ میں بھی خوش تھا۔ اس کی جاب کی خوشی میں ہم دونوں نے باہر ڈنر کیا۔ میں آیت کو زبردستی مارکیٹ لے گیا اور اسے دو نئے جوڑے اور جوتے لے دیے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ جاب پر پرانے کپڑوں میں جائے۔

آیت نے چھ دن بعد جاب پر جانا تھا۔

لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ میری زندگی اب میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔

اس دن میں اور آیت مل کر کپڑے دھو رہے تھے۔ وہ کپڑے دھو کر مجھے دیتی تو میں ان کو تار پر سکھانے کے لیے ڈال دیتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ آیت کو میرے گھر میں رہتے ہوئے دو مہینے گزر چکے تھے۔ تبھی میرے گھر کے گیٹ پر دستک ہوئی۔

میں دستک سے چونک گیا۔ کیونکہ میرے گھر میں کوئی نہیں آتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کوئی سائل ہو۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو جہاں تھا وہیں جم گیا۔

کیونکہ سامنے کا منظر ہی کچھ ایسا تھا۔ مجھ پر قیامت ٹوٹنے والی تھی بلکہ ٹوٹ چکی تھی۔

میرے ابا، اماں، میری منگیتر بانو اور اس کے ابا اور اماں گیٹ کے باہر کھڑے تھے۔

میں حیرت کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ ابا نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا۔ اماں نے بھی پیار دیا اور بانو مجھے دیکھ کر شرما گئی۔

میرے ہونے والے ساس سسر بھی بیٹوں کی طرح مجھے پیار دینے لگے اور اگلے ہی پل سب گیٹ سے اندر داخل ہو چکے تھے۔

لیکن اچانک سب کی نظر جب آیت پر پڑی تو سب حیرت و سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ آیت نے بھی ان کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی ڈر گئی تھی۔

سب کی سوالیہ نظریں میرے پریشان حال چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور میں چوروں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

اگلا ایک گھنٹا مجھ پر اور آیت پر بہت کٹھن گزرا تھا۔

قیامت ہم پہ نازل ہو گئی تھی۔ اور طوفان سے ہمارے دل کی عمارت مسمار ہو چکی تھی۔

اب اس عمارت کا ملبا تھا اور اس ملبے کی تہہ میں مردہ حالت میں پڑے ہوئے بھی خون کے رشتے تھے۔

زندگی کا دوسرا رنگ، زرد رنگ، خزاں کی علامت میرے جسم و جاں سے لپٹ چکا تھا۔

☆.....☆

سب کچھ کسی خواب کی مانند وقوع پذیر ہوا تھا۔

اس دن میرے گھر میں کوئی مرا نہیں تھا لیکن مجھے ہر طرف خون میں لپٹی چلتی پھرتی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔

زندگی کا ایک اور رنگ، سرخ رنگ مجھ پر طاری ہو چکا تھا۔

یہ رنگ تو محبتوں کی علامت سمجھا جاتا ہے نا.....؟ مگر کبھی کبھار یہ رنگ ڈر کا باعث بھی بنتا ہے۔

یا یہ کہہ لیں کہ جہاں محبتیں ہوتی ہیں وہاں ڈر بھی ایک کونا سنبھال کر بیٹھا تاک میں رہتا ہے۔

آیت اور میں بے قصور ہونے کے باوجود سب کی نظروں میں قصوروار ثابت ہو چکے تھے۔ شاید اسی لیے کہ عدالت بھی انہی کی تھی، وکیل بھی وہی اور منصف بھی وہی تھے۔

ہم تو بس ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے کھڑے تھے۔

آیت کو دیکھ کر سب کے چہروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔

مجھ سے سوال کیا گیا کہ یہ لڑکی کون ہے؟

اماں نے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کیا کر رہی ہے؟

بانو کی اماں کا سوال یہ تھا کہ تمہارا اس لڑکی سے کیا تعلق ہے؟

بانو کے ابا نے پوچھا کہ تم نے ہم سب کو کیوں دھوکے میں رکھا ہوا تھا؟

بانو نے سسکی لیتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہ تمہارے ساتھ ہی رہتی ہے؟

سب کے سوال مجھے کسی زہریلے تیر کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ ایسے تیر جن سے زخم تو نہیں بن رہے تھے مگر درد و تکلیف بہت ہو رہی تھی۔

میں نے بس اتنا ہی کہا کہ یہ لڑکی اس دنیا میں تنہا ہے۔ حالات کی ماری ہوئی ہے اور میں نے اس کی مدد کی ہے۔ صرف اس نیت سے کہ اسے زندگی میں آگے بڑھنے کا موقع مل سکے۔

مگر میرے جواب سے کوئی مطمئن نہیں ہوا۔

میں نے سب کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر سب

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

کوششیں بیکار گئیں۔ آیت نے خود سب کو بہت مطمئن کرنا چاہا مگر آیت کو دیکھ کر سب کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

آیت نے اتنا تک کہا کہ وہ آج ہی یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس کی وجہ سے باقی لوگوں کی زندگیاں خراب ہوں مگر میں نے سب کے سامنے اسے ٹوک دیا تھا۔

کیونکہ جب ہم دونوں غلط نہیں تھے تو پھر کیوں سب کو صفائی دیتے۔

بانو کی اماں جھٹ سے بولیں۔ ''دیکھو کلثوم۔ اپنے بیٹے کے تیور تو دیکھو۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔'' پھر تھوڑا وقفہ لے کر دوبارہ گویا ہوئی۔ ''اگر یہ لڑکی اس گھر سے چلی بھی گئی تو بھی یہ اس سے ملتا رہے گا۔ جو ایک لڑکی کو بنا کسی رشتے کے اتنے دن اکیلے اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے وہ تو دنیا جہان کا ہر کام کر سکتا ہے۔''

مجھے ان کی باتوں سے غصہ آنے لگا۔

بانو بھی رو رہی تھی اور آیت بھی۔

تبھی بانو کے ابا نے کہا کہ بس اب اور کچھ نہیں کہنا نہ ہی کچھ اور سننا ہے۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔

انہوں نے بانو کو دیکھا پھر اس کے بائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی انگلی میں پہنی ہوئی میرے نام کی انگوٹھی اتار کر میرے قدموں میں پھینک دی، بانو کی اچانک سے ہچکی بندھ گئی۔ بانو کی اماں بھی دکھی لہجے میں مجھے غصے سے دیکھ رہی تھیں۔

میرے ابا اور اماں سر جھکائے شرمندگی سے کھڑے تھے۔

میرے پیروں میں منگنی کی انگوٹھی پڑی تھی...... ایک رشتہ خاک میں پڑا ہوا خاک بن چکا تھا۔

میرے ابا اور اماں نے بانو کے والدین کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''بھائی صاحب ہمیں معاف کر دو۔ ہمیں نہیں علم تھا کہ ہمارا بیٹا ہماری عزت کو یوں خراب کرے گا۔ ہم گناہگار ہیں آپ سب کے اور بانو بیٹی کے...... ہمیں جو چاہے مرضی سزا دے لیں ہم اف تک نہیں کریں گے۔''

میرے ابا اور اماں رو رو کر معافیاں مانگ رہے تھے جبکہ میں سن ہو چکا تھا۔ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

''نہیں بھائی صاحب۔ ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ساری زندگی ہم نے ایک ساتھ گزاری ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کتنے اچھے انسان ہیں۔ مگر آپ کے تالاب میں جو اکلوتی مچھلی تھی وہی گندی نکلی۔'' بانو کے ابا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اور آیت حیرت کا مجسمہ بنے کھڑے تھے۔ بانو زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ جانے انجانے میں، میں نے اس کا دل دکھایا تھا۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح بانو کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

''بانو میرا یقین کرو، جیسا تم سب لوگ سوچ رہے ہو ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ میں نے کسی کو آیت کے بارے میں نہیں بتایا، صرف اس لیے کہ کوئی غلط گمان نہ کرے۔'' میں بانو کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جن کے دل میں چور ہوتا ہے نا وہی چھپاتے ہیں۔ آپ کا یہ دوسرا روپ دیکھ کر مجھے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔ ہاں دکھ بھی بہت ہے مگر وہ دکھ میری اس نفرت سے بہت کمتر ہے۔ اگر ابا یہ انگوٹھی میری انگلی سے نہ نکالتے تو میں خود اسے نکال کر تمہارے منہ پہ مارتی۔ سو باتوں کی ایک بات کہ اب میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

بانو پہلی بار غصہ میں تھی اور شاید اس کا غصہ بھی بجا تھا مگر میں بھی غلط نہیں تھا اور یہ بات کوئی ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

پھر سبھی میرے گھر سے نکل گئے۔ میں نے اماں اور ابا کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر کسی نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

جاتے جاتے بانو ایک لمحے کے لیے رکی۔ پیچھے مڑ کر میری اور آیت کی طرف دیکھا۔ اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بولی۔

''میری زندگی خراب کرنے والو تم پہ لعنت ہے۔'' پھر وہ تیز تیز بڑھتی چلی گئی۔

وہ گھر جس میں کچھ دیر پہلے قیامت برپا ہوئی تھی اب کسی اجڑے ہوئے ویران کھنڈر کی طرح لگ رہا تھا۔ جس کی دیواریں تو سلامت تھیں مگر جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر حالات کی ستم ظریفی کی داستان سنائے جا رہی تھیں۔

زندگی میں پہلی بار مجھے کسی نے نفرت سے دیکھا تھا اور اس نے جس کے ساتھ میری زندگی گزرنے والی تھی۔ زندگی کا یہ رنگ جو بالکل سیاہ تھا میرے لیے نفرت اور سیاہ بختی ثابت ہوا تھا۔

ایک لمحے میں میری قسمت اندھیر نگری بن گئی۔ عزیز ترین لوگوں کی نفرت میرے حصے میں آئی تھی۔

میں اور آیت اس دن ساکت و جامد بیٹھے رہے۔ ایک

UUNOVELS.COM

دوسرے سے بھی کوئی بات نہ کر پائے۔

میں سمجھا تھا کہ یہی میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہو گا مگر کون جانتا تھا کہ ابھی ایک اور دکھ میری تاک میں بیٹھا ہوا ہے۔

اس دن اماں، ابا، بانو، اس کے والدین کوئی بھی واپس گاؤں نہ پہنچ پایا تھا۔ میں نے کئی بار فون ٹرائی کیا مگر نمبر آف جا رہا تھا۔ ہمسائے کو کال کی تو پتا چلا کہ دونوں گھروں کو تالا لگا ہوا ہے۔ میں پریشان ہو گیا۔ تبھی مجھے ابا کے نمبر سے کال آئی۔ میں نے ابا کا نمبر دیکھا تو پُرسکون ہو گیا۔ پھر میں نے کال اٹینڈ کی۔

مگر وہ کال میرے لیے پیغام اجل ثابت ہوئی۔ کال کرنے والا ریسکیو آفیسر تھا۔ اس نے مجھے ایمرجنسی وارڈ میں بلایا تھا۔ آیت نے میری بدلتی ہوئی کیفیت دیکھی تو پوچھا کہ کیا ہوا؟

میں نے اسے بتایا کہ اسپتال سے ابا کے نمبر سے کال آئی ہے مگر کوئی دوسرا بندہ بات کر رہا تھا اس نے مجھے ایمرجنسی میں بلایا ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے آیت۔

آیت بھی پریشان ہو گئی۔ ”آپ پریشان مت ہوں بلکہ ابھی اسپتال جائیں۔ رکیں، میں بھی ساتھ چلتی ہوں پھر میں اور آیت جلدی سے اسپتال پہنچے مگر وہاں میرے انتظار میں پانچ لوگوں کی خون میں لت پت لاشیں پڑی تھیں۔“

”اماں، ابا۔ بانو، اس کے والدین......“

سب کے چہرے گرد اور خون کی وجہ سے گندے ہو گئے تھے۔ میں حیرت کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ آیت مسلسل رو رہی تھی۔ میرے آنسو تو بنا رکے سیلاب کی مانند بہے جا رہے تھے اور میرے دل کی بستی کو اپنی تند لہروں سے بہائے جا رہے تھے۔

کاش کہ کوئی کسی کو مردہ حالت میں نہ دیکھ پاتا۔ کسی مردے کو دیکھنا بالکل ایسے ہوتا ہے جیسا کوئی ایک مردہ کسی دوسرے مردے کو دیکھ رہا ہو۔ میری دنیا پل بھر میں اجڑ گئی۔

سب کچھ کسی خواب کی سی حالت میں ہوا تھا۔ میں کبھی اپنے پیاروں کی لاشوں کو دیکھتا تو کبھی آیت کو۔ کبھی پاس کھڑے لوگوں کو دیکھتا تو کبھی ڈاکٹرز کو...... سب کی نظروں میں میرے لیے ہمدردی تھی۔ دلاسے تھے۔

مگر کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ میرا دکھ کتنا بڑا ہے۔ میرا صبر جواب دینے والا تھا۔ میرے کندھے اتنے مضبوط نہیں تھے جو اپنے پیاروں کے جنازے کو اٹھا سکیں۔

کاش میں وقت کو بدل سکتا۔

کاش میں پتھر کے دل والا ہوتا۔

کاش میں پیدائشی یتیم ہوتا۔ کم سے کم آج تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

یہ جو قدرت ہوتی ہے نا، بڑی استاد ہوتی ہے۔ وہاں ضرب لگاتی ہے جہاں سے انسان سینکڑوں حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ آزمائشیں کوئی معمولی تو نہیں ہوتی نا.... آزمائش تو وہ ہوتی ہے جس میں ہر سیکنڈ کے بعد زندگی بوجھ محسوس ہونے لگے اور موت، موت بہت سہل لگے۔“

☆......☆

زندگی کا سیاہ رنگ میں نے جی بھر کر دیکھا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میری سیاہ بختی میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اماں ابا، بانو اور اس کے والدین کو گزرے ہوئے گزشتہ دن پورے دو سال ہو گئے تھے۔ ان دو سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ میں نے اپنے گاؤں کی ساری اراضی فروخت کر دی تھی اور مستقل طور پر بہاولنگر آ گیا تھا۔ لیکن گاؤں والا گھر نہیں بیچا تھا۔ کبھی کبھار میں وہاں چلا جاتا تھا۔ اس گھر میں میری زندگی کے بہت سے سہانے سال گزرے تھے۔ اس گھر میں میری کلکاریاں گونجی تھیں۔ میرے رونے کی آوازیں چکرائی تھیں۔ میرے ابا اور اماں کا سایہ مجسّم تھا۔

اے کاش کہ سب ویسا ہی رہتا۔ اماں ابا حیات ہوتے......

مگر انسان کی اکثر خواہشوں کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ بس ایک احساس ہوتا ہے، ایک بھرم اور اسی بھرم میں وہ خود کو جلاتا رہتا ہے۔

میں اب ہیڈ کلرک بن گیا تھا۔ تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ یوں تو زندگی میں کسی شے کی کمی نہیں تھی مگر رشتوں کی بات کی جائے تو میں کنگال ہو چکا تھا۔

آیت ڈیڑھ سال پہلے میرے گھر کو خیرآباد کہہ کر جا چکی تھی۔ ویسے تو میں نے اسے کبھی جانے کا نہیں کہا تھا مگر اس کی جاب تھی، وہ خود مختار تھی۔ زیادہ دن تک وہ میرے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر نہیں رہ سکتی تھی۔

سچ کہوں تو اس کا مجھے بہت سہارا تھا۔ میرے والدین کے گزرنے کے بعد وہ آیت ہی تھی جس نے مجھے سنبھالا تھا۔ میرا خیال رکھا تھا۔ ماں کی طرح دیکھ بھال کی تھی۔

ایک سچ یہ بھی ہے کہ مجھے اس کی عادت ہو گئی تھی۔

وہ مجھے ہوٹلوں سے اٹھا کر گھر کے کچن تک لائی تھی۔ گھر کے کھانوں کا ذائقہ چکھایا تھا اور مجھے بنجارے سے انسان بنا

کر چلی گئی۔

اکثر جب وہ کھانا بناتی اور ہم ساتھ میں کھا رہے ہوتے تو میں اس سے کہا کرتا تھا۔ "آپ نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ گھر کے کھانے کھلا کھلا کر ہوٹل کے کھانوں کا ذائقہ تک بھلا دیا ہے۔ جب کبھی آپ نہ ہوئیں اور میرا گھر کے کھانے کھانے کا دل کیا تو میں کیا کروں گا۔"

وہ مجھے مسکرا کر تکتی رہتی اور پھر بولتی۔ "میں نے آپ کی عادتیں بگاڑی نہیں بلکہ سنواری ہیں۔ دیر سے گھر آنے کی عادت ختم کی آپ کی۔ پیسے بچانے کی عادت ڈالی آپ کو اور اگر میں نہ ہوئی تو آپ خود کچن میں جا کر کھانا بنایا کریں گے۔ جیسا بھی بنا، اسے بڑے چاؤ سے کھایا کریں گے۔ اور کبھی فضول خرچی نہیں کریں گے۔"

فضول خرچی سے اس کی مراد باہر ہوٹلوں پر مہنگے پکوان کھانے کی تھی۔

اس کی جاب ہوگئی اور وہ روز صبح نو سے شام پانچ بجے تک فیکٹری ہوتی تھی۔ وہ اپنی ضروریات خود پوری کرنے لگی تھی۔ یہ بات نہیں کہ مجھے اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں کوئی عار محسوس ہوتی تھی، بلکہ وہ خود بہت سمجھدار تھی۔ جب تک وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں تھی تب تک کی بات اور تھی لیکن جیسے ہی وہ کمانے لگی تو اپنا خیال خود رکھنے لگی۔ یہ بہت اچھی بات تھی، کیونکہ میں اسے کبھی بھی لاچار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ زندگی میں سب کچھ اپنے بل بوتے پر حاصل کرے۔ میں اسے فاتح عالم دیکھنا چاہتا تھا۔

پھر اس نے کرائے پر ایک کمرا لے لیا اور ایک شام مجھے الوداع کہہ گئی۔

وہ میرے گھر سے کیا گئی گویا زندگی بے رنگ سی ہو گئی۔ کچھ لوگ ایسے مصور ہوتے ہیں جو غیر ارادی طور پر انجانے میں کسی کی زندگی میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ آیت بھی ایسی ہی تھی۔

نازک سی، گوری رنگت اور شرم کی چادر اوڑھے ہوئے، خیال رکھنے والی۔

محلے کے ان لوگوں نے جن سے سلام دعا تھی وہ بھی پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ آپ کی بیگم آج کل نظر نہیں آرہیں اب میں ان کو کیسے بتاتا کہ وہ میری بیگم نہیں تھی۔ اس سے تو میرا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ ایک بے نام رشتے میں جڑی آیت کیا گئی میری زندگی ویران ہوگئی۔ میں پھر سے پہلے جیسا ہوگیا۔

صبح سویرے تیار ہو کر رحمان بابا کی شاپ پہ چلا جاتا، پہلے کی طرح ناشتا کرتا، چائے پیتا اور سلام دعا کے بعد آفس چلا جاتا۔ دوپہر کا کھانا آفس میں ہی کھا لیتا اور شام کو واپسی پر گھر آتے ہوئے کسی ہوٹل سے ڈنر کر آتا..... اتوار کے روز مشین لگا کر کپڑے دھوتا، ان کو پریس کر کے الماری میں رکھتا اور بے مقصد لیٹا رہتا۔

جب آیت ساتھ تھی تو زندگی بہت پیاری تھی لیکن اب زندگی، زندگی نہیں بلکہ بوجھ بن گئی تھی۔

کبھی کبھی آیت خیریت دریافت کرنے کے لیے کال کر لیتی تھی۔ رسمی سی گفتگو کرتی پھر خدا حافظ کہہ کر کال کاٹ دیتی۔

میں سوچتا تھا کہ میری طرح شاید آیت کے دل میں بھی میرے لیے کچھ ہے مگر میں غلط تھا۔ وہ مجھے صرف اپنا محسن مانتی تھی حالانکہ مجھے اپنے لیے اس کی یہ سوچ قطعی ناپسند تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے ساری زندگی خیر کا علمبردار سمجھتی رہے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میں نے اس کے لیے جو بھی کیا تھا وہ اسے بھول جائے۔ مجھے میرے اس عمل کی وجہ سے جھیلے نہیں۔

ایک رات میں یونہی لیٹا ہوا تھا، آسمان کی چھاتی سے لپٹے ستاروں کی شماری کر رہا تھا جب آیت کی کال آگئی۔

وہ کبھی اس وقت کال نہیں کرتی تھی۔ ہمیشہ اتوار کے دن کرتی تھی اور وہ بھی دن کے وقت مگر نہ تو اس دن اتوار تھا نہ ہی دن تھا۔ پھر اس نے کیسے کال کی۔

میں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کال اٹینڈ کر لی۔

"السلام علیکم ارحم جی۔"

"وعلیکم السلام۔ سب خیریت تو ہے نا؟"

"جی سب خیریت ہے۔"

"تو پھر اس وقت کال؟"

"کیوں اس وقت آپ کو کال نہیں کر سکتی میں؟" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے خود سوال کر دیا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ جب کال کرتی ہیں تو اتوار کے روز کرتی ہیں اور وہ بھی دن کے وقت لیکن آج آپ نے اپنے معمول سے ہٹ کا کال کی تو تھوڑی تفتیش ہوئی اسی لیے پوچھا تھا آپ سے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بس آپ سے ایک بات کرنی تھی۔ اوہ۔ بات کرنی نہیں بلکہ آپ کا مشورہ چاہیے تھا مجھے۔"

"جی جی حکم کریں آپ......"

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

گی یادوں کو ہوا دی۔ میں اتنا تو جان ہی گیا تھا کہ آیت کوئی بھی فیصلہ لینے میں ڈر رہی تھی۔ اس رات میں اسے بہت غور سے دیکھتا رہا۔ ایسے جیسے آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

"ارحم جی ایک بات بولوں؟" آیت نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔ "آپ اب شادی کر لیں۔"

میں اس کی بات سن کر چپ ہو گیا۔ کچھ کہہ نہیں پایا۔ کیسے کہتا اسے بتا سکتا کہ جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں وہ کسی اور سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے۔

"ارحم جی میں نے آپ سے کچھ کہا ہے۔ جواب نہیں دیں گے؟" آیت نے مجھے خیالوں میں گم پا کر یاد دہانی کروائی۔

"شادی۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کبھی شادی کروں گا بھی یا نہیں۔ سچ کہوں تو اب دل نہیں مانتا...... روز روز خود کو زندہ درگور نہیں کر سکتا پہلے بانو چلی گئی اور اب......" میں اچانک بات کرتے کرتے رک گیا۔ غیر ارادی طور پر میں آیت کا نام لینے والا تھا۔

آیت سمجھ گئی کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں اس سے۔ "پہلے بانو چلی گئی اور اب؟ اب کون چلا گیا ارحم جی؟"

آیت ایک دم سے تفتیشی افسر کا روپ دھار چکی تھی۔

"کوئی نہیں۔ وہ بس ایسے ہی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔"

"نہیں ارحم جی۔ اتنا تو میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ کے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ مجھ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"نہیں آیت۔ میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ اب آپ بھی سو جائیں۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" اتنا کہہ کر میں اٹھ کر اپنے روم میں چلا گیا۔ آیت مزید الجھن کا شکار ہو گئی۔ وہ شاید بہت دیر تک وہاں بیٹھی رہی تھی پھر اٹھ کر سونے چلی گئی۔

☆......☆

وہ ایک سہانی شام تھی۔ ہلکی ہلکی ہوائیں، اور ہواؤں میں پھیلی ہوئی سینکڑوں حسیناؤں کے بدن کی خوشبوئیں، اڑتے ...... پرند اور میں...... میں پارک میں بیٹھا آیت کی سوچوں میں گم تھا۔

گیٹ سے اندر آتے ہوئے لوگ میری نظروں کے سامنے تھے۔ تبھی اچانک، آیت پارک کے گیٹ سے داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ بھی کوئی تھا۔ میرا دماغ جھٹ سے جان گیا کہ یہ آیت کا وہی جاب فیلو ہے جس نے آیت کو شادی کے لیے پرپوز کیا ہے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے ہی میں کھڑا ہوا آیت کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ اس شخص کے ساتھ میرے جانب بڑھنے لگی۔ میں نے دوسری طرف چلتے ہوئے ایسے ظاہر کیا جیسے میں نے ان کو دیکھا ہی نہ ہو۔

آیت تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میرے سامنے آ کر رک گئی...... آیت کی نظریں مجھ پر تھیں...... اور میں ایسے برتاؤ کرنے لگا جیسے مجھے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر بہت خوشی اور حیرت ہوئی ہے۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہیں ارحم جی؟" آیت نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے کن انکھیوں سے پوچھا۔

"میں بھاگا تھوڑی جا رہا ہوں...... بلکہ میں تو بس جا رہا ہوں......"

"مجھے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیا آپ نے۔ کیوں جی۔ کوئی غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟"

"ارے نہیں نہیں۔ میں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔"

آیت مجھے ہنوز گھورتی رہی۔ وہ آج پھر جان گئی تھی کہ میں اس سے جھوٹ بول رہا ہوں۔

آیت کے ساتھ کھڑا شخص ہم دونوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"آیت آپ نے ان کا تعارف نہیں کروایا۔" میں نے پاس کھڑے شخص کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ سوری۔ یہ ہیں میرے جاب فیلو۔ قاسم علی اور قاسم یہ ہیں ارحم جی۔ میرے سب سے زیادہ خیر خواہ، میرے محسن، میرے دوست۔"

آیت نے کھلے دل سے قاسم سے میرا تعارف کروایا تو قاسم کا رنگ اڑ گیا۔ رقابت اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی مگر مجھے کوئی خوشی یا کوئی دکھ نہیں ہوا۔

"اچھا آیت میں چلتا ہوں۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔ ان شاء اللہ جلدی ملاقات ہو گی۔"

میں خدا حافظ کہہ کر جانے لگا تو آیت گویا ہوئی۔ "میں قاسم کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہوں ارحم جی......"

میں نے ایک لمحے کے لیے آیت کو دیکھا پھر قاسم کو دیکھا اور تھوڑا نارمل ہوتے ہوئے بولا۔ "تو جب آپ اسلام آباد سے واپس آئیں گی تو ان شاء اللہ ملاقات ہو گی۔"

آیت کے چہرے پر ہلکی سی شرمندگی تھی۔ وہ نظریں چرا رہی تھی مجھ سے۔

UUNOVELS.COM

غازی علم دین شہید

پیدائش 4 دسمبر 1908ء ، تاریخ وفات 31 اکتوبر 1929ء غازی علم دین شہید 3 دسمبر 1908ء ، بمطابق 8 ذیقعد 1366ھ کو لاہور کے ایک علاقے کوچہ چابک سواراں (موجودہ نام محلہ سرفروشاں) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام طالع مند تھا جو ترکھان یعنی لکڑی کے کاریگر تھے۔

سر سکندر حیات

پیدائش 5 جون 1892ء ، وفات 26 دسمبر 1942ء ۔ آپ یونینسٹ پارٹی کے صدر، متحدہ پنجاب کے گورنر اور ریزروبینک آف انڈیا کے ڈپٹی گورنر رہے ہیں۔ حضوری باغ کے عین سامنے اور بادشاہی مسجد کے پہلو کے احاطہ میں سکندر حیات خان کی قبر ہے۔

حسین شہید سہروردی

پیدائش 8 ستمبر 1892ء ، وفات 5 دسمبر 1963ء ۔ حسین شہید سہروردی پاکستان کے سیاست دان تھے۔ آپ 1956ء سے 1957ء تک پاکستان کے وزیراعظم رہے۔ آپ قائداعظم کے پسندیدہ افراد میں سے تھے۔ 16 اگست 1946ء کے راست اقدام کے موقع پر آپ نے شہرت حاصل کی۔

ہمیشہ محسوس کرتا رہوں گا۔"

"آپ بھی مجھے آخری سانس تک یاد رہیں گے ارحم...... جب بھی میری زندگی میں کوئی برا وقت آئے گا تو مجھے یقین رہے گا کہ آپ کسی مہربان سائے کی طرح میرے ساتھ کھڑے ہوں گے...... آپ سے مل کر، آپ کے ساتھ رہ کر، آپ کو جان کر مجھے انسانیت پہ یقین ہوا ہے...... ورنہ جو میرے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد تو میرا انسانیت سے بھروسا ہی اٹھ گیا تھا لیکن آپ نے مجھے غلط ثابت کر دیا۔ آپ نے بغیر کسی مطلب کے، میری ہر ضرورت کو پورا کیا، مجھے میری زندگی لوٹائی۔ ہر خوشی دی۔ لیکن میں نے ہی آپ کی خوشیوں کا قتل کر دیا۔ آپ کے ابا، اماں اور بانو میری وجہ سے مرے ہیں۔ اگر میں آپ کے گھر نہ ہوتی اور وہ مجھے نہ دیکھتے تو شاید وہ آپ پر غصہ نہ ہوتے۔ غصے میں ڈرائیونگ نہ کرتے جس کی وجہ سے ان کی ویگن ٹرالر سے ٹکرائی تھی۔ ورنہ آج سب زندہ ہوتے۔"

"کیا بات ہے آیت۔ آپ پریشان لگ رہی ہیں۔ اور یوں نظریں کیوں چرا رہی ہیں؟"

"ارحم جی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قاسم کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہوں۔ وہاں قاسم کا گھر ہے۔ قاسم چاہتے ہیں کہ میں شادی سے پہلے ہی جاب چھوڑ دوں اور صرف گھر سنبھالوں۔"

"تو آپ پھر کبھی بھی واپس نہیں آئیں گی؟" میں نے بہت دکھی دل سے پوچھا تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں کے وزن سے بے قابو ہو رہی تھیں۔

"ہاں شاید۔ میں کبھی واپس نہ آ پاؤں۔" آیت نے بھی دکھی دل سے کہا تھا۔

میں کچھ لمحے ٹرانس کی حالت میں رہا۔ دماغ سن ہو چکا تھا۔ دل درد سے بھر گیا تھا۔ میں نے نظر بھر کر آیت کو دیکھا۔ ایک آنسو میری آنکھ سے گر کر مٹی میں مل گیا۔ "خوش رہیں۔ اللہ آپ کو من چاہا سب کچھ عطا فرمائے۔ آمین۔"

اتنا کہتے ہی میں جلدی سے وہاں سے چلا آیا۔ آیت اور قاسم شاید میرے دل کا احوال جان گئے تھے، یا شاید نہیں......

لیکن جب میں وہاں سے چلا تو آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ درد کی شدت سے دل پھٹا جا رہا تھا۔ قدم شکستہ تھے اور بدن بے جان......

بس اک وقت تھا جو گزر رہا تھا ورنہ میں تو وہیں رک گیا تھا جہاں آیت کو خدا حافظ کہا تھا۔

وہ رات میری زندگی کی سب سے بڑی رات ثابت ہوئی تھی۔ ساری رات میں خدا سے شکوے شکایتیں کرتا رہا اور میرا خدا مجھے سنتا رہا۔

اسلام آباد جانے سے قبل مجھے آیت کی کال آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ قاسم کے ہمراہ یہ شہر چھوڑ کر جا رہی ہے۔ میری صحت کا حال احوال بھی اس نے پوچھا تھا اور یہ بھی کہ مجھے آیت کے اس طرح چلے جانے پر کوئی دکھ یا افسوس تو نہیں مگر میں نے دل بڑا کرتے ہوئے اس کے سارے خیالات و احساسات کی نفی کر دی...... کال کے دوران بار بار میری آواز رندھ رہی تھی۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ دل تو جیسے ابھی سینے سے باہر نکل آنے والا تھا۔

کال کٹنے سے پہلے میں نے کہا تھا۔ "آیت آپ ساری زندگی ایک خوبصورت احساس کی طرح میرے ساتھ رہیں گی۔ میں آپ کو اپنے گھر کے ہر کونے میں، ہر شے میں

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

آیت رو رہی تھی، اور بے تحاشا رو رہی تھی..... میں بھی آنسو بہائے جا رہا تھا۔

پھر کال کٹ گئی۔

زندگی مجھ سے گفتگو کر کے، آگے بڑھ گئی۔

آیت اپنی زندگی میں آگے بڑھ گئی لیکن میں وہیں کھڑا رہا..... میری زندگی میں گویا جمود سا طاری ہو گیا تھا لیکن وقت، وقت مسلسل سفر میں تھا۔

ماہِ رمضان کا مہینا خیر و عافیت سے گزر گیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے یہ سارا مہینا عبادت میں گزارا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے دلی سکون محسوس ہوا تھا۔ ایسا سکون جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن آیت کی یادیں اکثر مجھے بے چین رکھتی تھیں۔ میرے زخموں پہ وار کرتی تھیں۔ آیت میرے ذہن و دل میں بہت گہرائی تک جا بسی تھی۔

کاش کہ اِس عید پہ آیت کا ساتھ مجھے میسر ہوتا۔ کاش وہ میرے ہمراہ ہوتی۔

☆......☆

آج آیت کو میری زندگی سے ہجرت کیے پورے دو سال گزر گئے ہیں..... یہ دو سال جس کرب و اذیت میں گزرے تھے اس کا اندازہ لگانا ہی ناممکن تھا۔

بس دل کی حالت کچھ یوں تھی کہ دھڑکے بغیر ہی دھڑک رہا تھا، بنا کسی احساس کے محسوس کر رہا تھا، بنا کسی سوچ کے سفر کر رہا تھا۔ بس یہ دل کسی اندھی گلی میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

آیت جب اسلام آباد چلی گئی تو دو تین بار ہی اس سے بات ہو پائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے قاسم سے شادی کر لی ہے اور وہ گھر میں ہی رہتی ہے..... بتا رہی تھی کہ وہ مطمئن ہے زندگی سے۔

پھر دو مہینے بعد اس نے دوبارہ کال کی اور بولی۔ "ارحم زندگی کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے اور یہ لوگ گرگٹ سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔" میں نے اس سے بہت پوچھا کہ آخر پریشانی کیا ہے۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ میں اسے حل کر دوں گا مگر وہ بس اتنا ہی بولی۔

"نہیں ارحم۔ اب اور نہیں۔ میں اپنی وجہ سے دوبارہ آپ کو کسی دکھ درد میں مبتلا نہیں کر سکتی۔" پھر اس نے کال کاٹ دی۔ اس نے مجھے روکا تھا کہ میں اسے خود کال نہ کیا کروں بلکہ وہ خود ہی مجھے کال کر لیا کرے گی۔

مجھے آیت اور قاسم کے رشتے میں کچھ گھٹن سی محسوس ہوئی۔

دو ہفتے بعد آیت کی تیسری اور آخری کال آئی۔

وہ رو رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ قاسم نے اسے طلاق دے دی ہے۔ مزید بولی کہ وہ اسے روز مارنے لگا تھا۔ ہر بات میں شک کرنے لگا تھا۔ میں بھی تنگ آ گئی تھی روز روز کے جھگڑوں سے۔ میں نے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو تو مجھے چھوڑ دو۔

اس رات دوبارہ لڑائی ہوئی۔ اس نے مجھے پھر سے مارا، اور میرے ہاتھ پہ طلاق کا ٹھپا لگا کر گھر سے نکال دیا۔ وہ خود کو کوستی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔

اس نے کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ بس اتنا بول کر فون بند کر دیا۔ "دعاؤں میں یاد رکھیے گا ارحم جی۔"

میں نے اسے خود کال کی مگر نمبر آف تھا۔ میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ میں اسے اتنا بھی نہیں کہہ پایا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے مگر جلد بازی میں کچھ کہہ ہی نہیں پایا۔ دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں۔

ساری رات میں آیت کا نمبر ٹرائی کرتا رہا مگر آف تھا۔ دن پہ دن گزرتے چلے گئے۔ دو بار میں اسلام آباد بھی گیا تھا۔ آیت کو ڈھونڈنے مگر اس کا کہیں پتا نہیں چلا۔

میری حالت تو ایسی تھی کہ جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔

آیت کا نمبر دوبارہ آن ہی نہیں ہوا۔

آج آیت کو میرے شہر سے، میرے گھر سے دور دو سال گزر گئے تھے۔ اس کی تلاش جاری تھی۔ اس کی تصویر میں نے مختلف اخبارات، ٹی وی چینلز پر دی ہوئی تھی۔ اس اُمید پہ کہ کہیں سے کوئی اچھی خبر ضرور آئے گی۔

اور پھر ایک دن، وہ اچھی خبر آ ہی گئی۔

میں اس خبر کا پیچھا کرتے کرتے دارالامان جا پہنچا۔

وہ میری زندگی کا ایسا لمحہ تھا جب میں خوشی سے روتے ہوئے سجدے میں جا گرا تھا کیونکہ میرے سامنے، ہاں بالکل، میری آنکھوں کے سامنے آیت کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں بھی مجھ پر تھیں، ٹپ ٹپ آنسو بہاتی۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنا دل سنبھالنے کی سعی کر رہی تھی جو کسی بھی لمحے بے قابو ہو سکتا تھا۔

اور میرا دل بھی میرے صبر کو آزمائے جا رہا تھا۔

آیت کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے مجھ ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

جانے کتنے ہی لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کو بس

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

دیکھتے ہی رہے۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام تک نہیں لے رہے تھے۔۔۔۔ صبح سے دوپہر ہو گئی لیکن ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کی۔ شاید وہ جگہ بات کرنے کے لیے موزوں نہیں تھی۔

کچھ کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں آیت کو اپنے ساتھ اپنے شہر اپنے گھر کی دہلیز پر لے آیا۔

نہ جانے کیوں مگر مجھے بہت شدت سے محسوس ہوا کہ میرے گھر میں آ کر آیت کے چہرے پر سکون چھا گیا تھا۔ آنکھوں میں پہلے سا وقار آ گیا تھا۔ قدموں میں جان پڑ گئی تھی اور جذبوں کو زباں مل گئی تھی۔

آیت فریش ہو چکی تھی۔ میں باہر سے کھانا لے آیا تھا۔ ہم دونوں نے چپ چاپ کھانا کھایا۔ پھر برتن سمیٹنے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کرنے کو تیار تھے۔

''ارحم جی پورے دو سال گزر گئے ہیں نا۔ ہم دونوں کو یوں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے؟'' آیت نے گھر کی ہر ایک چیز کو بڑی چاہت سے دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

میں بس سر کو ہلا پایا۔

''ارحم جی کہتے ہیں نا کہ انسان کا ہر فیصلہ اسے کچھ نہ کچھ سکھاتا ضرور ہے۔۔۔۔ مجھے بھی سکھایا ہے۔ بلکہ میں نے تو خود سیکھا ہے۔ قاسم سے شادی کا میرا فیصلہ غلط تھا۔ وہ شخص ویسا نہیں تھا جیسا یہاں تھا۔ وہاں تو وہ کوئی اور ہی انسان تھا۔ ارحم جی میں نے جاتے وقت آپ کو کال کر کے کہا تھا ناں کہ جب بھی میری زندگی میں برا وقت آئے گا تو مجھے یقین رہے گا کہ آپ کسی مہربان سائے کی طرح میرے ساتھ کھڑے ہوں گے مگر جب قاسم میرے ساتھ برا کر رہا تھا تو آپ کہاں تھے۔ کیوں میرے پاس نہیں تھے۔ کیوں مجھ سے اتنا دور تھے۔۔۔۔؟ بتائیں مجھے۔'' آیت جذبات کی رو میں بہتی چلی گئی۔ اس کے گالوں سے سرکتے ہوئے آنسو کسی پہاڑ کے دہانے سے نکلتے ہوئے چشمے کی طرح تھے۔ صاف شفاف۔ نمکین مگر بہت میٹھے۔

''آپ کا گلہ بجا ہے آیت۔ کاش کہ میں آپ کے ساتھ ہوتا۔ کاش کہ مجھے قاسم کے بارے میں تھوڑا سا بھی علم ہوتا کہ وہ کیسا انسان ہے۔ کاش۔ مگر اب کاش کاش کہنے سے ہمارے پچھتاوے کم یا ختم تو نہیں ہو جائیں گے نا۔ یہ پچھتاوے تو دل کے شجر سے آکاس بیل کی طرح چپکے رہیں گے۔ شاید مار کر ہی دم لیں۔''

''ارحم جی میں نے اس ست رنگی زندگی کا ہر رنگ دیکھا ہے۔۔۔۔ میں نے سرسبز و شاداب رنگ میں بہار بھی دیکھی ہے اور پیلے زرد رنگ میں خزاں کا مزہ بھی چکھا ہے۔ سرخ رنگ میں محبتیں اور ڈر کو بھی پایا ہے اور سیاہ رنگ میں سیاہ بختی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کے بھی درشن کیے ہیں اور کچھ بے وقت سی جاگتی خواہشوں کو بھی دیکھا ہے۔۔۔۔ مگر جو سب سے زیادہ رنگ مجھے بھایا ہے وہ ہے سفید رنگ۔۔۔۔ پارسائی کی علامت۔ بے داغ۔ آنکھوں کی ٹھنڈک۔ قلبی سکون جو صرف اور صرف مجھے اس گھر میں رہ کر ملا ہے۔'' پھر رکی کچھ توقف کے بعد بولی۔

''ارحم جی آپ نے میرے لیے وہ سب کیا جو کوئی اپنا بھی نہیں کرتا لیکن میں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جتنی قدر اور عزت آپ نے مجھے دی اتنی میں آپ کو کبھی نہیں دے پائی اور تو اور قاسم سے شادی اور اسلام آباد جانے کے بارے میں بھی میں نے آپ کو آخری لمحے میں بتایا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو میرے اس عمل سے ٹھیس ضرور پہنچی ہو گی۔ کیونکہ آپ میرا ہمیشہ اچھا کرتے آئے تھے اور میں اپنا اچھا کرنے کی پہلی کوشش میں ہی ناکام ہو گئی۔ وہ ناکامی در اصل آپ کو اپنی ناکامی لگتی ہو گی۔ آیت آہستہ آہستہ بولتی جا رہی تھی۔ جیسے کسی مدھر گیت کو کسی پیانو پر ہلکی آواز میں بجایا جا رہا ہو۔''

''آیت آپ ماضی کو مت یاد کریں۔۔۔۔ یہ سچ ہے کہ انسان کا حال اس کے ماضی میں چھپا ہوتا ہے لیکن یقین کریں آپ کا مستقبل بہت اچھا ہو گا۔ مثبت سوچیں۔ منفی سوچوں کو دل میں آنے ہی مت دیں۔ آپ کو زندگی نے دوسرا موقع دیا ہے۔ ہر کسی کو یہ دوسرا موقع نہیں ملتا اسی لیے اس دوسرے موقع کو ضائع مت کیجیے گا۔ اب آپ آرام کر لیں۔ آپ کا روم آپ کے جانے کے بعد بھی ویسا ہی رکھا ہے میں نے۔ جائیں۔ اندر جا کر آرام کر لیں۔ صبح فجر کے وقت ملاقات ہو گی۔''

آیت اپنے روم میں سونے چلی گئی جبکہ میں وہاں بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ بہت لمبے عرصے کے بعد وہ ویرانہ ایک بار پھر سے گھر لگنے لگا تھا۔ گو کہ صحن میں بنے باغیچے میں ہر قسم کے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے مگر وہ آیت کے آنے سے پہلے بے بو تھے۔ آیت کے اس گھر میں قدم رکھتے ہی وہ بھی خوشبوئیں بکھیرنے لگے تھے۔ صحن میں پڑے سوکھے زرد پتے جو میرے اندرون کی حالت کا بیان تھے ایک دم سے سرسبز ہو گئے اور اڑ کر پیڑ کی خالی ٹہنیوں میں جا کر پیوست ہو گئے۔ سب کچھ کسی خوبصورت خواب کے زیر اثر ہو رہا تھا۔ یہ سبھی تبدیلیاں آیت کے آنے سے ہو رہی تھیں۔ میں نے

UUNOVELS.COM

سوچ لیا تھا کہ اب میں آیت کو خود سے دور کبھی نہیں جانے دوں گا۔ ہمیشہ اپنے سامنے رکھوں گا۔ اس کا بہت سا خیال رکھوں گا اور اسے زندگی میں کوئی بھی دکھ نہیں دوں گا۔

رفتہ رفتہ دن گزرتے رہے اور آیت پھر سے جینے لگی۔ مجھے بھی قرار مل گیا تھا۔

ایک رات تقریباً سوا دو بجے مجھے آیت کے کمرے سے زور زور سے کھانسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میری نیند فوراً ٹوٹ گئی اور میں جلدی سے اپنے روم سے باہر نکلا۔ باہر آکر دیکھتا ہوں کہ آیت صحن میں ایک جگہ دوزانوں بیٹھی ہوئی اور زور سے کھانس رہی تھی۔ میں نے باہر صحن کی لائیٹ جلائی تو آیت نے کمزور نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں تیزی سے آیت کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے جا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ”آیت کیا ہوا آپ کو......“

جواب میں مجھے تیز کھانسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے کچھ لمحے سوچنے کے لیے لیے، پھر جلدی سے بائیک باہر نکالی اور آیت کو سہارا دے کر بائیک تک لایا۔ باہر گیٹ کا دروازہ بند کیا اور آیت کو بائیک پہ بٹھا کر اسپتال ایمرجنسی وارڈ میں لے گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد آیت کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو میں اسے گھر لے آیا۔

ڈاکٹر نے مجھے بلا کر پوچھا تھا کہ انہیں اتنی شدید کھانسی کب سے ہے؟ تو میں نے کہا کہ ابھی ابھی مجھے اس کھانسی کا علم ہوا ہے پہلے تو کبھی نہیں ہوئی۔ تب ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ ان کے یہ سارے ٹیسٹ کروالیں۔ اگر کوئی زیادہ مسئلہ ہوا تو رپورٹس میں سامنے آجائے گا۔

دو دن بعد میں نے آیت کے سارے ٹیسٹ کروالیے پھر جس دن رپورٹس ملیں تو میں ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ مریض کو گلے کا کینسر ہے لیکن ابھی ابتدائی اسٹیج پر ہے اگر مکمل طور پر علاج کروایا تو بہتر ہو جائے گا۔

ڈاکٹر کے اس انکشاف نے میری سانسیں اور دل ایک دم سے بند کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر کیا کہتا رہا۔ مجھے اپنے چاروں طرف سے صرف اتنا سنائی دے رہا تھا کہ مریض کو گلے کا کینسر ہے۔

میرے چہرے کا رنگ ایک دم سے اڑ گیا۔ کانوں میں ڈاکٹر کے وہی منحوس الفاظ گونج رہے تھے۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہاں سے نکل کر میں پارک میں آ گیا۔ پارک کا ایک تاریک کونا سنبھالا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، یہاں تک کہ میری ہچکی بندھ گئی۔ میری شرٹ کا گلا میرے آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔

میں خدا سے سوال کر رہا تھا کہ وہ مجھے کس گناہ کی سزا دے رہا ہے؟ کیوں بار بار میرے صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ میں اتنے بڑے دل کا مالک نہیں کہ ہر غم کو برداشت کر سکوں۔ میں خاک ہوں اور خاک کو تو دنیا والے ایک پھونک سے اڑا دیتے ہیں۔ جب میں انسان کے ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتا تھا تو اس پروردگار کی آزمائش پر کیسے پورا اتر سکتا؟ اور آیت۔ وہ تو معصوم تھی بیچاری۔ موم کی گڑیا کی مانند۔ روئی کا گالا تھی وہ...... اسے کیوں اتنی آزمائشوں سے گزارا جا رہا ہے...... وہ تو پہلے ہی بہت کچھ سہہ چکی ہے۔ زندگی کا رنگ دیکھ چکی ہے۔ لمحہ لمحہ ٹوٹ کر بکھر چکی ہے۔ کبھی اپنے بکھرے وجود کو چنتی تو کبھی دوبارہ پھر سے خود کو تعمیر کرتی...... یہ سب آیت کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ بالکل نہیں ہونا چاہیے۔

میں پھر سے رونے بیٹھ گیا۔

رات دیر سے گھر لوٹا تو آیت میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک دم سے وہ مجھے بہت کمزور لگنے لگی۔ بہت ٹوٹی ہوئی۔ بکھری ہوئی۔ خود سے لڑتی ہوئی۔ حالات سے اور تقدیر سے لڑتی ہوئی۔

بہت بہادر تھی وہ لیکن تقدیر سے زیادہ نہیں۔

اسے علم تھا کہ میں رپورٹس لے کر پھر انہیں ڈاکٹر کو چیک کروا کر ہی واپس آؤں گا۔

شاید وہ بھی اسی انتظار میں تھی کہ جان سکے کہ اسے کوئی سنجیدہ نوعیت کا مسئلہ تو نہیں ہے۔ میں خود کو آیت کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر کے آیا تھا۔ بہت ہمت جمع کی تھی آیت کے سامنے جانے کی۔

وہ بھی مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہلکے سے مسکرا کر کہا کہ اسے کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے دوائیاں لکھ دی ہیں۔ بولا ہے کہ باقاعدگی سے استعمال کرنی ہیں پھر آپ جلد پہلے جیسی ہو جائیں گی۔

شاید وہ میری باتوں اور تسلی سے مطمئن نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں اس کے چہرے کو پڑھ سکتا تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ خود کو بڑی بیماری میں مبتلا پا چکی ہے۔ اسی لیے مسکرائی تھی۔

پہلی بار مجھے اس کی ہنسی میں آیت کی ہنسی کہیں نظر نہیں آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی تقدیر پر ہنسی ہو۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

میں آیت کو خود دوائی کھلاتا، اسے مکمل ریسٹ دے رکھا تھا۔ وہ مجھے اپنے لیے بھاگ دوڑ کرتے دیکھ کر کھوسی جاتی تھی۔ جانے وہ اپنے اندر کون سی جنگ لڑ رہی تھی۔

کچھ دن تک سب ٹھیک رہا لیکن پھر ایک شام آیت کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اسے جلدی سے میں اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹرز نے معائنہ کیا اور ایڈمٹ کر لیا۔

میں نے اس کے علاج کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ وہ پھر سے پہلے جیسی صحت مند ہو جائے۔

میں آیت کو ایک سیکنڈ کے لیے بھی اکیلے نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لیے مجھے آیت اور جاب میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

میرے پاس گاؤں کی اراضی بیچ کر اور کچھ سیونگ سے اتنی تو رقم جمع تھی کہ میں ایک دو سال بغیر کسی کام کاج کے اچھے سے گزار سکتا ہوں۔ میں نے جاب چھوڑ دی۔ مستعفی ہونے کے بعد میں ہمہ وقت آیت کے سرہانے موجود رہتا۔

اسے خود اپنے ہاتھوں سے دوائی کھلاتا۔ کھانا کھلاتا۔ پھر شام کو تھوڑی دیر کے لیے اسپتال کے گارڈن میں لے جا کر واک کراتا۔

سچ کہوں تو مجھے آیت کے لیے یہ سب کر کے بہت سکون ملتا تھا لیکن جس بے سکونی میں آیت رہ رہی تھی وہ مجھے بھی بے سکون رکھتی تھی۔

''آپ ایک ہفتے سے آفس نہیں جا رہے۔ یہیں اسپتال میں موجود ہیں۔ کیا چھٹی لے رکھی ہے آپ نے؟'' میں ایک شام آیت کو جوس پلا رہا تھا جب اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''ہاں، چھٹی لی ہوئی ہے۔'' میں نے آیت کی نظروں سے بچتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں کر رہے ہیں ایسا؟'' آپ اور میں دونوں ہی یہ بات اچھے سے جانتے ہیں کہ آپ کا یہ تیاگ بھی بیکار جائے گا پھر کیوں میرے لیے اپنا وقت، اپنا پیسا برباد کر رہے ہیں۔

''کیوں کر رہے ہیں ایسا؟'' آیت جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی عود آئی تھی۔

میں نے آیت کو بغور دیکھا۔ دیکھتا رہا پھر ہلکے سے مسکرایا اور بولا۔ ''آیت جی آپ نے ایک بار کہا تھا ناں کہ جب بھی میری زندگی میں کوئی برا وقت آئے گا تو مجھے یقین رہے گا کہ آپ کسی مہربان سائے کی طرح میرے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ تب تو میں چاہ کر بھی آپ کے ساتھ نہیں تھا۔ کیونکہ میں ہر بات سے لاعلم تھا لیکن اب تو میں سب جانتا ہوں۔ آیت جی میں کوئی مہربان انسان تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہر وقت۔ ہر لمحہ۔''

میں نے اپنے جذبوں کو زباں دی تھی۔ آیت کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں نے اپنی انگلیوں کی مدد سے آیت کے آنسو صاف کیے۔ ایسا کرتے ہوئے آیت نے میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے ہاتھ کو چوم لیا۔ میرے بھی آنسو نکل آئے۔

''مجھے رلانے کے لیے تو آیت کی طرف جاتا گرم ہوا کا جھونکا ہی کافی تھا۔ مگر اس وقت تو وہ خود رو رہی تھی۔ یہ میں کیسے برداشت کر پاتا؟''

کچھ دیر کے بعد ہم چپ ہو گئے۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

اسپتال کی اس وارڈ میں زندگی میں پہلی بار میں نے خاموشی کو بولتے سنا تھا۔

اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ ارحم جی کاش میں آپ کے سنگ کچھ دن اور جی سکتی...... کچھ دن اور زندگی میں رنگ بھر سکتی۔

اس کی خاموشی کو زبان ملی...... وہ کہہ رہی تھی کہ ارحم جی اس رات کے بعد سویرا کبھی نہیں ہوگا۔ ہر سو بس گھٹا ٹوپ اندھیرے کا راج ہوگا۔ بس کچھ ان کہے جذبات ہوں گے۔ کچھ ادھوری خواہشیں۔ کچھ حسرتیں اور کچھ ارمان ہوں گے۔

اس رات آیت جب سونے لگی تو اس نے مجھے اپنے پاس بیڈ پر بٹھا لیا۔ اپنا سر میری گود میں رکھا اور میرے ہاتھوں کو اتنی مضبوطی سے تھام لیا کہ جیسے میں کہیں بھاگ ہی نہ جاؤں۔

وہ ساری رات مجھے بند آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ اور میں ساری رات کھلی آنکھوں سے برے برے خواب دیکھتا رہا۔ میرا دل بے چین ہوا جا رہا تھا۔ ایسے جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

تبھی آیت نے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف متشکر نگاہوں سے دیکھا۔ ہلکے سے مسکرائی اور بولی۔ ''ارحم جی۔ یہ زندگی تو بے وفا نکلی۔ دیکھیں میرا وقت ختم ہو رہا ہے۔ میں جا رہی ہوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔''

''ایسا مت کہیں پلیز...... آپ فکر مت کریں۔ آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میرا وعدہ ہے کہ

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

آپ بہت جئیں گی۔"

"ارحم جی۔اب تو حقیقت تسلیم کر لیں۔مان لیں کہ اب میں ختم ہو چکی ہوں۔اور ایسا کوئی وعدہ مت کریں جو آپ وفا نہ کر پائیں۔"

"ارحم جی یوں تو میں نے اپنی زندگی گزار لی ہے مگر ابھی مجھے اور جینا تھا۔میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔مجھے آپ کے ساتھ اور جینا تھا ارحم جی۔مگر دیکھیں نا وقت ظالم کتنا نکلا۔بڑا استاد ہے یہ وقت بھی۔اور موت دیکھیں وقت کی کتنی پکی ہے۔ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر نہیں کرتی۔وہ سامنے کھڑی ہے میرے۔مجھے بلا رہی ہے اپنی طرف۔اب مجھے اجازت دے دیں ارحم جی!" آیت روتے ہوئے مجھ سے اجازت طلب کر رہی تھی۔

میں بچوں کی طرح آیت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔"نہیں آیت۔ایسا مت کہیں......میں آپ کو کہیں نہیں جانے دے سکتا۔مجھے ضرورت ہے آپ کی۔میری زندگی میں آپ کی ضرورت ہے۔"

"ارحم جی میرا مسلمان ہونے کے ناطے یہ ایمان ہے کہ میں جنت میں ضرور جاؤں گی......اور میں اس آخری وقت یہ دعا کرتی ہوں کہ جنت میں مجھے آپ کا ساتھ ملے......یہ زندگی تو بہت چھوٹی تھی۔مجھے آپ کے ساتھ کئی زندگیاں گزارنی ہیں۔اپنا خیال رکھیے گا......اور اپنے گھر میں جو کمرا آپ نے مجھے دے رکھا تھا،اسے تازہ ہوا کے لیے کھولتے رہیے گا اگر آپ اس کمرے میں نہ آئے تو میرا دم گھٹ جائے گا۔میں یہاں سے تو جا رہی ہوں مگر آپ کے گھر میں،ہر ایک کونے میں،ہر ایک شے میں آپ مجھے ہی پائیں گی۔بس مجھے وہاں سے نکالیے مت گا۔"

آیت کی سانس اکھڑ رہی تھی......

وہ اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگی۔آنکھوں سے پانی مزید تیزی سے بہنے لگا۔میں نے زور سے نرس کو آواز لگائی۔دو نرسیں ایک ساتھ بھاگتے ہوئی آئیں مگر ان کے قدموں کی رفتار،موت کی رفتار سے زیادہ نہیں تھی۔موت اپنا کام کر کے جا چکی تھی۔

آیت میری گود میں ساکت وجود لیے لیٹی تھی۔اس کے گالوں پر آنسوؤں کا پانی ابھی تک موجود تھا۔اس کی کھلی آنکھیں ابھی تک مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"میرے گرد اسپتال کا عملہ تھا۔سب افسوس کر رہے تھے۔کسی کی آنکھوں میں پیار تھا تو کسی کی آنکھوں میں ہمدردی کے آنسو مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں نے کیا کھویا تھا۔سب کو شاید یہی لگا تھا کہ میں نے اپنی بیوی کھوئی ہے مگر یہ کسی کو نہیں پتا تھا کہ میں نے اپنا آپ کھویا ہے......اپنی ہستی کھوئی ہے......"

پتا نہیں کس طرح میں آیت کو لے کر گھر پہنچا،کفن دفن کا انتظام کیا۔

جنازے کے بعد،آیت کو میرے گھر میں بنے باغیچے کے وسط میں،پھولوں کے درمیان،سپردِ خاک کر دیا گیا۔

میں اسے خود سے دور نہیں جانے دے سکتا تھا۔میرا گھر ہی اس کے لیے بہترین محافظ تھا۔

روز میں صبح فجر کی نماز کے بعد آیت کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر فاتحہ خوانی کرتا ہوں یہ روز کی روٹین ہے کہ آج میں نے کیا کیا کرنا ہے کہاں کہاں جانا ہے پھر میں اس کے کمرے میں جاتا ہوں۔پانچ منٹ وہاں بیٹھ کر اس کو محسوس کرتا ہوں اسی طرح دن گزر جاتا ہے۔

☆......☆

آیت کو اس دنیا سے گزرے ہوئے دس سال بیت گئے ہیں،مگر ایسا لگتا ہے جیسے کل کی ہی بات ہو۔

ہم دونوں کا رشتہ بھی عجیب تھا۔میں اس کے لیے انجان تھا مگر اس نے ساری زندگی مجھ پر بہت زیادہ اعتبار کیا۔میرے ساتھ رہتے ہوئے وہ خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔

میری زندگی بھی آیت کے آنے سے پہلے بے معنی سی تھی مگر اس کے آنے کے بعد زندگی میں رنگ بھرنے شروع ہو گئے۔

اسے دیکھ کر میں نے پیار کرنا سیکھا تھا۔وہ میری زندگی میں مجھے محبت سے آشنا کروانے آئی تھی۔

رات کے سوا بارہ بجے ہیں۔میں آیت کے کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں۔اس کا کمرا جوں کا توں ہے۔ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی ہے۔جیسے اس نے رکھی تھی......

میز پر اس کی دوائیاں پڑی ہیں۔ایک طرف اس کے کپڑے سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔میں آیت کی ان یادوں سے کب سے محوِ گفتگو ہوں۔

اس نے کہا تھا کہ وہ میرے گھر میں،ہر ہر کونے میں ہر شے میں موجود ہوگی۔

درست کہا تھا اس نے۔وہ وہیں ہے۔بھلے ہی میری نظروں سے اوجھل ہے مگر میں اس کو محسوس کر سکتا ہوں۔وہ مجھے ہر وقت دیکھتی رہتی ہے۔

++

UUNOVELS.COM
©UUNOVELS.COM